دل گداز تحریریں ۰ زندگی کی تصویریں

ماہنامہ

سچی کہانیاں

کراچی

September

2014



اس شمارے میں:

- ☆ ایک گورکن کی کہانی جس نے اپنی محبوبہ کو......
- ☆ کشمیر کی حسین وادیوں میں جنم لینے والی محبت کی داستان
- ☆ بیٹی کے ہاتھوں ممتا کے قتل کی لرزہ خیز داستان
- ☆ اسرار میں ڈوبا تہلکہ خیز سلسلہ ''ناگن'' اعجاز احمد نواب کے قلم سے
- ☆ مسئلہ یہ ہے، قرآنی آیات کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

ماہنامہ
سچی کہانیاں
کراچی

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا



MEMBER	
APNS	رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
CPNE	رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

خط و کتابت کا پتا: 110 'آدم آرکیڈ
شہید ملت روڈ/ بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی

قیمت فی شمارہ: 60 روپے ✻ جلد: 31 ۔ شمارہ: 09 ✻ ستمبر: 2014ء

ایڈیٹر، پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

فون: 34930470 - 021-34939823 / پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس، OB-7 تالپور روڈ، کراچی

زرسالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 720 روپے' افریقہ 65 ڈالر' کینیڈا' آسٹریلیا 65 ڈالر' ایشیا' یورپ 55 ڈالر/ قانونی مشیر جی ایم بھٹو ایڈووکیٹ ہائی کورٹ



''دھرنا ہوگا''

پاکستانی سیاست کس راستے پر گامزن ہے یہ اب سمجھنا مشکل نہیں...... پاکستان اور پاکستانیوں کا کیا مستقبل ہوگا، یہ بھی بہت واضح ہے۔احتجاج اور دھرنے ہی اب ہماری قومی شناخت بن چکے ہیں۔مرضی کے خلاف بات ہوتو بس ایک ہی راستہ سب کو نظر آتا ہے اور وہ ہے احتجاج اور دھرنوں کا......زیادتی کے خلاف آواز بلند کرنا بہت ضروری ہے مگر ہر وہ عمل جس سے وقت کا زیاں ہو اور دوسروں کو تکلیف ہو غلط ہے۔احتجاج میں شریک لوگ حالات کی سنگینی سے کس قدر آگاہ ہیں، وہ ڈھول کی تھاپ پر ہوتا رقص بتاتا ہے۔ ڈھور ڈنگروں کو ہنکانے میں اور انسانوں میں فرق ہونا چاہیے۔ طاقت ور حزبِ اختلاف ملک کی تقدیر بدلنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ حکومت میں آ کر ملک کی خدمت کرنے کا جذبہ تو ہر شخص میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے لیکن اصل محبت تو یہ ہے کہ حزبِ اختلاف کی کرسیوں پر براجمان ہوں اور پوری ایمان داری سے حکومت کو کام کرنے کی تنبیہ کی جائے۔ یہی جمہوری طریقے ہیں، یہی شائستہ انداز ہیں۔ باقی رہی بات دھرنوں کی تو اِس سوچ کو بدلنا ہوگا کہ سب اچھا ہوگا جب دھرنا ہوگا......

منزہ سہام

پرل پبلی کیشنز کی جانب سے دو عظیم کتابیں

"جاگتے رہنا"

بانی پرل پبلی کیشنز، سہام مرزا کے قلم سے

صحافت کی دنیا کا نیا باب

ماہنامہ ''دوشیزہ'' اور ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں شائع ہونے والے، منتخب اداریے، جو آج بھی لمحۂ موجود کا عکس ہے۔

قیمت صرف=/200 روپے

منورہ نوری خلیق کے قلم سے

میری ساتھی میری یادیں

ایک ایسی روداد جس کا ہر لفظ سچا، ہر سطر عبرت انگیز

ایک ایسی روداد جو مصنفہ کی اپنی ہے

مگر سبق اوروں کے لیے ہے

مصنفہ نے اپنے شوہر کے احوال زیست کو

اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ اس پر ناول کی چاشنی بھی قربان ہو جائے

ایسے لطیف انداز میں بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں ہر گھر میں بطور استاد اسے موجود رہنا چاہیے۔

قیمت=/500 روپے

کتابیں منگوانے کا پتا: پرل پبلی کیشنز 110 آدم آرکیڈ شہید ملت روڈ۔ کراچی

فون : 021-34939823-34930470

کچھ اپنی باتیں

کُتّے تو آپ نے یقیناً دیکھے ہوں گے۔ عجیب و غریب مخلوق ہے صاحب! یہ تو یہ، اس کا نام بھی کسی عجوبے سے کم نہیں ہے۔ اس کے نام میں بڑی تاثیر ہے، اگر آپ اس اسمِ بامسمّیٰ کی تاثیر کے قائل نہیں تو ہاتھ کنگن کو آرسی...... کسی بھائی بند کو کتا کہہ کر دیکھ لیجیے، اچھا بھلا انسان بھی جواباً با کاٹنے کو دوڑ پڑے گا۔ اگر چہ کتے کو پچکار کر کتا کہیں تو سرشاری سے دم ہلانے لگتا ہے۔ صرف ایک پچکار کے جواب میں جان نچھاور کرنے کو تل جاتا ہے۔ اسے پچکارنا اور پیار سے بلانا یا چونگے مونگے میں کچھ کھلا دینا تو بہت بڑی بات ہے، اگر یہ آپ کی گلی میں کسی گاڑی کے نیچے سوتا ہے تو پھر لاکھ اسے دھتکاریں، لاکھ پتھر ماریں، لاکھ ٹھوکروں پر رکھ لیں، یہ محض گاڑی کی چھاؤں کے بدلے آپ کی حفاظت کرنا اپنا فرض سمجھ لیتا ہے۔ ہماری طرف ایک صاحب رہتے تھے، جنت نصیب ہو گئے، اب اُن کا نام کیا لکھوں، ان کے اہل و عیال برا مان جائیں گے، بڑے ہی کڑوے کسیلے تھے، جیسے ان کی زبان نہ ہو کر یلے کا کھیت ہو، ان کا ذہن کسی زرخیز زمین سے کم تھوڑی تھا، کہ ہر موسم میں کریلے کی سرسبز تازہ تازہ فصل سے لدا پھندا رہتا تھا۔ انھیں زمانے کے ساتھ ساتھ گلی کے کتوں سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ جہاں کوئی کتا دیکھتے پتھروں کے ساتھ ساتھ مغلظات کی برسات کر دیتے۔ مگر کتوں کی جی داری بھی عجیب تھی، محلے میں بڑے سے بڑا سورما بھی آ جائے، کتوں نے نہ اس سے ڈرنا ہے اور نہ ہی شناخت واضح ہونے تک اس کا پیچھا چھوڑنا ہے، جیسے ہی محلے کا کوئی آدمی اجنبی سے سلام دعا کرتا کتے جس پر بھونکتے اسی کے سامنے دُم ہلانا شروع کر دیتے، جیسے شرم سے پانی پانی ہو رہے ہوں، مگر سلام ہے ان کتوں پر کہ جس کسی کو غلطی سے پکڑا، اُسے ندامت کے ساتھ چھوڑا، اس سے پولیس کی طرح پیسے نہیں لیے، کبھی نہیں لیے......

بات ہو رہی تھی ان صاحب کی، یہ سورما کتے ان منحنی سے صاحب سے ایسے چھپتے پھرتے تھے کہ جیسے کہ ہم ادھار چڑھ جانے کے بعد کریانے والے سے چھپتے ہیں۔ ان صاحب کی کتا دشمنی کے سامنے ہٹلر کی یہود دشمنی ہیچ تھی۔ یہودی تو ہٹلر سے پھر بھی بچ گئے، مگر کتوں کا ان صاحب سے بچنا مشکل تھا۔ ایک دن سرِ شام کتوں نے بھونک بھونک آسمان سر پر اٹھا لیا، لوگ باہر نکل آئے، کتوں کا بھونکنا غیر معمولی تھا، یوں لگتا تھا کہ محلے کے نہیں پورے علاقے کے کتوں نے بھونکنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا دی ہے۔ معلوم ہوا کہ کتوں نے دو موٹر سائیکل سواروں کو گھیرا ہوا ہے، ان سواروں نے کتوں پر گولی بھی چلا دی مگر کتوں کو مرنا منظور ہے ان سواروں کو علاقے کی حدود سے باہر جانے نہیں دینا۔ جب تک لوگ وہاں پہنچے کتے موٹر سائیکل سواروں کو نیچے گرا چکے تھے۔ ایک کی پستول والا ہاتھ اُسی کتے کے منہ میں تھا جو کریلے صاحب کے ہزار پتھر کھانے کے باوجود ان کی گاڑی کے نیچے سونے سے باز نہیں آتا تھا۔ کچھ دیر بعد صورتِ حال واضح ہوئی تو پتا چلا کہ موٹر سائیکل سوار کریلے صاحب کے پوتے کو تاوان کی غرض سے اغوا کر کے لے جا رہے تھے، کتوں کی مداخلت سے ان کا پوتا بخیر و عافیت واپس اپنی ماں کی گود میں پہنچ گیا۔ پھر تو کریلے صاحب اور زیادہ کریلے ہو گئے، مگر اب وہ کریلے صرف انسانوں کے لیے تھے، کتوں کے لیے تو شیر شکر ہو گئے تھے۔ چھیچھڑے لاتے اور کتوں کو ڈھونڈتے پھرتے کہ انھیں کھلائیں۔ اور یہ بات کہتے کہتے ہی مر گئے کہ کتے انسان سے اچھے ہیں۔ یہ تو تھی کتوں کی بات جو اپنے دشمن کی اولاد کی حفاظت بھی اپنی جان پر کھیل کے کر گئے۔ اور اب ایک بات ہم انسانوں کی بھی، اُس معصوم بچے کی جو کسی کا دشمن نہیں تھا، جو ابھی ابھی تو اسکول سے علم و روشنی کا سبق پڑھ کر آیا تھا۔ ابھی ابھی تو اُس نے اپنے دو مقدس ہاتھوں سے بستہ گھر پر رکھا تھا۔ ابھی تو اپنے دو ننھے ہاتھوں سے اُس نے نہ جانے کتنے چراغ جلانے تھے۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ ابھی ابھی یہ دو ہاتھ ایک درندہ چھین لے گا۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ اُس کے باپ کی معمولی سی رنجش کا ایک حقیقی درندہ اُسے ایسا بھیانک صلہ دے گا کہ وہ چیختا چلاتا رہے گا اور وہ درندہ قہقہے لگاتا ہوا اُس کے دونوں ہاتھ ٹیوب ویل کے پٹے میں دے دے گا۔ میں دونوں ہاتھ کٹے ہوئے اس معصوم سے بچے کا انٹرویو ٹی وی پر دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آخر ہم کون ہیں؟ کیا ہم انسان ہیں؟ ہاں ہم واقعی انسان ہیں، ہم انسان ہی کہلانے کے لائق ہیں۔ ہم واقعی کتا کہلانے کے لائق نہیں، کریلے صاحب ٹھیک ہی کہتے کہتے مر گئے کہ کتے انسان سے اچھے ہیں۔

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

پیارے ساتھیو!
ستمبر کا شمارہ آپ کے ہاتھ میں ہے ہمیں یقین ہے جس طرح آپ نے اگست کا شمارہ پسند کیا ہے اسی طرح یہ بھی آپ کو پسند آئے گا اور آپ اپنی آراء سے ہمیں آگاہ کریں گے، ہم آپ کی رائے کے منتظر ہیں۔ ساتھیو! احوال کا آغاز کریں گے۔

✉ **کھاریاں** سے نبیلہ شاہین شامل احوال ہیں، لکھتی ہیں۔ جناب ایڈیٹر صاحب، آپ نے میرے خط کا جواب دیا، شکریہ۔ مجھے اپنے پسندیدہ عالمی لکھاری ایم اے راحت کے ناول کا شدت سے انتظار ہے، آپ نے جلد شائع کرنے کی یقین دہانی کرائی ہے اس لیے ایک بار پھر آپ کا شکریہ۔ ماہ اگست کا خوف ناک ٹائٹل والا پراسرار نمبر ملا، سرورق دیکھ کر ہی اندر کا مضمون (کہانیاں) بھانپ لیا پڑھ کر مزا آ گیا، ایک سے بڑھ کر ایک حیرت انگیز، سحر میں مبتلا کر دینے والی کہانیاں شامل تھیں۔ احوال کا حال دیکھ کر خوشی ہوئی کہ احوالیوں کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے جو کہ پرچے کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ شمارے کے باقی تمام سلسلے بھی خوب ہیں، عشق آتش اور مکھنی بھی لاجواب رہے، بقیہ باتیں آئندہ خط میں ہوں گی، اللہ نگہبان

☆ نبیلہ جی احوال میں شمولیت اور پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔



✉ سدرہ انور علی **جھنگ صدر** سے شامل احوال ہیں۔ لکھتی ہیں کاشی چوہان بھیا، ڈیئر سسٹرز، برادرز، اینڈ آل اسٹاف السلام علیکم! اسی امید، یقین اور دعا کے ساتھ کہ آپ ہمیشہ کی طرح ہنستے مسکراتے اور خوش و خرم ہوں گے۔ زندگی کے لمحات میں جب دکھ و کرب گھل جائیں تو پھر زندگی کے تمام رنگ، تمام رشتے ناتے اور جذبات و احساسات پھیکے پڑ جاتے ہیں، جیسا کہ آج کل ہمارے ملک کے حالات ہیں۔ انسان ہونے کے ناتے کیا ہمیں تکلیف نہیں ہوتی؟ کیا وہی درد ہمیں محسوس نہیں ہوتا، تو ایسے میں اگر چند ثانیوں کے لیے خوشیاں اور مسرتیں آ بھی جائیں تو کیا غنیمت نہیں؟ مہینے بعد ہم سچی کہانیاں میں تمام سسٹرز، برادرز ایک دوسرے کو محبت سے بلا لیں یا ان کو کوئی لقب عنایت کر دیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ سراب، دھوکہ یا جھوٹ ہے۔ ہمارے ملک میں ہماری زندگیوں میں زہر گھلا ہوا ہے، ایسا زہر جو انسان کا سارا لہو نچوڑ لیتا ہے۔ زرد تھوں کی مانند بھٹکتی آنکھیں ہر طرف خوشیوں کا تعاقب کرتی ہیں، مگر سکون اور خوشی کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ ہر ماہ سچی کہانیاں کے ذریعے سے ہی ہمیں خوشی ملتی ہے۔ وہ بھی کسی کو کھٹکتی ہے تو یہ ان کے مزاج کی بات ہے۔ پہلے ملک کے حالات اتنے خراب ہیں اور وہ پرچے کے حالات خراب کرنے پہنچ گئیں، دہشت گرد کا پورا رول نبھایا محترمہ نے۔ ریحانہ نعیم کا خط، خط کیا تھا طمانچہ تھا جو انہوں نے ہمارے، خاص طور میرے منہ پر مارا، ملکہ احوال کا لقب تحسین جونیجو کو میں نے ہی دیا تھا۔ اگر ہم کسی کو محبت سے مخاطب کرتے ہیں تو وہ سراب ہے؟ خوب کہی۔ سچی

کہانیاں میں مجھے لکھتے ہوئے 4 سال 9 ماہ ہوگئے ہیں مجھے سچی کہانیاں کی طرف سے بہت محبت وچاہت ملی، جب میں نے لکھنا شروع کیا تب انکل ناصر رضا مدیر تھے۔ وہ میری تحریروں کی بہت تعریف اور حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ان کے بعد منزہ سہام آنٹی اور پھر انکل سلیم فاروقی اور اب آپ، آپ نے جس طرح میری کہانی ''میں کون ہوں'' کی تعریف کی اس کی خوشی میں بیان نہیں کرسکتی۔ میں ادارہ سچی کہانیاں کی بہت شکر گزار ہوں کہ میری حوصلہ افزائی کر کے میری تحریریں شائع کرتے ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ پراسرار نمبر میرا کتنا فیورٹ نمبر ہے۔ 25 تاریخ کو موصول ہوا۔ ٹائٹل نے پراسرار ہونے کی خوب یقین دہانی کروائی۔ منزہ آنٹی کا عید مبارک اداریہ دل کی آنکھ سے پڑھا۔ احوال میں مجھے تمام خطوط بہت پسند آئے مگر اسامہ ندیم کا خط ایسے لگا جیسے انگوٹھی میں جڑا ہوا نگینہ۔ سب سے پہلے ان تمام سسٹرز برادرز کا بہت شکریہ جنہیں میری کہانی پسند آئی۔ جن میں کنول عمران، مسز نوید ہاشمی، منشی محمد عزیز بھیا، مجید احمد بھیا، فیصل ندیم، ثمینہ ناز، شائستہ جمال، عادل حسین، شاہد حسین بھیا، عبدالغفار عابد، اشفاق شاہین، کرن ناز، صفدر علی بھیا، تحسین جونیجو، اسامہ ندیم، وری تھینکس، منشی محمد عزیز بھیا میرے بابا کا نام محمد انور علی ہے۔ ہم لوگ سید نہیں۔ ملکہ احوال تحسین جونیجو آپ نے مجھے ظالم کہا، ٹھہریے میں آرہی ہوں۔ مسز نوید ہاشمی، آپ کا ہیئر اسٹائل میرے دل میں اُترتا جارہا ہے۔ Beautiful Woman۔ انکل محمد سلیم کی، خان زادہ، جسم و جان کو ہلا کر سکتہ زدہ کر گئی، آصفہ ضیاء احمد کی راج زتلی پسند آئی۔ مسز نوید کی انار کا درخت کبھی ذہن سے محو نہ ہونے والی تحریر ہے۔ کفیل خان کی عاشق جن، سلمٰی غزل کی پراسرار حویلی نے جسم و جان کو لرزا دیا۔ الماس فاطمہ ارمان کی ایک حسینہ پسند آئی۔ مور بھیا کی بریانی، اُف ایسی کہانی سے تو طبیعت عجیب سی ہوگئی۔ نایاب نسرین کی روح سے ملاقات اچھی لگی، حمیرا خان کی آسیب عجب ترس آیا اس کہانی کے کرداروں پر، کاشف عبید کی وہ کون تھی، رخسانہ نباء کی پہلے سوچ لیتے، ملک صفدر عباس کی نادیدہ روح تمام تحریریں پسند آئیں۔ سخن آباد میں تمام شعراء کی شاعری پسند آئی۔ عبدالعزیز انکل ہے کوئی کرنے کی بات، اس طرح اپنوں سے ناراض ہوتا؟ آپ نے سوچا ہے کہ آپ کے بعد ہم سب کا کیا ہوگا پلیز، یہ ضد چھوڑیں اور یاد رکھیے گا ڈیئر انکل! اگر آپ نے یہ ضد نہ چھوڑی تو اگلا خط ہمارا بھی آخری ہوگا۔ ہم بات کے سچے، اصول کے پکے ہیں۔ کاشی بھیا شاعری پر نظر ثانی کیجیے گا۔ سچی کہانیاں میرا دل میری جان، پڑھے سارا پاکستان۔ زندگی رہی تو پھر ہوگی ملاقات تب تک کیلئے اللہ نگہبان۔

☆ ارے سدرہ جی! چھوڑیں، غصہ تھوک دیں، وہ کہتے ہیں نا کہ۔ جلنے والے کا...... ہمیں یقین ہے کہ جی آ جی استاد ضدی ہرگز نہیں ہیں، وہ تو بس انہیں ذرا پیار سے غصہ آ گیا تھا۔ وہ آپ کی نہ صرف عزت کرتے ہیں بلکہ بیٹیوں جیسا مان بھی دیتے ہیں آپ کو، وہ آپ کی بات ضرور مانیں گے اور...... اور...... پھر اپنے بچوں کی سرپرستی کرتے رہیں گے اپنی تحریروں اور ہدایات کے ذریعے۔

✉ تحسین جونیجو برڑی شریف خیر پور ناتھن شاہ سے لکھتی ہیں، اداریہ عید مبارک خیریت کے ساتھ مالک خیر مبارک کرے۔ آمین۔ کچھ اپنی باتیں سدا سے اپنی لگتی ہیں، جیجل میتلو جی تو ہاں یہ سدا ئیں خوش رہو۔ ڈیئر سدرہ انور جی یعنی کھیل کے میدان میں، میں نے بھی گول کر ہی دیا، پھر تو یہ خوشی کی بات ہے نا، غصہ نہیں کرتے بچے تصور کیا روبروہی ملوں گی...... میں بھی الحمدللہ اچھی ہوں، اپنا خیال رکھنا...... عزیز مئے بھائی، بجا فرمایا آپ نے، اچھی بات ہے۔ شعبان کھوسہ سلطان بھائی، اچھا خیال ہے۔ خوش رہیے ثمینہ ناز جی، بہت ممنون ہوں، سلامت رہیے، شائستہ جمال جی بڑی نوازش، خوش رہیے۔ مور شاہد حسین بھائی سلامت رہیے۔ عبدالغفار عابد بھائی حوصلہ افزائی کے لیے مشکور ہوں۔ اسماعیل بروہی بھائی اپنے ہی دکھ سکھ میں ساتھ رہتے ہیں۔ اشفاق شاہین بھائی بہت شکر گزار ہوں، خط کی پسندیدگی کیلئے...... آپ کا خط اچھا رہا۔ کہانیوں میں جو بہترین رہی۔ (تبصرہ کیا کروں جب کاٹ ہی دینا ہے) بریانی، مور شاہد حسین۔ عاشق جن، بشریٰ کفیل خان۔ خانزادہ، سلیم اختر انکل۔ عشق ہوش ربا، صفدر علی حیدری۔ فیض عشق، امجد جاوید اور مکھنی پسند آئی۔ سخن آباد میں بابائے ملت، ساحل ابڑو، عید کا تحفہ، غزل، عبدالعزیز جی آ انکل اور تھوڑی سی وفا ثانیہ بھٹی

کی عمدہ رہیں۔ اب اجازت، اگر یہ خط شائع ہوا تو پھر حاضر ہوں گی۔

☆ ادی تحسین۔ احوال میں بھرپور شرکت کا شکریہ، قینچی سے نہ گھبرائیں، یہ تو کاٹتی ہے تمہیں اچھا لکھاری بنانے کے لیے۔

✉ **حاصل** پور سے **سید مبارک علی شمسی** لکھتے ہیں۔ محترم جناب کاشی چوہان صاحب، سلام مسنون! سب سے پہلے تو میری طرف سے سچی کہانیاں کی پوری ٹیم اور تمام لکھاریوں اور معزز قارئین کرام کو بہت بہت سلام ہو۔ میری دعا ہے کہ خالق اکبر آپ سب کو خوش وخرم اور ہمیشہ سلامت رکھے۔ یہ آپ کی محبتوں کا کمال ہے، میں آپ کی محبت میں اسیر ہوکر سچی کہانیاں میں پہلی بار خط لکھ رہا ہوں اور انشاء اللہ یہ سلسلہ جاری وساری رکھوں گا۔ آپ کے آنے سے سچی کہانیاں کا معیار بہتر ہوا ہے اور سرکولیشن میں خاطر خواہ اضافہ ہوتا جارہا ہے اور اس کی پرنٹنگ وغیرہ میں مزید نکھار ا پیدا ہوا ہے۔ یہ آپ کی محنت اور ادب دوستی کا جیتا جاگتا اور منہ بولتا ثبوت ہے۔ میرے مخلص دوستوں جناب صفدر علی حیدری اچ شریف، جناب مجید احمد جائی ملتانی اور تسنیم کوثر لاہور، جناب مبشر حسن ہیڈ بکائنی نے کئی بار سچی کہانیاں میں لکھنے کو کہا، مگر میں اپنی ذاتی مصروفیات کے باوجود بروقت تحریریں نہ بھجوا سکا جس پر معذرت خواہ ہوں اب انشاء اللہ باقاعدگی سے لکھتا رہوں گا۔ تمہید مزید سے گریز کرتے ہوئے آئندہ ملاقات تک اجازت چاہوں گا۔ اللہ نگہبان۔

☆ بھائی مبارک، آپ کی آمد احوال میں مبارک ہو، آپ کی کہانی ''بدلہ'' موصول ہوگئی ہے، انشاء اللہ بہت جلد سچی کہانیاں کی زینت بنے گی۔ آپ احوالیوں سے رشتہ مضبوط رکھیے اور قلم کو رکنے مت دیجیے، ہماری حوصلہ افزائی کا شکریہ

✉ **ریحانہ نعیم**۔ مزنگ لاہور سے لکھتی ہیں جناب ایڈیٹر صاحب، آپ نے مجھے اپنے پرچے میں جگہ دی، شکریہ، پراسرار نمبر دیکھ کر تو دل ہول گیا، سرورق کی تصویر نے سب کچھ بتادیا کہ پرچے کے اندر کیا چھپا ہوا ہے۔ کہانیاں پڑھ کر تو اور بھی حیرت ہوئی کہ لکھنے والوں نے کمال کردیا، کیسے کیسے اسرار کو پراسرار میں بدل دیا، آپ کو میرا خط پسند آیا۔ بہت بہت شکریہ، باقی باتیں آئندہ ملاقات میں۔

☆ ریحانہ جی! احوال میں آپ کی آمد اور حوصلہ افزائی کا شکریہ۔



✉ **بشیر احمد بھٹی**، بہاولپور سے شامل احوال ہیں۔ محترم کاشی چوہان صاحب، آداب۔ السلام علیکم جولائی 2014 کا سچی کہانیاں بک اسٹال سے خریدا۔ یہاں بہاول پور میں ماہنامہ دوشیزہ ڈائجسٹ کسی اسٹال یا شاپ پر نظر نہیں آتا۔ براہ مہربانی بہاولپور کے لیے دوشیزہ پہنچانے کا بندوبست کیجیے۔ شکریہ۔ صفحہ نمبر 13 پر خوش خبری کا جو اشتہار شائع ہوا ہے۔ ایسا اشتہار ٹائٹل کے قریب والے صفحے پر ہونا چاہیے، تاکہ تمام لکھاریوں کے لیے آسانی ہو اور وہ پڑھ لیں کہ اب بغیر کوپن کے کوئی خط یا کہانی شائع نہ ہوگی۔ کوپن کے ساتھ کہانی بھیجنے سے یہ فائدہ ہوگا کہ ہر ماہ ہر قاری صرف ایک کہانی ارسال کرے گا اور ایک ترتیب سے سب کی کہانیاں شائع ہوں گی۔ ظاہر ہے، دوسری کہانی کے لیے یا تو اُن کو اگلے شمارے کا انتظار کرنا پڑے گا، تاکہ نئے شمارے کے کوپن استعمال کیے جاسکیں یا پھر مزید ایک ہی شمارے کو دو دفعہ خریدا جائے۔ ایک ساتھ تین تین کہانیاں کوئی نہیں بھیجے گا۔ پراسرار کہانی نمبر II کا شدت سے انتظار ہے۔ اس شمارے میں ساتویں سچ بیانی میں محمد عزیز مئے صاحب کی تصویر دیکھی۔ موصوف کی صورت بھارتی اداکارا کشے کمار سے ملتی جلتی نظر آتی ہے۔ ان کی کہانی بھی پسند آئی۔ کہانی مہراں بھی نمبر ون ہے۔ خط مختصر کہ دوسروں کے خطوط بھی احوال میں شامل ہوسکیں، اگلے شمارے تک خدا حافظ۔ شکریہ

☆ بھائی بشیر احمد بھٹی! احوال میں شرکت اور تبصرہ وتجویز کا شکریہ۔ جن اسٹالوں پر شمارہ نہیں ملتا، ان کی تفصیل آپ نے نہیں لکھی۔ آپ 2269932-0333-2313256-0300 پر ایس ایم ایس کردیں یا کال کرکے اطلاع دیں۔ عن قریب ہمارے سرکولیشن منیجر آپ کے شہر کا دورہ بھی کریں گے۔ آپ ان سے رابطے میں رہیں۔



✉ **محمد یوسف لغاری لیہ** سے پہلی مرتبہ احوال میں شرکت کررہے ہیں، لکھتے ہیں۔ السلام علیکم، پہلی مرتبہ آپ کے ''سچی کہانیاں'' بزم میں شرکت کررہے ہیں۔ امید ہے دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید بولیں گے اور ساتھ یہ بھی کہ ''ارے میاں اتنی دیر کردی مہرباں آتے آتے'' کیوں کہ سچی کہانیاں کے ساتھ وابستگی تو کافی پرانی ہے، مگر آپ فیس بک کے کافی سارے بہن بھائیوں کو لکھتا دیکھ کر ہمارا قلم کنٹرول میں نہیں رہا۔ جولائی کا سچی کہانیاں ملا تو ٹائٹل کے اوپر رمضان مبارک لکھا تھا تو کاشی بھیا آپ کو بھی رمضان مبارک اور عید مبارک مگر یہاں ایک خامی تھی کہ رمضان مبارک کے حوالے سے سرورق نہ تھا۔ کوئی مسجد، کوئی دل نشین تصویر ہوتی تو مناسب تھا۔ امید ہے مناسب تنقید قبول کریں گے۔ منزہ سہام کے ساتھ ہم نے بھی دعا کی، اے اللہ کراچی اور پورے ملک کو امن و امان کا گہوارا بنادے (آمین) خطوط کے احوال میں کل خطوط 44 تھے، جن میں 29 قارئین تصاویر کے ساتھ موجود تھے، جبکہ الیکٹرونک احوال میں 12 ساتھیوں نے حصہ لیا ہوا تھا۔ ہر ساتھی اپنے اپنے محبت کے رنگ برسا رہا تھا، کہیں شکوہ تھا تو کسی جگہ محبت بھی ٹپک رہی تھی۔ کوئی اپنا نہ رہا معاشرے میں عورت کے وفا کے کردار کو نمایاں کررہی تھی۔ کسے الزام دوں بہن زرینہ جونیجو نے آنسو نکال کے رکھ دیے۔ کلمو ہی یکسانیت کا شکار لگی، لیکن عمدہ کہانی تھی۔ کیا آج بھی عورت پر ایسا ظلم ہوتا ہے؟ زخموں کا مداوا، مہراں، اپنے ہی دام میں، میں کون ہوں، یہ سب عورت کی دُکھ بیانیاں ہی معلوم ہوئیں۔ تین مرد تین کہانیاں میں کھلاڑی کے خطرناک انجام نے بہت خوف زدہ کیا کہ جب انسان اللہ کی پکڑ میں آتا ہے تو انجام کیا ہوتا ہے۔ مردوں کے معاشرے میں ایک مرد ہو کر، مردوں کے خلاف مزمل صدیقی کی صدق بیانی نے خوب متاثر کیا۔ باقی جس کا نام ہی شعلہ ساماں تحریریں ہوں اس کی تعریف کیا کرنی، تاہم اس میں ہندو لڑکی کی کہانی بٹوارا نے بہت اثر چھوڑا۔ مدھومتی کی واپسی نے بھی خوب متاثر کیا۔ سخن آباد میں ٹوٹل 18 ساتھیوں نے حصہ لیا ہوا تھا، جن میں ایک شاعرہ صبا جرال بیرون ملک بحرین سے بھی تشریف فرما تھیں۔ آپ نے یہ جو انعامی سلسلہ شروع کیا ہے اب اگر کوئی سالانہ خریدار ہے تو وہ کیا کرے گا، کیوں کہ کئی قارئین کمپوز خط ارسال کرتے ہیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ سالانہ خریداروں کو نمبر الاٹ کیا جائے، وہ کمپوز فائل ای میل کرتے وقت اپنا مکمل ایڈریس اور خریداری نمبر لکھیں، تاکہ ڈبل خرچ سے بچ سکیں اور انعامی مقابلے میں یا ویسے ہی وصول شدہ قابل اشاعت کہانیوں کے نام شائع کردیے جائیں کہ وقت آنے پر شائع ہوجائیں گی، تاکہ قارئین کا انتظار ختم ہوسکے۔ سچی کہانیاں اور دوشیزہ کا فیس بک گروپ بنایا جائے، جس پر ناول نگار، افسانہ نگار، شاعر اکٹھے ہوں تاکہ ایک دوسرے کی تحریروں کو پڑھ اور جان سکیں اور اس کا ایڈریس رسالے پر شائع کیا جائے، تاکہ کوئی جعلی ایڈریس نہ بن سکیں اور جو اس گروپ میں خوشی سے آنا چاہیں، آسکتے ہیں، نہیں آنا چاہتے تو اُن کی اپنی مرضی۔ تو بس جناب یہ تھا ہمارا پہلا خط اور تبصرہ۔ لازمی بتایئے گا کیسا لگا؟ شکریہ۔

☆ برادر شریف لغاری! احوال میں آپ کی آمد اور تجویز و حل کا بہت بہت شکریہ۔ بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے، لیکن اب آگئے ہو تو پھر برابر آتے رہیے گا۔ فیس بک پیج بنا ہوا ہے۔ monthlysachcheekahaniyan@gmail.com اس سے آپ بھی منسلک ہوجائیں اور اپنے دوستوں کو بھی شامل کرلیں۔ آپ اپنی کہانی یا تبصرہ ای میل کرسکتے ہیں، کوڈ کی ضرورت نہیں، آپ کی کہانی کا انتظار ہے۔



✉ اسلام آباد سے **نصرت سرفراز صاحبہ** احوال میں شریک ہیں، لکھتی ہیں مدیرہ اعلیٰ منزہ سہام مرزا اور مدیر کاشی چوہان صاحب السلام علیکم۔ ماہ جولائی کا سچی کہانیاں کا شمارہ بہت تاخیر سے ملا اخبار والے نے ڈالا نہیں اور اس کے انتظار میں ہم نے خریدا نہیں اور جیسے ہی سات جولائی کو خرید کر لائے تو اگلی صبح اخبار والا بھی ڈال کر چلا گیا۔ اس طرح ماہ جولائی کے دو شمارے ہمارے پاس ہوگئے، لہٰذا ایک شمارہ اپنی دوست کو گفٹ میں دے دیا، وہ بھی خوش اور ہم بھی کہ

رسالہ ہے ہی اتنا مزیدار کہ شروع کرنے کے بعد ختم کیے بغیر رکھنے کا دل ہی نہیں چاہتا ہے، چاہے لاکھ کام تاخیر کا شکار ہوجائیں۔ گھر والے آوازیں لگاتے رہ جائیں، ہم نے پہلے رسالہ ختم کرنا ہوتا ہے، تاکہ احوال میں شمولیت کی جاسکے، مگر وائے قسمت کہ پچھلے تین ماہ سے خط (رسالہ دیر سے ملنے کی وجہ سے) تاخیر کا شکار ہوجاتا ہے۔ اس بار اگر خط شمولیت کی منزل تک پہنچا تو عید کا مہینہ ہوگا، لہٰذا تمام احوالیوں منزہ باجی قارئین سچی کہانیاں وممبرانِ ادارہ کو دلی عید مبارک قبول ہو۔ اب آتے ہیں رسالے کی جانب، منزہ سہام مرزا کے قلم سے نکلے الفاظ زندگی روٹھ گئی واقعی شہر کراچی کو کسی کی نظر ہی لگ گئی ہے۔ آج کل آئی ڈی پیز کا شمار کیا جارہا ہے، کیا کراچی کے آئی ڈی پیز کی کسی کو خبر بھی ہے؟ ہم نہیں بھولے نہ ہم بھول سکتے ہیں سہام مرزا اپنے کام سے زندہ ہیں اور منزہ باجی تصویرِ سہام کے طور پر ہمارے درمیان موجود ہیں۔ تمام احوالیوں کی بے حد شکرگزار ہوں جنھوں نے ماہِ جون میں شائع ہونے والی میری کہانی امانت پر اپنے الفاظ سے پسندیدگی کی مہر ثبت کی اور ادارۂ سچی کہانی کی بے حد مشکور ہوں جنھوں نے ہم جیسے نئے لکھاریوں کی بے پناہ حوصلہ افزائی کی ہے۔ کوپن والا سلسلہ بہت اچھا ہے اس طرح قاری کی پسندیدگی اور آرا کو مدنظر رکھتے ہوئے پہلے دوسرے اور تیسرے نمبر پر آنے والی کہانی کا انتخاب کیا جاسکے گا۔ پراسرار کہانی نمبر دو کا شدت سے انتظار ہے، کیا ہی اچھا ہوتا اگر ایک دو ماہ پہلے ہی بتادیا جاتا تو ہم بھی کوئی ڈراؤنی سی تحریر لکھنے کی کوشش کرتے۔ سچ بیانیاں میں کوئی اپنا نہ رہا وقاص حسین، کیسے الزام دوں زرینہ جونیجو، کلموہی، غزل قریشی، مہران کشور وسیم، اپنے ہی دام میں صفدر عباس، زخموں کا مداوا محمد عزیز میئے، سب جائز ہے عبدالغفار عابد، سب ایک سے بڑھ کر ایک تھیں خاص طور پر سب جائز ہے کے سوال کا جواب شاید ہی کسی کے پاس ہو۔ میں کون ہوں سدرہ انور علی کے قلم کی تحریر اعمال کا انجام اس دنیا میں مل جانے کی کہانی اچھی لگی۔ تایا، بٹوارا اور مقدر کی آگ بھی پسند آئی۔ ملکھنی واقعی حقیقت سے دور ایک عجوبہ لڑکی کی داستان ہے۔ عائشہ صدیقہ کی ایک حقیقت ایک کہانی کو اصولاً پراسرار نمبر میں شائع ہونا چاہیے تھا۔ لکھاری سخن آباد کے یوں تو سارے اچھے لگے، مگر خواتین نے مرد حضرات کو یہاں پر مات دے دی خاص طور پر نجیل میتلو کراچی کی ''کاری'' سب پر چھا گئی۔ امید ہے اس بار خط شاملِ احوال ضرور کیا جائے گا، پچھلے تین ماہ سے تو محنت رائیگاں ہی چلی جاتی ہے۔ کاشی بھائی میری کہانی دلہن وہی جو مل گئی ہے نا؟ ایک اور کہانی ''ناکردہ گناہ'' ارسال کررہی ہوں امید ہے مناسب قطع و برید کے بعد شائع کرکے شکریہ کا موقع عنایت کریں گے۔ سخن آباد میں ایک چھوٹا سا پلاٹ درکار ہے، پڑھ کر فیصلہ کریں کہ مل سکتا ہے کہ نہیں۔ تمام احوالیوں، قارئین اور ادارۂ سچی کہانیاں میں کام کرنے والے تمام لوگوں خصوصاً کاشی بھائی اور منزہ باجی کی صحت ترقی اور کامیابی کے لیے دعاگو۔

☆ نصرت سرفراز جی! احوال میں شرکت اور پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ سخن آباد میں آپ کو پلاٹ الاٹ کیا جاچکا، اب اس کی مستقل رہائشی ہوجایئے۔ آپ کی کہانی ناکردہ گناہ بھی شاملِ اشاعت ہے، اخبار والے کو پابند کیجیے کہ وہ بروقت پرچہ پہنچائے تاکہ خط ہمیں بروقت مل سکے۔ آپ پراسرار III کے لیے کوئی پراسرار کہانی زبردست سی لکھ بھیجیں۔ کوپن سسٹم کی پسندیدگی کا شکریہ۔

✉ **محمد اسماعیل** بروہی نواب شاہ سے شامل احوال ہیں، السلام علیکم کاشی بھیا بہت سی دعائیں اور نیک تمنائیں آپ اور پورے اسٹاف کے نام۔ اگست کا شمارہ ملا...... اُف، سرورق دیکھ کر پورے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ منزہ آپی کا اداریہ دل آنکھ سے پڑھا، آپ کی باتیں بھی پڑھ کر اچھا لگا۔ احوال کی طرف آئے تو محفل جمی ہوئی تھی، پیر نوید شاہ کو ویلکم کہتے ہیں، انکل عزیز جی آصاحب ہم آپ کو جانے نہیں دیں گے، سدرہ انور علی کبھی اپنے خط میں ہمارا بھی تو نام لکھیں۔ مور شاہد، مجید جائی، امجد علی، غلام رسول اور کاشف عبید کو سلام۔ محمد سلیم اختر کی خانزادہ، سانپوں سے جڑی اور آصفہ ضیاء کی راج زنگی بہترین کہانی تھی۔ مسز نوید ہاشمی کی انار کا درخت بھی دل چسپی سے بھرپور تھی۔ بشریٰ کفیل خان کی عاشق جن، سلمیٰ غزل کی پراسرار حویلی، الماس فاطمہ کی ایک حسینہ بھی پسند آئی۔ میرے دوست اور فیورٹ رائٹر، مور شاہد کی لکھی کہانی بریانی پسند آئی۔ روح سے ملاقات اور آسیب بھی اسرار سے بھری ہوئی کہانیاں تھیں۔ زیبا مصطفیٰ کی ناجاں بھی منفرد اور اچھی کہانی

خوش خبری

میرے قاری دوستو اور لکھاری ساتھیو! جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہیں کہ ماہنامہ سچی کہانیاں قاری اور لکھاری کے لیے ایسا ہر دل عزیز پرچہ ہے جس میں ان کے دل کی عرضیاں اور من کی سچائیاں اشاعت پذیر ہوتی ہیں اور لکھنے اور پڑھنے والوں کے دلوں کی تسکین کا سبب بنتی ہیں۔ اس بات سے انکار تو ناممکن ہے کہ سچی کہانیاں لکھاریوں کے لیے حوصلہ افزا پرچہ ہے کہ جس میں بد سے بدتر تحریر بھی سجا سنوار کر پرچے کی زینت بنادی جاتی ہے۔ سچی کہانیوں کو یہ اعزاز بھی سچی کہانیاں کو حاصل ہے کہ اس نے بے شمار لوگوں کو گوشۂ گم نامی سے نکال کر میدانِ نام وری میں لا کھڑا کیا ہے اور آج وہ صف اول کے لکھاری کہلاتے ہیں، یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔ سچی کہانیاں کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے لکھاریوں اور قارئین کی حوصلہ افزائی کے لیے کوئی نہ کوئی سلسلہ جاری کرتا رہتا ہے۔ اب سچی کہانیاں کی جانب سے آپ تمام لوگوں کو یہ خوش خبری دی جاتی ہے کہ ادارہ کی جانب سے لوگوں کے بے حد اصرار پر دوبارہ سے انعامی سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے، جس میں پہلی کہانی کو 1500 سو روپے، دوسری کہانی کو ایک ہزار اور تیسرے نمبر پر آنے والی کہانی کو 700 روپے دیے جائیں گے۔ لیکن اس کے لیے ادارے نے ایک کوپن پالیسی وضع کی ہے، جس کے تحت کہانی چھپوانے کے لیے کوپن منسلک کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح جس کہانی کے لیے قارئین اپنی آراء اور پسندیدگی کے ساتھ سب سے زیادہ کوپن بھیجیں گے، وہ کہانی پہلے انعام کی مستحق ٹھہرے گی۔ اسی طرح آپ کو احوال میں اپنے خطوط چھپوانے کے لیے بھی خط کے ساتھ کوپن بھیجنا لازمی ہوگا۔ یاد رکھیے، ایسی کوئی کہانی یا خط ہرگز ہرگز قابل اشاعت نہ ہوگا جس کے ساتھ کوپن منسلک نہ ہوگا اور وہی کہانیاں انعام کی حق دار ہوں گی جن پر کوپن کے ذریعے پسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہوگا۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے قاری و لکھاری حضرات اس ضابطہ کو ضرور اپنائیں گے اور اس سلسلے کو مزید آگے بڑھانے میں تعاون کریں گے۔

تھی۔ مکھنی کی کیا بات ہے، ناگن میری فیورٹ کہانی ہے ویلڈن اعجاز نواب، آتش جنوں اور فیض عشق بھی بہترین جارہے ہیں۔ ایم اے راحت کی ہم شکل کا بے چینی سے انتظار ہے۔ رضوان قیوم صاحب کہاں ہو، کوئی کہانی تو بھیجو اور آخر میں۔ نجیل میتلو، تحسین جونیجو، کنول عمران، ممتاز احمد، غلام حسین، کرن ناز اور اسامہ ندیم کو سلام۔

☆ اڈا اسمٰعیل بروہی! بھلی کری آھی۔ احوال میں آمد اور کہانیوں کی پسندیدگی کا شکریہ۔ ایم اے راحت کا سلسلہ ہم شکل ان شاء اللہ ستمبر کے شمارے سے شروع کیا جائے گا۔

✉ سرگودھا سے مریم شاہ بخاری شامل احوال ہیں، پیارے کاشی بھیا! السلام علیکم احوال میں طویل غیر حاضری کے بعد دوبارہ خراماں خراماں آپ کی اس چاند ستاروں کی محفل میں حاضر ہوں۔ غیر حاضری کی کیا وجہ لکھوں؟ بہت سی ہیں، وقت کی کمی یا پھر ان سانحات کا ذکر کروں جو اس دوران پے در پے ہماری زندگی میں آتے اور ہمیں خون کے آنسو رُلاتے رہے۔ سب سے پہلے میری چچازاد بہن محض اٹھارہ برس کی عمر میں ہمیں روتا چھوڑ کر چلی گئی، سیدہ کومل بخاری، جس کے بدن میں دوبارہ زندگی کی لہر دوڑانے کے لیے ہر چھ ماہ بعد خون تبدیل کیا جاتا تھا۔ ہمارے چچا سید صابر حسین نے پندرہ برسوں میں جو کچھ کمایا سب اپنی لاڈلی اور پیاری بیٹی کے علاج پہ خرچ کردیا مگر افسوس...... وہ پیاری صورت ہمیشہ کے لیے منوں مٹی تلے جا سوئی۔ ابھی ہم اس صدمے سے پوری طرح سنبھلنے نہ پائے تھے کہ چند ماہ بعد ہی ہماری خالہ کے پیارے بیٹے اور ہماری بھابھی کے بڑے بھائی ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ ہم حق دق جانے والوں کو جاتا دیکھتے رہے۔ انہیں روک نہ سکے۔ برسوں بعد واپس آئے بھی تو ساتھ فرشتۂ اجل لیے چلے آئے۔ دل ان کا ذکر کرتے رو رہا ہے، ان کی شفقت اور محبت بھری آواز اب بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے...... بہنا! مسور کی دال پکا کر کھلاؤ گی تو

آؤں گا، مسور کی دال پکی کی پکی رہ گئی مگر جانے والے نے تو پلٹ کر دیکھا تک نہیں...... بھلا یوں بھی کرتے ہیں کم از کم جاتے جاتے اپنا ہاتھ ہی سر پہ رکھ جاتے...... دل غم لبریز ہے، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا، ہم نے بھی لوٹ کر اسی جا ہی جانا ہے، پھر بھی دل سے ہوک سی اُٹھتی ہے ''کاش'' کاش......! آپ سب سے التماس ہے کہ ہماری فیملی کے لیے دعائے خیر فرمادیں اور ہمیشہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ ''سچی کہانیاں'' سے الگ کٹ کر نہیں رہ سکتے اسی لیے کاغذ قلم سنبھالا اور لکھنے بیٹھ گئے، مگر صرف اپنی سنائیں...... اوہو آپ لوگ تو اُداس ہو گئے، سوری۔ اچھا چلیے سچ سچ بتائیں ہمیں کس کس نے یاد کیا؟ کیا......؟ کسی نے بھی نہیں۔ ویری بیڈ، پر میں نے تو آپ سب کو بہت مس کیا اسی لیے تو آپ سب کے درمیان پھر سے آ گئی آپ سب کا دماغ کھانے...... ہوشیار ہو جائیں (اپنے اپنے دماغ سنبھال لیں ہاہاہاہا) نام لکھنے بیٹھی تو پوری فہرست تیار ہو جائے گی اور کاشی بھیا کی قینچی کا تو پھر پتا ہی ہے نا آپ سب کو...... اسی لیے مختصر یہ کہ سب کو درجہ بہ درجہ نہایت ادب واحترام سے ہمارا اسلام پہنچے اور دعاؤں کے مہکتے پھول آپ سب کے نام...... اللہ تعالیٰ آپ سب کی زندگی میں آسانیاں پیدا کرے اور ہمیشہ شاد و آباد رہیں۔ آمین، منزہ آپی اور آنٹی رخسانہ سہام مرزا کو بھی بہت بہت سلام، کاشی بھیا! اپنی ایک غزل بھی بھیج رہی ہوں امید ہے آپ کو پسند آئے گی اور ''سچی کہانیاں'' کے اوراق میں جگہ بھی پائے گی، خدا کرے ''سچی کہانیاں'' دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین

☆ مریم جی! اللہ تعالیٰ آپ کو اور مرحومین کے لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں، بلاشبہ موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے مفر ممکن نہیں۔ احوال میں آمد کا شکریہ، غزل مل گئی ہے، جلد شائع ہو گی۔

✉ عمران فائق، اٹک سے شامل احوال ہیں، صاحبانِ ادارت واحباب ذی احترام! السلام علیکم! ماہِ آزادی ''اگست'' کا سچی کہانیاں نہایت مصروفیات کے عالم میں موصول ہوا۔ ٹائٹل اور اس پر درج شدہ ''پراسرار نمبر'' دیکھ کر اکتاہٹ سی ہونے لگی، کیوں کہ ''ہم'' ایسی تحریروں سے اکثر گریز کرتے ہیں جس میں وقت کے ضیاع کے اسباب وافر مقدار میں موجود ہوں۔ بہر کیف ''سچی کہانیاں'' سے ایک خاص قسم کا انس اور محبت ہے، تاہم یہ تحاریر بھی حلق سے نیچے اُتاریں اور خلاف معمول اچھی بھی لگیں۔ سلیم فاروقی صاحب کی ''آتش جنوں'' سلسلہ در سلسلہ بہت خوب جا رہی ہے۔ پراسرار کہانیوں میں راج نرتکی، آصفہ ضیاء احمد۔ ناگن، اعجاز احمد نواب۔ آسیب، حمیرا خان اور عاشق جن، بشریٰ کفیل خان اچھی ہیں۔ رونگٹے کھڑے کر دیے ان تحاریر نے...... احوال میں ایم حسن نظامی، ایم اشفاق بٹ، منشی محمد عزیز مئے اور مجید احمد جائی نے بہت خوب لکھا۔ ریحانہ نعیم کا شامل احوال خط پڑھ کر یوں لگا جیسے انہوں نے میرے دل کی بات کہہ ڈالی......! سدرہ انور کا ''خطاب'' اچھا لگا۔ اپنے پسندیدہ سلسلے ''سخن آباد'' کے دریچے میں جھانک کر دیکھا تو معطر فضائیں دل و دماغ پر اپنا اثر کر گئیں۔ کیا خوب منظر کشی ہے شاہد فراز کی۔ بڑا ہی رومینٹک منظر پیش کر دیا۔ حافظ مون شاہ بخاری......! بہت اچھے، ثانیہ بھٹی اپنے آپ کو خوب وفادار Show کرتی ہوئی نظر آئیں۔ مہر نسیم کی غزل اچھی ہے۔ عنبرین نعیم کا تخیل اچھا ہے لیکن یہ سمجھ نہ آئی کہ یہ کون سی صنف ہے؟؟ حسن نظامی صاحب کی غزل کے اشعار نمبر 3 اور 4 وضاحت طلب ہیں۔ موصوف سے گزارش ہے کہ تھوڑا واضح کر دیں تا کہ ہمارے پلّے بھی کچھ پڑ جائے۔ چلو یار اب الوداع کہتے ہیں کام زیادہ ہی ہو گیا۔ (مزید کلام ارسال کر رہا ہوں) اوہ ہاں! آخر میں تمام قارئین سے گزارش ہے کہ میرے لیے دعا فرمائیں میرا ICS سیکنڈ ایئر کا رزلٹ عنقریب آنے والا ہے۔

☆ برادر عمران فائق! احوال میں شرکت اور پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ ہر تحریر وقت کا ضیاع نہیں ہوتی، لوگ تو کوڑے سے بھی کارآمد اشیاء تلاش کر لیتے ہیں، پھر یہ تو پراسرار نمبر ہے جس کا لوگ شدت سے انتظار کرتے ہیں، بہر حال پسند اپنی اپنی......

✉ روبینہ حامد علی کراچی سے شامل احوال ہیں۔ محترم ایڈیٹر صاحب السلام علیکم۔ میں یو بی ایل بینک میں

ملازمت کرتی ہوں۔ بینک سے گھر، گھر سے دفتر اور رات میں انٹرنیٹ کتاب پڑھنا پڑھانا، ہم نیو جنریشن اس سے کافی دور ہیں، مگر میری بہن مسز نوید ہاشمی پڑھنے لکھنے کی شوقین ہیں۔ ان کی کہانی ''انار کا درخت'' مجھے بے حد پسند آئی۔ جو قلم صرف بینک میں اُٹھتا تھا آج ''انار کے درخت'' کی وجہ سے اٹھا رہی ہوں۔ آپ کی کتاب دوسری مرتبہ پڑھی ہے میں نے اور مجھے بے حد پسند آئی ہے۔ باجی اس کتاب کی ایسے ہی تعریف نہیں کرتی ہیں۔ ناجاں، زیبا مصطفیٰ اور خان زادہ، محمد سلیم اختر کی اچھی لگی، مگر پہلے نمبر پر ''انار کا درخت'' ہے یہ ایمان داری سے کہہ رہی ہوں۔ ڈر و خوف کے علاوہ اس کہانی کا پلاٹ بہت مضبوط ہے۔

☆ روبینہ! پرچہ آپ کو پسند آیا اور انار کا درخت کی وجہ سے آپ نے قلم اٹھایا، چلیں اسی بہانے آپ نے احوال میں شرکت تو کی۔ اب کوشش کیجیے گا کہ یہ سلسلہ چھوٹے نا......



✉ **سید محمود حسن**، حیدرآباد سے لکھتے ہیں۔ محترم جناب مدیر کاشی بھائی السلام علیکم۔ امید ہے کہ آپ اور سارا اسٹاف خیریت سے ہوں گے، ماہنامہ سچی کہانیاں بلاشبہ ایک معیاری رسالہ ہے اور ہر طرح کے موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے ہوتا ہے۔ تمام کہانیاں معاشرتی، سچائیوں اور تلخ حقیقتوں پر مبنی ہوتی ہیں اور سبق آموز بھی۔ میں بچوں کے رسالے نونہال، ڈر ڈائجسٹ اور دیگر رسائل میں لکھتا رہتا ہوں، پر میرے لیے باعث فخر ہوگا کہ میری لکھی ہوئی کہانی آپ کے رسالے کی زینت بنے۔ میں ایک کہانی جو کہ سچی ہے بنام ''چھلاوہ گراؤنڈ'' ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے اصلاح کر کے شائع فرمائیں گے اور شکریہ کا موقع دیں گے۔ اللہ تعالیٰ ماہنامہ سچی کہانیاں کو مزید کامیابیاں اور فروغ عطا فرمائے آمین۔

☆ برادر سید محمود حسن، احوال میں آپ کی آمد کا شکریہ، آپ کی کہانی مل گئی ہے جلد ہی شائع ہوگی۔



✉ **اشفاق شاہین** کراچی سے شامل احوال ہیں، سچی کہانیاں عید سے پہلے ہمیں کیا ملا، ہماری تو عید ہوگئی لیکن یہ کیا، پراسرار نمبر کے حوالے سے ٹائٹل اتنا خوفناک تھا کہ ہماری نظریں نہ ٹھہر سکیں، کچھ عید مبارک کے حوالے سے ہی رنگین بنا دیتے۔ منزہ سہام کا اداریہ ''عید مبارک'' لاجواب تھا۔ کاشی کی اپنی باتیں کمال کی ہوتی ہیں۔ احوال میں پہنچے، حسن نظامی سب سے پہلے براجمان تھے، کاشی بھائی آپ کے جواب خوب ہوتے ہیں، آپ رونق ہیں محفل احوال کی، ویسے ردّی کی ٹوکری کا بھلے روزہ ہو، رات کو تو روزہ نہیں ہوتا نا۔ پیر نوید، عصمت پروین، جگجل میتلو بہت خوب، کنول عمران ذرا تفصیل سے لکھیے۔ اشفاق بٹ، ریحانہ نعیم، فرید عالم، ریحان آفاق، شازیہ گل، لاجواب خط آپ کے۔ مقصود بلوچ، محبت آپ کی جناب آپ نے پکارا ہم حاضر، آپ سے مل کر سیروں خون بڑھ گیا۔ عبدالعزیز جی آپلیز یہاں محبت کی بات کیجیے، نفرت کی نہیں۔ اگر کسی نے جانا ہوتا ہے تو دہائی دینے کی ضرورت کیا ہوتی ہے؟ سدرہ انور، نیولک ویری نائس جیو جی بھر کے۔ منشی عزیز محبت سے یاد رکھتے ہیں تو دل کو بہت خوشی ہوتی۔ مجید جانی لاجواب لکھتے ہو گڈ، کرن ناز اچھا اضافہ ہیں ویری نائس جی آیا نوں۔ صفدر حیدری محفل کی جان ہیں زرینہ تحسین اب ہم کہیں نہیں جائیں گے اور چاہتے ہیں کہ آپ کی دعاؤں کے حصار میں رہیں۔ کاشی بھائی ہماری تو کوشش ہے کہ احوال میں باقاعدہ رہیں اور باقاعدہ ہونے کے ساتھ ساتھ محبتوں کے علمبردار بھی اور ہمیں امید ہے کہ یہ گلشن یونہی مہکتا رہے گا اور نئے نئے ستاروں کی آمد اسے اور روشن بنا دے گی۔ رہا تبصرہ، آتش جنوں بہترین جا رہا ہے زبردست، صفدر حیدری کی عشق ہوش ربا بہت خوب، مکھنی بھی ٹھیک ہی جا رہی ہے پراسرار کہانیوں پر تبصرہ اس لیے نہیں کر رہا کہ مجھے ان سے رغبت نہیں بس اتنا کافی کہ پڑھی سب ہیں، سب ٹھیک ہی ہیں۔ تمام احباب سے ایک شعر کے ساتھ اجازت۔

جو ترستا ہے سمندر کو، وہ صحرا ہوگا!
طرف ہر ایک کا خواہش میں چھپا ہوتا ہے

☆ برادر اشفاق شاہین، احوال میں شرکت اور پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ عید سے قبل آپ کی عید ہوگئی، سن کر خوشی ہوئی۔ اب آپ احوال میں باقاعدہ ہوجائیں۔



✉ مسز نوید ہاشمی کراچی سے شامل احوال ہیں۔ میرے دوستوں ساتھیوں تمام اسٹاف سچی کہانی، پڑھنے لکھنے والوں کو عید کی بہت بہت مبارکباد قبول ہو۔ صبح جب میں باغ میں ٹہل رہی تھی کہ اچانک میری نظر ایک خوفناک چہرے پر پڑی جو اپنے ہی ہاتھ کے ناخنوں سے اپنا چہرہ نوچ رہی تھی، مجھے گھور کر دیکھ رہی تھی، ایسا لگ رہا تھا اپنے پاس بلا رہی ہو کہ آجاؤ میری طرف آجاؤ۔ اُس خوفناک چہرے کو دیکھ کر میں مسکرانے لگی اور اُس کو اپنے ہاتھ میں اٹھالیا۔ میرا خوشی سے بُرا حال تھا کیوں کہ وہ چہرہ سچی کہانی کے پراسرار نمبر کا تھا۔ سب سے پہلے تو میں شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں اپنے چھوٹے بھائی کاشی چوہان کا، پھر منزہ سہام صاحبہ کا، پھر خاص ڈاکٹر شاہ محمد تبریزی اور دانیال شمسی کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ میری کہانی اس عید پر دے کر میری عید دوبالا کردی۔ رمضان کی طاق راتیں پھر عید کی وجہ سے تھوڑی کتاب کو کم پڑھ پائی مگر جیسے ہی موقع ملا میں نے کتاب ہضم کرلی اور تبصرہ لکھ رہی ہوں۔ سلسلہ وار کہانی تخت آباد ابھی باقی ہے آہستہ آہستہ پڑھوں گی، جب تک میرے ہاتھ میں دوسرا شمارہ نہ آجائے۔ سچی کہانیاں ہمیشہ سے پسند ہے، تمام کہانیاں ہی مجھے پسند آئیں کس کا نام لوں اور کس کا نہیں۔ اول سفید آنکھیں، ریاض حسین شاہد، دوم پہلے سوچ لیتے، رخسانہ نیاء، سوم پراسرار حویلی، سلمیٰ غزل، چوتھی نادیدہ روح، ملک صفدر عباس اعوان، خان زادہ، محمد سلیم اختر کی سانپوں کی پسند آئی۔ راج نرتکی، آصفہ ضیاء احمد اچھی لگی۔ انار کا درخت مسز نوید ہاشمی کی اپنے میاں مٹھو بنوا اچھا نہیں لگتا، دوسروں کو پسند آئے تب مزا آئے گا اور سچی خوشی ہوگی۔ عاشق جن، بشریٰ کفیل خان کی، ایک حسینہ، الماس فاطمہ ارمان کی کہانی بھی پسند آئی۔ مور شاہد حسین نے بریانی کی کہانی لکھ کر میری بیٹی ہنیش اور بختاور کو بریانی کھانے سے ڈرا دیا ہے، روح سے ملاقات نایاب نسرین کی اور آسیب، حمیرا خان کی اچھی لگی۔ وہ کون تھی، کاشف عبید چھوٹے سے رائٹر کی پیاری کہانی، ناجاں، زیبا مصطفےٰ کی کہانی اور جنوں والا باغ، محمد وقاص خان کی پسند آئی۔ منزہ سہام نے ہمارے فوجی جوان بھائیوں کے لیے اپنے عقیدت محبت کے پھول پیش کیے وہ تمام عمر مہکتے رہیں گے۔ کاشی چوہان کی تحریر میں ایک نک کھٹ اور چلبلا سا شرارتی لڑکا نظر آیا جو مجھے بے حد پسند آیا۔ احوال میں سب دوست اور ساتھی ہیں، اپنوں سے مل کر کسے اچھا نہیں لگتا۔ خط کافی لمبا ہوگیا ہے کاشی بھائی جو پسند آئے رہنے دینا جو پسند نہ آئے کاٹ دینا ہمیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ آج میں خوش ہوں اور خوش رہنا چاہتی ہوں۔

☆ مسز نوید ہاشمی صاحبہ! پرچہ آپ کو پسند آیا، شمارے کی کہانیاں آپ کے دل کو لگیں، پسندیدگی کا شکریہ۔



✉ **عبدالغفار عابد، چیچہ وطنی** سے احوال میں شریک ہیں لکھتے ہیں۔ اگست کا شمارہ پراسرار نمبر، خوف ناک حسینہ کے ٹائٹل کے ساتھ ملا۔ منزہ صاحبہ کا اداریہ عید مبارک بہت گہرائی لیے ہوئے تھا، کاشی چوہان کی کچھ اپنی باتیں ہمیشہ کی طرح یاد رہیں۔ ایم حسن نظامی، پیر نوید شاہ، نادیہ امین، عصمت پروین عظیمی، جگل میتلو، فوزیہ فرید احمد، نبیلہ شاہین، ایم اشفاق بٹ، کنول عمران خان، ریحانہ نعیم، مقصود احمد بلوچ، فرید عالم، ریحان آفاق، شازیہ گل، فرحت صدیقی، عبدالعزیز جی آ، ارم خان، چوہدری مدثر حسین، نسرین اختر، رضوان قیوم، سدرہ انور علی، مسز نوید ہاشمی، عظمیٰ شکور، شعبان کھوسہ، مجید احمد جائی، منشی عزیز اور دیگر تمام بہن بھائیوں کے احوال میں تبصرے زبردست رہے۔ کہانیوں میں محمد سلیم اختر کی خان زادہ اپنی مثال آپ رہی، راج نرتکی، انار کا درخت، پراسرار حویلی، بریانی، آسیب، عشق ہوش ربا، نادیدہ روح اور سفید آنکھیں اس پراسرار نمبر کی بے مثال کہانیاں ثابت ہوئیں، باقی عاشق جن، ایک حسینہ، روح سے ملاقات، وہ کون تھی، جنوں والا باغ اور خبیث روحیں بالکل پسند نہیں آئیں، جبکہ ناجاں اور پہلے سوچ لیتے پھر بھی قدرے بہتر



پاکستان کی شان، قومی پہچان

سمیع اللہ خان

فتوحات کے قصے، سُنہری یادوں کے چمکتے حروف اور آج کی کارگزاریاں۔

وہ محبوب کھلاڑی، جنہیں بین الاقوامی طور پر ''فلائنگ ہارس'' اور ''ڈینجر مین'' کے خطابات سے نوازا گیا۔



بہت جلد:

دوشیزہ کے صفحات پر ایک یادگار ملاقات کی صورت ملاحظہ فرمائیے۔

اگست 2014ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا ر کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کر لیں۔

نام: ---

مکمل پتا: ---

اگست 2014ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا ر بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کر لیں۔

عنوان کہانی: ------------------------- تعداد صفحات: ----------

نام: ---

مکمل پتا: ---

فون رسیل نمبر: ---

اگست 2014ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا ر کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان: ------------------------- مصنف: ----------

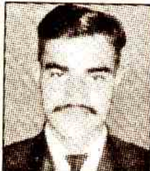
دوم، عنوان: ------------------------- مصنف: ----------

سوم، عنوان: ------------------------- مصنف: ----------

نام: ------------------------- شہر: ----------

تھیں۔ سخن آباد میں عبدالعزیز جی آ، عمران فائق، مور شاہد حسین، ایم حسن نظامی، غلام رسول گل، دستگیر شہزاد، نگہت اکرم اور راؤ تہذیب راؤ کے کلام پسند آئے۔ سلسلے وار ناول اچھے جا رہے ہیں، جبکہ فیض عشق بھی امجد جاوید کی خاص تحریر ہے، مگر بڑی مختصر سی لگی، مزہ نہیں آیا۔ انشاءاللہ اگلے ماہ پھر حاضر ہوں گے، تمام ساتھیوں کو بہت سلام۔

☆ عبدالغفار عابد صاحب! دیر آید درست آید، آپ کی کہانی بھی اس ماہ شائع ہو رہی ہے۔ آپ نے تبصرہ بہت شاندار کیا۔



✉ **ظفر علی ابڑو ملیر، کراچی** سے لکھتے ہیں۔ محترم کاشی چوہان السلام علیکم۔ اس بار تو سچی کہانیاں دل کو بہت بھایا۔ شمارہ خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ پراسرار نمبر شائع کرنے پر مبارکباد قبول فرمائیے۔ سب سے پہلے اداریہ پڑھتا ہوں، اس بار منزہ جی نے بہت اچھا لکھا اُداس ہی کر دیا۔ کچھ اپنی باتیں تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ احوال میں ساتھیوں کے خط پڑھے، جولائی کے شمارے پر بہت ہی اچھا تبصرہ کیا گیا۔ نوید شاہ صاحب، حسن نظامی، جیجل میتلو، ایم اشفاق بٹ، چوہدری مدثر حسین، سدرہ انور علی، عظمیٰ شکور، مجید احمد جائی، ثمینہ ناز، عادل حسین، مور شاہد حسین، ممتاز احمد، اشفاق شاہین، صفدر علی حیدری، تحسین جونیجو کا بھرپور تبصرہ اچھا لگا۔ تمام کہانیاں اسرار سے پر تھیں۔ انار کا درخت دل دہلاتی پراسرار کہانی پڑھنے کو ملی تو نادیدہ روح بہت ہی خوفناک لگی۔ پہلے سوچ لیتے بہت حیرت انگیز ثابت ہوئی تو بریانی اسرار سے بھرپور تھی، مور شاہد حسین مزید کامیابی کیلئے دعائیں۔ ممکھنی ارشد علی ارشد کے قلم سے نکلا ناول پڑھ کر معلومات میں کافی اضافہ ہوتا ہے۔

☆ اڑا ظفر علی ابڑو! آپ کو پرچہ پسند آیا شکریہ۔

✉ **عبدالغفار ثاقب، ایبٹ آباد** سے لکھتے ہیں السلام علیکم۔ میری طرف سے سچی کہانیوں کے سبھی اسٹاف اور قارئین کو دل سے سلام اور ڈھیر ساری دعائیں قبول ہوں۔ 3 اگست کو چلچلاتی دھوپ، گرم ہواؤں کے بوسوں کے ساتھ ہم اپنے پیارے رسالے کو آخری بار پراسرار نمبر کی صورت لیے، سینے سے لگائے جب بک اسٹال پر پہنچے تو ٹائٹل گرل ڈائن دوشیزہ کی صورت میں اپنا بدصورت چہرہ نوچتی ہوئی (میں دل میں آتی ہوں سمجھ میں نہیں) کا تاثر دے رہی تھی اور رسالے کے اندرونی صفحات پر ایک بار پھر ایم اے راحت صاحب کی قسط وار کہانی جلد آ رہی ہے کی نوید کے ساتھ رسالے کے کچھ بہتر ہونے کی نوید سنا رہی تھی۔ ایم اے راحت صاحب جن کو میں نے بہت پڑھا اور بہتر پایا، جن کا میں فین ہوں۔ ان کی کہانی کے اشتہار نے مجھے رسالے سے تعلق جوڑنے اور اس خط کی صورت میں شکوے، شکایات اور کچھ تجاویز و آراء پر اس امید پر کہ اس پر عمل بھی ہوگا مجبور کر دیا۔ سچی کہانیوں سے تعلق بھی پراسرار نمبر پڑھ کے ہی شروع ہوا تھا۔ بہت سے پرانے سچی کہانیوں کے شمارے بھی پڑھنے کو ملے بہت زبردست تھے۔ آج سچی کہانیاں میں ہر مہینے صرف تین چار دوسری اور دو قسط وار کہانیاں ہی اچھی اور پڑھنے کے قابل ہیں، ایک سلیم فاروقی صاحب کی آتش جنوں بہترین ہوتی ہے اور کچھ بہتر ناگن ہے اعجاز نواب صاحب کے قلم سے۔ سلیم فاروقی کا بھی میں فین ہوں اور رسالوں میں بھی ان کو پڑھا ہے۔ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ ابھی باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے، کہانیوں میں خان زادہ، انار کا درخت، جنوں والا باغ اچھی لگی۔ خدا حافظ اب اجازت۔

☆ برادر عبدالغفار ثاقب! احوال میں آمد اور رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ۔



✉ لاہور سے **حنا بشریٰ** لکھتی ہیں، السلام علیکم! پیارے بھیا۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے پاکستان سمیت تمام عالم اسلام کو جن مصائب والم کا سامنا ہے، اُن سے اللہ پاک ہم سب کو نجات عطا فرمائے اور دہشت گردی کا مکمل خاتمہ ہو جائے (آمین) اگست کا شمارہ آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور سچی کہانیاں کے تمام اسٹاف کو

مزید ترقی عطا فرمائے (آمین) سچی کہانیاں ایک رسالہ نہیں ہے، بلکہ جس طرح اس نے میری طرح اور بہت سوں کا قلم پکڑنا سکھایا، یہ اب ایک اکیڈمی بن گیا ہے جہاں سے طالب علم تعلیم حاصل کر کے جاتے ہیں۔ ہماری عام سی کہانیوں کو خاص بنانا آپ کا ہی کمال ہے اور ہم سچی کہانیاں کی محبت کی ہمیشہ مقروض رہیں گے۔ اگست کا شمارہ زبردست تھا۔ کچھ اپنی باتیں پڑھ کر مزہ آیا۔ تحریریں بے شک تمام لاجواب تھیں، مگر خان زادہ، سلیم اختر صاحب، راج نرنگی، آصفہ ضیاء احمد، بریانی، مورشاہد حسین بھیا، نادیدہ روح، ملک صفدر عباس، اگست کے شمارے کی خاص تحریریں تھیں۔ اس کے علاوہ ناجاں، عاشق جن، پراسرار حویلی، انار کا درخت، عشق ہوش رُبا، جنوں والا باغ، ایک حسینہ، آسیب بھی بے حد خوب صورت اور سبق آموز تحریریں تھیں۔ عشق ہوش ربا کا اینڈ بے حد خوب صورت تھا، لیکن اگست کے شمارے کی خوف ناک کہانیاں دو تھیں، نادیدہ روح، ملک صفدر عباس اعوان اور سفید آنکھیں، ریاض حسین شاہد، ان دونوں کہانیوں کو رات میں بالکل پڑھنا نہیں چاہیے تھا۔ مگر اب تو پڑھ لیں، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ آپ دونوں حضرات ڈرانے میں کامیاب رہے ہیں بہت بہت مبارک ہو اتنی اچھی کاوش پر۔ زرینہ جونیجو اللہ پاک آپ کو صحت عطا فرمائے اور آپ کی اچھی سی تحریر کا انتظار ہے۔ سدرہ انور علی جس طرح تم خود پیاری ہو، ویسے ہی تمہاری ہر تحریر خوب صورت ہوتی ہے سدا خوش رہو، عبدالعزیز جی آ صاحب! آپ ناامید نہ ہوں۔ اللہ پاک بہت بہتر کرنے والا ہے، اللہ آپ کو خوش رکھے ہم آپ کی کہانیوں سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ کاشی بھیا نے جس انداز میں آپ کا حوصلہ بڑھایا مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمام احوالیوں، لکھنے والے دوستوں اور تمام پڑھنے والوں کو ڈھیروں دعائیں۔ پہلی بار تفصیلی خط لکھا ہے مکمل چھاپ دیں تو مہربانی ہوگی ورنہ پیغامات رہ جائیں گے آئندہ طویل خط نہیں لکھوں گی، اب اجازت۔ اللہ حافظ

☆ حنا بشریٰ جی! آپ نے خط طویل نہیں لکھا بلکہ طویل مضمون کو مختصر خط میں محفوظ اور قارئین کو اپنے اس ہنر سے محظوظ کر دیا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ، بلاشبہ سچی کہانیاں ایک اکیڈمی کی حیثیت رکھتا ہے اور آج کی طرح کل بھی یہ لکھاریوں کی اسی طرح حوصلہ افزائی کرتا رہے گا اور ان کے فن کو اجاگر کرے گا۔



✉ مورشاہد حسین قمر شہداد کوٹ سے شامل احوال ہیں۔ ہر دلعزیز کاشی چوہان بھیا سلام و دعائیں آداب، اگست کا تازہ شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے، ٹائٹل بہت ہی خوفناک پراسرار نمبر کے لیے بے حد اچھا تھا۔ خوفناک تصویروں سے سجی فہرست میں ارے یار وہ مورشاہد حسین بھی بعنوان ''بریانی'' شامل ہیں۔ حوصلہ افزائی کا بے حد شکریہ۔ ایم اے راحت کے ناول ہم شکل کا انتظار ہے۔ آنٹی منزہ سہام کا اداریہ عید مبارک ہر ماہ کی طرح بہترین اداریہ تھا۔ آپ کی کچھ اپنی باتیں بے مثال تحریر ہے۔ اپنوں کی محفل احوال اپنے عروج پر تھی، ایم حسین نظامی، سائیں پیر نوید شاہ، شعبان کھوسہ، اشفاق شاہین، بھلی کرے آیا۔ انکل عبدالعزیز جی آ کا استعفیٰ نامنظور نامنظور؟ ممتاز احمد بھیا اور سدرہ انور علی بہنا خدا کے کرم سے ہم بالکل ٹھیک ہیں۔ مجید احمد جائی بھیا تساں ٹھیک ہے وے؟ فرخندہ بتول کے والد صاحب کی صحت یابی کے لیے پُرخلوص دعائیں۔ شائستہ جمال بہن عمرے کی سعادت مبارک ہو۔ ڈاکٹر ایس وفا اور غلام رسول گل اپنی محبت و اپنائیت ہمیشہ قائم رکھیے گا۔ منشی محمد عزیز مئے، فیصل ندیم بھٹی، انکل ایم اشفاق بٹ، صفدر علی حیدری آپ کے خط میں میرا نام کیوں نہیں؟ کبھی بھولے سے یاد بھی کر لیا کرو جی۔ امجد علی بھیا، ظفر علی ابڑو شکریہ خدا آپ کو بھی سدا سلامت رکھے۔ ادی زرینہ جونیجو آپ کی طبیعت کیسی ہے خدا آپ کو صحت دے، ہاں! ملکہ احوال ادی تحسین جونیجو صاحبہ لوگ کیوں آپ کو دادی اماں پکارتے ہیں اب بتا بھی دو۔ محمد اسماعیل بروہی اور ڈاکٹر ایس وفا آپ اپنی تصویر بھیجیں نا پلیز، بندہ دیدار ہی کر لے، شاہد فراز، رانا محمد شاہد، فیض رسول، طارق جاوید، ملک صفدر عباس اعوان، نصرت سرفراز آپی اس حسین محفل میں آپ کی کمی تھی کہاں ہیں آپ؟ کاش بھیا یہ کیا شعبان کھوسہ سچی کہانیاں میں سلطان ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں اور تحسین جونیجو ملکہ بنی ہوئی ہیں میری بھی ایک چھوٹی بہت ہی چھوٹی سی التماس

ہے کہ مجھے شہزادا احوال بنا دیا جائے، ہاہاہاہاہا۔ محمد سلیم اختر، خان زادہ، آصفہ ضیاء احمد، راج زتکی، حیرت و اسرار سے پُر پڑھنے کو ملی۔ مسز نوید ہاشمی، انار کا درخت، بشریٰ کفیل خان، عاشق حسین اچھی تھیں۔ سلمیٰ غزل، پراسرار حویلی، آخر آسیب نے مکینوں کا بھلا ہی کیا ان کو گھر کی صورت تحفہ دے گئے۔ الماس فاطمہ ارمان، ایک حسینہ نایاب نسرین، روح سے ملاقات، حمیرا خان، آسیب، کاشف عبید، وہ کون تھی، حیرت اور تجسس سے بھرپور تھیں، انکل سلیم فاروقی، آتش جنون، اگلی قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ رخسانہ نباء، پہلے سوچ لیتے، لالچ بہت ہی بری شے (چیز) ہے ماں کی لاپروائی اور لالچ نے بیٹے کو موت کی نیند سلا دیا۔ اعجاز احمد نواب ناگن، ارشد علی ارشد مکھنی اچھی جا رہی ہیں۔ صفدر علی حیدری عشق ہوش ربا، ملک صفدر عباس اعوان نادیدہ روح، ریاض حسین شاہد سفید آنکھیں، حیرت تجسس اور اسرار میں ڈوبی بہت ہی خوف ناک تھیں۔ زیبا مصطفےٰ، ناجاں، نادیدہ مخلوق نے اس کی جان ہی لے لی۔ محمد وقاص خان، جنوں والا باغ، نسیم آراء، خبیث روحیں، مختصر مگر اسرار سے پر جامع لگی۔ سخن آباد میں سب کے خیال اچھوتے تھے۔ امجد جاوید، فیضِ عشق دوسری قسط بھی شاندار تھی۔

☆ اڑا مور شاہد حسین! بابا شہزادہ' احوال بننا ہے تو اڑی سدرہ سے رابطہ کریں، یہ ٹائٹل وہیں سے ملتے ہیں۔ ایم اے راحت کا سلسلہ جلد ہی شروع ہوگا، احوال میں شرکت اور پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔

✉ ڈاکٹر ایس وفا لاڑکانہ سے لکھتے ہیں، بھیا کاشی چوہان سدا خوش رہو۔ احوال میں یہ میری تیسری شرکت ہے۔ بحکم آپ کے احوال میں تیسری شرکت کو بھی یقینی بنایا پھر انشاء اللہ چوتھی، پانچویں اور پھر مستقل احوالی ضرور ہو جائیں گے بشرط احوال میں مختصر ہی سہی جگہ ملتی رہی تو؟ تازہ شمارہ میرے سامنے میز پر پڑا ہے۔ احوال کی محفل ہمیشہ کی طرح بے حد پسند آئی۔ مور شاہد حسین آپ نے گلے لگایا ہمارے دل کو ٹھنڈک و راحت محسوس ہوئی بھئی ہم نے آپ کو زوروں گلے لگایا۔ کیا یاد کرو گے جی۔ غلام رسول گل عید کا دن آپ کے ساتھ بہت ہی یادگار گزرا، آپ ہمارے لیے بہت خاص ہیں؟ اداریہ عید مبارک، کچھ اپنی باتیں، کچھ سوچنے پر مجبور کر گئی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے اپنے محبوب مور شاہد حسین کی بریانی، دل کی آنکھ سے پڑھی اور روح میں اُترتی چلی گئی۔ مبارک باد مور شاہد حسین۔ روح سے ملاقات، وہ کون تھی، ایک حسینہ، جنوں والا باغ، سفید آنکھیں تمام کہانیاں اسرار سے بھرپور تھیں۔ بے حد پسند آئیں، سخن آباد میں مور شاہد حسین عید کا تحفہ اور غلام رسول گل عید لائے۔ باقی سب کی غزلیں اور نظمیں دل کو بھائی۔

☆ برادر ڈاکٹر ایس وفا! آپ کا خط شامل احوال ہے، اب آپ مستقل احوالی بن جائیں۔



✉ **غلام رسول گل** جیکب آباد سے لکھتے ہیں۔ عزیز کاشی بھائی آداب! آپ سمیت سچی کہانیاں کے پورے اسٹاف، لکھاری اور قارئین حضرات کے لیے زندگی، صحت، خوشی، کامیابی، امن اور سلامتی کی دعائیں اس بار محفل احوال بہت خوب صورتی اور پیار و محبت سے بجی ہوئی تھی، مگر چند دوست ظفر اللہ رند، شاہد فراز حیدر آباد سے غیر حاضر تھے امید ہے خیریت سے ہوں گے۔ جن دوستوں نے یاد رکھا ان کے لیے دعائیں۔ مور شاہد حسین انشاء اللہ اپنی دوستی تا قیامت رہے گی، آپ کی کہانی بے حد اچھی لگی آپ کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔ محفل میں سب سے پہلے ایم حسن سے ملاقات ہوئی ویلکم۔ آگے پیر نوید شاہ، عصمت پروین، جیجل میتلو، ایم اشفاق بٹ، کنول عمران خان، فرید عالم، ریحان آفاق، عبدالعزیز جی آ، سدرہ انور علی، مسز نوید ہاشمی، عظمیٰ شکور، محمد عزیز، شعبان کھوسہ، مجید احمد، حنا بشریٰ، فیصل ندیم، کاشف عبید، ثمینہ ناز، عادل حسین، مور شاہد حسین، شفقت حسین، چھوٹے بھائی غلام حسین، امجد علی، ظفر علی، عبدالغفار، ممتاز احمد، کرن ناز، صفدر علی چوہدری، زرینہ جونیجو، تحسین جونیجو، اسامہ ندیم سے مل کر خوشی ہوئی۔ مصروفیات کے باعث تبصرہ نہیں کر رہا۔ انشاء اللہ اگلے ماہ بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضری دوں گا۔ اللہ حافظ۔

☆ برادر غلام رسول گل! اگلے ماہ آپ کے بھرپور تبصرے کا انتظار ہے۔



✉ امجد علی۔ چیزل آباد سے شامل احوال ہیں، مدیر اعلیٰ منزہ سہام، مدیر کاشی چوہان اور دانیال شمسی صاحب السلام علیکم۔ امید ہے مزاج بخیر ہوں گے، اگست کا چمکتا دمکتا پر اسرار نمبر 27 جولائی کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے خریدا۔ منزہ سہام جی کا اداریہ عید مبارک کاشی چوہان کی کچھ اپنی باتیں، بہت ہی خاص موضوع پر لکھی گئی۔ اسماعیل برو ہی ہماری طرف سے دوستی سچی اور پکی سمجھو۔ ظفر علی ابڑو تم ہمیشہ دعاؤں میں یاد رہتے ہو۔ غلام رسول گل، مور شاہد حسین، شفقت حسین یادگیری کا شکریہ۔ ناول آتش جنوں بہت اچھا جا رہا ہے۔ عشق ہوش ربا، پہلے سوچ لیتے، مکھنی بے حد پسند آئی۔ مور شاہد حسین آپ کی کہانی بریانی اور نظم عید کا تحفہ اچھوتی تھی۔ ویلڈن۔ ناگن اپنی مثال آپ منفرد ناول ہے۔ انار کا درخت بھی اچھی تھی۔ شاعری بھی پسند آئی، کاشی بھائی اپنا اور تمام احوالیوں کا خیال رکھیے گا۔

☆ امجد علی! آپ کی احوال میں شرکت اور پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔



✉ غلام حسین، جیکب آباد سے لکھتے ہیں۔ کاشی بھائی السلام علیکم! چاروں طرف عید کی خوب تیاریاں ہو رہی تھیں، بازاروں میں رش اپنے عروج پر تھا، ہر چہرے پر خوشی رقص کر رہی تھی مگر میرا دل خون کے آنسو میں ڈوبا ہوا اس کے لیے تڑپ رہا تھا ویران آنکھیں اس کی متلاشی تھیں وہ یوں بچھڑا کے آنکھیں اس کی یاد میں اب تک اشک بہاتی ہیں۔ وہ اپنے پیاروں کی چیخ پکار کے باوجود بھی آنکھیں نہ کھول سکا۔ آفتاب علی میرا خانزادہ اور بہت ہی پیارا دوست تھا چند دن پہلے اس نے فون کیا کہ آج ہم لاڑکانہ شفٹ ہو رہے ہیں تم پرسوں تک ہمارا نیو گھر دیکھنے ضرور آنا میں نے اسے مبارکباد دی پھر خدا حافظ کہہ کر ہم نے فون بند کیا۔ پون گھنٹے بعد فون آیا کہ دوران سفر حادثہ ہوا آفتاب علی کی ٹانگیں کچل گئی ہیں اور اس وقت سول اسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں ہے۔ اس کی دلیری اور بہادری دیکھو جب اسے ہوش آیا سب کو مسکرا کر تسلی دینے لگا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں بس معمولی سی چوٹ لگی ہے اس کی بہادری پر اُداسی چہروں پر رونق سی بکھر گئی یوں سب کو حوصلہ دیتے ہوئے اور زندگی سے لڑتے ہوئے رات 3 بجے زندگی کی بازی ہار گیا سب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے روتا ہوا چھوڑ کر اگلے جہاں چلا گیا جہاں سے لاکھ کوشش کرنے کے باوجود بھی واپسی ناممکن ہے۔ یہ خط لکھتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں اور آنکھیں پرنم ہیں۔ آخر میں تمام قارئین سے گزارش ہے کہ میرے دوست آفتاب علی کے لیے دعائے مغفرت ضرور کریں۔

☆ برادر غلام حسین! اس افسوسناک واقع پر ہم سب آپ کے ساتھ شاملِ غم ہیں، اللہ تعالیٰ مرحوم کے لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے اور آپ کو بھی۔



✉ شفقت حسین حب چوکی سے شامل احوال ہیں، 27 رمضان المبارک بمطابق 26 جولائی کو اگست 2014 کا سچی کہانیاں پر اسرار نمبر بہت ہی ڈراؤنے سرورق کے ساتھ ساڑھے گیارہ بجے موصول ہوا۔ حسب عادت پرچہ ملتے ہی اپنوں کی محفل احوال کی جانب لمبی چھلانگ لگائی اور ہمیشہ کی طرح اپنے خط پر قدم رک نہیں جم گئے۔ آپ کا محبت سے بھرپور جواب پڑھ کر حوصلہ بڑھ گیا جن دوستوں، بہنوں، بھائیوں نے بندہ ناچیز کو یاد رکھا ان کا بے حد شکریہ۔ خاص عبدالعزیز جی آ، سدرہ انور علی، منشی محمد عزیز، امجد علی بھیا، مجید احمد جائی، غلام رسول گل، مور شاہد حسین، تحسین جونیجو سدا خوش و سلامت رہو آمین شکریہ۔ خان زادہ، محمد سلیم اختر۔ آسیب، حمیرا خان۔ محمد وقاص خان، جنوں والا باغ۔ خبیث روحیں، نسیم آراء، مور شاہد حسین، بریانی، فیض عشق، امجد جاوید اپنے مثال آپ تھیں۔ آتش جنوں، سلیم فاروقی، مکھنی، ارشد علی ارشد، ناگن، اعجاز احمد نواب پسندیدہ سلسلے ہیں۔ اب اجازت آپ سچی کہانیاں کی پوری ٹیم اور قارئین کے لیے پُرخلوص دعائیں۔

☆ شفقت جی! ہم آپ کی شفقت کے متمنی ہیں یہ احوال میں آپ کی شرکت کا شکریہ۔

⊠ نازیہ جہانگیر خان لاہور سے شریک احوال ہیں، لکھتی ہیں السلام علیکم میرا نام نازیہ جہانگیر ہے، میں سچی کہانیاں کی بہت پرانی قاری ہوں، تقریباً پانچ سال سے میں پڑھ رہی ہوں، مجھے سچی کہانیاں بہت پسند ہے بہت زیادہ، مگر اب آپ نے اس میں قسط وار کہانیاں بہت زیادہ کر لی ہیں۔ میرے جاننے والے جو یہ پڑھتے ہیں اُن سب کو یہ شکایت ہے کہ یہ قسط وار بند کی جائے، باقی سب بہت اچھا ہے، بالکل پرفیکٹ ڈائجسٹ ہے۔ ایک بات اور کہ 2014 مارچ میں پراسرار نمبر کی کہانیاں حقیقت سے دور تھیں۔ اصل واقعات سے ہٹ کر کہانیاں تھیں، پراسرار نمبر میرا پسندیدہ نمبر ہے پھر بھی زبردست تھا۔ مسئلہ یہ ہے بہت ہی اچھا سلسلہ ہے، خدمت خلق کا یہ سلسلہ بہت اچھا ہے۔ مجھے لکھنے کا بہت شوق ہے مگر مجھے تجربہ نہیں ہے، لیکن میرے پاس چوں کہ یہ سچا رسالہ ہے اس لیے میرے پاس بہت سے سچے واقعات ہیں جنہیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ دل بہت کرتا تھا لکھنے کو مگر ہمت نہیں ہوتی تھی، لیکن آج ہمت کر لی ہے، پلیز میری کہانی اور احوال میں مجھے ضرور شریک کر لیں۔ میں سچی کہانیاں کی مستقل لکھاری بننا چاہتی ہوں، میری ہمت بندھائیں، میری کہانی ضرور شائع کریں کوئی غلطی کوتاہی ہوگئی ہو معاف کر دیں۔ کاشی چوہان کو سلام اور مبارکباد اس رسالے کیلئے اور دلی عید مبارک۔

☆ نادیہ جی! محفل احوال میں آپ کی پہلی بار آمد، شکریہ آپ کی کہانی جلد شائع ہوگی اور آپ کی دلی خواہش بھی ضرور پوری ہوگی، آپ کو اچھا لکھاری ہم بنائیں گے۔ آپ اپنا قلمی رشتہ ہم سے مضبوط کر لیں اور ہمیں اپنی تحریر اور خط برابر بھیجتی رہیں، کہانی کے معاملے میں سب کی پسند اپنی اپنی، قسط وار سلسلے بھی پرچے کا حصہ ہوتے ہیں، ہر قاری کا اپنا مزاج ہوتا ہے، اس لیے سب کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔

⊠ راولپنڈی چاندنی چوک سے **محمد رضوان قیوم** لکھتے ہیں! محترم کاشی چوہان صاحب السلام علیکم، میں خیریت سے ہوں، امید کرتا ہوں کہ آپ بھی خیریت سے ہوں گے، دیگر احوال یہ ہے کہ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میری جانب سے بھیجی گئی دو پر اسرار کہانیوں میں سے ایک کہانی پراسرار نمبر میں شائع ہوگی، لیکن خصوصی پراسرار نمبر میں میری کہانیوں میں سے ایک بھی شائع نہ ہوئی، حالاں کہ میں نے آپ کو CD میں دونوں کمپوز کروا کر بھیجی تھیں، ''ذرا سی غلطی'' اور ''سدرا'' طویل کہانی کا پلاٹ بہت منفرد اور اچھوتا ہے۔ آپ کے پاس میری دو کہانیاں بھی موجود ہوں گی ''عبرت'' اور ''مظلوم گوری'' مہربانی کر کے انہیں جگہ دیں، یہ سب کہانیاں کسی بھی ڈائجسٹ میں شائع نہیں ہوئیں۔ سچی کہانیاں ماہ اگست 2014 کا پرچہ میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ میں نے تمام کہانیوں کو پڑھا، خان زادہ تسلیم اختر کی لکھی یہ کہانی واقعی اپنے پلاٹ کے لحاظ سے اچھوتی اور دلچسپ سحر انگیز تھی، جبکہ انار کا درخت اپنے موضوع کے لحاظ سے اچھی تحریر تھی۔ جنوں والا باغ کے رائٹر محمد وقاص کا خیال بہت جاندار لیکن قلم کی گرفت قدرے کمزور نظر آئی، میرے خیال میں موصوف اگر تھوڑی اور اس کہانی پر محنت کرتے تو یہ کہانی مزید خوب صورت لکھی جا سکتی تھی۔

☆ برادر رضوان قیوم! غالباً آپ نے ماہ اگست کے احوال میں ہمارا جواب نہیں پڑھا۔ ہم نے لکھا تھا کہ آپ کی کہانی سدرہ کا پرنٹ ہمیں مل گیا ہے، لیکن آپ کی سی ڈی بالکل خالی، سادہ، بلینک ہے اس میں کوئی کہانی نہیں ہے، لہٰذا آپ ہمیں اس کا پرنٹ بھیجیں۔ شکریہ



⊠ **ملک عاشق حسین ساجد**، ہیڈ بکائی سے شامل احوال ہیں، محترم جناب کاشی چوہان صاحب السلام علیکم! گزرتے وقت کے ساتھ ماشاء اللہ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' ترقی کی منزلیں طے کرتا اپنے سفر پہ رواں دواں ہے، قبلۂ ادب میں اس کا مقبول نام معیار کے حوالے سے خاصا معتبر اور منفرد ہے۔ آپ کی قیادت میں زبردست جا رہا ہے، انعامات کا سلسلہ دوبارہ شروع کر کے آپ نے لوگوں کے دل جیت لیے ہیں، اس سے لکھاری مزید اچھے سے اچھا خیال اور حقیقت لکھنے کی کوشش کرے گا۔ تمام کہانیوں کا انتخاب لاجواب ہوتا ہے، مگر منظوم کے حوالے سے بہت کم احباب کو جگہ دی جاتی ہے، اس پر توجہ کی ضرورت ہے قارئین کرام کے ایک دوسرے کے ساتھ قلمی پیغامات کا سلسلہ شروع کریں یہ سب حالات و وقت کا

تقاضا ہے تا کہ قارئین وشعراء اور مصنفین کے باہمی روابط فعال اور مضبوط ہوسکیں۔ ایک دو کہانیاں اور غزلیں بھی ساتھ لایا ہوں، انہیں آپ کی توجہ کی ضرورت ہے۔ معیار پر اتریں تو قریبی اشاعت میں جگہ دے کر ممنون فرمادیں، تمام کارکنان کو درجہ بہ درجہ سلام۔

☆ ڈیئر ساجد! آپ سب لوگ سچی کہانیاں کی فیس بک پر ایک دوسرے سے رابطے میں رہیں، یہ رابطے کا سب سے مضبوط سلسلہ ہے۔ monthlysachcheekahaniyan@gmail.com



✉ **سیٹلائٹ ٹاؤن سرگودھا سے ممتاز احمد لکھتے ہیں۔** پیارے کاشی بھیا السلام علیکم، سلامتی کے ساتھ اللہ پاک آپ کو ہمیشہ خوش رکھے، آمین۔ ماہ اگست کا شمارہ عید سے پہلے مل گیا تھا۔ اداریہ میں منزہ سہام نے دلکش الفاظ، خوب صورت انداز اور زبردست پیغام کے ساتھ عید کی مبارکباد دی اور ایک احساس کو جگایا۔ کاشی چوہان کی کچھ اپنی باتوں نے سرکاری ہسپتال کا چکر لگوایا اور بعدازاں فٹ بال کے میچ تک پہنچادیا۔ احوال میں پہنچے تو نظر محترمہ ریحانہ نعیم صاحبہ کے خط کی کراری کراری، کھری کھری کڑوی کسیلی مگر بہت حد تک سچی باتوں پر ٹھہر گئی۔ مگر آپ کی کچھ باتوں سے میں متفق نہیں ہوں۔ بات یہ ہے کہ اگر کسی کی شاعری یا کہانی اچھی ہوتی ہے تو اُس کو اچھا کہنا تعریف کرنا رائٹر اور شاعر کا حوصلہ بڑھانا ہوتا ہے۔ مکھن لگانا یا خوشامد کرنا مقصد نہیں ہوتا، باقی آپ کی یہ بات سو فیصد غلط ہے کہ ہر شخص خط اور تصویر چھپوانے کے لیے جھوٹی تعریفیں کرنے میں لگا ہوا ہے، کہانیوں پر تنقید بھی ہوتی ہے ہاں مگر ذرا کم ہوتی ہے، باقی تنقید برائے اصلاح ضرور ہونی چاہیے، میں ذاتی طور پر اُن تمام لوگوں کو سلام کرتا ہوں جن کا قلم سے رشتہ ہے جو کہ آج کل انٹرنیٹ، موبائل، کیبل، فیس بک وغیرہ کے سحر سے نکل کر کتابوں، ادب، اور لکھنے لکھانے سے منسلک ہیں تو اگر کسی کی تحریر، اچھے الفاظ اور خوب صورت جذبوں کی تعریف میں کوئی چند جملے کہہ دیتا ہے تو یہ جھوٹی تعریف نہیں ہوتی اور نہ ہی کوئی بُرائی۔ ہاں حد سے زیادہ تعریفوں کے پُل باندھنا اور خود ساختہ القابات دینا بہت غیر مناسب ہے۔ بھائی عبدالعزیز جی آ صاحب السلام علیکم، اللہ آپ کو عمر خضر عطا فرمائے۔ آمین۔ ایوارڈ نہیں تو نہ سہی جناب آپ اپنا استعفیٰ فی الفور واپس لیں، ہمارا کیا قصور ہے جو ہم سب کو اپنے چاہنے والوں کو چھوڑ کر جانے کی باتیں کررہے ہیں؟ آپ کا استعفیٰ نامنظور نامنظور۔ میں تہ دل سے ممنون ومشکور ہوں کراچی کی مسز نوید ہاشمی، شائستہ جمال، بھائی عادل حسین، اسامہ ندیم اور سرگودھا کی عظمیٰ شکور کا آپ سب نے مجھے عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کی مبارکباد دی۔ کراچی کی کنول عمران خان، سدرہ انور علی، منشی محمد عزیز مئے، حنا بشریٰ، فیصل ندیم بھٹی، ثمینہ ناز، مور شاہد حسین، اشفاق شاہین اور صفدر علی حیدری آپ سب نے میری کہانی ''کھلاڑی'' کو اپنی پسندیدگی کی سند سے نوازا، یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔ بہت بہت شکریہ، گزارش ہے کہ ایس ایم ایس کے ذریعے احوال کا حصہ بننے والے دوستوں کے پیغامات بھی شائع کیا کریں۔ محمد سلیم اختر کی کہانی ''خان زادہ'' حیرت سے ڈوبی ایک ناقابل یقین کہانی تھی۔ مسز نوید ہاشمی کی ''انار کا درخت'' حیرت انگیز اور زبردست کہانی تھی۔ عاشق جن، پراسرار حویلی، ایک حسینہ، روح سے ملاقات، آسیب اور وہ کون تھی؟ پراسرار نمبر کے حوالے سے بہترین کہانیاں تھیں، رخسانہ نباء کی ''پہلے سوچ لیتے'' بہت عمدہ کہانی تھی۔ صفدر علی حیدری کی ''عشق ہوش رُبا'' واقعی ایک ہوش ربا کہانی تھی، باقی ''فیض عشق'' خاص کہانی صرف چار صفحات کی؟ خط کافی طویل ہوگیا ہے اس سے پہلے کہ قینچی چل جائے اس پیغام کے ساتھ اجازت چاہوں گا کہ ''محبتوں کا پھول تقسیم کرنے والوں کا دامن کبھی بھی خوشیوں سے خالی نہیں رہتا، آزمائش انسان کا حوصلہ بڑھاتی ہیں۔ صبر وتحمل کرنے والوں کی اللہ ضرور مدد فرماتا ہے۔'' اگلے ماہ انشاء اللہ حاضری ہوگی، اللہ نگہبان۔

☆ عزیزم ممتاز احمد، پرچے کی ضرورت کے مطابق ردّو بدل صفحات وغیرہ میں ضروری ہوتا ہے، ہمیں بہت سے معاملات دیکھنے ہوتے ہیں، بھرپور خط لکھنے کا شکریہ۔



✉ حاذق ندیم کراچی سے لکھتے ہیں، کاشی بھائی! اگست کا سچی کہانیاں میں اور میرے دوست نے پہلی بار کوئی ڈائجسٹ پڑھا۔ میں نائن کلاس کا اسٹوڈنٹ ہوں اور مجھے ڈراؤنی کہانیاں پڑھنے کا بچپن سے بہت شوق رہا ہے۔ گھر میں سچی کہانیاں آتا ہے، میرے نئے نئے کالج گوئنگ برادر اسامہ ندیم سچی کہانیاں شوق سے پڑھتے ہیں۔ سب سے پہلے تو مجھے بریانی کہانی نے چونکنے پر مجبور کر دیا، یہ کہانی میں نے پہلے بھی پڑھی ہوئی ہے۔ شاید آپ ہی کی تھی یہ۔ خیر یہ پہلے بھی میرے ذہن میں بیٹھی ہوئی تھی اور پھر سے پڑھ کر بہت اچھی لگی۔ زبردست، اس کے بعد جنوں والا باغ، انار کا درخت، نادیدہ روح، آسیب، روح سے ملاقات، وہ کون تھی، پہلے سوچ لیتے ٹھیک ٹھاک ڈرانے میں کامیاب رہیں مگر سفید آنکھیں، خان زادہ، پراسرار حویلی، نادیدہ روح اور عشق ہوش ربا اس شمارے کی جان تھیں، کچھ اپنی باتیں میں آپ نے ہمیں عش عش کرنے پر مجبور کر دیا جب کہ منزہ باجی نے عید مبارک بہت پیارا لکھا۔ شاعری بھی اچھی تھی ڈائجسٹ میں، اب اگلے ماہ خط لکھوں گا، سب کو میری طرف سے سلام قبول ہو۔

☆ پیارے ننھے حاذق۔ تمہارا تبصرہ بہت پیارا تھا۔ پوت کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آجاتے ہیں، تمہاری یہ پہلی تحریر بتا رہی ہے، تم میں بہت اسپارک ہے۔



✉ کراچی سے کنول عمران خان لکھتی ہیں۔ سب سے پہلے تمام اسٹاف اور آپ کو عید مبارک اور تمام قارئین کو بھی، پُراسرار نمبر 2 زبردست تھا، سرورق کافی ڈراؤنا تھا، احوال کی محفل زبردست رہی، ہر ایک کی اپنی پسند اور اپنا تبصرہ پڑھ کر مزہ آ گیا۔ مگر کچھ حضرات ناراض بھی ہو گئے، آپ سمجھ گئے ہوں گے اور ڈیئر سدرہ جی، بہت کیوٹ لگ رہی ہوئی تصویر میں، ممتاز بھائی آپ کو عمرے کی بہت بہت مبارک مٹھائی کہاں ہے جی۔ ''خان زادہ'' بیسٹ لگی، بہت زبردست، راج نرتکی، انار کا درخت، عاشق جن اتنی پر اثر اور متاثر کرنے والی تحریریں نہیں تھیں، پراسرار حویلی اچھی تھی۔ بریانی زبردست رہی۔ ویسے بریانی مجھے بھی بہت پسند ہے مور بھائی۔ وہ کون تھی؟ اچھی کاوش تھی، پہلے سوچ لیتے بھی اچھی لگی۔ معذرت کے ساتھ عشق ہوش رُبا میں بہت غیر ضروری باتیں تھیں اور کہانی کو بلاوجہ طویل کیا گیا، مزہ نہیں آیا اور یہی حال نادیدہ روح کا بھی تھا۔ باقی کہانیوں میں ناجاں، جنوں والا باغ، سفید آنکھیں سب اچھی لگیں۔ ویسے شمارے میں سلسلے وار کہانیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ سلسلہ وار کہانیوں کا ڈائجسٹ بن جائے (ہاہاہا)۔ میرا خط شائع کرنے پر بہت شکریہ، کاشی بھائی ستمبر میں میری بیٹی کی سالگرہ آ رہی ہے 7 ستمبر کو اور پھر 12 ستمبر کو میری بھی سالگرہ ہے، میری طرف سے سب کو سلام منزہ آپی کو بہت سلام۔

☆ کنول جی! صاحب زادی کو اور آپ کو ہماری طرف سے پیشگی سال گرہ مبارک، احوال میں شرکت اور پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ، سلسلے وار کہانیاں بھی شمارے کا حصہ ہیں اور قارئین کے ذوق کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ لہٰذا......



✉ سرگودھا سے فیصل ندیم بھٹی شامل احوال ہیں، لکھتے ہیں۔ محترمہ منزہ سہام صاحبہ اور کاشی چوہان صاحب ہمیشہ خوش رہیں اور پھولوں کی طرح مسکراتے رہیں، ماہِ اگست کا شمارہ میرے ہاتھ میں ہے جو کہ عید کے بعد موصول ہوا اور عید کی مصروفیات کی وجہ سے تھوڑا سا ہی مطالعہ کر سکا۔ منزہ سہام صاحبہ کا اداریہ، عید مبارک پڑھ کر احساس ہو رہا ہے کہ اصل عید تو غربا کو عید میں شریک کرنے کا نام ہے۔ کچھ اپنی باتیں، اس بار تو آپ نے بہت ہی فلسفی انداز میں اداریہ لکھا ہے، احوال میں دوستوں سے ملاقات عید کے حوالے سے یادگار رہے، نجیل میتلو اس میں شکریہ ادا کرنے کی کون سی بات ہے آپ کی کہانی اس قابل تھی کہ ہم نے سراہا۔ عبدالعزیز جی آ، یہ تو بات نہ ہوئی نا ہم خود چکوال آ جائیں گے آپ کو احوال میں لینے کے لیے، آپ کے ساتھ ہی تو شمارے کی رونق ہے، سدرہ انور علی صاحبہ آپ کی عید کیسی گزری؟ آپ بھی

کھلاڑی ہیں تو ثانیہ مرزا کی طرح ایک اسٹار بن سکتی ہیں، کوشش جاری رکھو، مجید احمد جائی آپ کیسے ہیں؟ مور شاہد بھائی سلام، کرن آپ کو شمارے میں خوش آمدید۔ آصفہ ضیاء احمد، راج نرنگی، انار کا درخت، بہت ہی اچھی کہانیاں ہیں، بشریٰ کفیل خان کی عاشق جن حیران کردینے والی ہے، الماس فاطمہ کی ایک حسینہ، بچے پر جن کا عاشق ہوجانا بھی عجیب منظر ہے، مور شاہد کی بریانی بہت ہی پسند آئی، نایاب نسرین کی روح سے ملاقات، آسیب، وہ کون تھی اچھی کہانیاں ہیں۔

☆ برادر فیصل بھٹی، احوال میں شرکت اور پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ، دعا کریں سدرہ جی ثانیہ مرزا کی طرح مشہور ہوں، جی آ جی واپس آ چکے ہیں، خوش ہوجائیں۔



✉ ثمینہ عبدالقیوم، کراچی سے شامل احوال ہیں، محترم کاشی بھائی السلام علیکم امید ہے آپ سمیت پورا اسٹاف، مدیر اعلیٰ منزہ سہام اور تمام قارئین خیر و عافیت سے ہوں گے، تمام اہل وطن کو جشن آزادی کی ڈھیروں خوشیاں مبارک ہوں۔ انکل عبدالعزیز جی آ! پلیز ایسی باتیں مت کریں آپ میرے محسن اور رہنما ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے سچی کہانیاں میں میرے پہلے تبصرے کو نمبرون آپ ہی نے قرار دیا تھا۔ پُراسرار کے حساب سے ٹائٹل تو شاندار اور دل کش تھا، مگر سچ پوچھو تو میرے کمزور دل کو اس کی نفرت اور دہشت بھری آنکھیں بالکل پسند نہ آئیں، لہٰذا سرورق پر بلینک پیپر چسپاں کردیا، تاکہ کچھ اپنی باتیں، سلسلہ وار کہانیاں اور شاعری تو پڑھی جاسکے۔ البتہ میرے شوہر نے پورا ڈائجسٹ پڑھ ڈالا اور کہنے لگے، کچھ کہانیاں تو واقعی رات میں پڑھنے والی نہیں، خوف دلاتی اور دل دہلاتی تحریریں ہیں۔ سچی کہانیاں انعامی سلسلہ بہت شاندار بلکہ جاندار ہے۔ بھائی نوید شاہ، بھائی ایم اشفاق بٹ نظم کی پسندیدگی کے لیے بہت شکریہ۔ بھائی ممتاز احمد آپ کو عمرہ کی بہت بہت مبارک باد قبول ہو، یاد کرنے کا بہت شکریہ۔ ”سخن آباد“ میں عبدالعزیز جی آ، ایم حسن نظامی، ساحل ابڑو اور کنول عمران کی غزلوں نے خوش کردیا۔ مور شاہد حسین، حافظہ مون، نسیم سکینہ صدف اور نگہت اکرام کی نظموں نے دل کو چھولیا۔ قسط وار ملکھنی پڑھ کر دینی معلومات میں کافی اضافہ ہوا، آتش جنوں اور ناگن بھی بہت خوب رہیں، فیض عشق پڑھ کر مزہ آ گیا اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ باقی تمام لکھاریوں سے معذرت، اس ماہ تبصرے سے قاصر ہوں، سچی کہانیاں خوب ترقی کرے۔

☆ ثمینہ جی! کہانیاں پسند آئیں شکریہ، آپ تو صرف ٹائٹل سے ہی ڈر گئیں اگر...... خیر چھوڑیں اور شریک احوال رہیں۔



✉ ایم اشفاق بٹ، لالہ موسیٰ سے لکھتے ہیں۔ اس دفعہ جولائی کا پراسرار نمبر عید سے تین چار دن پہلے ہی ڈرانے آ گیا، بڑا ہی ڈراؤنا تھا، ایک دفعہ تو دیکھ کے دل دھک دھک کرنے لگا۔ سب سے پہلے منزہ سہام نے سچی کہانیاں کا اچھا آغاز کیا، کاشی بھائی کچھ اپنی باتیں ہمیشہ کی طرح دل میں اُتر جانے والی کر رہے تھے، ان کی باتوں میں ایک جادو ہے، جو کہ پڑھنے والوں کو اپنے سحر میں لے لیتا ہے۔ احوال بہت ہی اچھا کالم ہے، اس کے ذریعے قارئین کی ایک دوسرے سے گپ شپ ہوجاتی ہے، مقصود احمد بلوچ صاحب آپ بھی چھلانگ لگا کر سچی کہانیاں میں آ گئے ہیں، ویری گڈ! بہت اچھا کیا ہے آپ نے، جی آیا نوں بلوچ جی اب اس کو چھوڑ کر مت جانا۔ پُراسرار نمبر میں جناب محمد سلیم اختر کی کہانی پڑھی، سسپنس سے بھرپور تھی، باقی کہانیاں جتنی بھی تھیں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ سخن آباد میں سب نے بہت اچھے کلام پیش کیے، میں فریدہ فری کو بہت بہت مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ ان کی شاعری کی کتاب، محبت یاد رکھوں گی، مارکیٹ میں آ گئی ہے، باقی سب سچی کہانیاں پڑھنے والوں کو میرا سلام اور دعائیں۔ سچی کہانیاں دن بدن اور زیادہ ترقی کرے آمین۔

☆ برادر اشفاق بٹ! سنبھل کے رہنا، مقصود جی آ گئے ہیں میدان میں، یہ چھلانگیں لمبی لگاتے ہیں، ذرا بچ کے۔ احوال میں آمد، پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔



✉ فریدہ فری یوسف زئی، لاہور سے لکھتی ہیں محترم بھائی کاشی چوہان السلام علیکم! سچی کہانیاں پراسرار نمبر ملا، ایسی ایسی ڈراؤنی کہانیاں، ٹائٹل تو اتنا ڈراؤنا تھا کہ میری چھوٹی سی بھانجی ہے، اس نے تو دیکھ کر چیخیں مار کر رونا شروع کر دیا، مما بھوت آ گیا، احوال میں سب دوستوں کے خط جگمگا رہے تھے۔ ایک تو لاہور کی گرمی نے مت ماری ہوئی ہے، بارش ہو بھی جائے تو حبس ہو جاتا ہے۔ دوشیزہ اور سچی کہانیوں کے تو ہم دیوانے ہیں، یہ دونوں میگزین نہایت ہی معیاری ہیں اور ہم ان کے بہت پرانے قاری ہیں، میگزین میں ایم اشفاق بٹ اور مقصود احمد بھائی کو دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی، سب بہت اچھا لکھ رہے ہیں تمام رائٹرز، قارئین کو دعا اور سلام، سدرہ انور کو بے حد سلام اور دعا۔

☆ فریدہ فری جی! ڈاکٹری ہدایت کے مطابق ایسے پرچے بھی بچوں کی پہنچ سے دور رکھیں، احوال میں آپ کی آمد سب کے لیے باعث مسرت ہے۔

✉ ڈیرہ غازی خان سے ارم خان لکھتی ہیں، بھیا جی کیسے ہیں آپ، امید تو یہی ہے خوش باش، ٹھیک ٹھاک اور سلامت ہوں گے۔ ایسا ہی ہے نا۔ چلو اچھا ہی ہے، اللہ پاک میرے سب مسلمان بھائیوں کو سدا سلامت رکھے آمین۔ اگست کا سچی کہانیاں سامنے ہے، ٹائٹل کے بارے میں کیا کہوں، بس اتنا کہوں گی، اُف توبہ اللہ بچائے۔ میں نے خط کافی لیٹ بھیجا تھا، لیکن پھر بھی آپ نے جگہ دی، بہت شکریہ۔ اب جلدی سے میری غزل کو بھی جگہ دیں، یہ سن کر خوشی ہوئی کہ ردّی کی ٹوکری کا روزہ ہے۔

☆ ارم جی! ٹوکری کا روزہ ٹوٹ چکا ہے۔



✉ عظمیٰ شکور، سرگودھا سے شامل احوال ہیں، ایڈیٹر صاحب آداب! اگست کے حبس زدہ موسم میں ''سچی کہانیاں'' کی آمد جیسے دل کو سکون دے گئی، جیسے ہی ''پراسرار نمبر'' ملا، ہاتھوں میں آیا، میں ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی۔ تو اور کیا سرورق تھا ہی ایسا ہیبت ناک، وہ تو شکر کریں کہ مجھے ہوش آ گیا اور میں نے فوراً سے پہلے سب کہانیاں پڑھیں اور لکھنے بیٹھ گئی تبصرہ، تو آیئے چلتے ہیں تبصرے کی طرف، سب سے پہلے منزہ سہام کی باتیں پڑھنے کو ملیں، ان کی وطن سے محبت کے جذبات پڑھ کر دلوں میں اُن کی عزت اور بڑھ گئی۔ ''کچھ اپنی باتیں'' پڑھیں، کاشی چوہان صاحب ایسے بولتے ہیں جیسے سب احوال والے اُن کے سامنے ہی بیٹھے ہیں، مزہ آتا ہے ان کو پڑھ کر، احوال میں آئے تو بہت سے خطوط پڑھے، کچھ میں ہمارا ذکر بھی تھا اور جی، یہ عبدالعزیز صاحب کہاں جا رہے ہیں؟ روکیں ان کو پلیز، سدرہ انور علی نے اتنی محبت سے سلام کیا، میرا ڈھیر سارا پیار سدرہ علی کے لیے، ممتاز صاحب کہانی سمیت سچی کہانیوں میں آئیں، اُن کی کوئی کہانی نہیں تھی اگست کے شمارے میں، دلوں کو تھام لیں، بس اب ہم جا رہے ہیں جنوں اور روحوں کے دیس میں جہاں بہت سی کہانیاں بکھری پڑی ہیں اور تبصرے کے انتظار میں ہیں۔ مور شاہد بھائی کیا کرتے ہیں۔ ''بریانی'' کا سوچ کر ہی خوف آ رہا ہے کھانا تو دُور کی بات۔ ''الماس فاطمہ ارمان'' کی لکھی تحریر ''ایک حسینہ'' اُف خوف زدہ ہو گئے پڑھ کر اور دُکھی الگ ہوئے۔ سلمیٰ غزل کی پراسرار حویلی، ہائے ایسا جن ہمیں بھی مل جائے کہ ایک حسین سا گھر لے دے، پرکھوں جی، عاشق جن، بشریٰ کفیل خان کی تحریر، بہت زبردست تھی۔ مسز نوید ہاشمی کا لکھا انار کا درخت بہت ذوق و شوق سے شروع کیا۔ اناروں تک تو بات ٹھیک تھی جیسے ہی انسانی کھوپڑیوں کا ذکر آیا ہونٹوں پہ خود بخود آیت الکرسی کا ورد شروع ہو گیا، روح سے ملاقات نایاب نسرین صاحبہ کی لکھی تحریر ہائے قسم سے بہت اچھا لگا کہ کم از کم اس کی اپنے شوہر سے ملاقات تو ہو گئی، حمیرا خان کی لکھی کہانی ''آسیب'' اُف زبردست تھی، صفدر علی حیدری کی لکھی کہانی عشق ہوش ربا، کیا بات ہے، جملوں کی ادائیگی بہت خوب تھی۔ زبردست لکھتے ہیں صفدر صاحب، ایڈیٹر صاحب آپ کو خوب اچھی طرح سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کس محبت سے میں نے بغور رسالہ پڑھا ہے، تبصرہ پورا ہو گیا۔ ٹھہریں ذرا سخن آباد بھی ہو آؤں۔ عبدالعزیز صاحب کی غزل داد کی

مستحق ہے، عصمت پروین صاحب نے بھی اچھا لکھا ''میں خود سے بچھڑ گئی'' ایڈیٹر صاحب پلیز قینچی ذرا دور رکھیں میرے خط سے میرے معصوم سے خط کو آپ کی قینچی سے خوف آتا ہے۔ سب لکھنے والوں کو سلام و دعا اللہ حافظ۔

☆ عظمیٰ جی! قینچی سے نہ ڈریں، ''یہ تو چلتی ہے تمہیں لکھاری بنانے کے لیے۔'' نیم بے ہوشی میں لکھا گیا خط، تبصرہ اچھا ہے۔ آپ کی محبت اور خلوص کا شکریہ



✉ ملتان سے مجید احمد جائی شامل احوال ہیں، لکھتے ہیں سلام و محبت! بعد از سلام اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ سچی کہانیاں کے تمام اسٹاف، منزہ سہام، کاشی چوہان، دانیال شمسی، قارئین اور لکھاریوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔ بہت شکریہ کہ سچی کہانیاں عید الفطر سے پہلے جلوہ گر کیا، جس کے لیے تمام اسٹاف داد کے مستحق ہیں۔ ورنہ عید پھیکی پھیکی ہو جاتی، سرورق پر چڑیل کی خوف ناک شکل دیکھ کر ہم تو ڈر ہی گئے، ارے ارے کیا چڑیل بھی انگلیوں میں انگوٹھی، انگوٹھیاں پہنتی ہے۔ ڈرتے ڈرتے آگے کو بڑھ گئے، منزہ سہام سے عید مبارک وصول کی، ہمیشہ کی طرح بہترین نصیحت فرما رہی تھیں۔ کچھ اپنی باتیں، کاشی چوہان نے اپنا گرویدہ بنا دیا ہے۔ سب سے پہلے کچھ اپنی باتیں نہ پڑھیں دل کو چین نہیں آتا۔ احوال میں پہنچے تو میرے من موہنے محمد حسن نظامی سرفہرست تھے، ویلکم جی۔ یاد رکھنے کا شکریہ۔ عصمت پروین، جنجل میتلو، پیارے ایم اشفاق بٹ، کنول عمران خان، فرید عالم، ریحان آفاق، سدرہ انور علی، اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ منشی محمد عزیز مے، حنا بشریٰ، فیصل ندیم بھٹی، ثمینہ ناز کا شکریہ۔ عادل حسین، مور شاہد حسین، شفقت حسین، ممتاز احمد، اشفاق شاہین، زرینہ جونیجو اور پیارے صفدر علی حیدری خوب صورت تبصرے کے ساتھ انٹر ہوئے تھے۔ باقی تبصرے بھی خوب تھے۔ ریحانہ نعیم مزنگ خوب صورت الفاظ کے ساتھ شامل احوال تھیں۔ یہ دور ہی ایسا ہے، بڑے لکھاری ہوں یا چھوٹے اپنی تعریف سننے کے لیے بے تاب ہیں۔ تنقید کڑوے کریلے جیسی لگتی ہے، تنقید کرو اور تنہا رہ جاؤ، کیوں کہ سچائی کسی کو پسند نہیں ہے سب جھوٹ کے پیچھے سر جھکائے کھڑے ہیں۔ میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں اور داد دیتا ہوں کہ دل جگر کے ساتھ سچی باتیں کیں اور سچی کہانیاں کا شکریہ کہ انہوں نے آپ کا احوال شائع بھی کیا، ورنہ کاشی چوہان بھائی۔ نئی نئی قینچی لائے ہیں۔ ہاہاہاہاہا ...... ارے میرے سوہنے عبدالعزیز جی آ، آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آپ کے لبوں پر موت کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ سفید داڑھی کی لاج نبھاؤ، دنیا داری کے رشتے ہوتے ہی ایسے ہیں، لمحہ لمحہ دل جلاتے ہیں۔ مایوس نہیں ہوتے۔ پیارے مسعود احمد بلوچ ہم تو چیخ چیخ کر آپ کو کہتے رہے کہ سچی کہانیاں میں آ جاؤ مگر آپ سنتے ہی کب تھے، اب گلہ بھی ہم سے، اُلٹا چور کوتوال کو ڈانٹے، ویلکم جناب ڈاکٹر آکاش صاحب آپ بھی ریگولر حاضری دیں۔ خان زادہ محمد سلیم اختر خوب صورت تحریر لائے، عشق ہوش ربا، صفدر علی حیدری کیا تحریر تھی، کیا کمال کیا آپ نے۔ لائف میں پہلی بار اتنی طویل کہانی لکھی ہوگی، ورنہ آپ تو مختصر لکھتے ہیں، بریانی مور شاہد حسین، نادیدہ روح صفدر عباس اعوان، جنوں والا باغ محمد وقاص، سفید آنکھیں ریاض حسین شاہد زبردست تحریریں تھیں، باقی تحریریں بھی عمدہ تھیں۔ مکھنی زبردستی جا رہی ہے۔ ناگن، آتش جنوں بھی کم نہیں ہیں۔

☆ ڈیئر مجید جائی جی! قینچی سے جو ڈر گیا، وہ...... جدید دور کی چڑیلیں ایسی ہی ہوتی ہیں، غالباً آپ کا واسطہ نہیں پڑا ابھی تک...... احوال میں شرکت اور پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔



✉ رانا محمد شاہد بورے والا سے شامل احوال ہیں، اگست کا شمارہ پراسرار نمبر ملا۔ پراسرار نمبر تو اکثر ہی سچی کہانیاں شائع کرتا رہتا ہے۔ اگست کے حوالے سے آزادی نمبر وغیرہ ہوتا تو زیادہ اچھا لگتا۔ میری تجویز ہے کہ اگست و ستمبر آزادی و دفاع پاکستان نمبر کے طور پر شائع کیا کیجیے اور دوسرا خاص نمبروں میں بھی انفرادیت لائیے۔ ایک ہی موضوع پر بار بار خصوصی نمبر

قارئین کی دلچسپی کو کم کر دیتے ہیں۔ منزہ سہام عید کی مبارکباد دے رہی تھیں۔ کاشی چوہان اپنی باتوں میں فٹ بال ورلڈ کپ میں پاکستان کی شمولیت کا تذکرہ کر رہے تھے۔ عبدالعزیز جی آ! اچھی کہانیاں سے شکوے اور اپنی محبت اور رفاقت کا اظہار کرتے نظر آئے۔ منشی محمد عبدالعزیز مئے! آپ کا شکریہ، شمارہ ایجنسی پر نظر آ گیا، سدرہ انور علی! یاد فرمانے کا شکریہ۔ حوادثِ زمانہ بعض اوقات انسان کو انسان سے دور کر دیتے ہیں، ویسے بھی اب ماشاءاللہ بہت سے نئے احوالی، احوال کی رونق بڑھائے ہوئے ہیں۔

☆ ڈیئر رانا شاہد! کہانیاں آپ کی شائع ہو جائیں گی، بس ذرا......



✉ لڈن ضلع وہاڑی سے منشی محمد عزیز مئے لکھتے ہیں، ڈیئر کاشی چوہان جی! السلام علیکم سب سے پہلے تو آپ تمام اراکین ادارہ کو اس قدر محنت اور مستعدی پر مبارکباد قبول کیجیے۔ آپ سب اور باجی منزہ سہام مرزا بھی کہ جن کو اتنے فعال اور مستعد کارکن اللہ نے عطا کیے ہیں۔ میری یہ باتیں نہ تو خوشامد ہیں اور نہ ہی مَسکا، خصوصاً یہ بات میں ریحانہ نعیم، مزنگ کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہوں، کیوں کہ اُن کو احوالی دوستوں کا کہانیوں کی تعریف کرنا شاید اچھا نہیں لگا۔ محترمہ! کسی حد تک آپ کی بات بھی درست ہے کہ خامیوں کی نشاندہی بھی ہونی چاہیے، لیکن یہ بھی ذہن نشین رہے کہ تعریف سے لکھاری کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے اور وہ پہلے سے بھی بہتر لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کاشی بھائی! اب صرف آپ سے ایک التجا۔ مانا کہ اگست کا شمارہ پُر اسرار نمبر تھا لیکن پلیز سرورق اس طرح کا نہ دیا کریں، رسالے کے اندر بے شک کوئی زندہ ''بھتنی'' یا ''چڑیل'' بٹھا دیا کریں۔ پلیز...... پلیز ایسا لگا کوئی ایک چڑیل ہمیں عید مبارک کہہ رہی ہے لیکن اُس کی مبارکباد ہمیں قبول نہیں۔ آپ کی عید مبارک پر ہم خیر مبارک کہتے ہیں۔ کچھ اپنی باتیں میں کاشی بھیا ہمیں پہیے کی ایجاد سے متعلق بتا رہے تھے۔ احوال کی ابتدا میرے پسندیدہ شہر قبولہ شریف کے اہم حسن نظامی کے خط سے ہوئی، ان کو ہم خصوصی طور پر ویلکم کہتے ہیں۔ سائیں پیر نوید شاہ! خط کی پسندیدگی کا بہت شکریہ۔ فرید عالم! یار بڑے بے مروت ہو، ہم بھی آپ کے پرانے ساتھیوں میں سے ہیں لیکن آپ نے ہمیں تو شاید بالکل ہی بھلا دیا ہے۔ آ یا! عبدالعزیز جی آ جی! ارے یار! غصہ تھوک دیجیے، دیکھیے تو ذرا دوستوں کے چہرے آپ کے استعفیٰ والی بات پڑھ کر کملا گئے ہیں، سدرہ انور عرف گڑیا رانی، مسز نوید ہاشمی، عظمیٰ شکور، حنا بشریٰ، ثمینہ ناز، شائستہ جمال، عادل حسین، مور شاہد حسین، عبدالغفار عابد، ممتاز احمد، اشفاق شاہین، صفدر علی حیدر اور تحسین جونیجو! زخموں کا مداوا کی پسندیدگی پر آپ سب کا مشکور ہوں۔ خان زادہ میں ایک تھانیدار کو راہِ راست پر آتے دیکھ کر دل بہت خوش ہوا کہ چلو کوئی تو سدھرا، چاہے ڈنڈے کھا کر ہی۔ راج نرتکی میں آصفہ ضیاء احمد نے انڈیا کی سیر کروا دی، انار کا درخت میں مسز نوید ہاشمی ایک جن کی عاشقی کی داستان سُنا رہی تھیں، بشریٰ کفیل خان اپنی نانی کی آپ بیتی سنا رہی تھیں۔ مور شاہد حسین کی بریانی پڑھتے ہوئے بار بار منہ میں پانی بھر آتا لیکن آخر میں سارا ستیاناس ہو گیا۔ اچھی تحریر تھی، صفدر علی حیدری کی عشق ہوش ربا رات کے وقت پڑھی اور جب لائٹ چلی گئی تو میرے تو پسینے ہی چھوٹ گئے۔ ناجاں زیبا مصطفیٰ کی تحریر آخر میں بہت رنجیدہ کر گئی، خصوصاً شعر بہت زبردست تھا۔ جنوں والا باغ میں وقاص خاص اپنے باغیچے کے اُجڑنے کا رونا رو رہے تھے، سفید آنکھیں کے عنوان سے پُر اسرار نمبر کی مطابقت سے بہت ہی زبردست تحریر ڈھونڈ کے لائے ہیں۔ بہت خوب شاہد صاحب! اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ اور ڈبل مبارکباد، میرا اشارہ تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے؟ نہیں تو عبدالغفار عابد صاحب سے پوچھ لیجیے گا۔ کاشی بھائی اللہ حافظ کہنے سے پہلے یہ بتا دوں کہ سخن آباد میں شازیہ گل، مور شاہد حسین، عبدالعزیز جی آ اور ثانیہ بھٹی کی شاعری دل کے تار ہلا گئی، اللہ حافظ سوہنے رب دے حوالے۔

☆ ڈیئر عزیز مئے! احوال میں آپ کی آمد رونق سی لگا گئی، شکریہ۔



✉ کراچی سے اسامہ ندیم احوال میں شریک ہیں لکھتے ہیں، کاشی بھائی اگست کا شمارہ پراسرار نمبرا اپنی مثال آپ تھا منزہ جی کا عید مبارک گہری فکر کی دعوت دے گیا۔ کچھ اپنی باتیں میں آپ نے یادگار باتیں کیں۔ سمیع اللہ خان سے انٹرویو دوشیزہ میں کب آرہا ہے؟ میرے گھر والوں کو بہت انتظار ہے، اب آتے ہیں کہانیوں کی جانب خانزادہ، راج نرتکی، پراسرار حویلی، خبیث روحیں، پہلے سوچ لیتے، انار کا درخت، عاشق جن، ایک حسینہ، وہ کون تھی، ناجاں، جنوں والا باغ بہت دل دہلا دینے والی کہانیاں تھیں لیکن اس شمارے کی جان بریانی، عشق ہوش ربا، آسیب اور سفید آنکھیں ثابت ہوئیں۔ اس قدر خوب صورت کہانیاں لکھنے پر میں مور شاہد حسین، صفدر علی حیدری، حمیرا خان اور ریاض حسین شاہد صاحب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ امید ہے آئندہ بھی اسی طرح کے شاہکار شمارے پڑھنے کو ملتے رہیں گے۔ سخن آباد میں تمام شعراء کے کلام دل کو بھائے، کاشی بھائی اس ماہ فیضِ عشق کی قسط بہت مختصر تھی۔ مکھنی، ناگن اور آتشِ جنوں تینوں ناول بہت خوب صورت سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ میرے پاپا خاص طور پر آتشِ جنوں اور ناگن بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔

☆ بہت اچھے اسامہ! بہت گہری نظر رکھتے ہو کچھ لکھنے کی طرف بھی آ جاؤ امید ہے جلد آپ کی کہانی ہمیں ملے گی۔ خوش رہو۔

ایس ایم ایس کے ذریعے احوال کا حصّہ بننے والے قارئین

ذیشان احمد قریشی۔ کراچی، حرا فاروق۔ کراچی، کوکب جہاں۔ سکھر، تسنیم حسن۔ حیدرآباد، منیب احمد۔ گوجرانوالہ، شازیہ گل۔ پشاور، جاوید احمد۔ ہری پور ہزارہ، صفیہ مہر۔ سکھر، رضوان کھوسہ۔ کوئٹہ، عبید خان۔ ملتان، یاسر عباس۔ کراچی، انیل قربان پٹھان۔ جامشورو

ساتھیو! لیجیے اس ماہ کا احوال تو اپنے اختتام کو پہنچا اب آپ پڑھیے اور لکھیے گا کہ اس ماہ کا پرچہ آپ کو کیسا لگا؟ ان شاء اللہ اگلے ماہ ان ہی صفحات پھر سے ملاقات ہوگی۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

آپ سب کی دعاؤں کا طالب

کاشی چوہان

دُور کے ڈھول



محمد سلیم اختر

ڈگمگاتے قدموں کو سہارا دینے والے ایک شخص کی خوب صورت کہانی

انسان فطری طور پر انتہا پسند واقع ہوا ہے یا حالات اسے انتہا پسند بنا دیتے ہیں۔ وہ نفرت کرنے لگے تو نرم و نازک پھولوں کو بھی بے دردی سے مسل دے اور پیار کرنے پر آئے تو اس شدّت سے کہ کانٹوں کو دامن میں سجالے۔ بدگمانی کی کیفیت طاری ہو تو اپنا آپ بھی بُرا لگے اور خوش گمانی ہو تو دشمنِ جان کو بھی رفیق سمجھ کر گلے سے لگا لے۔

جاوید بھی کچھ دنوں سے ایسی ہی کیفیت سے دوچار تھا۔ جب سے اس نے ثانیہ کو دیکھا تھا، تب سے اسے اپنی بیوی آسیہ سے نفرت محسوس ہونے لگی تھی۔ آسیہ اُسے ایک بوجھ لگنے لگی تھی، جبکہ آسیہ لاکھوں میں نہ سہی مگر ہزاروں میں ایک ضرور تھی۔ پوری برادری میں اس جیسی حسین لڑکی اور کوئی نہ تھی۔ آسیہ سرو قد، سرخ و سپید رنگت...... سیاہی مائل بھورے بال...... بڑی بڑی روشن آنکھیں اور بھرے بھرے ہونٹوں کی مالک تھی۔ اُس کا لب و لہجہ ایسا تھا کہ لگتا تھا اس کے منہ سے پھول برس رہے ہوں، جاوید نے آسیہ کے منہ سے برسنے والے پھول چُن کر اپنے دامن میں بھر لیے، جاوید اور آسیہ کی شادی نہ صرف محبت کی شادی تھی بلکہ آسیہ جاوید کی ماں کی بھی پسند تھی۔ یوں یہ شادی ایک یادگار اور منفرد کہلائی تھی۔ سہاگ رات کو جاوید نے آسیہ کے نرم و نازک ہاتھ کو پیار سے پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

’’تمہارے ہاتھ کتنے نرم و نازک اور سڈول ہیں۔‘‘ تو آسیہ شرما سی گئی تھی، دونوں میاں بیوی میں بہت محبت تھی۔ آسیہ اپنے ہاتھوں کی بہت ہی حفاظت کرتی، ان پر گھنٹوں کریم کی مالش کرتی۔ ناخن سنوارتی اور جاوید کی پسند کی پالش لگاتی۔ یوں ہی وقت گزرنے لگا، جب آسیہ دو بچوں کی ماں بن گئی تو وہ اپنے ہاتھوں کی حفاظت کرنا ہی بھول گئی بلکہ وہ اپنے آپ کو ہی بھول گئی۔ گھر میں اس کی ساس کے علاوہ ایک نند بھی تھی، آسیہ نے گھر کا سارا انتظام اور کام کاج سنبھال لیا۔ جب وہ تیسرے بچے کی ماں بنی تو وہ اپنا بناؤ سنگھار تک بھول گئی...... گھر کے کام کاج کے ساتھ بچوں کو سنبھالنے کی وجہ سے اس کا آرام و سکون ختم ہو گیا۔ اس نے کئی بار جاوید سے کہا کہ کوئی ڈھنگ کا نوکر تلاش کریں، کیوں کہ مجھ سے اب اتنے سارے کام نہیں نپٹتے۔ کمر اور ٹانگوں میں اب تو مستقل درد رہنے لگا ہے۔ پانچ لوگوں کے لیے کھانا پکانا، ڈھیر سارے برتن اور کپڑے دھونا، استری، سلائی، بنائی، گھر کی صفائی، سارا دن لگی رہتی ہوں، پھر بھی گھر کے کام مکمل نہیں ہوتے...... آپ شام کو بچوں کو پڑھانے کا کام ہی اپنے ذمّے لے

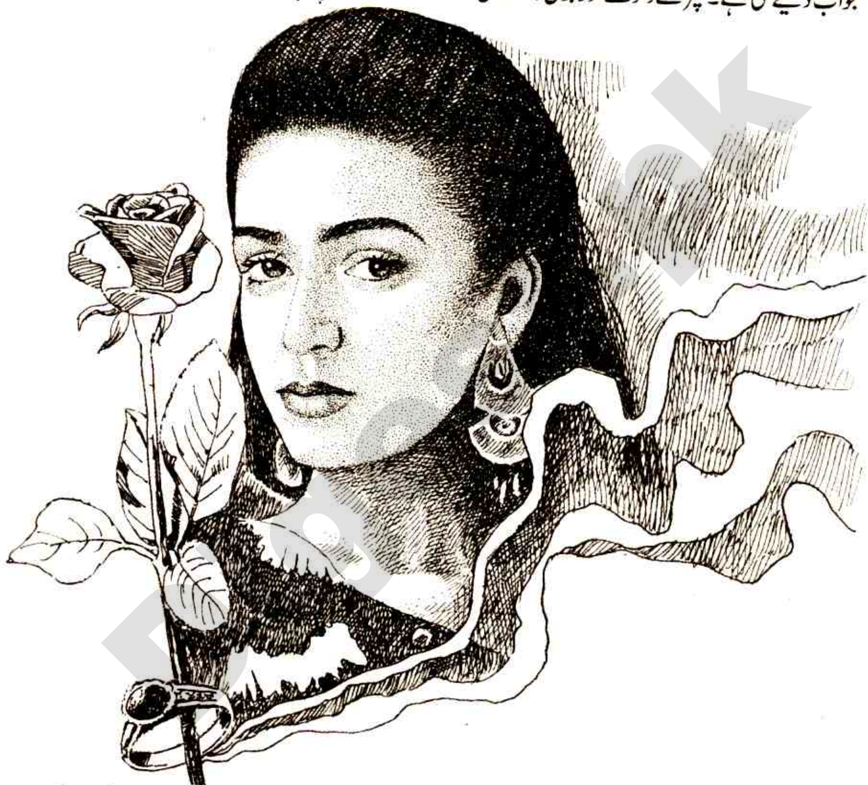
لیں تاکہ میرا کچھ بوجھ بٹ جائے...... سچ جاوید میں بہت تھک جاتی ہوں۔"

کئی جگہ تو کہا ہے مگر نوکر تنخواہ بہت زیادہ مانگتے ہیں اور ہمارے اخراجات تو پہلے ہی پورے نہیں ہو پا رہے۔"

جاوید نے وضاحت کر دی۔

"اس بات کا مجھے اندازہ ہے۔ میں اپنے طور پر پوری کوشش کرتی ہوں کہ آپ سے کچھ نہ مانگوں مگر صحت جواب دینے لگی ہے۔ کپڑے دھونے اور برتن مانجھنے ہی

کے دور میں گزارا مشکل سے ہوتا تھا...... اس جگہ اوپر کی کمائی بھی ہو جاتی ہے مگر جاوید اور آسیہ نے یہ وعدہ کیا ہوا تھا کہ وہ حلال کی روزی کمائیں گے اور حرام کا نوالہ تک اپنے اور بچوں کے منہ میں نہ ڈالیں گے...... جاوید اس عہد پر قائم تھا اور رزقِ حلال سے اپنے خاندان کی کفالت کر رہا تھا۔ حرام اور اوپر کی کمائی سے وہ کوسوں دور تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ آسیہ کے لیے ایک نوکرانی کا بندوبست نہ کر پا رہا تھا کہ یوں اس کا ہاتھ تنگ



کو ذرا کم تنخواہ پر مل جائے تو وہ بھی غنیمت ہوگا۔" مگر جاوید اس کی بات کا جواب نہ دے پاتا۔

☆......☆

جاوید ایک سرکاری ادارے میں ملازم تھا جہاں سے لوگ اپنا پاسپورٹ وغیرہ بنواتے ہیں۔ وہ اسسٹنٹ کے عہدے پر فائز تھا، تنخواہ تو معقول تھی، مگر اس مہنگائی

ہو جاتا...... آسیہ بھی صبر شکر کر کے گزارا کر رہی تھی اور بھی شکایت کا لفظ زبان پر نہ لاتی تھی، اُس کی ساس اُس سے بہت خوش تھی کہ وہ نہ صرف ان کا خیال رکھتی تھی بلکہ ماں سمجھ کر ان کا احترام بھی کرتی تھی، تبھی تو وہ اس کے واری جاتی تھیں اور اسے بہو نہیں بیٹی کہتی تھیں۔ ساس اور بہو کی یہی محبت اور حسین اتفاق نے اس گھر کو امن کا گہوارہ

بنا رکھا تھا۔ گھر میں کبھی لڑائی جھگڑا نہ ہوا تھا۔ سب لوگ اتفاق سے رہ رہے تھے۔

☆......☆

چھ ماہ قبل جاوید کی تبدیلی ایک چھوٹے شہر میں کردی گئی، وہ ایک تحصیل تھی...... اس تحصیل کے زیادہ لوگ یورپ اور عرب ممالک میں گئے ہوئے تھے، ان لوگوں کے اصرار پر حکومت نے وہاں بھی پاسپورٹ آفس کی نئی برانچ کھولی اور جاوید کی تبدیلی بھی وہاں کردی گئی۔ جاوید روزانہ اپنے گھر سے بذریعہ ویگن دفتر آتا اور جاتا تھا۔ پون گھنٹے کا سفر تھا۔ جاوید خوش تھا کہ وہاں جانے سے اس کے کچھ الاؤنسز میں اضافہ ہوگیا تھا۔ نئے دفتر میں اسٹاف کی کمی تھی۔ اس لیے جاوید کو تین سیٹوں کا کام کرنا پڑتا تھا۔ انگوٹھے لگوانے، ڈیٹا انٹری اور پاسپورٹ ڈلیوری بھی وہ ہی کرتا تھا۔ چوں کہ دفتر نیا تھا۔ رش کم تھا، اس لیے جاوید تینوں کام بخوبی سرانجام دے رہا تھا اسے کسی قسم کی پریشانی نہ تھی اور وہ اپنے کام اور ڈیوٹی سے مطمئن تھا کہ وہ وہاں بھی سب کام نہایت ہی ایمانداری اور لگن سے کرتا تھا۔ اس کے آفیسرز، اسٹاف کے لوگ اور سائل بھی اس سے مطمئن تھے۔

☆......☆

اس روز موسم کافی خراب تھا، صبح ہی سے بارش ہورہی تھی، ساتھ ہی زور کی ہوائیں بھی چل رہی تھیں، جاوید وقت کی پابندی کرتا ہوا دفتر جا پہنچا تھا، سوائے ایک چپراسی اور گارڈ کے اور کوئی بھی ملازم ابھی تک دفتر نہ پہنچا تھا، پھر بھی جاوید نے اپنے کام کا آغاز کردیا مگر ابھی تک کوئی کسٹمر بھی نہ آیا تھا۔ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا گزشتہ دن کا کام دوبارہ چیک کررہا تھا کہ دفتر کی خاموش فضا میں اچانک سینڈل کی ایڑی کی ٹک ٹک کرتی آواز نے ایک عجیب یکسانیت سے نغمہ بکھیرا اور ساتھ ہی کمرہ بھی مہک اُٹھا، جانے وہ کون سی خوشبو لگائے تھی کہ کمرہ باغ و بہار ہوگیا...... جاوید نے سر اوپر اٹھایا تو سب سے پہلے اس کی نگاہ ان محترم کے اٹھتے ہوئے قدموں پر پڑی، سرخ سینڈل میں انتہائی سفید اور سڈول سے پاؤں جن کے ناخن بالکل سینڈل ہی کی طرح سرخ رنگ کی پالش سے سجے تھے۔ اوپر نازک نازک ٹخنوں پر طلائی پازیب چمک رہی تھی۔

''واہ'' اُس نے دل میں کہا اور اوپر نظر اُٹھائی...... وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ایک شانِ بے نیازی سے چلی آرہی تھی...... نگاہ ملنے پر خاتون نے ہاتھ اُٹھا کر ماتھے تک لے جاتے ہوئے۔ ''السلام علیکم'' کہا۔ ابھی وہ پاؤں کی خوب صورتی کے رعب میں ڈوبا ہوا تھا کہ اس کے ہاتھوں کی کوندنے اسے بالکل ہی چندھیا دیا...... وہ گورے گورے مخروطی انگلیوں والے ہاتھ، جن میں جانے کتنی ہیروں جڑی انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ نازک پوروں پر بڑھے ہوئے لمبے لمبے ناخن بھی پاؤں کے ناخنوں پر لگی پالش ہی کے رنگ سے آراستہ تھے۔ سنہری چوڑیاں بازو کے اوپر اُٹھنے پر کھنکھنا اٹھیں۔ جاوید نے بھی کرسی پر سے ذرا سا اُٹھتے ہوئے سلام کا جواب دیا اور خاتون کو سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تشریف رکھیے۔''

کرسی پر بیٹھ کر ذرا آگے جھکتے ہوئے ان محترمہ نے اپنے بازو میز پر پھیلا دیے۔ جاوید اس کی اس شانِ دُلربائی پر بوکھلا سا گیا۔ جلد ہی اس نے اپنے آپ کو نارمل کرتے ہوئے کہا۔

''جی فرمایئے محترمہ!''

وہ کسی بڑے آدمی کی بیگم تھی، جو ملک سے باہر تھا۔ ان کی حال میں ہی شادی ہوئی تھی، محترمہ نے ایک شانِ تفاخر سے اپنا تعارف کرایا اور بولی کہ وہ بھی اپنے شوہر کے پاس جانا چاہتی ہے۔ اس لیے پاسپورٹ بنوانے کے لیے آئی ہے۔ وہ اپنا کام بتاتے ہوئے دانستہ اپنے ہاتھوں کو اس انداز سے جنبش دے رہی تھی گویا وہ دھیرے دھیرے رقص کررہی ہو۔ مرمریں کلائی پر کالے اسٹریپ کی گھڑی بندھی تھی۔ ہتھیلیاں اتنی گلابی تھیں گویا رنگ لگایا گیا ہو۔ جاوید نے آج تک اتنے گورے، گلابی اور نرم و نازک ہاتھ نہیں دیکھے تھے۔ ویسے بھی وہ نہ جانے کیوں ہر ایک کے ہاتھ اور پاؤں بڑے غور سے دیکھا کرتا تھا اور ان کی صفائی اور خوب صورتی کو شخصیت کو سمجھنے میں بڑی اہمیت دیتا تھا۔

جاوید نے محترمہ کا شناختی کارڈ اور فیس ادائیگی کی رسید لی اور ان کو ٹوکن دیا، پھر اس نے اس کی تصویر بنائی۔ جب اس نے محترمہ کا ہاتھ پکڑ کر اس کی انگلیوں کے

انگوٹھے لگائے تو وہ اس کے نرم و نازک ہاتھوں اور پتلی انگلیوں کے سحر میں کھو گیا۔

"کاش وہ ان ہاتھوں کو سدا یوں ہی تھامے رکھے۔" اس خیال کے آتے ہی اس نے انگوٹھوں کے نشان مکمل کیے پھر جب اس نے محترمہ کی ڈیٹا انٹری شروع کی تو اس نے جان بوجھ کر ایک اعتراض لگا دیا کہ وہ اپنا نکاح نامہ بھی دکھائیں، محترمہ نکاح نامہ ساتھ نہ لائی تھیں، لہٰذا اس نے ان کو اگلے دن پھر آنے کو کہا۔

محترمہ جانے کے لیے اٹھیں اور اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کمال بے باکی سے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا، جس کا تقاضا اخلاقاً اس کے لیے ضروری تھا۔

"اُف خدایا" اسے یوں لگا کہ جیسے خالص ریشم اس کی مٹھی میں سما گیا ہے۔ اُس نے ہاتھ چھڑایا اور وہ لہراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆......☆

واپس کرسی پر بیٹھ کر کہنیاں میز پر لگاتے اور گم صم سے انداز میں اپنا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لیتے ہوئے جاوید کو اپنے دائیں ہاتھ سے خوشبو کی لپٹ آئی، وہ اپنے ہاتھ کو دوبارہ سونگھنے لگا۔

"کیا شے تھی؟" وہ سوچ رہا تھا۔

"چلو یار اب واپس دفتر بھی آ جاؤ۔" اس کے ایک ساتھی نے ساتھ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے بھی اس خاتون کو واپس جاتے ہوئے دروازے میں دیکھ لیا تھا۔

"جاوید چونک پڑا۔" ہاں یار! میں تو واقعی اس کے ہاتھوں کی نرمی اور خوشبو سے جانے کون سی دنیا میں چلا گیا تھا۔ وہ عورت تھی یا ریشم کی بنی ہوئی گڑیا؟ کتنا خوش قسمت ہے اس کا شوہر! ایک ہماری بیویاں ہیں کہ لگتا ہے گویا کسی ریگستانی مٹی کی بنی ہوئی ہیں۔"

"ہاں جاوید۔ تم سچ کہتے ہو۔" اس کا ساتھی بولا۔

"ہماری عورتوں کو تو اپنے آپ کو سجانے بنانے کا سلیقہ ہی نہیں آتا۔ سارا دن سر جھاڑ، منہ پہاڑ بنی پھرتی ہیں۔ اب دیکھو اس کی چند منٹوں کی موجودگی ہی نے سب کو تازہ کر دیا ہے۔ لگتا ہے چوکیدار اور چپڑاسی کی تھکن بھی کافور ہو گئی ہے۔"

☆......☆

سارا دن اس خاتون کی موجودگی کا سحر جاوید کے اعصاب پر چھایا رہا، حتیٰ کہ چھٹی کا وقت ہو گیا وہ گھر لوٹ آیا، مگر اس خاتون کے سحر سے آزاد نہ ہو سکا۔ شام کے وقت صحن میں بچھی کرسی پر بیٹھا گرم گرم چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے وہ نجانے کون سی دنیا میں گم تھا۔ اس کے چہرے پر سرور کی سی کیفیت نمایاں تھی، جیسے جاگتے میں وہ کوئی سہانا خواب دیکھ رہا ہو۔ وہ ان ہی خیالوں میں گم اسی خوشبو اور ان نرم و نازک گلابی ہاتھوں کو چشم تصور سے دیکھ رہا تھا کہ ساتھ والی کرسی پر آسیہ آ کر بیٹھ گئی۔ پسینے اور سستے سے پاؤڈر کی ملی جلی باس کا جھونکا آیا اور اس کا چہرہ لاشعوری طور پر سکڑ گیا۔

"ایک کپ چائے مجھے بھی دے دیں، جسم مضمحل ہو رہا ہے۔ اس شدید گرمی میں کھڑے ہو کر استری کرتے ہوئے نڈھال ہو گئی ہوں۔"

ناگواری سے جاوید نے اس کے لیے چائے کپ میں ڈال دی، اس کے حسین تصور کو تہس نہس کرنے پر اسے آسیہ پر غصہ بھی آیا اور خوامخواہ اس سے چڑ سی محسوس ہوئی، ساتھ ہی اس نے کن اکھیوں سے اس کے سراپے پر نظر ڈالی، مسلے ہوئے کپڑے، الجھے ہوئے بال، بغیر لپ اسٹک کے کورے کورے ہونٹ، بھدے کھردرے ہاتھ اور ٹوٹے پھوٹے ناخن دکھائی دیے، جن کے کناروں پر بوائیاں پھوٹی ہوئی دور سے نظر آ رہی تھیں۔ اس کا سارا نشہ کافور ہو گیا۔

"کتنی بدسلیقہ اور بدذوق ہے یہ، اپنے آپ کو ڈھنگ سے سنوار بھی نہیں سکتی۔" اس نے بدمزہ ہوتے ہوئے سوچا۔

☆......☆

اگلے دن جاوید صبح کو جلدی اُٹھ گیا۔ اس نے پینٹ اور شرٹ نکال کر خود ہی استری کی اور وہ پہن کر دفتر روانہ ہو گیا۔ آج اس خاتون نے پھر آنا تھا۔ وہ دفتر پہنچ کر بے قراری سے ایک ایک پل گننے لگا اور جب ایک نئی خوشبو کا جھونکا آیا تو وہ جان گیا کہ وہ خاتون آ گئی ہیں۔ آج اُس نے دوسرا لباس پہنا ہوا تھا، پنک کلر کے سوٹ کے ساتھ اس نے سینڈل بھی اسی کلر کے پہنے ہوئے تھی، ناخنوں پر پالش بھی پنک

کلر کی تھی اور ان پر طلائی پازیب چمک رہی تھی، آج خوشبو بھی نئی تھی۔ جاوید اسے دیکھ کر کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ خاتون نے سلام کیا اور نکاح نامہ کی کاپی جاوید کی طرف بڑھادی، جاوید نے کاپی وصول کر کے ٹوکن خاتون کی طرف بڑھایا اور بولا۔

''دو دن بعد آپ کو پاسپورٹ مل جائے گا۔''

شکریہ کہہ کر خاتون نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھادیا۔ جاوید نے بھی اپنا ہاتھ بڑھایا اور پھر وہ خاتون چلی گئی، مگر اس کی خوشبو اور اس کے حسین سراپے کا خیال دِن بھر جاوید کے دل و دماغ پر چھایا رہا۔ اس کے گلابی اور ریشمی ہاتھوں کا لمس وہ دن بھر محسوس کرتا رہا......

وہ چھٹی کر کے گھر پہنچا تو اس خاتون کا سراپا ابھی تک اس کے خیالوں میں بسا ہوا تھا...... شام کو جب اس کی بیوی اس کے لیے چائے لے کر آئی تو اُس نے اُس کے ہاتھوں سے کپ تھامتے ہوئے اس کے کھردرے اور کالے ہاتھوں کی طرف دیکھا تو اسے آج پھر چڑ سی محسوس ہوئی۔ اس نے چائے کے گھونٹ بھرا اور فوراً ہی کپ میز پر رکھ دیا اور بُرا سا منہ بنا کر غصہ سے بولا۔

''کیسی چائے بنائی ہے تم نے...... کبھی ڈھنگ کا کام بھی کرلیا کرو۔''

''کیوں کیا ہوا۔ روزانہ میں ہی چائے بناتی ہوں اور ایسی ہی بناتی ہوں۔'' آسیہ نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''آج سے پہلے کبھی آپ نے ایسی بات نہیں کی، آپ تو ہمیشہ میرے کھانوں کی تعریفیں ہی کرتے رہتے ہیں آج آپ کو کیا ہوگیا ہے؟''

''بس ویسے ہی کہہ دیا ہے...... آج جی نہیں چاہ رہا، چائے پینے کو۔'' جاوید نے اسے ٹالتے ہوئے کہا۔

شاید اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا، مگر آسیہ کے من میں شک کا ناگ کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ جاوید نے کبھی اس سے اس طرح بات نہیں کی تھی، آسیہ پریشان سی ہوگئی، جاوید کا روّیہ اُسے دُکھی کر گیا تھا۔

☆......☆

دو دن بعد وہ ملکۂ حسن پاسپورٹ لینے آ گئی۔ اُس روز اس نے نیا لباس پہنا ہوا تھا، ساتھ ہی بڑا نفیس میک اپ کیا ہوا تھا۔ اس کے بالوں کا جوڑا بھی خوب صورت لگ رہا تھا۔ سفید رنگ کے سوٹ اور کالے رنگ کے سینڈل میں اس کا حسن و شباب دوآتشہ ہوگیا تھا۔ وہ بجلیاں گراتی ہوئی آئی اور پاسپورٹ لے کر قیامت ڈھاتی ہوئی چلی گئی۔ اب اس کے بعد اس نے نہیں آنا تھا۔ پاسپورٹ اس کے حوالے کرنے کے بعد جاوید اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں شور مچانے لگی تھیں اور سارا جسم جلنے لگا تھا وہ دہکتے ہوئے جذبات کے انگاروں پر لوٹنے لگا۔ وہ گھر لوٹا تب بھی وہ انجانی سی آگ میں جل رہا تھا۔ آتے ہی اس نے آسیہ سے پانی لانے کو کہا۔

آسیہ نے فریج سے بوتل نکالی اور پانی کا گلاس بھر کر اس کے کمرے میں گئی، جاوید نے اسے گلاس میز پر رکھنے کو کہا۔ جوں ہی اس نے گلاس میز پر رکھا تو اس کا دوپٹا سرک کر اس کے بازوؤں اور ہاتھوں پر جو آن گرا تو اس کے ہاتھوں کی بوائیوں میں الجھ گیا۔ اس نے دوپٹا بوائیوں سے چھڑانے کی کوشش کی تو پانی کا گلاس اس کی زد میں آ کر فرش پر آن گرا اور ٹوٹ گیا۔ آسیہ نے اپنے ہاتھوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ جاوید کا تو دماغ ہی گھوم گیا۔ اس نے ایک زوردار تھپڑ آسیہ کے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔

''جاہل اور بدتمیز عورت! تمہیں کسی بات کا سلیقہ نہیں ہے۔ اپنے ہاتھ اور اپنی شکل دیکھو، بھنگن لگ رہی ہو۔''

آسیہ کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ اپنا گال سہلانے لگی، جاوید نے پہلی بار اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔

''جاؤ نکل جاؤ میرے کمرے سے اور مجھے اپنی منحوس شکل سے نجات دلاؤ۔'' جاوید دھاڑا۔

آسیہ روتی ہوئی اس کے کمرے سے نکلی اور ساس کے کمرے میں جا کر ان کی گود میں سر رکھ کر رونے لگی۔ اس کی ساس بھی پریشان ہوگئی، آسیہ نے روتے روتے ان کو تمام بات بتائی۔ تو وہ حیران اور پریشان ہوگئیں کہ جاوید کو کیا ہوگیا ہے۔ اُس نے بہو پر ہاتھ کیوں اُٹھایا ہے۔ انہوں نے آسیہ کو تسلی دلاسا دے کر چپ کرایا کہ وہ جاوید کی خبر لیں گی اور اس سے باز پرس کریں گی کہ اس کا روّیہ اچانک بدل کیوں گیا ہے؟ گھر کی پُرسکون فضا

میں بھونچال سا کیوں آ گیا ہے؟ کون ہے جو اس گھر کی دیواروں میں شگاف ڈالنے لگا ہے؟ انہیں کسی پل چین نہ تھا۔ انہوں نے آسیہ کو اپنے پاس ہی بٹھالیا اور جاوید کا انتظار کرنے لگیں کہ وہ جب ان کو سلام کرنے آئے گا تو وہ اس کی خوب خبر لیں گی۔"

جب کافی دیر گزرنے کے باوجود بھی جاوید ان کے پاس نہ آیا تو انہوں نے پوتے کو کہہ کر اسے بلوایا، جاوید شرمندہ سا ہو کر ان کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اس پر برس پڑیں کہ اس نے مرد ہو کر ایک کمزور عورت اور وہ بھی اپنی بیوی پر کیوں ہاتھ اٹھایا ہے؟ لگتا ہے میری دی ہوئی تربیت میں کوئی کمی رہ گئی ہے؟

جاوید شرمندہ سا نگاہیں جھکا کر بیٹھا تھا اور ماں کی کسی بات کا جواب نہ دے رہا تھا۔ انہوں نے آسیہ کو آواز دے کر اپنے کمرہ میں بلالیا اور اس کے سامنے جاوید سے پوچھنے لگیں۔

"بتاؤ۔ اس کا کیا قصور تھا، صرف ایک شیشے کے گلاس کے ٹوٹنے پر تم نے اس پر ہاتھ اٹھا دیا۔ اس کا قصور صرف یہ ہے کہ اس کے ہاتھوں میں بوائیاں پھوٹ نکلی ہیں، اس کے ہاتھ کھردرے ہو گئے ہیں۔ میں آسیہ کو تم سے زیادہ جانتی ہوں، یہی تمہاری سچی ہمدرد ہے، تمہارے دُکھ سکھ کی ساتھی ہے۔ یہ کام سے کبھی نہیں گھبراتی، تم دونوں نے حلال کی روزی سے گزارا کرنے کا عہد کیا ہوا تھا، آسیہ کو ذرا بیماری اور کمزوری نے گھبرا دیا ہے۔ تمہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ ایک بار پھر تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اسے اتنی فرصت ہی کہاں ملتی ہے کہ یہ اپنے ہاتھوں اور حلیے پر توجہ دے۔ تم پہچانو تو سہی، یہی وہ نرم و نازک اور سڈول ہاتھ ہیں جن کی تم تعریف کرتے اور ہونٹوں سے لگاتے تھے۔ تم اس کے ہاتھوں کی ہی نہیں اس کے پاؤں کی خوب صورت کی بھی تعریف کیا کرتے تھے۔ اب تو اس کی پوریں، چاقو چھریوں کی مسلسل خراشوں اور دیسی صابن کے سوڈے کی سختی سے کٹ گئی ہیں۔ برتنوں کی سیاہی نے ان کا رنگ و روپ بگاڑ ڈالا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ آسیہ اپنے ہاتھوں کے کھردرے پن اور سانولے رنگ پر فخر محسوس کرتی ہے۔ جب روزِ آخرت ہاتھ اور پاؤں خود ہی گواہی دیں گے کہ وہ دنیا میں کیا عمل کرتے رہے ہیں۔ تو اس وقت آسیہ کے ہاتھ بولیں گے کہیں گے۔"

"ہم نے اپنے وسائل میں رہ کر اپنے گھرانے کو پالنے اور میاں کو ناجائز کمائی لانے پر مجبور نہ کرنے کے لیے دن رات مشقت کی ہے، آسیہ کے کھردرے ہاتھ مجھے ان نازک ہاتھوں سے بہت عظیم اور اعلیٰ لگتے ہیں جو تم لوگوں کی شادی سے پہلے تھے، تم نے نہ جانے کس کے حسین اور نرم و نازک ہاتھ دیکھ لیے ہیں کہ بیوی کے ہاتھوں سے نفرت ہو گئی ہے۔ یاد رکھو جو ہاتھ کام نہ کریں وہ تو نرم و نازک ہی رہیں گے۔ آسیہ اب کیا کیا کرے، اپنے ہاتھوں کو سنوارنے کے لیے لوشن، کریمیں وغیرہ خریدے، خوشبوئیں لگائے یا گھر اور بچوں کی ضروریات پوری کرے۔ آج کے بعد تم نے اگر آسیہ پر ہاتھ اٹھایا تو میں تجھے کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

ماں کی باتیں سن کر اندر ہی اندر جاوید اپنی سوچ کی پستی پر پانی پانی ہو گیا۔ اپنی عظیم جیون ساتھی کا یہ رُوپ کیوں اس کی نظروں میں ماند پڑ گیا تھا۔ اسے یاد آنے لگا۔ وہ کتنی سرخ و سپید اور نرم و نازک تھی جب وہ اسے بیاہ کر لایا تھا۔ اس نے خود ہی تو شادی کے بعد اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کی جائز آمدن میں ہی گزارا کرے گی اور واقعی اس نے دس برسوں میں جاوید سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی تھی۔ گزرتے وقت کے ساتھ گھر کے اخراجات بھی بڑھنے لگے تھے۔ جاوید کو اس کا اندازہ ہی نہ تھا، مگر آسیہ نے اپنی محنت اور سلیقے سے گھر کے قلعے کو تھاما ہوا تھا۔ شکوہ کا لفظ کبھی اس کی زبان پر نہ آیا تھا۔ جاوید کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا، اس نے لاشعوری طور پر آسیہ کا ہاتھ تھام لیا اور اسے چومتے ہوئے آنکھوں سے لگایا اور بولا۔

"واقعی کتنے خوب صورت ہیں تمہارے ہاتھ جو میری اگلی نسل کو سینچنے میں اپنی آب و تاب کھو بیٹھے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ روزِ قیامت یہ چاند کی طرح چمکیں گے۔"

☆......☆

دُکھ دہلیز کے

جاوید راہی

اپنوں کی بے اعتنائی کا شکار، ایک حوصلہ مند شخص کی کہانی

پورے محلے میں بچے بوڑھے نوجوان بابے نیاز کے گھر کے سامنے اکٹھے تھے۔ بابا نیاز مسلسل اس بات پر بضد تھا کہ تم میرے مجید نہیں ہو سکتے، لیکن لڑکا مسلسل کہہ رہا تھا کہ ”ابا مجھے پہچانو، میں ہی تمہارا کھویا ہوا جیدا ہوں۔“

میں نے غور سے اس شخص کا جائزہ لیا۔ دونوں آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ سر کے سارے بال سفید ہو رہے تھے۔ جسم استخوانی پنجر کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ پھٹے پرانے کپڑے، پیروں میں ٹوٹا ہوا جوتا۔ بار بار اس کا یہی تقاضا اور بابے نیاز کا وہی فقرہ کہ ”جاؤ جاؤ اپنا کام کرو۔“

میں نے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے یہی مناسب سمجھا کہ کسی طرح بابے نیاز اور اُس منحنی شخص کو کوئی ایسا موقع فراہم ہو جائے کہ یہ دونوں علیحدگی میں بات چیت کر سکیں، مگر لوگوں کے اس ہجوم میں یہ ممکن نہیں لگ رہا تھا۔ بلدیہ کے انجینئر چوہدری صاحب، جو میرے ہمراہ علی پور محلے کی اسٹریٹ لوکیشن دیکھنے آئے تھے، اپنی سرکاری گاڑی میں بیٹھے میرے واپس آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے بھیڑ کو ہٹاتے اس شخص کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹنے کے سے انداز میں جیپ کی طرف لے آیا۔ پچھلا دروازہ کھول کر اسے اندر بٹھایا اور خود چوہدری صاحب کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے انہیں چلنے کا کہا۔ وہ پیچھے بیٹھا اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا، جس کی کوئی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ ”جی راہی بھائی یہاں؟“ چوہدری صاحب نے پوچھا؟

”مجھے دفتر چھوڑ دیں۔“ وہ مجھے اور مجید کو سرور چوک میں ضلع کونسل پلازہ کے باہر اُتار کر واپس بلدیہ چلے گئے۔

میں مجید کو لے کر اپنے آفس آ گیا۔ اسے بٹھا کر میں نے اپنے ہیلپر آصف کو چائے بنانے کا کہہ کر اس سے مخاطب ہوا۔ مجید ایک بات میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ تم بابے نیاز کو اپنا باپ کہہ رہے ہو، مگر وہ تمہیں اپنا بیٹا ماننے سے سراسر انکار کر رہا ہے؟ چند پل وہ میرے دفتر کے درودیوار کو گھورتا رہا، پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”باؤ جی آپ کو کیا لگتا ہے کہ میں اپنے باپ، اپنے گھر، اپنی ماں اور اپنے بہن بھائیوں کو نہیں پہچانتا؟ کیا ہوا جو میں اٹھارہ سال تک ان سے دور رہا۔ اس عرصے میں مجھے تو اپنے گھر والے سبھی لوگ بے پناہ اذیتوں میں بھی بھولے نہیں۔ اپنے گھر والے، رشتے دار حتیٰ کہ دور کے رشتے دار بھی، مگر افسوس ہے کہ میرے والد نے مجھے اپنا بیٹا ماننے سے انکار کر دیا۔ میں نے شہر کے کسی کروڑ پتی کو باپ تو نہیں کہا اور نہ ہی میرا کوئی ایسا پلان تھا اور نہ ہی ہے۔ مجھے اپنی بدنصیبی پر رونا آ رہا ہے۔ لڑکپن سے آج تک ہزاروں اذیتوں نے جو نشانہ بنایا، وہ اتنا تکلیف دہ نہیں

تھا، جتنی اذیت اور کرب کا سامنا مجھے اپنے گھر کے باہر سگے باپ کے انکار پر کرنا پڑا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرّا گئی۔ میں نے اُٹھ کر اسے دلاسا دیا، اتنے میں آصف نے چائے کا کپ اس کے ہاتھ میں دیتے کچھ نہ سمجھتے میری طرف دیکھا، جسے میں نے اشارے سے باہر جانے کا کہا اور دوبارہ مجید کی طرف متوجہ ہوگیا، جو اپنی میلی آستین سے اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔

بابے نیاز کا بیٹا اٹھارہ سال قبل جو پانچویں کلاس میں پڑھتا تھا، نٹ کھٹ سا، گورا چٹا، تیز طرار اسکول گیا، پھر واپس نہ آیا۔ باپ جو حجام تھا اور محلے میں ہی کرسی میز رکھے حجامت بنانے کا کام کرتا تھا اور ساتھ میں پکوائی بھی۔ اسے روز کوئی نہ کوئی دیگ پکانے کے لیے مل ہی جاتی تھی۔ بابے نیاز کی دو بیٹیاں اور مجید سمیت تین بیٹے تھے۔ دونوں بیٹیاں اور سب سے بڑا بیٹا شادی شدہ تھے، جب کہ مجید اور اس سے چھوٹا رشید پانچویں اور چوتھی میں پڑھتے تھے۔ چھوٹی سی فیملی کی گزر اوقات بڑے اچھے طریقے سے ہو رہی تھی کہ اچانک مجید گھر سے غائب ہوگیا۔ بہت تلاش کیا گیا مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، بالآخر اس کی جدائی کا زخم آہستہ آہستہ ہلکا ہوتا گیا۔ ماں روتے روتے اندھی ہوگئی اور نیاز کی کمر بھی غم سے جھک گئی۔ وہ نیاز سے بابا نیاز بن گیا۔ آج اٹھارہ سال کے بعد یہ شخص جو خود کو مجید بتا رہا تھا، جب اپنے گھر پلٹا تو اس کا سگا باپ اس کو اپنا بیٹا ماننے سے انکاری تھا۔

میں نے پھر مخاطب کیا۔ ''مجید تم اتنی مدت کہاں رہے؟''

''میں اس وقت اپنے آپ میں نہیں ہوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنے ساتھ ہونے والے سارے حالات سے آپ کو ضرور آگاہ کروں گا۔'' مجید نے چائے ختم کر کے کپ واپس ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

''اب تمہارا اگلا پروگرام کیا ہے۔ تمہارے گھر



والے تو تمہیں قبول کرنے سے صاف انکاری ہیں، بس اوپر والے کا سہارا تو نہیں چھوٹا، وہ تو ہے نا، اپنے مسکین بندوں پر کرم کرنے والا۔ اگر آپ مہربانی کر دیں تو مجھے کام کاج پر لگوا دیں۔"

میں نے سلوا آئل گروپ کے ڈائریکٹر صاحب سے فون پر مجید کے ساتھ ہونے والی ساری صورت حال بیان کی تو انہوں نے اُس کو گیٹ پر دوسرے سیکورٹی گارڈز کے ونگ میں شامل کر لیا۔

مجید کی مدد کر کے جہاں مجھے ذہنی سکون ملا، وہاں بابے نیازی کی بے نیازی پر بہت افسوس ہوا۔

اسی دوران میں کچھ وقت کے لیے کسی کام کے سلسلے میں تھائی لینڈ چلا گیا۔ میری واپسی کوئی دو ماہ کے بعد ہوئی۔ پاکستان آ کر پھر میں اپنے روز مرہ گھر کے کاموں میں اُلجھ گیا۔ ایک دن جب میں گاڑی بند کر کے گھر کے گیٹ کی طرف آیا تو گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھولنے والا مجید تھا، جس نے ہاتھ میں گن پکڑی ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے ملنے آیا ہوا تھا۔ مجید کی حالت پہلے سے خاصی درست ہو چکی تھی، پھر خیریت کے بعد میں نے اس سے بابے نیاز کی بابت پوچھا تو اس نے بڑے دُکھ بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "صاحب جی! کیا لینا دینا ہے، ایسے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے، جن کے ہوتے ہوئے میں لاوارث ہوں۔ اللہ بھلا کرے آپ کا جنہوں نے میرے سارے گھاؤ بھر دیے ہیں۔" وہ میرے ساتھ آفس تک آیا اور پھر واپس چلا گیا۔

چوہدری صاحب سے فارغ ہو کر میں واپس جاتے ہوئے مجید کے پاس ٹھہرا اور اسے اس کا وعدہ یاد دلایا۔ اس نے چھٹی والے روز میرے آفس آنے کی حامی بھر لی۔

دو تین دن کے بعد میں آفس میں بیٹھا کام میں مصروف تھا کہ مجید نے اندر آنے کی اجازت لی۔ میں نے خوش دلی سے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ رسماً خیر خیریت میں اس نے بتایا کہ وہ فیکٹری میں ہی رہتا تھا۔ چھٹی کے بعد اس کا زیادہ وقت سلوا کے خیراتی اسپتال اور مسجد میں گزرتا تھا۔ کھانے پینے کی پروا نہیں تھی۔ تنخواہ وہ اپنی دیگر ضروریات پر خرچ کر رہا تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے میرے کہنے پر اپنے ساتھ بیتے واقعات یوں شروع کیے!

"ایم سی او کاڑہ میں میرے ٹیچر سلطان سلیمی تھے، جن سے میں پانچویں کلاس میں کمزور ہونے کی بناء پر دیگر چند لڑکوں کے ہمراہ چھٹی کے بعد سبق یاد کرنے کے لیے رُک جاتا تھا۔ وہ گھر کے چھوٹے موٹے کام بھی کروا ہی لیا کرتے تھے۔ اپنی بدنصیبی کے آغاز سے بے خبر سلیمی صاحب کے گھر کے لیے سبزی منڈی سے ان کی بتائی چیزیں خرید کر واپس آ رہا تھا کہ دو آدمی جو ڈالہ نما جیپ میں بیٹھے ہوئے تھے، نے مجھے روک کر مجھ سے کمیٹی گھر کا پتا پوچھا۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے ان کو سمت بتائی تو ایک نے کہا کہ "بیٹا آپ بیٹھو، ہم آپ کو چھوڑ دیتے ہیں۔" میں جھٹ سے کچھ بھی سوچے بغیر جیپ کے پچھلے حصے میں بیٹھ گیا، جہاں ان کا ساتھی پیچھے موجود تھا، جس نے پچھلا دروازہ بند کرتے ہی مجھے دبوچ لیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ مزاحمت کرتا، مگر کوئی تیز قسم کی بو میری ناک میں گھس گئی اور مجھے کچھ خبر نہ رہی کہ میں کہاں ہوں۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں گھپ اندھیرے میں ننگے فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میرا پورا جسم اکڑا ہوا تھا اور سر تھا کہ جیسے کسی نے من بھر کا پتھر میرے سر پر باندھ دیا ہو۔ آہستہ آہستہ کر کے سارے حالات مجھے یاد آتے گئے، میں اغوا ہو چکا تھا۔ بڑی مشکل سے میں نے خود پر قابو پایا۔ اندھیرے میں اِدھر اُدھر ٹٹولتے، دیواروں کا سہارا لے کر کھڑا ہوا اور دیوار ہی کے سہارے آہستہ آہستہ رینگ کر بند دروازے تک پہنچ گیا۔ پورا کمرہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، کسی طرف سے بھی کوئی روشنی کی کرن اندر نہیں آ رہی تھی، یا تو رات کی تاریکی تھی یا کمرہ ہی ایسی جگہ پر بنایا گیا تھا جہاں روشنی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ مجھے اپنی بدنصیبی پر بے اختیار رونا آ گیا۔ گھر والے یاد آ گئے، مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ مجھے تو یہ بھی خبر نہیں کہ میں کتنے دن بعد ہوش میں آیا۔ کافی دیر ہو چکی تھی، اچانک میرے کانوں میں قدموں کی چاپ سنائی دی، شاید کوئی اِدھر ہی آ رہا تھا، پھر باہر کی کنڈی کھلی۔ دروازہ کھلنے پر بھی اندھیرا تھا۔ ڈر کے مارے میرا پورا وجود تھر تھر کانپ رہا تھا۔ آنے والے نے مجھے اس طرح دیکھ لیا جیسے اس کی آنکھیں

اندھیرے میں بھی دیکھ سکنے کی طاقت رکھتی ہوں، کیوں کہ اس کا ہاتھ میرے بازو پر رُکا۔ اس نے بے دردی سے مجھے پکڑ کر اُٹھایا اور گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر لے آیا۔ یہ کوئی راہداری تھی خاصی طویل، جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے، ہلکی ہلکی روشنی کا احساس ہو رہا تھا، پھر ایک بڑا سا دروازہ آ گیا، جس کے اوپر سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں۔ اب میری سمجھ میں اندھیرے کا مطلب آیا۔ وہ کمرہ زمین دوز بنایا گیا تھا۔ چند سیڑھیاں عبور کر کے میں اس آنے والے آدمی کے ساتھ ایک دروازے کو عبور کرتا کھلے آسمان کے نیچے پہنچ گیا۔ وہ آدمی وہی تھا جس نے جیپ میں مجھے کچھ سنگھا دیا تھا اور میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ وہ کوئی بڑا ایریا تھا۔ چاروں جانب کچے دالان اور اونچی اونچی کچی دیواریں اور آخری کونے میں خاصا بڑا گھر بنا ہوا تھا اور گھر کے باہر کچھ لوگ چارپائیوں پر موجود تھے۔ وہ مجھے گھسیٹتا ہوا وہاں لے آیا، سامنے وہی دونوں جیپ والے، جن کی باتوں میں آ کر میں جیپ میں بیٹھ گیا تھا، جبکہ چار لوگ اور تھے۔

وہ چاروں میرا ایسے جائزہ لے رہے تھے جیسے میں کوئی قربانی کا جانور ہوں، پھر ان کے سر ہلانے پر دونوں نے اسے اشارہ کیا جو مجھے وہاں لایا تھا۔

وہ مجھے پھر گھسیٹتا ہوا اسی طرف لے آیا اور دروازے کے اندر دھکیل کر باہر سے بند کرتا ان کے پاس پلٹ گیا۔ دروازے کی جھری سے باہر کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا، حالاں کہ وہ فاصلہ اس جگہ سے دور تھا، مگر وہ لوگ صاف دکھائی دے رہے تھے۔

مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ لوگ خرکار تھے اور بچوں کو اغوا کر کے خرید و فروخت کا دھندا کرتے تھے۔ گھر کے اندر سے ملازم کھانے کے برتن باہر لاتے دکھائی دیے تو میری بھوک پھر سے جاگ اُٹھی۔ جب وہ کھا چکے تو وہی آدمی جو مجھے نیچے سے اوپر لایا تھا۔ میرے لیے بچا ہوا کھانا اُٹھائے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ میں جلدی سے پیچھے تک ہٹ کر دیوار کا سہارا لیتے زمین پر بیٹھ گیا۔

دروازہ کھلا اور کھانے کے برتن اس نے میری طرف کرتے ہوئے کہا کہ کوئی ہوشیاری نہیں کرنی، یہاں فرار ہونے کا دوسرا نام موت ہے یعنی گولی۔ اس نے اپنے گلے میں لٹکتا پستول چھوتے مجھے دھمکی دی۔ جلدی جلدی سے کھانا ختم کرو، پانی لاتا ہوں یہ کہتے ہی وہ پھر واپس چلا گیا۔ اس بار اس نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔

میں ٹھنڈی سانس بھرتے کھانا زہر مار کرنے لگا، ساتھ ہی میرے دل و دماغ میں طرح طرح کے وسوسے سر اُٹھا رہے تھے، مگر میں بے ہمت کر بھی کیا سکتا تھا۔ دروازہ پھر بند کر دیا گیا تھا۔ میں اب اس ماحول میں تھوڑا تھوڑا خود کو مانوس کر چکا تھا۔ یہاں رہتے ہوئے مجھے کئی دن ہو گئے تھے بہت سارے لوگ آتے، مجھے دکھایا گیا، شاید میرا سودا نہیں ہو رہا تھا، پھر آخرِ کار ایک پارٹی کے سپرد مجھے کر دیا گیا۔

جس جگہ مجھے لایا گیا تھا، اس کے چاروں جانب فلک بوس پہاڑ ہی پہاڑ تھے۔ چھوٹی چھوٹی آبادیاں اور تھوڑے تھوڑے گھر تھے۔ میرے نئے مالک مجھے جیپ میں بٹھائے محوِ سفر تھے۔ دن ڈوبنے سے پیش تر وہ لوگ مجھے لے کر ایسے مقام پر آ گئے جہاں بہت سی بڑی بڑی مشینیں پتھر کے ٹکڑے ریزہ ریزہ کرنے میں مصروف تھیں اور کئی چھوٹے بڑے لوگ وہاں پتھر اُٹھا کر مشینوں میں ڈال رہے تھے، کسی نے میری طرف توجہ نہیں کی۔ بس اپنے اپنے کام میں جتے ہوئے تھے۔ جیپ چلانے والے خان نے اپنے ساتھی کو اپنی زبان میں کچھ کہا تو اس نے مجھے نیچے اُترنے کا اشارہ کیا۔ میرے اُترتے ہی جیپ آگے بڑھ گئی۔ وہ مجھے لے کر بڑا سا چکر کاٹ کر مشینوں والے حصے کو پیچھے چھوڑتا حویلی نما بڑے سے گھر کے دروازے پر آ گیا۔ اس نے باہر کھڑے کھڑے کچھ کہا اور اندر سے ایک مسلح خان نے دروازہ کھول دیا۔ وہ مجھے اس کے سپرد کرتا واپس پلٹ گیا۔ اس نے میرا بغور جائزہ لیتے اندر سے پھر کنڈی چڑھائی اور سر کے اشارے سے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

اندر آ کر میں نے چاروں جانب کا جائزہ لیا۔ چار دیواری کے ساتھ ساتھ گہری کھائی بنی ہوئی تھی اور دیوار سے ہٹ کر پوری لائن میں چھوٹے چھوٹے کمرے تھے اور دو مسلح پہرے دار اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ مجھے ان دونوں کے سپرد کرتے وہ واپس پلٹ گیا۔ گہری خاموشی تھی پورے ماحول پر۔ کونے میں بندھے دو بڑے بڑے

کتوں نے سر اُٹھا کر دیکھا اور دوبارہ اسی پوزیشن میں دراز ہوگئے۔ کمروں کے دروازے باہر سے بند تھے۔ ایک بند دروازہ کھولتے ہوئے مجھے اس نے اندر جانے کا اشارہ کی۔ اندر چٹائی پر چار لوگ پیروں میں لوہے کے کڑے ڈالے دیوار میں پیوست کنڈوں کے ساتھ سنگلوں میں جکڑے ہوئے پڑے تھے۔ ایک سنگل کے ساتھ میری ٹانگ بھی باندھ دی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ چاروں نے مجھے دلاسا دیا اور ہمت سے دن کاٹنے کا مشورہ دیا۔

دوسرے دن مجھے بھی دیگر لوگوں کے ساتھ بڑے سے ٹرک میں سوار کروا دیا گیا۔ ٹرک جو آگے پیچھے چل رہے تھے، دونوں میں مسلح پہرے دار گن تھامے نگرانی پر مامور تھے۔ کافی دیر کے سفر کے بعد ٹرک پہاڑوں کے درمیان رُکے۔ وہاں بڑی بڑی ٹوکریاں اور کدال پڑے تھے۔ مجھے بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ جن میں میری عمر کے کم ہی لڑکے تھے، کام پر لگا دیا گیا۔ ٹوکروں میں پتھر بھر کے ان لوگوں کے سروں پر رکھوانے کے لیے اور پتھر جو پہاڑ توڑ کر اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے، اپنی ہمت کے مطابق اُٹھا اُٹھا کر بڑے ڈھیر میں جمع کرنے کے کام پر لگا دیا۔ ذرا سا تھکاوٹ کا احساس ہوتا یا کام میں سستی آتی تو ہم پر جلاد مقرر تھے، مار مار کر لہولہان کر دیتے۔ دوپہر کے کھانے میں پانی کی طرح دال اور بڑی بڑی باجرے کی روٹیاں اور تالاب میں بھرا کڑوا پانی ملا، جو بڑی مشکل سے حلق سے نیچے اُترا۔ پھر آہستہ آہستہ میں اس کا بھی عادی ہوگیا۔ کام کے دوران یا رات کو ایک دوسرے سے بات کرنے کی سختی سے پابندی تھی۔ اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرتا تو اس کے ساتھ ہونے والے تشدد کو دیکھ کر دوبارہ کوئی جرأت نہ کرتا۔

گھوگا خان، سارے ملازمین اور وہاں کام کرنے والوں کا سرپنچ تھا۔ اُس کا راج اور حکم چلتا تھا۔ اس خرکار کیمپ پر اگر بڑے خان کا ملازم بھی کوئی گڑبڑ کرتا تو اس کی چمڑی ادھڑ جاتی اور گھوگا خان سے بڑے خان صاحب بھی کوئی جواب طلبی نہ کرتے کہ جو بھی اس نے کیا ٹھیک کیا۔ وہ اس بلا کا سفاک تھا کہ اس نے صرف اس بات پر کہ ایک اغوا ہونے والا پٹھان لڑکا سب کے سامنے گولیوں سے چھلنی کر ڈالا کہ وہ اپنے گھر والوں کو یاد کر کے آنسو بہا رہا تھا۔ اس کی لاش سارا دن ہماری آنکھوں کے سامنے پڑی سڑتی رہی، شام کو اس لاش کو اُٹھوا کر گہری کھائی میں گرا دیا گیا۔

میں تمام رات خوف کے مارے سو نہ سکا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہم سب کے سامنے کیا گیا کہ ہم عبرت پکڑیں۔ پہاڑ بڑے خان کی ملکیت تھے اور ان کو توڑ توڑ کر مشینوں پر کرش بنوا کر ایک جگہ ذخیرہ کیا جاتا، پھر کرش کے خریدار اپنے ٹرکوں میں بھر کر شہر لے جاتے، اس بڑے ڈھیر کے قریب کرش کو شہر لے جانے والے ٹرک کھڑے ہوتے تھے، وہاں کسی کو جانے کی نہ اجازت تھی اور نہ ہی کوئی اس طرف منہ کرتا تھا۔ جن کمروں میں مجھ جیسے اغوا کر کے لائے ہوئے لوگ رکھے جاتے تھے، ہر دوسرے تیسرے روز ان کو ادل بدل کیا جاتا تھا، تاکہ ہم لوگ آپس میں کوئی تعلق واسطہ نہ بنا سکیں۔

''مجید تمہیں کوئی اندازہ ہے کہ وہ مقام کہاں تھا جہاں یہ خرکار کیمپ بنایا گیا۔''

''راہی صاحب! میں مسلسل 22 دن تک پہاڑوں اور دروں میں بھٹکتا پھرا۔ اگر میں جا کر تلاش بھی کرنا چاہوں تو نہیں جا سکتا وہاں۔'' اس نے پہلو بدلتے جواب دیا۔

''اس خوف ناک جہنم میں بیگار کاٹتے سات سال بیت گئے۔ دل نے فیصلہ کرلیا کہ اب یہی گھر اور یہی قبرستان بنے گا، مگر اس جہنم سے فرار ہونے کا جذبہ دل میں کبھی کبھار جاگ پڑتا، لیکن اس فرعون کے خوف سے میں سختی سے اپنے دل کو اپنے بس میں کر لیتا۔

ایک دن صبح جب ہم ٹرکوں سے اُتر کر بیگار کرنے کا سفر طے کر کے کیمپ پہنچے (یہاں میں بتاتا چلوں کہ ٹرک ہمیں جہاں اُتارتے تھے، وہاں سے پہاڑ کی گھاٹی چڑھ کر دوسری جانب نیچے اُتر کر جانا پڑتا تھا، کیوں کہ ٹرک آگے نہیں جا سکتے تھے۔) پیچھے پیچھے تو ہمارے سامنے گھوگا خان کی بجائے ایک لمبا تگڑا پٹھان، جس کا نام بعد میں معلوم ہوا کچھو خان تھا، کو کھڑے پایا۔ جس نے بتایا کہ گھوگا خان حج کی سعادت پر گیا ہے، اس کے آنے تک کچھو اس کی جگہ ڈیوٹی کرے گا اور سارے لوگ

کان کھول کر سن لو۔ اگر روٹین کے قانون کو کسی نے توڑنے کی کوشش کی تو اس کا انجام سزا نہیں بلکہ سزائے موت ہوگا۔ اب کام پر لگ جاؤ۔ اس کا لہجہ سرد اور سفاک تھا۔ میرے سر پر پتھر سے بھرا ٹوکرا تھا کہ میرا پاؤں پھسل گیا، میں ٹوکرے سمیت لڑکھڑاتا دور تک لڑھک گیا۔ بس کیا تھا کچھو خان نے اپنا بید اس وقت چھوڑا جب تک وہ میرے جسم پر برستے برستے ٹوٹ نہ گیا۔ میرا سارا جسم خون سے لت پت ہوگیا، مگر اس بے رحم کو رحم نہ آیا۔ میں نے بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دعا کی۔ یا اللہ مجھے موت ہی دے دے تاکہ میں روز کی موت مرنے سے ایک بار ہی ختم ہوجاؤں۔ میں اسی حالت میں سارا دن کام کرتا رہا۔ تکلیف کی شدت کے باوجود منہ سے کوئی حرف شکایت نہ نکلا۔ مجید اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کو یاد کرکے سسک اٹھا۔ میں نے اسے دلاسا دیا۔ اسی اثناء میں چیئرمین پریس کلب کا فون آ گیا کہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں فوراً کلب آؤ، میں مجید کو کھانا وغیرہ کھلانے کا کہتے آفس سے نکل کر پریس کلب چلا آیا، تقریباً دو گھنٹے بعد میری واپسی ہوئی، اس وقت مجید تازہ دم ہوا بیٹھا تھا۔

ہاں جی شروع کریں جہاں سے سلسلہ ٹوٹا تھا۔

میں سارا دن زخمی حالت میں پتھر اُٹھاتا رہا۔ مجید نے مجھے یاد دلایا میں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ سب کچھ میرے ہی ساتھ نہیں ہوتا تھا، بلکہ روز کسی نہ کسی کی شامت آتی تھی۔

رات بھر میں بخار میں جلتا رہا۔ جب نگراں نے دوسرے ستم رسیدہ دوستوں کے ساتھ مجھے سنگل سے آزاد کیا تو مجھ میں سکت نہیں تھی اُٹھنے کی، پتا نہیں اس درندے نگراں کو کیا ہوا، رحم نام کی چیز تو میں نے اتنے عرصے سے اس میں نہیں دیکھی تھی، مگر اس نے مجھے دوبارہ سنگل میں جکڑ دیا اور باقی ساتھیوں کو لے کر وہ باہر نکل گیا۔ یہ پہلا موقع تھا اس ناکردہ گناہ کی پاداش میں قید کا جو کسی انسان کو انسان پر ترس آیا تھا۔

کوئی دو گھنٹے بعد وہی خان، جس کا نام نثار خان تھا، آیا اس کے ہاتھ میں چائے کا گلاس اور اس کے علاوہ بخار کی گولیاں بھی تھیں جو اس نے میری طرف بڑھاتے ہوئے ناشتا کرکے دوا کھانے کی تاکید کی اور چلا گیا۔

دوپہر کو نثار خان نے آکر میرا حال دریافت کیا جو تھوڑا سا بہتر ہوا تھا، پھر مجھے کھول کر سہارا دیتے لے کر باہر آ گیا۔ میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ مجھے لے کر بڑے خان کی بیٹھک پر آ گیا۔ ہمیں حکم تھا کہ نظر نیچی ہی رکھنی ہے اوپر نہیں اُٹھنی چاہیے۔ ڈر کے مارے میرا برا حال تھا۔ بڑی مشکل سے خود کو اپنی ٹانگوں پر کھڑا کر رکھا تھا۔ بڑے خان نے نثار خان کو اپنی بولی میں کہا کہ اسے ٹھیک ہونے تک اپنی نگرانی میں اپنے پاس رکھو۔ اتنا عرصہ ہوگیا تھا ان لوگوں کی قید میں رہتے ہوئے، ان کی زبان کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی۔

نثار خان مجھے سہارا دیتے ہوئے ان کمروں کی طرف لے آیا جس میں نگراں رہتے تھے۔ تین دن تک میں وہاں ان کے کمرے کے کونے میں پڑا رہا، صرف مطلب کی بات ہوتی تھی مجھ سے، ورنہ یوں لگتا جیسے اس کمرے میں میری حیثیت بھی کسی بے جان چیز جیسی تھی۔

جب میں کام کرنے کے قابل ہوگیا تو بڑے خان نے مجھے اندر ڈیرے کے کام کاج پر مامور کردیا۔ یہاں یہ فائدہ ہوا کہ میں ہر وقت کی مار پھٹکار سے بچ گیا۔ یہاں بھی کام کاج مشقت سے کم نہیں تھا۔ رات گئے دوسرے دو کام کرنے والوں کے ساتھ جٹا رہتا۔ رات کو جس جگہ ہم تینوں سوتے تھے، وہ کمرہ ہر لحاظ سے ایسا بنایا گیا تھا کہ اس سے باہر والے کی مرضی کے خلاف باہر ہی نہیں نکلا جاسکتا تھا۔ کمرے کی چھت تقریباً 25 فٹ اونچی، چھت کے ساتھ دو چھوٹے چھوٹے روشندان اور باہر آنے جانے کے لیے صرف لکڑی کا بھاری دروازہ، زمین پر چٹائیاں اور پانی کا گھڑا یا کونے میں بنا زمین دوز بڑا سا کنواں، جس کے اوپر بڑی سی پتھر کی سل پڑی تھی اور درمیان میں سوراخ تھا، جو کہ رفع حاجت کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اور بس۔ یہاں اتنا ضرور ہوگیا کہ ہم تینوں آپس میں بات چیت کرلیا کرتے تھے۔ اس خرکار بستی میں اغوا شدہ تھوڑے ہی لوگ تھے، زیادہ تر خرید و فروخت یا ایڈوانس کے نام پر قابو کیے لوگ، جن کی زندگیاں ان ہی پہاڑوں اور مشینوں کی نذر ہوچکی تھیں۔

میں بچپن یا نوعمری، پھر جوانی کی حدود سے بے نیاز دن رات اور سال گزارتا ہوا اس جہنم میں اٹھارویں

سال میں پہنچ گیا تھا۔ اس دوران بڑے خان فوت ہوگئے۔ سارا نظام بڑے خان کے بیٹے طارق خان، جسے کڑھیو خان کہا جاتا تھا، کے سپرد ہوگیا۔ اس کا دل شاید اپنے آبائی کام میں زیادہ خوش نہیں تھا۔ اس لیے کئی لوگ، جن کے ورثاء نے بڑے خان سے ایڈوانس رقم لے کر اپنے بچوں کو یہاں کام پر لگا رکھا تھا، کو واپس ان کے ورثاء کے حوالے کر دیا۔ پہلے کبھی ڈیرے پر اتنی آزادی نہیں ہوتی تھی۔ اب کبھی کبھار کوئی بیوپاری کڑھیو خان کے ساتھ ڈیرے پر کاروباری معاملات کے سلسلے میں آجاتا تو گپ شپ اور موج میلہ رات گئے تک جاری رہتا۔ میری خوش قسمتی یہ تھی کہ اب میں ڈیرے کا با اعتماد کا آدمی تھا۔ باہر آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی، کیوں کہ اٹھارہ سال کے لمبے عرصے نے اور کبھی بھی نہ بھاگنے والی شکایت نے میرا اعتماد کڑھیو خان پر بحال کر رکھا تھا، مگر آزادی کا خواب اور اپنے والدین، بھائی، بہنوں، یار، دوستوں کی جدائی کا زخم ہر پل ہرا رہتا تھا۔ باہر سے آنے والے ٹرک، جن پر کرش لوڈ ہوتی تھی، وہ جگہ ڈیرے سے زیادہ دور نہیں تھی، کیوں کہ پتھر مشینوں پر کرش ہونے کے بعد بڑے ڈھیر پر جمع ہوتا رہتا تھا اور ٹرک ادھر ہی رکتے، ادائیگی کرنے کے بعد وہ لوگ جو یہاں ملازمین کی مد میں کام کرتے تھے، وہ ٹرک میں کرش لوڈ کرنے کا کام سرانجام دیتے۔ وہ لوگ ہماری طرف نہیں آتے تھے، کیوں کہ ادھر آنے کی سخت پابندی تھی۔

میرے ذمے کڑھیو خان نے اپنے کتوں کی دیکھ بھال بھی لگادی تھی۔ بڑی جلدی اور خونخوار گدی کتے، جن کی آنکھوں میں ہر وقت خون اُترا رہتا تھا، میرے کہنے کار میں آگئے۔ جب میں کتوں کو لے کر باہر گھمانے جاتا تو میرا گزر مشینوں والے حصہ کی طرف ہوتا۔ وہاں کام کرنے والے لوگوں سے میری جان پہچان بھی ہوگئی تھی۔ ٹرکوں پر لوڈ ہوتی کرش کو دیکھ کر میرے اندر اس جہنم سے فرار ہونے کی خواہش دن بدن مضبوط ہوتی جارہی تھی۔ میں فرار ہونے کی راہیں تلاش کرتا رہتا۔ ٹرک کے اوپر کرش لوڈ ہونے کے بعد ٹرک واپس شہر کی طرف جاتے۔ کڑھیو خان کی حدود کراس کرتے وقت لوڈ مال کے ناپ تول کا بھی جائزہ لیا جاتا۔ اگر مال کی پیمائش زیادہ ہوتی تو ٹرک سے اتنا مال چیک پوسٹ پر اُتار کر ٹرک آگے جانے دیا جاتا اور ٹرک پر مال لوڈ کرنے والی ٹولی کی شامت آجاتی۔ اگر کسی ٹرک پر سوار ہوا بھی جاتا تو پکڑے جانے کا زیادہ اندیشہ تھا۔ آخر کار میں نے فیصلہ کرلیا کہ جو ٹرک دوپہر کے بعد لگے گا، کیوں کہ وہ شام تک مشکل سے بھرا جاتا تھا، میں نے اسی میں فرار ہونے کا پروگرام ذہن میں رکھا۔ کئی ماہ تک میں چوری چھپے بھر جانے والے ٹرکوں کا جائزہ لیتا رہا کہ کیسے اور کس طرح فرار ہونے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ پکڑے جانے کا مطلب موت تھی اور میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ آزادی یا پھر موت۔

آج صبح سے موسم خراب تھا۔ پہاڑوں پر دھوپ بھی ہو تو ماحول پر دھوپ چھاؤں جیسا ہی گمان دکھائی پڑتا ہے۔ صبح والے ٹرک لوڈ ہوکر جاچکے تھے، اب لگنے والا بڑا ٹرالر تھا، جسے ڈبل لیبر بھرنے میں مصروف تھی۔ میں دھڑکتے دل سے اس بات اور لمحہ کے انتظار میں تھا کہ کب لیبر فارغ ہوکر اپنی ٹوکریاں اور کرش اُٹھانے والے کدال لے کر ٹرک سے نیچے اُترتے ہیں۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ ٹرک بھر چکا ہے اور لیبر اپنا کام ختم کرکے چھٹی کرنے والے ہیں۔ میں نے ڈیرے پر آخری نگاہ ڈالی اور سب لوگوں کی نظر بچا کر ادھ کھلے گیٹ سے باہر نکل آیا۔ میرا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ ابھی اچھل کر باہر آن گرے گا۔ مجھے گیٹ سے جتنی جلدی ہوسکے وہ حصہ عبور کرکے مشینوں کے پچھواڑے جانا تھا۔ وہاں سے ٹرک پر چڑھ کر کیبن کے اوپر والے حصے میں جہاں ٹرک کا ٹول اور ترپال بستر وغیرہ ڈرائیور رکھتے تھے، تک جانا اور چھپنا تھا۔ میں تیز تیز چلتا ہوا چھپتا چھپاتا اس جگہ تک پہنچ گیا، جہاں رُک کر میں نے ٹرک گزرنے کا انتظار کرنا تھا، یہ گھاٹی جو نیچے کو جاتی تھی، یہاں تک ٹرک کی اسپیڈ نارمل رہتی، بس یہی موقع تھا اُچک کر پیچھے سے ٹرک پر سوار ہونے کا۔ میں سانس روکے چاروں جانب کا جائزہ بھی لے رہا تھا، ابھی تک قسمت مہربان ہی چلی آرہی تھی کہ میرے ڈیرے پر سے غائب ہونے کا کسی کو بھی علم نہیں ہوا تھا، پھر ٹرک اسٹارٹ ہوا، میری سانسیں تیز تیز چلنے لگیں، ٹرک میرے قریب سے گزرا اور میں پوری قوت صرف کرتے ہوئے اس

کے پیچھے والے چھجے کے ساتھ چمٹ کر کرش کے اوپر جا گرا۔ اس سارے عمل میں کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی، پھر میں نے رینگ کر خود کو ٹرک کے آخری کونے تک کرلیا، چند پل سانسیں روکے پڑے رہا۔ جب یقین ہوگیا کہ ٹرک کے انجن سے نکلنے والے شور میں ٹرک کے عملے کو میرے ٹرک پر کودنے کا علم نہیں ہوا تو میں بغیر آواز پیدا کیے اوپر والے حصے میں پہنچ گیا۔ اس کیبن نما اسٹور کا تختہ اوپر اُٹھا کر میں ترپال کے اندر بے حس وحرکت دبک گیا۔ دل مارے خوف کے بیٹھا جارہا تھا۔ پورا جسم پسینے سے بھیگ رہا تھا۔ مجھے کڑھیوخان کی آخری چیک پوسٹ کا انتظار تھا، جہاں ٹرک میں لدے مال کا جائزہ لینے والے چیک کرتے تھے اور پھر جانے دیتے تھے۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا میری حالت غیر ہوتی جارہی تھی، آخر کار ٹرک رُکا، آوازوں کا تبادلہ ہوا، پھر کوئی ٹرک کے اوپر چڑھا، مجھے یوں لگا جیسے کوئی میرا گلا دبوچ کر دبا رہا ہے، مارے ڈر کے میری سانس بند ہورہی تھی، میں دل میں پروردگار کی مدد مانگتا اور گڑگڑا رہا تھا، پھر ٹرک ہلکا سا جھٹکا لے کر آگے بڑھ گیا۔ پہاڑوں کے بیچ اُچھلتا کودتا ٹرک آگے بڑھا جارہا تھا اور میں دھڑکتے دل سے بس ایک ہی دُعا مانگ رہا تھا کہ ٹرک جلدی سے یہ علاقہ چھوڑ کر ایسے علاقہ میں پہنچ جائے جہاں میں خود کو محفوظ کرلوں۔ کبھی کبھار میں ڈھکن اُٹھا کر سر باہر نکال کر ارد گرد اور پیچھے کا جائزہ بھی لیتا آرہا تھا۔ ٹرک کی رفتار اب کافی تیز تھی، کیوں کہ اونچا نیچا راستہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ پہاڑوں کے درمیان درہ سا بنا ہوا تھا، چاروں جانب نہ کوئی آبادی نہ کوئی انسان، صرف ٹرک کے انجن کا شور یا میرے سینے کا اندر تیزی سے دھڑکتے دل کی آواز، جو صرف میں ہی محسوس کرسکتا تھا۔

پورے ماحول پر ہلکا ہلکا اندھیرا چھا رہا تھا۔ مجھے یہ یقین تھا کہ اب تک پیچھے میری کوئی خبر نہیں ہوئی تھی ورنہ کڑھیوخان کی فورس اور گاڑیاں کب کی اس ٹرک تک پہنچ جاتیں۔ اب پھر پہاڑوں کا اونچا نیچا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ میں نے ٹرک کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس کیبن والے حصہ سے اُٹھ کر نیچے کرش پر آکر رینگنا شروع کردیا اور بڑی احتیاط سے ٹرک کے آخری سرے پر پہنچ کر اس وقت کا انتظار کرنے لگا کہ کب اس کی رفتار کم ہو اور میں نیچے کود جاؤں، شاید آگے کوئی موڑ آرہا تھا، ٹرک کی رفتار قدرے کم محسوس ہوئی تو میں جھٹ سے پیچھے والے حصہ کو پکڑ کر لٹک گیا اور چھلانگ لگادی۔ گرنے سے میرے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں اور گھٹنے بری طرح سڑک پر رگڑے گئے، مگر میں سڑک پر بے حس وحرکت اس وقت تک اسی پوزیشن میں پڑا رہا جب تک ٹرک کافی دور تک نہ نکل گیا، پھر اُٹھتے ہی میں نے دور تک پیچھے نظر دوڑائی جدھر ٹرک کا رُخ تھا پہاڑوں کی چڑھائی چڑھتے دوسری طرف آ گیا۔ چاروں جانب ہُو کا عالم تھا، جنگلی جانوروں کا خوف الگ، مگر میں وقت ضائع کیے بغیر درختوں اور جھاڑیوں میں الجھتا آگے بڑھ رہا تھا۔ کبھی کبھار کوئی پرندہ یا گیدڑ وغیرہ بولتا تو میں سہم جاتا۔ نہ کوئی راستے کی خبر نہ منزل کا پتا، بس چلا ہی جارہا تھا، جدھر راستہ جاتا ادھر چل پڑتا۔ رات کی تاریکی بڑھ رہی تھی اور راستے کا کوئی علم نہیں تھا۔ ایک اونچے درخت پر چڑھ کر میں نے رات بسر کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

پیدل چلنے کے باعث ٹانگیں پھوڑے کی مانند دُکھ رہی تھیں اور بھوک کے مارے برا حال تھا۔ چلتے ہوئے میں نے جیب میں تھوڑے سے چنے اور گڑ کی ڈلی چھپالی تھی کہ پتا نہیں آگے کیا حالات ہوں۔ ایک بڑے سے تناور درخت کے اوپر پہنچ کر میں نے خود کو اس کے دو شاخ تنے کے درمیان پھنسالیا کہ اگر اونگھ بھی آجائے تو کم از کم گرنے سے محفوظ رہ سکوں۔ رات بھر اسی درخت پر بیٹھا رہا۔ جب اندھیرا تھوڑا سا کم ہوا تو میں نے خود کو پھر سے آگے بڑھنے کے لیے تیار کرلیا۔ اب بھی میں کڑھیوخان کے علاقے میں تھا اور مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ مجھ کو تلاش کرتا اپنے گدی کتوں سمیت اس طرف ہی نہ آجائے۔ میں جلد سے جلد اس حدود سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اس بات کا مجھے یقین تھا کہ میں اگر اس سمت بڑھتا رہا تو کوئی نہ کوئی محفوظ ٹھکانہ آ ہی جائے گا۔ راستے میں کئی جگہ جنگلی بیر کی جھاڑیوں نے میری بھوک کا مسئلہ کم کردیا اور تھوڑی بہت جو مقامی بولی مجھے آتی تھی، اس کے طفیل میں علاقے میں آنے والی کسی آبادی میں پناہ بھی لے سکتا تھا۔ اُونچے نیچے راستوں پر آگے بڑھتے مجھے تین روز ہوچکے تھے۔ خدا کا شکر تھا کہ نہ تو کسی جنگلی جانور سے اور

نہ ہی کسی انسان سے مڈبھیڑ ہوئی تھی اور میں مسلسل اس جہنم کو پیچھے ہی چھوڑتا آرہا تھا، مگر اس آزادی میں بھی خود کو قیدی ہی محسوس کر رہا تھا۔

کبھی ادھر اور کبھی ادھر بھٹکتے مجھے بیس روز ہو گئے، مگر درختوں پہاڑیوں ندی نالوں کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا، آخر کار میں نے فیصلہ کیا کہ جو اونچا سا پہاڑ میرے بالکل سامنے تھا، اس کے دوسری جانب دیکھا جائے تو شاید اونچائی سے کوئی آبادی وغیرہ نظر آ جائے۔ گرتا پڑتا دن ڈھلنے سے قبل میں اتنا ہی سفر کر پایا کہ اس بلند ترین پہاڑ کے دوسری جانب جھانک سکوں۔ میرے سامنے بھی دور تک پہاڑی سلسلہ تھا، مگر پہاڑوں کے اس پار آبادی کے نشانات آسمان کی طرف اُٹھنے والے مختلف مقامات سے دھویں کی شکل میں محسوس ہو رہے تھے۔ پیچھے کا خوف میرے اندر سے ختم ہو چکا تھا اور اب صرف یہ دھن سر پر سوار ہوگئی کہ جتنی جلدی ہو سکے میں اترائی تک پہنچ جاؤں۔ اندھیرے تک میں پہاڑ کی اونچائی پر چڑھتا رہا۔ خورا کی شکل میں جنگلی گھاس پھوس، بیر وغیرہ تھے، میرے آس پاس پانی جو چاروں جانب وافر مقدار میں نالیوں کھالیوں کی شکل میں نیچے کی جانب گر رہا تھا۔ جب ہمت جواب دے گئی تو میں نے ایک جگہ رُک کر رات گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔ علی الصبح اُٹھ کر دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ دوپہر تک میں پہاڑوں کے درمیان سپاٹ گھاٹی عبور کرتا نیچے آ گیا۔ اپنے انداز سے ایک پگڈنڈی پر اونچائی کی جانب بڑھنے لگا۔ میرے چلنے میں اب طاقت آ چکی تھی، ایک عزم تھا میرے ارادے میں۔ دوپہر تک چلتے چلتے میں ایسی جگہ پہنچ گیا، جہاں سے سڑک پر آتی جاتی ٹریفک نظر آ رہی تھی۔ مجھے یقین ہوگیا کہ میں اب کسی محفوظ مقام تک آسانی سے پہنچ جاؤں گا۔

میرا سانس پھولا ہوا تھا اور میں سڑک کے کنارے دھڑکتے دل کے ساتھ کسی سواری کے انتظار میں کھڑا تھا۔ ایک دو ٹرک گزرے، مگر میں نے جان بوجھ کر اشارہ نہ کیا کہ شاید کوئی کرش والا ہی ٹرک نہ ہو اور میں پھر سے پکڑا جاؤں۔ دور سے آتے ایک چھکڑے نما چھوٹے سے ٹرک کو ڈرتے ڈرتے ہاتھ دیا، مگر وہ آگے بڑھ گیا۔ میں مایوس ہو کر دوبارہ سڑک کے کنارے بیٹھ ہی رہا تھا کہ میں نے اسے تھوڑی دور جا کر رُکتے دیکھا۔ میں اُٹھ کر اس کی طرف سرپٹ بھاگ اُٹھا۔ میں کوئی سوال جواب کرتا کہ سائیڈ پر بیٹھے آدمی نے مجھے اشارہ کرتے پیچھے بیٹھنے کا کہا۔ میں جھٹ سے اس منی ٹرک کے اوپر چڑھ گیا۔ ٹرک پر ٹماٹروں کی ٹوکریاں لدی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں خود کو سمیٹ کر پھنس گیا۔ ٹرک آگے بڑھ گیا۔ نہ اس نے مجھ سے پوچھا نہ میں نے کچھ بتایا کہ یہ کون سی جگہ تھی اور وہ کدھر جا رہا تھا۔ اس سے بے نیاز میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں کرتا بیٹھا ہوا تھا۔ کئی گھنٹے کے سفر کے بعد وہ منی ٹرک ایک مقام پر رُک گیا، وہ شاید کوئی ڈرائیور ہوٹل تھا۔

اس نے اشارے سے مجھے بیٹھنے کو کہا اور پیچھے والا تختہ ہاتھ سے پیٹتے مجھے نیچے اُترنے کو کہا۔ میں سہما ہوا نیچے اُتر آیا۔ چارپائی پر اس چھوٹے ٹرک کا ڈرائیور آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ میں نے قریب جا کر اسے ماتھے پر ہاتھ رکھتے سلام کیا، اس نے جواب دیتے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ میرے بیٹھنے پر اس نے بڑی شفقت سے پوچھا، بیٹا کہاں جانا ہے۔ پہلی بار کسی کے منہ سے پیار بھرا لفظ بیٹا سنتے ہی میری آنکھیں بھر آئیں۔ وہ پریشان ہوگیا، مجھے دلاسا دیا اور اپنے ہیلپر کو میرے لیے بھی کھانے کا کہا۔ اس دوران مجھے اس جگہ کا پتا چلا کہ وہ (اُشو) کا مقام تھا۔ یہ ٹماٹر پنڈی کی سبزی منڈی میں جا رہے تھے۔ اتنے دنوں بعد کھانا اور چائے نصیب ہوئی تھی۔ میرے پورے جسم میں توانائی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

پنڈی پہنچتے صبح کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ وہ دونوں نمازی تھے۔ ان کے آنے تک میں نے ٹرک کا اگلا حصہ کپڑے اور پانی سے چمکا دیا تھا۔ ونڈ اسکرین کو بھی چماچم کر دیا تھا پرانے اخبار سے، جو ادھر پڑی خالی ٹوکریوں میں سے مل گئے تھے۔ دونوں واپس آئے تو دیکھ کر مجھے شاباش دی۔ کھانا کھاتے میں نے دونوں کو ایک فرضی کہانی سنائی کہ میں گاؤں سے شہر جا رہا ہوں کام کی تلاش میں۔ ناشتا کے بعد بڑے ڈرائیور نے مجھے پچاس روپے کا نوٹ دیا اور دعائیں دے کر مجھے فارغ کر دیا، کیوں کہ یہ اُن کی آخری منزل تھی۔

اب مجھے نہ تو کوئی خوف تھا اور نہ ڈر، میں بس

اسٹینڈ کا پتا پوچھ کر پیدل ہی چلتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ ایک خدا ترس نے میرے پچاس روپے بھی واپس کردیے اور مجھے لاہور کے لیے اپنی بس میں بٹھالیا۔ سارے راستے میں اپنی آزادی جو مجھے اٹھارہ سال بعد نصیب ہوئی تھی، کا جشن مناتا اور پچھلے واقعات یاد کرتا اپنوں کی طرف رواں تھا۔

لاہور پہنچ کر وہی پچاس روپے کام آئے اور میں رات کے کوئی دو بجے اپنے گھر، اپنے شہراوکاڑہ پہنچ گیا۔ اپنے گھر اور اپنے شہر کی مہک نے مجھ پر ایک نشے کی سی کیفیت طاری کردی تھی۔ یہاں کا تو پورا منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ مجھے صرف اتنا یاد تھا کہ ہمارا محلّہ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ تھا۔ بس اسٹینڈ کے مسافر خانے سے باہر بیٹھا میں دن نکلنے کا انتظار کر رہا تھا کہ پولیس والوں نے پکڑلیا۔ میرا حلیہ اور حالت ہی ایسی تھی۔ رات کا بقایا حصّہ تھانے میں گزارا۔ اللہ بھلا کرے خورشید جیلانی نامی ایک خدا ترس کا، جو تھانے میں کسی اپنے سرکاری کام کے لیے آیا تھا، مجھ پر نظر پڑی تو اس نے پوچھا۔ یہ کون اور کیسے۔ میں نے اُٹھ کر انہیں یہ بتایا کہ میں آج اٹھارہ سال بعد اپنے شہر اور اپنے گھر آیا ہوں۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا میں اس وقت کہاں ہوں، کہتے کہتے میں بے اختیار رو پڑا۔ منشی محرر نے ان کے کہنے پر مجھے چھوڑ دیا۔ میں تھانے سے باہر آ کر ذہن پر زور دیتا اپنے گھر کے راستے پر چل پڑا۔ گھر تلاش کرنے میں کوئی وقت پیش تو نہ آئی۔ میرا خیال تھا کہ میرے گھر والے مجھے دیکھ کر دیوانہ وار ہاتھوں ہاتھ لیں گے، مگر جو میرے ساتھ ہوا، وہ آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں، کہتے کہتے مجید نے ٹھنڈی آہ بھرتے سر نیچے جھکالیا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

میں اس کے ساتھ بیتے واقعات کے تانے بانے محسوس کرتا خود بھی دُکھی ہوگیا۔ مجید اجازت لے کر چلا گیا۔ جب میں کچھ دنوں بعد گھی والوں سے بل لینے گیا تو پتا چلا کہ مجید چپکے سے بغیر اطلاع دیے اپنی تنخواہ لیے بغیر نہ جانے کہاں چلا گیا۔ اپنے ہی گھر میں بے گھر ہونے والا مجید خدا جانے کس جرم کی سزا کاٹتا پھرتا تھا۔



تُکّا لگاؤ مسلمانو......

اِس بار اِک الگ ہی جگہ کھولی ہے دُکان
اور اُس میں بیچنے کا ارادہ ہے پاکستان
اِس بار تو سفینہ بھی اپنا ہے، موج بھی
جھانسے میں پہلے قوم تھی اِس بار فوج بھی
اِس بار بھی میں لوگوں کو اُلّو بناؤں گا
مسجد نہ جانے دوں گا، تماشے دکھاؤں گا
روزہ خراب کیجیے، نمازیں بھی چھوڑیے
بس مجھ کو دیکھیے فقط اِفطار چھوڑیے
میں اِک تماشا گر ہوں یہ ذاتی ہے کاروبار
بیوی بھی میری ساتھ چلاتی ہے کاروبار
رمضان کو تماشا بنانا ہے میرا کام
دھندا چلانا، پیسا کمانا ہے میرا کام
لالچ میں انعامات کے سب دوڑے آئیں گے
اِک اِک انعام کے لیے ہُلڑ مچائیں گے
میری ٹھرک کا پہلا نشانہ ہیں بچیاں
پھر بھابھی، نند، خالہ، جواں پھپھی چچیاں
شوہر کو چھوڑ، وائف کو اُس کی کروں گا زُوم
تاکہ تمام دنیا کے تاڑُو بھی جائیں جھوم
یوں تو میں چھوٹے بچوں کو قصّے سناؤں گا
لیکن میں اُن کی پیاری مما کو پٹاؤں گا
مجبوروں کو رُلاؤں گا ریٹنگز بڑھاؤں گا
اُن کی سفید پوشی پہ دھبّہ لگاؤں گا
آسان کردیا ہے تِرنہ گوڑے ڈالنا
کرنا ہے جو کرو یہاں رکھا ہے پالنا
میں کیوں کہوں کسی کو کہ بچّے نہ پھینکیے
ہیں آپ ذمّے دار اُسے پالیں، پوسیے
میں کیوں کہوں کہ اُٹھیے تراویح کو جایئے
رمضان اپنا ٹی وی پہ یوں مت گنوایئے
والنٹیئرز کے نام پر رونق بڑھاؤں گا
بیٹی کسی کی سیٹ پر اپنے دوڑاؤں گا
پردہ کہاں کا، کون سا اسلام، کیسا دین
مستی، مذاق، ٹھٹّا، تمسخر، تماشا دین
جتنے بھی چینلز ہیں یہ مرے نقشِ پا پر ہیں
یعنی تماشا کرنے میں سارے برابر ہیں
میں دینِ عامری کی بناء ڈال رہا ہوں
یورپ کے چوزے ایشیا میں پال رہا ہوں

(معراج عالم)

گلابی دوپٹا



بشریٰ سعید احمد

گلابی دوپٹے میں ڈوبی اسرار بھری ایک لازوال داستان

کچھ دنوں سے میں اپنی بیس سالہ بیٹی کے بدلے ہوئے انداز دیکھ رہی تھی اور اندر ہی اندر گھبرا رہی تھی۔
میری بیٹی لائبہ جو تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ گھر بھر ہی کی لاڈلی نہیں بلکہ پورے خاندان کی آنکھ کا تارا تھی۔ اپنے ددھیال کی اکلوتی بیٹی تھی، میرے شوہر چار بھائی ہیں اور اُن کی ایک ہی بہن ہے۔ سب سے بڑے میرے شوہر عثمان ہیں، ہمارے تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے، پھر میرا دیور فیضان ہے جس کے دو بیٹے ہیں۔ اُس سے چھوٹا عمر جس کے تین بیٹے ہیں اور سب سے چھوٹا بلال ہے جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔ ان چاروں بھائیوں کی لاڈلی بہن میری اکلوتی نند رافعہ ہے، جس کا صرف ایک ہی بیٹا ہے اور وہ دبئی میں رہتی ہے۔
سارے خاندان کی لاڈلی میری بیٹی لائبہ جو چند دن پہلے تک کسی پارے کی طرح اِدھر اُدھر پھدکتی پھرتی تھی، ایک پل بھی آرام سے بیٹھنا جس کے لیے مشکل تھا۔ ہر وقت اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر کبھی کرکٹ، کبھی فٹ بال کھیلتی رہتی تھی۔ پورے گھر میں اُس کی آوازیں گونجتی تھیں۔ عثمان کہتے تھے "لائبہ ہمارے گھر کی رونق ہے۔"
چند دنوں سے یہ رونق ماند پڑی ہوئی تھی۔ ہر وقت موبائل کان سے لگائے دھیمے لہجے میں باتیں کرتی رہتی اور مسکراتی رہتی۔ اِدھر اُدھر کونوں کھدروں میں چھپی پتا نہیں کس سے باتیں کرتی رہتی تھی۔
میں شاید سچ میں انجان تھی یا پھر کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے انجان بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ دن میں ہزار بار خود کو تیار کرتی کہ لائبہ سے بات کروں لیکن نہ تو وہ مجھے موقع دیتی اور نہ ہی مجھ میں ہمت ہوتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو سب کی نظروں سے دور رکھنے کی پوری کوشش کرتی تھی۔ عثمان اور میرے تینوں بیٹے اُس کی بدلتی کیفیت کا گلہ کرتے تو میں امتحان کی ٹینشن کا کہہ کر ٹالنے کی کوشش کرتی، لیکن سچ بات تو یہ تھی کہ میں کسی آنے والے طوفان کا سوچ کر اندر سے خوف زدہ تھی۔
اِن ہی پریشان دنوں میں اچانک میری نند اور رافعہ دبئی سے آ گئی۔ اُس کی آمد سے جہاں گھر کے حبس زدہ ماحول میں تازہ ہوا کا سا احساس پیدا ہوا وہاں مجھے بھی حوصلہ ملا کہ اب رافعہ سے کہوں گی کہ وہ خود اپنی لاڈلی سے بات کرے۔ رافعہ کیوں کہ اکیلی آئی تھی اُس کا شوہر اور بیٹا دبئی میں ہی تھے۔ اس لیے وہ صرف پندرہ دن رہنے آئی تھی اور اِن پندرہ دنوں میں وہ دو، دو دن میرے دونوں دیوروں کی طرف گزار

گر اب باقی دن ہماری طرف رہنے آئی تھی۔ دو تین دن تو مہمانوں کی آمد و رفت میں گزر گئے۔ عثمان کی پیاری، لاڈلی چھوٹی بہن اتنی دور سے آئی تھی اُن کی تو خوشی سنبھالی نہیں جا رہی تھی، لیکن میرے تینوں بیٹے اور چھوٹا دیور بھی ہر روز کوئی نہ کوئی پروگرام بنا لیتے۔ اس سب رونق کے درمیان لائبہ سب سے الگ الگ اور کھنچی کھنچی رہی۔ اب اُس کی بے چینی مجھے اور بھی واضح دکھائی دے رہی تھی۔ اُس کی حالت ایسی تھی جیسے کسی نشے کے عادی کو اپنا نشہ پورا کرنے کا موقع نہیں مل رہا ہو اور وہ سب کو اپنا دشمن سمجھتا ہے۔ اُس کی ان بے چینیوں نے مجھے بھی بہت بے چین کر دیا تھا۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں لائبہ سے صاف الفاظ میں بات کروں گی، لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی۔

☆......☆

رافعہ کو آئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا، ایک رات کھانے کے بعد سب کے لیے چائے بنا رہی تھی کہ رافعہ میرے پاس کچن میں آ گئی۔ باتوں باتوں میں وہ بولی۔

''بھابی آپ میری اچانک آمد پہ حیران تو ہوئی ہوں گی۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''رافعہ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔ جب تمہارا دل چاہے تم آؤ اس میں حیرانگی والی کیا بات ہے۔'' وہ بھی میرا جواب سُن کر ہنسی اور بولی۔

''یہ سن کر تو آپ ضرور حیران ہوں گی کہ اِس وزٹ کی تیاری میں ایک سال سے کر رہی تھی۔'' اب تو میں واقعی میں حیران ہوئی۔

''کیوں! ایک سال پہلے سے کیوں تیاری کر رہی تھیں؟''

میری حیرانگی کو محسوس کر کے وہ پھر ہنسی اور بولی۔

''کیوں کہ اس بار میں بہت خاص ارادے سے آئی ہوں۔''

''خاص ارادے سے؟'' میں نے اور بھی زیادہ حیران ہو کر پوچھا تو وہ ہنستے ہوئے ہی بولی۔

''بھابی! میں لائبہ کو سچ میں اپنی بیٹی بنانے آئی ہوں۔ میں جنید کے لیے لائبہ کا ہاتھ مانگنے آئی ہوں۔ آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں ہے بھابی؟'' رافعہ نے مجھے آنے کا مقصد بتا کر ساری جہاں کی خوشی سمیٹ کر مجھ سے پوچھا۔

''نہیں مجھے کیا اعتراض ہوگا رافعہ! جنید گھر کا بچہ ہے، تم نے اپنے بھائی سے بات کی؟'' میں نے پوچھا تو وہ بولی۔

''نہیں میں نے سوچا پہلے آپ سے بات کر لوں پھر بھائی سے بات کروں گی۔''

پھر رافعہ نے عثمان سے بات کر لی اور عثمان کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ عام حالات ہوتے تو شاید میں عثمان سے بھی زیادہ خوش ہوتی۔ جنید پڑھا لکھا، خوب صورت لڑکا تھا، اچھی جاب کرتا تھا، لیکن اب لائبہ کی موجودہ حالت میں مجھے آنے والے طوفان کی دستک صاف سنائی دے رہی تھی۔

اور پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ بات عثمان سے ہوتی ہوتی سارے گھر میں پھیل گئی۔ میری دیورانیاں اور بچے لائبہ کو جنید کا نام لے کر چھیڑنے لگے۔ رات کو جب میں کسی کام سے لائبہ کے کمرے میں آئی تو وہ پہلے ہی میری منتظر بیٹھی تھی۔

''ماما یہ پھوپو کیا شوشا چھیڑنے آئی ہیں؟'' لائبہ کے لہجے اور اندازِ گفتگو نے مجھے اندر تک رنجیدہ کر دیا۔

''بیٹا وہ جنید کی شادی تم سے کرنا چاہتی ہیں اس میں شوشا چھیڑنے والی کیا بات ہے؟ اور تمہارے پاپا نے تو ہاں بھی کر دی ہے۔'' میں نے اپنے لہجے کو نرم رکھ کر کہا تو وہ اور بھی چلّا کر بولی۔

''یہ میری زندگی ہے اسے کیسے اور کس کے ساتھ گزارنا ہے، اس کا فیصلہ میں کروں گی کوئی اور نہیں۔''

میں نے حیرت سے اپنی فرمانبردار اور تمیز دار بیٹی کو ایک بدلے ہوئے روپ میں دیکھا اور افسوس سے کہا۔

''بیٹا وہ تمہارے پاپا ہیں، تمہارا اچھا بُرا تم سے زیادہ جانتے ہیں۔'' لائبہ اُسی انداز میں اُسی لہجے میں بولی۔

''اگر وہ سب جانتے ہیں تو اُن کے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ میں جنید سے شادی نہیں کروں گی۔''

''کیوں؟'' مجھے اپنی آواز خود کو ہی سُنائی نہ دی۔

''کیوں کا جواب بھی میں آپ کو جلد ہی دے دوں گی پہلے آپ پھوپو کو جواب دے دیں۔'' لائبہ نے تیز لہجے میں کہا اور میرا جواب سُنے بغیر باتھ روم میں گھس کر زور دار آواز سے دروازہ بند کر دیا۔

میں آنکھوں میں آنسو بھر کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

☆......☆

اُس رات میں ایک پل کے لیے بھی نہ سوئی، ساری رات میں نے جائے نماز پہ گزاری اور رو رو کر اپنے رب سے دُعا کی کہ وہ میرے گھر کا تماشا بننے سے بچا لے۔ وہ میرے شوہر اور بیٹوں کا سر جھکنے سے بچا لے۔ وہ میری لاڈلی کو برباد ہونے سے بچا لے۔ اتنا تو میں جان گئی تھی کہ لائبہ کسی اور کو پسند کرتی ہے، مگر یہ نہ جان سکی کہ آج کی محبت کیسی محبت ہے جو چند دنوں میں ہی برسوں کے رشتے بے وقعت کر دیتی ہے جو زندگی کا سلیقہ سکھانے کے بجائے بات کرنے کا طریقہ تک بھلا دیتی ہے۔ اُس رات اپنے رب سے میں نے رو رو کر کسی معجزے کی دعا کی، کیوں کہ وہ ہر شے پہ قادر ہے، ناممکن کا لفظ اُس کے

ہاں کہیں نہیں ہے۔

اگلے دن رافعہ اور سب گھر والوں نے مری کی سیر کا پروگرام بنالیا۔

لاہور سے مَری تقریباً چھ گھنٹے کی دوری پہ ہے، رافعہ تو مری کی دیوانی تھی۔ اپنی شادی سے پہلے بھی اور شادی کے بعد بھی اُسے جب موقع ملتا مری کا چکر ضرور لگاتی۔ مری کی آب وہوا ہے بھی بڑی نرالی۔ انسان وقتی طور پر اپنے سب غم سب پریشانیاں بھول جاتا ہے، رافعہ کی طرح میرے بچے بھی مری کی سیر کے لیے ہر وقت تیار رہتے۔ اسی وجہ سے چند سال پہلے عثمان نے مری میں ایک خوب صورت سا فلیٹ خرید لیا تھا۔

آناً فاناً پروگرام بنا اور ہم سب بڑی سی کوچ میں جو میرے دیور نے کرائے پہ لی تھی، سوار ہو کر مری کے لیے نکل پڑے۔

سارے راستے لڑکوں نے خوب ہنگامہ کیا، لیکن لائبہ سب سے الگ تھلگ آخری سیٹ پر منہ پھلائے بیٹھی رہی، وہ تو آنا ہی نہیں چاہتی تھی بڑی مشکل سے اِس وعدے پہ آئی کہ واپسی پہ میں عثمان سے بات کروں گی۔

اب لائبہ کو اِس طرح دیکھ کر میں خود بھی ماحول کا حصہ نہ بن سکی، اس بات کو سب نے نوٹ کیا۔ میں نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر ٹال دیا۔

مری میں ہم پنڈی پوائنٹ پہ ٹھہرے، تین دن کے قیام کا ارادہ تھا اور تینوں دن سب نے بہت انجوائے کیا، مال روڈ کی لمبی لمبی سیریں کی، ٹھنڈی ٹھنڈی آئسکریم کھائی اور کبھی گرم گرم کافی پی۔ نومبر کے مہینے میں مری کا موسم اور اُس پہ گرم گرم کافی کا مزا ہی کچھ اور ہے۔ ہر کوئی اِن تین دنوں کو بھرپور جینا چاہتا تھا، لیکن لائبہ کی حالت ایسی تھی جیسے اُسے اچانک زندگی سے دور کر دیا گیا ہو، ہر لمحہ بے چین اور بے قرار کبھی ایک طرف جا کر اکیلی بیٹھ جاتی اور کبھی دوسری طرف، بھائیوں نے اُسے اپنے ساتھ ملانے کی کافی کوشش کی مگر وہ اُن کے ساتھ گھل مل ہی نہ رہی تھی۔ بھائی امتحانات کا ڈر سمجھ کر اُسے ریلیکس کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

عثمان مجھ سے کہتے۔

''نادیہ! ایسے تو یہ بیمار ہو جائے گی۔'' سب ہی اُس کی فکر میں پریشان تھے، اور وہ کسی اور کی یاد میں پریشان...... میں چاہتی تو لائبہ پہ سختی کر کے یا غصہ دکھا کر اُسے روکتی مگر اُس کی بدلحاظی، جس کا مظاہرہ وہ میرے سامنے کر چکی تھی، میں نہیں چاہتی تھی کہ عثمان بھی دیکھیں اور اُن کا مان ٹوٹ جائے، لیکن اب میں نے سوچا کہ واپس لاہور جا کر عثمان کو سب سچ بتاؤں گی۔

تین دن کیسے گزرے پتا ہی نہ چلا، لڑکوں کی شرارتوں نے ماحول میں رونق سی بھر دی تھی۔ کبھی ایک درخت کے پاس تصویر کھچواتے تو کبھی دوسرے...... لائبہ کی بھی انہوں نے زبردستی دو چار تصویریں بنا ہی لیں۔ واپسی پہ بھی جگہ جگہ قدرتی مناظر کو دیکھتے اور تصویریں اُتارتے سفر جاری رہا۔ اسی دوران اچانک ایک موڑ پہ لائبہ نے اپنے چاچو فیضان سے گاڑی روکنے کو کہا اور بولی۔

''ماما میں نے وہاں تصویر کھچوانی ہے۔'' اُس نے ایک درخت کے نیچے دو بڑے بڑے پتھروں کی طرف اشارہ کر کے کہا تو عثمان نے کہا۔

''بیٹا درخت کے پیچھے بہت گہری کھائی ہے۔''

''کوئی بات نہیں پاپا ویو تو دیکھیں کتنا پیارا ہے۔''

لائبہ سچ کہہ رہی تھی، ویو بہت ہی خوب صورت تھا جس نے میری بیٹی کا موڈ ٹھیک کر دیا تھا۔ میں نے عثمان سے کہا۔

''کوئی بات نہیں عثمان احتیاط سے تصویر اُتار لیتے ہیں۔''

تب میرا بڑا بیٹا ابراہیم کیمرہ سنبھال کر کوچ سے نکلا اور بڑے پیار سے لائبہ کو اُن دونوں پتھروں پہ بٹھایا اور اُس کی تصویر اُتار لی۔ تصویر اُتارنے کے بعد لائبہ جب پتھروں سے اُٹھنے لگی تو اچانک بولی۔ ''بھائی کوئی لکڑی یا چھڑی وغیرہ ہے۔'' ابراہیم نے اُسے درخت کی ایک خشک ٹہنی توڑ کر دی جو لائبہ نے دونوں پتھروں کے درمیان جو باریک سی دراڑ تھی، اُس میں ڈالی اور کوئی چیز نکالنے کی کوشش کی، پھر اچانک اُس دراڑ میں پھنسا ہوا ایک گلابی پھولوں والا خوب صورت سا دوپٹا نکلا۔ جس کا ایک سرا تو پتھر میں اٹکا تھا، لیکن

باقی دوپٹا کھائی کی طرف لٹکا ہوا تھا۔

"ماما! کتنا پیارا دوپٹا ہے۔" لائبہ نے اپنا دوپٹا اتار کر اُس دوپٹے کو لیتے ہوئے خوشی سے چہک کر کہا تو ایک پل کو مجھے اپنی وہی معصوم، لاپرواسی لائبہ نظر آئی۔ صرف میں نے ہی نہیں ابراہیم نے بھی اس بات کو محسوس کیا اور ہنس کر بولا۔

"لائبہ اس بیک، واہ دوپٹا ہے یا جادو۔" لائبہ نے مسکرا کر دوپٹے کو اپنے گرد لپیٹا اور کوچ میں سوار ہوگئی، ابھی کوچ کو چلے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ رافعہ کی آواز آئی۔

"ارے اتنی پیاری خوشبو کہاں سے آرہی ہے؟"

اب میں نے محسوس کیا تو واقعی ساری کوچ خوب صورت بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہی تھی۔

"یہ خوشبو تو لائبہ سے آرہی ہے۔" میرے چھوٹے دیور بلال نے کہا تو میں نے لائبہ کی طرف دیکھا جو دوپٹا لپیٹے مست سو رہی تھی اور اُس کا پورا وجود خوشبو سے مہک رہا تھا۔ جس کی خوشبو نے ساری کوچ کو مہکایا ہوا تھا۔

☆......☆

پھر ہنستے کھیلتے کیسے پندرہ دن گزرے پتا ہی نہ چلا اور رافعہ چھ ماہ بعد آنے کا وعدہ کرکے واپس چلی گئی۔ وہ چاہتی تھی لائبہ کے بی ایس سی کے امتحان ہوجائیں گے تب وہ دھوم دھام سے منگنی کرے گی۔

میں نے ابھی عثمان سے لائبہ کے بارے میں کوئی بات نہ کی تھی، کیوں کہ لائبہ مری سے آنے کے بعد بالکل بدل گئی تھی، فون سے بھی لاپروا ہوگئی تھی۔ فون کسی کونے میں پڑا بجتا رہتا اور وہ سُنتی ہی نہ تھی پھر کچھ دنوں بعد فون بجنا بند ہوگیا۔

لائبہ فون سے تو کیا اپنے آپ سے بھی لاپروا ہوگئی تھی، وہ ہر وقت اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی۔ کمرے سے نکلتی تو کھوئی کھوئی سی خلاؤں میں دیکھتی رہتی، اب تو اُس کی حالت نے مجھے پہلے سے بھی زیادہ پریشان کردیا تھا۔ سب سے زیادہ پریشان مجھے اُس کا ہر وقت وہ گلابی دوپٹا لے کر پھرنا کرتا تھا۔

کچھ دنوں سے مجھے لائبہ کے کمرے سے رات کو رونے کی آوازیں آرہی تھیں لیکن میں اُسے اپنا وہم سمجھ کر نظر انداز کرتی رہی۔ ایک رات میں کچن میں پانی پینے آئی تو لائبہ کے کمرے سے بہت واضح سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔

میں دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھتی لائبہ کے کمرے تک آئی، خوش قسمتی سے دروازہ کھلا تھا، لیکن لائبہ اپنے کمرے میں نہ تھی، اُس کمرے سے ملحق چھوٹی سی ٹیرس سے سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ٹیرس تک آئی، میرے سامنے لائبہ کھڑی تھی، اُس کی کمر میری طرف تھی اور چہرہ سامنے، بال کھلے بکھرے ہوئے تھے اور گلے میں وہی گلابی دوپٹا......

"لائبہ" میں نے اُسے آواز دی تو لائبہ نے میری طرف مُڑ کر دیکھا مگر یہ تو میری لائبہ نہیں تھی، اُس کے نین نقش بدلے بدلے لگے۔ میں نے خوف زدہ ہوکر پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

"میں ماریہ ہوں خدا کے لیے میری مدد کرو۔ مجھے اس عذاب سے نجات دلاؤ۔" لائبہ کے حلق سے کسی اور کی آواز نکلی اور پھر وہ روتے روتے زمین پہ گر کر بے ہوش ہوگئی، میں بھاگ کر آگے بڑھی اور زمین پر گری لائبہ کو اُٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔ میرے حلق سے نکلنے والی چیخوں نے سب کو جگادیا اور پھر لائبہ کو تیز بخار ہوگیا جو کسی طرح اُترنے کا نام ہی نہ لے رہا تھا۔ بے ہوشی میں بھی لائبہ سسک رہی تھی، اُس کی بند آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ ہم سب اُس کی حالت دیکھ کر تڑپ رہے تھے۔ ایک ہفتے تک ہر طرح کا علاج کروایا مگر نہ لائبہ کا بخار اُترا اور نہ اُسے ہوش آیا۔

☆......☆

میں تو ماں تھی میری حالت کا تو اندازہ کوئی کیا کرتا، لائبہ کے پاپا اور بھائیوں کی حالت بھی بہت بُری تھی، نہ کسی کو کھانے کا ہوش اور نہ پینے کا، پورے گھر میں ہر وقت لائبہ کی سسکیاں گونجتی رہتیں۔ اسی پریشانی میں ایک ماہ گزر گیا۔

ایک دن ہمارا مالی جو پچاس، پچپن سال کا تھا میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"باجی مانسہرہ سے میرے چچا آئے ہیں۔ سب کہتے ہیں اُن کے پاس روحانی علم ہے، اگر آپ کی

اجازت ہوتو چھوٹی بی بی کوایک بارانہیں بھی دکھادیں۔''
ڈوبتے کوتو تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔ میں نے
دونوں ہاتھ جوڑ کراُس سے کہا۔

''جاؤ خدا کے لیے اپنے چچا کو لے آؤ شاید وہ ہی
ہماری کوئی مدد کردیں۔''

اور پھر میں نے دیکھا کہ اللہ کیسے اپنے بندوں کو
فرشتہ بنا کر انسانوں کی مدد کے لیے بھیجتا ہے۔ ہمارے
مالی رشید کے چچا بابا رحیم اسّی، نوّے سال کے ایک
باریش بزرگ تھے۔ انہوں نے لائبہ کے کمرے میں
آکراُس کے بیڈ کے اردگرد قرآن پاک کی کچھ سورتیں
منہ میں پڑھتے ہوئے سات چکر لگائے۔ ساتواں چکر
پورا ہوا تو انہوں نے لائبہ پہ دم کیا اور ہاتھ سے اُس گلابی
دوپٹے کو چھوا۔ دوپٹے کو چھونے کی دیر تھی، لائبہ نے
آنکھیں کھول دیں، لال سرخ آنکھیں وہ میری لائبہ کی
آنکھیں نہ تھیں۔

''کون ہو تم؟'' بابا رحیم نے پوچھا۔

''میں ماریہ ہوں'' لائبہ کی زبان سے ایک سسکی سی
نکلی اور میں جسے اپنا وہم سمجھ رہی تھی، وہ سچ نکلا۔

''کون ماریہ؟'' بابا رحیم نے دوبارہ پوچھا۔ اُن کے
ساتھ ساتھ ہم سب بھی جاننا چاہتے تھے کہ یہ ماریہ کون
ہے؟ اور لائبہ سے کیا چاہتی ہے۔

''میں بھی لائبہ کی طرح دو بھائیوں کی اکلوتی بہن
اور اپنے امی بابا کی لاڈلی تھی، بی اے کی طالبہ تھی، نہ
کوئی فکر تھی نہ پریشانی سارے گھر والے مجھ سے بے
پناہ محبت کرتے تھے اور پھر میری زندگی میں سعد آیا جو
میری بیسٹ فرینڈ فوزیہ کے پڑوس میں رہتا تھا۔ اُس
نے پتا نہیں ایسا کیا جادو کیا کہ میرے لیے امی، بابا اور
دونوں بھائیوں کا پیار کم پڑ گیا، مجھے تو صرف سعد کا پیار
چاہیے تھا اور سعد کا ساتھ...... اور اس ساتھ کو پانے کے
لیے میں سب کو چھوڑنے کے لیے تیار ہوگئی۔ اُن دنوں
گھر میں میری منگنی کی باتیں ہو رہی تھیں، میں نے امی
سے سعد کا ذکر کیا تو وہ میری خوشی کے لیے میرے ساتھ
اُس سے ملنے گئیں، مگر اُس کا چھوٹا سا دو مرلے کا کرائے
کا گھر اور ادھوری تعلیم نے امی کو انکار پر مجبور کردیا،
لیکن میں محبت کو دولت میں تولنے کی قائل نہ تھی، مگر امی
بار بار مجھے کہتیں۔ ''وہ تم سے نہیں تمہاری دولت سے
پیار کرتا ہے۔'' لیکن میں نہ مانی، کاش میں مان جاتی تو
آج یوں بے چین نہ ہوتی، انکار کا سُن کر سعد نے مجھے
گھر سے بھاگنے کا مشورہ دیا، اُس دن جب میں کالج
کے بہانے گھر سے بھاگ رہی تھی تو پہلے میں نے اپنی
شادی کے لیے بنوایا ہوا سارا زیور اور امی کی الماری
کے لاکر سے دس لاکھ بھی نکال لیے، لیکن پھر میرے دل
میں خیال آیا، اگر میں یہ سب لے گئی تو امی کو اپنی بات
سچ ثابت کرنے کا موقع مل جائے گا کہ سعد مجھ سے نہیں
میری دولت سے پیار کرتا ہے۔ یا شاید میں خود ہی یہ
جاننا چاہتی تھی کہ سعد مجھ سے پیار کرتا ہے یا میری
دولت سے۔''

گھر سے بھاگ کر ہم نے مری جانے کا فیصلہ کیا۔
سعد نے کرائے پہ ایک گاڑی لے لی، مری جاتے ہوئے
راستے میں اُسی پتھر کے پاس سعد نے تھوڑی دیر کے لیے
گاڑی روکی، کیوں کہ وہ گرم ہوگئی تھی، میں اپنی محبت اور
جذبات میں مست سعد سے باتیں کرتی کرتی اُسی پتھر پہ
بیٹھ گئی اور سعد سے کہنے لگی۔

''سعد ہم مری پہنچ کر شادی کرلیں گے اور وہاں ہی
ایک چھوٹا سا گھر بنا کر رہیں گے اور کبھی واپس نہ جائیں
گے۔'' سعد نے ہنس کر کہا۔

''چھوٹا سا کیوں میری جان بڑا سا بنگلہ بنائیں
گے۔'' اُس کی بات پہ مجھے بھی ہنسی آئی اور میں بولی۔

''سرکار بڑے بنگلے بڑے پیسوں سے بنتے ہیں اور ہم
دونوں ہی کنگلے ہیں۔'' میری بات سُن کر وہ چونکا اور بولا۔

''کنگلے کیوں؟ تم اپنے گھر سے اپنے زیور اور پیسے تو
لائی ہونا؟'' اُس کی بات پہ میں اُس سے بھی زیادہ چونکی
اور میرے کانوں میں امی کے الفاظ گونجنے لگے کہ اُسے
مجھ سے نہیں میری دولت سے پیار ہے۔

''نہیں سعد میں اپنے ساتھ کچھ نہیں لائی سوائے
اپنی محبت کے۔'' میں پتھر سے اُٹھی اور چلتی ہوئی درخت
تک آئی اور نیچے کھائی میں دیکھ کر سعد سے کہا۔

''تمہاری خالی خوالی محبت کا میں کیا اچار ڈالوں گا۔''
میری بات کے جواب میں سعد کی بے زاری سی آواز آئی تو
میں نے سعد کی طرف دیکھ کر کہا۔

''تمہیں مجھ سے محبت ہے یا میری دولت سے؟'' تو وہ بے دردی سے بولا۔

''بے وقوف لڑکی خالی محبت کے راگ سے زندگی نہیں گزرتی۔ زندگی گزارنے کے لیے دولت کی ضرورت ہوتی ہے جسے تم اتنی آسانی سے لات مار آئیں۔ اب ہم واپس جائیں گے، میں تمہاری ذمے داری نہیں اُٹھا سکتا۔''

''کیا؟'' سعد کی بات پہ میں پریشان ہو کر سعد کی طرف بڑھی تھی کہ اچانک میرا پاؤں پھسلا لیکن اس سے پہلے کہ میں گرتی، میں نے سعد کا بازو پکڑ لیا، لیکن اس سے پہلے کہ میں سنبھلتی، سعد نے میری پہلی اور آخری محبت نے جس کی خاطر میں نے اپنے بھائیوں اور ماں، باپ کے پیار کو ٹھکرایا تھا، بڑی بے دردی سے میرے ہاتھ کی انگلیاں کھول کے مجھے بے آسرا چھوڑ دیا، کھائی میں گرتے ہوئے اگرچہ میری آنکھوں میں آنسو تھے مگر میں نے سعد کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ دیکھ لی تھی، پھر چھ ماہ بعد وہاں سے یہ لوگ گزرے اور میرا دوپٹا اِس لڑکی کے ہاتھ لگ گیا اور دوپٹے کے ساتھ میری بے چین روح بھی......

لائبہ کے اندر موجود ماریہ کی روح نے روتے ہوئے کہا۔

''تم ہم سے کیا چاہتی ہو؟''

بابا رحیم نے پوچھا تو ماریہ کی روح نے اُسی طرح سسک کر کہا۔

''انصاف اور اس عذاب مسلسل سے نجات۔ میرا قاتل ابھی بھی آزاد ہے۔ میں اُسے سزا دلوانا چاہتی ہوں اور ایک بار صرف ایک بار اپنے گھر والوں سے ملنا چاہتی ہوں۔'' ماریہ کی روح نے کہا تو بابا رحیم بولے۔

''بیٹا بہت بُرا ہوا تمہارے ساتھ۔ تمہیں دھوکا دیا گیا لیکن تم نے بھی تو اپنے ماں باپ اور بھائیوں کو دھوکا دیا تھا، یہ اُسی کی سزا ہے، ماں باپ سے بڑھ کر بھلا کون محبت کرسکتا ہے۔ ہم سعد کو سزا دلوانے کی کوشش کریں گے، لیکن تم اُس بچی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤ گی۔'' ماریہ کی روح نے کہا۔

''میں اسے کیوں نقصان پہنچاؤں گی۔ اسے تو اللہ نے میرے لیے وسیلہ بنایا ہے کہ میرے گھر والے میری گم نام موت سے واقف ہوسکیں۔''

تمام حقیقت جان کر ہم سب بہت دُکھی ہوئے، عثمان نے مشورہ دیا کہ پہلے ماریہ کو (جو لائبہ کے اندر ہے) اُس کے والدین کے گھر لے جایا جائے پھر اُس کے والدین کی طرف سے سعد کے خلاف اُن کی بیٹی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی جائے، باقی معاملہ اُن کے ڈی ایس پی دوست سنبھال لیں گے۔

☆......☆

جس دن ہم لائبہ کے اندر موجود ماریہ کو اُس کے گھر لے جا رہے تھے، وہ تمام راستے بہت بے چین تھی۔ جیسے ہی ہم ڈیفنس ہاؤسنگ اسکیم میں داخل ہوئے اُس کی بے چینی حد سے بڑھ گئی اور سسکیوں نے ہلکی ہلکی چیخوں کی جگہ لے لی اور پھر جب ہم اُس کی نشاندہی پہ اُس کے بنگلے میں داخل ہوئے تو اُن ہلکی ہلکی چیخوں نے بین کی شکل اختیار کرلی۔

چیخوں کی آواز سن کر گھر سے اک سوبرسی خاتون نکلیں، جنہیں دیکھ کر لائبہ (ماریہ) دونوں بازو کھول کر اُن کی طرف دوڑی اور چیختی ہوئی اُن کے سینے سے لگ گئی۔

''امی آپ سچ کہتی تھیں، سعد کو میری دولت سے پیار تھا۔ اُسے مجھ سے پیار نہیں تھا۔ امی آپ سچ کہتی تھیں۔'' زاروقطار روتے ہوئے ماریہ نے ماں کے سینے سے لگ کر کہا اور ماریہ کی ماں جو پہلے حیران تھیں، نے ماریہ کی آواز سُن کر اور اُس کے سینے سے لگنے کے بعد انہوں نے لائبہ کے گلے میں موجود گلابی شیفون کے دوپٹے کو اپنے ہاتھ سے چھوا اور بولیں۔

''ماریہ میری بچی تو کہاں چلی گئی تھی۔''

نہ تعارف کی ضرورت پیش آئی اور نہ کچھ بتانے کی ایک دل سے آہ نکلی اور دوسرے دل تک پہنچ گئی، دوسرا دل بھی ماں کا دل تھا جسے کچھ بتانے کی ضرورت پیش نہ آئی وہ جان گئی کہ اُس کی بیٹی کے ساتھ کچھ بُرا ہوا ہے۔

لائبہ اُس عورت کے گلے لگی رہی اور ماریہ اپنی ماں کو رو رو کر اپنی بے بسی کی داستان سناتی رہی اُس بے بس عورت کی حالت دیکھی نہ جاتی تھی، ماریہ کے دونوں بھائی اور بابا بھی وہاں آگئے اور اُن کو بھی تمام حالات کا علم ہوگیا۔ باپ اور بھائیوں کو رو رو کر ماریہ یقین دلاتی

رہی کہ اُس نے اُن کی عزت پہ کوئی آنچ نہیں آنے دی۔
وہ جیسے اس گھر سے گئی تھی ویسے ہی اِس دنیا سے چلی گئی۔
یوں لگ رہا تھا جیسے اُن سب کے ساتھ ساری کائنات بھی رو رہی ہو، پھر اچانک لائبہ بے ہوش ہو کر گر گئی، لیکن اُس سے پہلے ہی ماریہ نے اپنی داستانِ الم پوری سنا دی تھی۔

☆......☆

ماریہ کے بابا نے سعد کے خلاف ایف آئی آر درج کروائی اور پولیس نے اُسے گرفتار کرلیا۔ وہ جو بے فکر آزاد گھوم رہا تھا، وہ نہیں جانتا تھا کہ ایک معمولی دوپٹے نے اُس کے خلاف گواہی دی، لیکن دوپٹا معمولی کیسے ہوسکتا ہے، وہ تو بہت خاص ہوتا ہے۔ جو عورت کی عزت کی علامت ہو، وہ معمولی کیسے ہوسکتا ہے۔ وہ تو بہت خاص ہوتا ہے۔ بہت ہی خاص ہوتا ہے۔

سعد کی گرفتاری اور اقبالِ جرم کے بعد جائے وقوعہ سے معصوم ماریہ کی مسخ شدہ لاش ملی جو کھائی سے نیچے ایک درخت کی ٹہنی میں اٹکی ہوئی تھی اور پرندوں نے اُس کو نوچا ہوا تھا۔

ماریہ کی بے بس ماں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی بیٹی کو غسل دیا اور اُس کے بابا اور بھائیوں نے اُس کے جنازے کو کندھا دیا اور اُسے منوں مٹی تلے دفن کردیا۔

اگرچہ اُن کا غم تو کبھی ختم ہونے والا نہ تھا مگر اُن کا لاحاصل انتظار ضرور ختم ہوگیا اور پھر میری لائبہ بھی بالکل ٹھیک ہوگئی، اُس کے امتحان بھی آکر گزر گئے جیسے وہ ایک بڑا امتحان آکر گزر گیا تھا۔

اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب میری معصوم سی گڑیا دلہن بنی۔ اُس پہ میری نظر ہی نہ ٹھہر رہی تھی۔ رافعہ نے بڑی چالاکی اور منگنی کے بجائے نکاح کروایا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس سارے عرصے میں لائبہ نے ذرا سا بھی اعتراض نہ کیا بلکہ وہ میرے ساتھ خوشی خوشی نکاح کی تیاریاں کرتی رہی۔

نکاح والی رات جب سب مہمان سونے چلے گئے اور لائبہ اپنے کپڑے بدلنے اپنے کمرے میں آئی تو میں نے اُس سے کہا۔

''لائبہ بیٹا ایک بات پوچھوں؟'' میری بات پہ میری سجی سنوری موہنی سی بیٹی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

''میں جانتی ہوں ماما آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں، آپ جانتی ہیں ماما اُس دن وہ دوپٹا مجھے ہی کیوں ملا، ہر روز وہاں سے ہزاروں لوگ گزرتے ہوں گے، پھر میں ہی کیوں؟ کیوں کہ اُن دنوں میں بھی ماریہ کے نقشِ قدم پر چل رہی تھی، شاید وہ آپ کی دعاؤں کا اثر تھا یا پھر کوئی معجزہ کہ ماریہ کا دوپٹا مجھے ملا۔ میری وجہ سے اُس کو نجات ملی یہ سب جانتے ہیں لیکن اُس کی وجہ سے مجھے کیا ملا یہ کوئی نہیں جانتا؟ مگر میں جان گئی تھی کہ اصل محبت کیا ہوتی ہے۔ میں بھی اُن دنوں اپنی فرینڈ جویریہ کے بھائی کو پسند کرتی تھی، جو ابھی پڑھ رہا تھا اور پانچ بہنوں کی ذمہ داری تھی جس پہ لیکن پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ میں آپ سب کو شادی کے لیے مجبور کروں یعنی وہ میرے ذریعے سے اپنی ذمے داریاں پوری کرنا چاہتا تھا۔

محبت کو ترقی کی سیڑھی سمجھنے والے ضرورت مند ہوتے ہیں اور ضرورت مند کو محبت کی نہ تو ضرورت ہوتی ہے اور نہ قدر، یہ بات شاید میں کبھی نہ سمجھتی اگر ماریہ میری زندگی میں نہ آتی۔ اُس کے دوپٹے نے مجھے عزت کی قدر و قیمت اور اہمیت کا احساس دلایا اور میں نے جان لیا کہ اپنے ماں باپ کی محبت اور عزت پاؤں تلے روند کر جانے والیاں ساری زندگی محبت اور عزت کو ترستی ہیں۔''

لائبہ نے مسکرا کر میرے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا تو میں اپنی ننھی سی گڑیا کو اتنی سمجھ داری کی باتیں کرتے دیکھ کر اندر تک نہال ہوگئی اور میں نے اپنے رب سے دعا کی کہ اے میرے رب میری بیٹی کو اتنی عزت اتنی محبت دینا کہ اُس کی زندگی میں اِن دونوں کی کبھی کمی نہ ہو۔''

پھر میری بیٹی رخصت ہوکر دبئی چلی گئی۔

آج وہ ماشاء اللہ دو بچوں کی ماں ہے۔ جنید اُسے بے پناہ پیار کرتا ہے اور وہ بھی جنید سے۔

اور ہاں وہ گلابی دوپٹا لائبہ اپنے ساتھ لے گئی تھی، جس نے اُسے عزت کی اہمیت کا احساس دلایا تھا۔

☆......☆



زندگی کا معیار

عظیم الدین انصاری

اسٹیٹس کی ماری، خواری اٹھاتی ایک لڑکی کی عبرت ناک کہانی

یار میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے؟ جس شخص کو اپنی جان سے زیادہ چاہا، اُسی نے ایسا کیا۔ اُس نے ایسا کیوں کیا میرے ساتھ، زندگی میں ایسا کون سا گناہ کیا تھا میں نے، جس کی سزا مجھے اس طرح مل رہی ہے۔ کیا غریب ہونا اتنا بڑا گناہ ہے۔ کیا اس علاقے میں انسان نہیں رہتے۔ یہ سب میں اپنے دوست راحیل کو بتا رہا تھا۔

راحیل میرا بچپن کا دوست ہے اور ہمارا رشتہ ایک فیملی کی طرح ہے۔ اُس کی بیوی کو میں بچپن سے جانتا ہوں۔ وہ راحیل کی کزن ہے اور میں انہیں باجی کہتا ہوں۔ میں جذبات میں اتنا اونچا بول رہا تھا کہ میری آواز سن کر وہ بھی کمرے میں آ گئیں۔

انہوں نے میری بات سُن لی تھی اور سن کر مجھے کہا کہ ''عمیر'' تم ایسا مت سوچو۔ اُس نے جو کیا تمہارے ساتھ، اُسے اُس کے کیے کی سزا اللہ دے گا۔ وہ کون ہوتی ہے تم کو کسی گناہ کی سزا دینے والی اور جہاں تک بات علاقے کی ہے تو ضروری نہیں کہ ہم غریب علاقے میں رہتے ہیں تو یہاں انسان کے بھیس میں جانور ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اَپر لیول کے لوگ اپنے چہرے پر انسانوں کا نقاب لگا کے گھومتے ہیں۔

باجی مجھے سمجھائے جا رہی تھیں اور میں خاموشی سے بیٹھا اُن کی باتیں سُن رہا تھا۔ جبکہ راحیل مجھ پر ہنس رہا تھا۔ باجی کی بات ختم ہوتے ہی راحیل نے کہا۔

''عمیر کسی ایک کے جانے سے زندگی ختم نہیں ہو جاتی، اپنی زندگی میں آگے بڑھو۔ ماشاءاللہ ہینڈسم ہو، برسر روزگار ہو، اپنا گھر ہے، بس اللہ کا شکر ادا کرو۔ اُس نے جو تمہیں دیا اس پر اکتفا کرو اور جو نہیں دیا اُس کی امید رکھو، کیوں کہ امید پر دنیا قائم ہے۔''

میں ان لوگوں کی باتیں سنتے سنتے رو پڑا اور باجی نے قریب آ کر میرے آنسو صاف کیے اور راحیل نے بھی اُن سے کہا کہ سمجھاؤ اپنے بھائی کو، میں بچپن سے آج تک اس کو سمجھ نہیں پایا، شاید تم سمجھ سکو۔

میری اُس سے ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی تھی وہ ہمارا پہلا دن تھا، جب وہ میرے پاس آئی تھی اور مجھ سے پین مانگا تھا، جب کہ اُس کا پین اُس کے بالوں میں لگا ہوا تھا، شاید اُسے یاد نہ رہا ہو اور میں نے جھٹ اپنے بیگ سے پین نکال کر اُسے دیا تھا۔ اُس نے شکریہ کہہ کر تھوڑی دیر میں دینے کا وعدہ کر کے سامنے پڑی بینچ پر بیٹھ گئی تھی اور تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تھی اور مجھے پین دے کر واپس چلی گئی۔

مجھے کوئی فیلنگ نہیں تھی، جیسا کہ فلموں یا ڈراموں میں ہوتا ہے کہ پہلی نظر میں محبت ہو گئی۔ ایسا میرے ساتھ کچھ بھی نہیں تھا، کیوں کہ مجھے پڑھ لکھ کر اپنے ماں باپ کی

خواہش پوری کرنا تھی، اس لیے کبھی کسی لڑکی کے چکر میں نہیں پڑا۔ جب وہ پین دے کر چلی گئی تب راحیل نے کہا کہ یار بڑے خوش قسمت ہو تم، اتنی خوب صورت لڑکی نے تم سے پین مانگا، جبکہ اُس کے پاس بھی تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے اور میں مسکراتا ہوا راحیل کے ساتھ کیفے ٹیریا چلتے ہوئے کہنے لگا۔

''یہ سب تمہاری سوچ ہے، اُسے ضرورت تھی اور یاد نہیں رہا ہوگا، قریب ہم دونوں ہی کھڑے تھے اور ہم دونوں کا ایک ہی بیگ ہے۔ جس میں ہم دونوں کی کتابیں ہیں، جو کہ میرے پاس تھا اور اُسے لگا کہ میرے

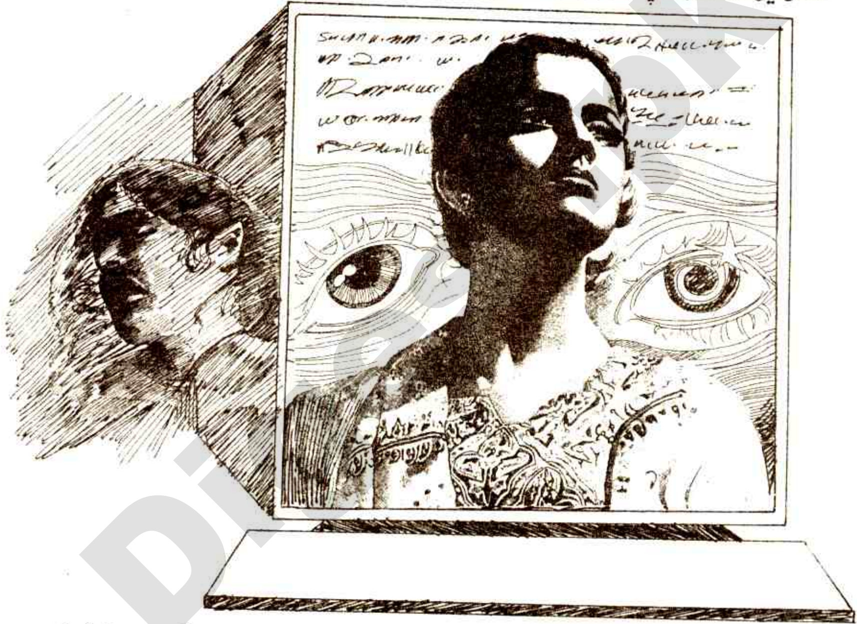
پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ ہی لڑکی میرا نام پکارے میرے پیچھے آ رہی تھی۔ میں نے رُک کر پیچھے دیکھا اور کہا۔

''جی فرمایئے۔'' اُس نے کہا۔

''چلیں کیفے ٹیریا چلتے ہیں۔ مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''Ok'' اور میں اس کے ساتھ کیفے ٹیریا آ گیا۔ وہاں اُس نے چائے کا آرڈر دیا اور بات یوں شروع کی۔

''میرا نام مہرین ہے اور ہم ایک ہی ڈپارٹ میں ہوتے ہوئے ایک دوسرے سے بات تک نہیں کر سکے،



پاس ہی پین ہوگا۔ اس لیے مانگا اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔''

راحیل اور میں ایک ہی کلاس میں تھے، جبکہ وہ الگ کلاس میں تھی اور ہمارا ڈپارٹمنٹ بھی ایک ہی تھا بس کلاس کا فرق تھا۔ تقریباً تین مہینے ہی گزرے ہوں گے، اُس دن میں اکیلا یونیورسٹی گیا تھا، کیوں کہ راحیل کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اس لیے وہ جا نہیں سکا تھا۔

صبح کا وقت تھا میں کلاس کی طرف بڑھ رہا تھا اچانک پیچھے سے آواز آئی۔ ''عمیر، عمیر بات سنیں۔'' میں نے

خیر اُس دن سر نے کلاس میں آ کر آپ کا ذکر کیا کہ وہ بہت ذہین لڑکا ہے، عمیر نام ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو مجھے تشویش ہوئی کہ پتا کروں کہ یہ کون ہے اور جب پتا کیا تو وہ آپ تھے۔ میں نہیں جانتی کہ مجھے کیا ہوا ہے، بس آپ کے بارے میں کچھ پتا کرنا ہے۔ آپ مجھے اپنی فیملی کے بارے میں بتائیں۔''

میں نے کہا۔ ''ہم چار بہن بھائی ہیں۔ ایک بھائی اور ایک بہن مجھ سے بڑی ہیں، دونوں شادی شدہ ہیں

اور مجھ سے چھوٹی ایک بہن ہے، اُس کی شادی میں ابھی دو سال ہیں۔اس کے علاوہ امی ابو اور بس۔'' میری بات سن کر اُس نے اپنے ہونٹوں کو بند کیے ہی ہم...... کی آواز نکالی جس کا مطلب اچھا کا تھا، پھر اُس نے مجھے اپنا سیل نمبر دیا اور میرا سیل نمبر لے کر چلی گئی۔ میں تھوڑی دیر وہیں بیٹھا رہا اور پھر اُٹھ کر کاؤنٹر پر پیسے دینے گیا تو پتا چلا کہ بل وہ ادا کر چکی۔ خیر اگلے دن راحیل بھی میرے ساتھ تھا۔ جب بریک میں ہم چائے پی رہے تھے تب وہ آئی اور سلام کیا، پھر کہنے لگی۔

آپ نے مجھے کال نہیں کی۔ میں نے آپ کے فون بہت انتظار کیا۔

میں نے کہا۔'' مجھے یاد ہی نہیں رہا، آپ کر لیتیں۔'' اور وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ تب راحیل نے مجھے چھیڑا۔

''اوئے ہوئے میں ایک دن نہیں آیا اور بات یہاں تک آ گئی۔'' میں نے راحیل کو سب کچھ بتا دیا۔ راحیل نے منع کیا کہ مت کرنا اُسے کال، میں نے کہا ہاں نہیں کروں گا۔

رات کے وقت میں راحیل کے گھر سے واپس آ رہا تھا، تب اچانک مہرین کا خیال آیا اور میں نے گھر جا کر اُسے کال کرنے کا سوچا۔ گھر پہنچ کر میں نے اُسے کال کی اُس نے پہلی ہی بیپ پر کال رسیو کر لی، شاید میری کال کا ہی انتظار کر رہی تھی، پھر ہمارا روز کا معمول کا ہو گیا، کبھی میسج اور کبھی کال پر بات کرنا۔ مجھے پتا ہی نہیں چلا اور میں اُس کی محبت میں گرفتار ہو گیا پھر ایک دن کال پر بات کرتے ہوئے میں نے اُسے کہہ دیا کہ مجھے محبت ہو گئی اور وہ حیران ہوتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ''کون ہے وہ۔''

میں نے کہا۔ ''جس سے اس وقت بات کر رہا ہوں۔'' وہ زور زور سے ہنسی اور کہنے لگی۔

''عمیر، مجھے بھی۔'' اور لائن کاٹ دی۔ میں بہت خوش تھا۔

اگلے دن یونیورسٹی میں، میں اس کے پاس گیا اور کہا کہ آپ نے لائن کیوں کاٹی تھی۔ اُس نے شرماتے ہوئے نیچے منہ کیا اور کہا ایسے ہی، پھر ہماری محبت چلتی رہی۔ راحیل سب جانتا تھا اور مجھے سمجھاتا تھا کہ سب فضول ہے ہم یہاں پڑھنے آئے ہیں محبتیں کرنے نہیں، مگر تمہاری مرضی ہے آگے کا انجام بہت بُرا ہو گا۔ اسی طرح دو سال گزر گئے اور پتا بھی نہیں چلا۔ میں اور مہرین ایک دوسرے کے پیار میں پاگل ہو گئے تھے۔ یونیورسٹی سے فارغ ہو کر مجھے جاب تلاش کرنا تھی، جبکہ راحیل کو اپنے ابو کا کاروبار سنبھالنا تھا جو کہ کپڑے بنانے کا کاروبار تھا، میں جاب کی تلاش میں گھومتا رہا اور اسی دوران راحیل کی شادی اُس کی کزن شمائلہ سے ہو گئی۔ شمائلہ کو میں بچپن سے جانتا تھا اور وہ مجھ سے دو سال بڑی تھی۔ جب تک ان کی شادی نہیں ہوئی تھی، میں اس کا نام لیتا تھا اور شادی کے بعد اُسے بھابی کہنا مجھے عجیب سا لگ رہا تھا اس لیے اُسے باجی کہنے لگا۔ باجی بھی کہتی تھیں اب تم بھی شادی کر لو تمہارے دوست کی تو ہو گئی، تم کب تک ایسے ہی رہو گے۔ میں نے کہا کہ باجی بس دعا کریں جلد سے جلد اچھی جاب مل جائے اور پھر میں بھی مہرین سے شادی کر لوں گا۔ جاب ڈھونڈنا کتنا مشکل ہوتا ہے یہ مجھے جب پتا چلا جب میں جاب کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ خیر اللہ اللہ کر کے جاب بھی مل گئی، جبکہ میری کال اور میسج پر مہرین سے بات ہنوز برقرار تھی، جاب ملنے کے بعد میں مصروف ہو گیا۔ مہرین سے بات بس رات میں ہی ہوتی تھی۔

ایک دن بات کرتے ہوئے میں نے مہرین سے کہا کہ بس تھوڑے دن اور صبر کرو میں بہت جلد امی کو تمہارے گھر بھیج رہا ہوں۔ میرا یہ کہنا تھا اور مہرین کو غصہ آ گیا۔

''تمہارا دماغ درست ہے میں تم سے شادی کروں گی؟'' میں حیرت میں آ گیا اور کہا۔ کیوں مہرین کیا ہوا۔

اُس نے کہا۔ ''تمہارے اور ہمارے اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تم پڑھے لکھے ہو، ذہین ہو، مجھے تم پسند بھی ہو مگر میں تم سے شادی نہیں کر سکتی، کیوں کہ تم جس علاقے میں رہتے ہوئے وہ علاقہ میرے قابل نہیں۔ ایسا لگتا ہے کچی بستی میں رہتے ہو اور میں عمر بھر تمہارے ساتھ اس کچی بستی میں نہیں رہ سکتی۔ اگر مجھ سے شادی کرنی ہے تو میرے علاقے میں اپنا گھر یا فلیٹ خریدو تب تو ٹھیک ہے ورنہ مجھے بھول جاؤ۔

میں اس کی بات سنتے سنتے رو پڑا اور یہ کہہ کر، اُس نے لائن کاٹ دی تھی، میں نے پھر کال کی تو اُس نے

ریسیو نہیں کیا ور جب میں نے اُسے میسج کیا اُس نے جواب نہیں دیا۔ میں اسے میسج پر میسج کرتا رہا، کال پر کال، مگر سب بے سود۔ اس ٹینشن میں ساری رات میں سو نہیں سکا۔ اگلے دن آفس گیا۔ آفس سے واپس آیا تو راحیل کے گھر گیا، تب میں نے راحیل کو یہ سب بات بتائی۔ راحیل نے کہا۔

''میں نے پہلے ہی کہا تھا۔'' تب باجی بھی ہماری باتیں سننے آ گئی تھیں اور مجھے سمجھانے لگیں کہ اسے محبت تھی ہی نہیں، وہ تو ٹائم پاس کر رہی تھی۔

باجی کی باتوں کا اثر مجھ پر یوں ہوا کہ میں نے حالات اللہ پر چھوڑ دیے۔ بس دعا کرتا رہا کہ اللہ جو کرے میرے حق میں بہتر کرے۔ ہر روز رات کو سونے سے پہلے دو آنسو تکیے کو بھگوتے اور میں سو جاتا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا سب کچھ لٹ گیا ہو، برباد ہو گیا ہو۔ شیو بنانا، بال کٹوانا، نئے کپڑے پہننا، کچھ بھی دل نہیں کرتا تھا۔ میری حالت مجنوں کے جیسی ہو گئی تھی۔ ہر وقت اُسے ہی سوچنا، اُس کی باتیں سوچنا۔ جب یونیورسٹی کے اوائل دن کا سوچتا تو چہرے پر مسکان آ جاتی اور جب مہرین کے وہ آخری الفاظ میرے ذہن میں گونجتے تو آنکھ بھر آتی۔ سلسلہ ایسے ہی چلتا گیا۔ چھ ماہ گزر گئے، میں پھر بھی مہرین کو کال کرتا، مگر وہ ریسیو نہیں کرتی تھی۔ میں نے اپنا سب کچھ اُسے ہی مان لیا تھا۔ محبت کے بارے میں سنا تھا کہ محبت درد دیتی ہے مگر اتنا درد دیتی ہے یہ اب محسوس کیا تھا۔

ایک دن آفس سے واپسی پر میں راحیل کے گھر گیا تو باجی میری منتظر تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی میری طرف خوشی سے لپکیں اور نہ سلام نہ دعا ڈائریکٹ یہی کہا۔

''عمیر'' تمہارے رشتے کی بات کی ہے میں نے، لڑکی اچھی ہے، سلجھی ہوئی ہے، تمیزدار ہے، خوب صورت ہے، پتلی دبلی، نازک سی اور گوری ہے، سب سے بڑھ کر یہ ہے وہ ہمارے ہی علاقے کی ہے، تعلیم اس کی انٹر تک ہے، مگر سگھڑ اور باشعار ہے۔ میں نے کہا۔

''رہنے دیں باجی مجھے شادی نہیں کرنی۔''

تب باجی نے کہا دیکھو ''عمیر'' میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہتی ہوں کہ کسی کے جانے سے زندگی ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کا انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ آگے کی طرف بڑھو۔ مہرین تمہارے معیار کی نہیں ہے اور جس لڑکی کا میں ذکر کر رہی ہوں، وہ راحیل کے ایک دوست کی بہن ہے۔ اس کا نام سائرہ ہے۔ تم اُسے ایک بار دیکھ لو، مل لو پھر فیصلہ کرنا۔'' میں نے باجی کو صاف انکار کر دیا، اتنے میں راحیل بھی باہر سے آ گیا اور آتے ہی مجھے گلے سے لگا کر مبارکباد دی۔ میں ان دونوں کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا کہ کتنا پیار کرتے ہیں یہ مجھ سے، جبکہ میرا ان سے خون کا بھی رشتہ نہیں، بس بچپن کی دوستی ہے۔ تب راحیل کو باجی نے سب بتایا اور راحیل نے مجھے اپنی دوستی کی قسم دی کہ یار تم سائرہ سے شادی کر لو، وہ تمہارا بہت خیال رکھے گی۔ کل اُس کی امی ہمارے گھر آئیں گی، اس لیے تم آفس سے واپسی پر کل پھر آنا اور ہاں ذرا اپنا حلیہ بھی درست کر لینا۔

میں نے اُس کی دوستی کی قسم پر ہاں کر دی۔ اگلے دن میں گیا تو سائرہ کی امی اور بھائی آئے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ سرفراز بھائی مجھ سے بہت گرم جوشی سے ملے۔ انہوں نے مجھے پسند کر لیا تھا۔ دو تین دن بعد باجی نے میری امی سے بات کی۔ میری امی بھی مان گئیں۔ مجھ سے میری رضامندی پوچھی گئی تو میں نے کہہ دیا جو آپ کی مرضی۔ اس طرح وہی فارملیٹیز پوری ہوئیں۔ میری امی سائرہ کے گھر گئیں اور یوں ہمارا رشتہ پکا ہو گیا۔ ایک سال بعد میری اور سائرہ کی شادی تھی۔

راحیل نے مجھے اور سائرہ کو شادی سے پہلے ایک بار ملانے کا پروگرام بھی ترتیب دے دیا۔ اس طرح سائرہ اپنی امی کے ساتھ راحیل کے گھر آئی اور میں بھی گیا۔ الگ کمرے میں ہم دونوں کو ایک ساتھ چھوڑ دیا گیا۔ سائرہ واقعی بہت خوب صورت تھی، شرمیلی سی، نازک سی۔ میں اور سائرہ الگ الگ صوفے پر بیٹھے تھے، کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا بات کروں، بلکہ مجھے راحیل پر غصہ آ رہا تھا کہ کیا ضرورت تھی یہ سب کرنے کی۔ جب میں راضی ہوں، سائرہ راضی ہے تو کیوں ملوانے کا سوچا۔ خیر میں نے سائرہ سے رسمی علیک سلیک کے بعد بات شروع کی اور اپنے اور مہرین کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ یہ بھی کہ میں راضی نہیں تھا، مجھے راحیل نے اپنی دوستی کی قسم

دے کر راضی کیا۔ میں نے مزید کہا کہ مہرین آپ کے مقابلے میں کم خوب صورت ہے، مگر میں اُسے بھلا نہیں پارہا۔ سائرہ نے میری ساری بات سُن کر کہا کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ اگر آپ کا جوڑا مہرین سے ہے تو وہ آپ کو ضرور ملے گی آپ چاہیں تو انکار کر سکتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو، لہجے میں نرمی اور آواز میں رونا سا لگ رہا تھا اور میں نے کہا کہ میں راضی ہوں۔

اس طرح وہ دن بھی قریب آ گیا جس کا انتظار ہر لڑکے لڑکی کو ہوتا ہے، مگر مجھے اس پل کا انتظار نہیں تھا۔ نصیب جہاں لے کر جارہا تھا میں چلتا گیا اور سائرہ میری بیوی بن کر میرے گھر آ گئی۔ اس رات بھی میں بہت رویا تھا۔ مہرین کی یاد ستاتی رہی۔ اُس کی بے وفائی اُڑاتی رہی، مگر میں نے سائرہ سے نا انصافی نہیں کی۔ چند ماہ بعد سائرہ نے خوش خبری دی اور میں بہت خوش ہوا۔ سلسلہ چلتا رہا اور میں ایک بچے کا باپ بن گیا۔

میرا بیٹا بہت خوب صورت تھا، بالکل اپنی ماں سائرہ پر گیا تھا۔ وہی ناک نقوش، بڑی بڑی آنکھیں، گورا رنگ، میری امی، سائرہ، بھابھی، اور بہنوں کی مشاورت سے اس کا نام زین رکھا گیا تھا۔ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔

میرا ملنا راحیل سے ویسا ہی تھا جیسے پہلے تھا اور مجھے باجی اور راحیل پر بہت پیار بھی آتا تھا کہ ان لوگوں نے مجھے مصیبت سے نکالا تھا۔ مکمل طور پر تو نہیں، مگر کافی حد تک میں مہرین کو بھول گیا تھا۔ زین اسکول جانے کے قابل ہوگیا تھا۔ ایک روز صبح میں زین کو اسکول چھوڑ کر آفس جارہا تھا تو راستے میں مجھے مہرین نظر آئی جو بلیک عبایہ میں تھی۔ اس کا رنگ بہت کالا ہوگیا تھا اور آنکھیں اندر دھنسی ہوئی۔ لگ رہا تھا کہ برسوں سے بیمار ہے۔ میں اسے کیسے بھول سکتا تھا، فوراً بائک اُس کے پاس لے جا کر روکی اور سلام کیا۔ اُس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ میرے سلام کا جواب تو دیا میں نے کہا۔

''کیسی ہو اور صبح صبح ہماری کچی آبادی والے علاقے کے مین روڈ پر کس کا انتظار کر رہی ہو۔'' اُس نے کہا۔

''بس کا انتظار کر رہی ہو۔ ایک پرائیویٹ کمپنی میں جاب کر رہی ہوں اور یہیں سامنے والی گلی کے پیچھے کرائے پر رہتی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''آؤ میں چھوڑ دوں، کیوں کہ میں اسی جگہ سے گزرتا ہوا جاتا ہوں۔''

وہ میرے ساتھ بائک پر بیٹھ گئی۔ میں اُسے چھوڑتا ہوا آفس چلا گیا۔ پورا دن اضطراب میں رہا کہ مہرین یہاں رہتی ہے؟ میں نے فیصلہ کیا کہ آفس سے واپسی پر آج اُس کے گھر جاؤں گا اور پتا کروں گا کہ کیا ہوا ہے اُس کے ساتھ۔ آفس سے آف کرنے کے بعد میں مہرین کے گھر گیا وہ تو گھر پر نہیں تھی۔ اُس کی امی تھیں۔ میں نے اپنے بارے میں بتایا تو وہ مجھے اندر لے آئیں، پھر مجھے بتایا کہ میرے بیٹوں نے اپنی اپنی پسند کی شادی کی اور الگ ہوگئے۔ مہرین کے ابو کا کاروبار مکمل طور پر ختم ہوگیا، ان کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ انتقال کر گئے۔ میرے بیٹوں نے گھر بیچ کر حصّہ مانگا اور بہت لڑائی جھگڑے کے بعد گھر بک گیا، اب ہم لوگ یہاں کرائے کے گھر میں رہ رہے ہیں اور مہرین جاب کرتی ہے میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ اُس کے جہاں سے بھی رشتے آئے تھے، مہریں نے خود منع کیا تھا کہ لڑکا امیر ہو اور اب کوئی رشتہ بھی نہیں آتا۔ یہ سب سُن کر میں رو دیا اور مہرین کی باتیں یاد آنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اجازت چاہی اور اپنے گھر آ گیا جہاں سائرہ اور زین میرا انتظار کرتے ہیں۔

میرا یہ سب لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ خدارا اسٹیٹس کے چکر میں مت پڑو، کیوں کہ وقت ایک جیسا نہیں رہتا۔ کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی رات بڑی۔ مجھے میرے دوست راحیل نے زندگی کی طرف راغب کیا تھا، اس کے ساتھ باجی نے بھی میرا ساتھ دیا تھا، مگر کیا ہر انسان راحیل اور باجی کی طرح ہوتا ہے؟

میری دعا ہے کہ اللہ سب کو راحیل جیسا دوست دے، جو صرف میرے اکیلے پن کی وجہ سے میرے ساتھ تعلیم حاصل کرتا رہا، سچ ہے اچھا دوست بھی کسی نعمت سے کم نہیں۔

☆......☆

فیصلے دِل کے

نزہت جبین ضیاء

موبائل کی الجھی راہوں میں، ایک سلجھی ہوئی تحریر......





''ممـا! آپ کو اپنا وعدہ تو یاد ہے نا'' توس پر مکھن لگاتے لگاتے ٹیپو نے مجھے مخاطب کیا۔

''ہاں مما! اس بار، ہمیں موبائل گفٹ کیجیے گا'' خوشی نے بھی دودھ کا گلاس اُٹھاتے ہوئے ٹیپو کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''او کے...... او کے...... بچو! مجھے یاد ہے اپنا وعدہ......! تم لوگ فٹافٹ ناشتا کرو۔ گاڑی آنے والی ہے'' میں نے چائے کا کپ خالی کر کے میز پر رکھتے ہوئے قدرے مسکرا کر کہا، تو دونوں بچے جلدی جلدی دودھ پینے لگے، تب ہی باہر بچوں کی گاڑی نے ہارن دیا۔

''او کے مما! اللہ حافظ'' بچوں نے گلاس ٹیبل پر رکھ کر بیگ اٹھا لیے۔

''اللہ حافظ، دُعا پڑھ کر جانا'' حسبِ معمول میں نے یاد دلایا۔ بچے با آواز بلند دعا پڑھ کر باہر کی طرف چل دیے۔

بچوں کے جاتے ہی میں نے چادر اوڑھی، پرس اُٹھا کر کاندھے پر ڈالا، گھر لاک کر کے چابی پڑوس میں رہنے والی سلمٰی خالہ کو دی اور تیز تیز قدم اٹھاتی بس اسٹاپ کی طرف چل دی۔ آج ضرور اسکول سے واپسی پر موبائل شاپ جاؤں گی۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

میری شادی سترہ سال پہلے یاسر سے ہوئی تھی۔ میرے ابو ایک سرکاری دفتر میں ملازم تھے، وہیں پر یاسر اکاؤنٹنٹ تھے۔ یاسر شریف اور عزت کرنے والے انسان تھے۔ وہ اپنی ضعیف والدہ کے ساتھ رہتے تھے جو بلڈ پریشر کی مریضہ تھیں۔ اب وہ چاہتی تھیں کہ یاسر شادی کر لیں تاکہ انہیں آرام مل جائے۔ انہوں نے ایک بار ابو سے میرے لیے یاسر کے رشتے کی بابت بات بھی کی تھی۔ ابو کو اس سے بہتر اور کیا چاہیے تھا۔ یاسر ایک سلجھے ہوئے ذہن کے مالک اور اچھی صورت و شکل کے شریف بندے تھے اور میں بھی ایم۔ ایس۔ سی کر کے مناسب رشتے کی منتظر تھی اور پھر بہت جلد میں یاسر کی دُلہن بن کر اُن کے چھوٹے سے گھر آ گئی۔

یاسر اور اُن کی والدہ بہت دین دار لوگ تھے۔ میرے میکے کا ماحول بھی اسی طرح کا تھا۔ اس لیے مجھے یہاں آ کر ذرا بھی پریشانی نہ ہوئی۔ ہمارا گھر جنت کا نمونہ تھا۔ اپنے معمول کے مطابق دن گزرتے رہے۔ شادی کے ایک سال بعد ہی خوش بخت کی پیدائش ہوئی اور پھر ایک سال بعد ٹیپو بھی اس جہان فانی میں آ گیا۔ اس عرصے میں یاسر کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔

ہم لوگ بہت امیرانہ نہ سہی پھر بھی اچھی بھلی خوش گوار زندگی گزار رہے تھے۔ بچے بڑے ہونے لگے تو میں نے بچوں کو اسکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ

دینی تعلیم اور قرآن پاک پڑھانا شروع کر دیا۔ ہمارے گھر کا ماحول بہت اچھا تھا۔ جب ننھی خوشی دوپٹا لپیٹے میرے ساتھ نماز پڑھتی اور تین سالہ ٹیپو سفید شلوار قمیض پہنے، سر پر ننھی سی ٹوپی لگائے یاسر کے ساتھ مسجد نماز پڑھنے کے لیے جاتا تو ہر کوئی اسے پیار کرتا اور دعائیں دیتا۔

یاسر کی دلی خواہش تھی کہ خوشی اور ٹیپو دین کی صحیح سمجھ بوجھ کے ساتھ مکمل اور مثالی انسان بنیں اور وہ اس بات کا ذکر اکثر مجھ سے کرتے اور کہتے کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے بچے مکمل اور سچے مسلمان بنیں اور میں ان کی اس بات پر آمین ثم آمین کہتی تھی۔

یاسر روز رات کو سونے سے پہلے بچوں کی دینی تربیت کرتے اور انہیں مختلف دعائیں، سورتیں اور اسلامی واقعات سُناتے تھے۔ بچے دلچسپی سے سُنتے بھی اور یاد بھی کر لیتے۔ اس کے علاوہ یاسر بچوں کی تفریح کا بھی بڑا دھیان رکھتے تھے۔ ہر چھٹی والے دن ہم بچوں کو لے کر کبھی کلفٹن تو کبھی سندباد اور الہ دین پارک لے جاتے۔ سی ویو پر بچوں کے ساتھ بھاگتے دوڑتے، یاسر خود بھی بچے بن جاتے اور میں بھی ان کا پورا پورا ساتھ دیتی تھی۔ ہماری فیملی ہر لحاظ سے مکمل اور آئیڈیل فیملی تھی۔ کہتے ہیں کہ خوشی کا وقت بہت مختصر ہوتا ہے تو ایسا ہی ہمارے ساتھ بھی ہوا، دن ہوا کی طرح اُڑ گئے۔

ایک رات حسبِ معمول یاسر بچوں کے ساتھ دعائیں پڑھ کر خوش گپیاں کر کے سوئے۔ اس رات یاسر نے مجھ سے بہت ساری باتیں کیں۔ میرے بارے میں، بچوں کی تعلیم کے بارے میں۔ مستقبل کے سہانے اور حسین سپنے بنتے بنتے یاسر کہیں کھو سے جاتے، پھر میری آواز پر چونک کر دوبارہ گویا ہوتے اور پھر ہم لوگ سو گئے۔

حسبِ معمول فجر کے وقت سب سے پہلے میں اُٹھی اور میں نے الارم بند کیا، پھر میں نے وضو کر کے یاسر کو جگایا، لیکن وہ ہلے تک نہیں۔ یاسر کا بے جان وجود دیکھ کر میں تیورا کر گر پڑی۔ وہ رات کے کسی پہر ہم سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے تھے۔ وہ ایسی جگہ جا چکے تھے کہ جہاں سے میری اور بچوں کی آہیں،



سسکیاں اور تڑپنا بھی انہیں واپس نہیں لا سکتا تھا۔ ہماری ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھنے والے یاسر آج بالکل خاموش تھے۔ ایک جامد اور مطمئن مسکراہٹ ان کے لبوں پر تھی۔ شاید وہ مجھے اس قابل سمجھتے تھے کہ میں بچوں کو ان کی خواہش کے مطابق تربیت دے سکوں گی جب ہی تو وہ اس قدر مطمئن تھے۔

اتنا بڑا صدمہ برداشت کرنے میرے لیے آسان نہ تھا۔ میں تو بالکل بکھر کر رہ گئی تھی۔ مجھے تو خود کو سمیٹنا مشکل ہی نہیں بلکہ اب تو ناممکن لگ رہا تھا۔ میں تو اپنے ہوش و حواس کھونے لگی تھی۔ اور شاید کھو بھی دیتی، تب ہی خوشی اور ٹیپو میرے سامنے آ گئے اور میں نے بہ مشکل خود کو سنبھالا۔ میرے سامنے صرف اور صرف یاسر کی نشانیاں میرے یہ بچے تھے۔ اُن کا مستقبل تھا۔ میں نے اپنا ہارا ہوا حوصلہ اور ٹوٹی ہوئی ہمتوں کو مجتمع کر کے خود کو آنے والے وقت کے لیے تیار کیا۔ نہ جانے اتنا حوصلہ

اور ہمت مجھ جیسی عورت میں کہاں سے آ گئی تھی۔ ابو اور امی نے اپنے ساتھ اپنے گھر لے جانے کے لیے کہا، لیکن میں نے صاف منع کر دیا۔ یاسر ایک خود دار انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے کسی قابل سمجھ کر ہی اتنی بڑی آزمائش میں ڈالا تھا اور اب مجھے ہر صورت اس آزمائشوں کو احسن طریقے سے نبھانا تھا۔

میں خود بھی ایک جوان اور باہمت و باحوصلہ خوب صورت عورت تھی اور اب یہ دو معصوم بچے جنہیں ماں اور باپ بن کر پالنا میری ذمے داری تھی۔ کئی لوگوں نے مجھے عقد ثانی کا بھی مشورہ دیا لیکن میرے لیے صرف اور صرف یاسر کی خواہشات اور بچوں کا بہتر مستقبل معنی رکھتا تھا، لہٰذا آنے والے وقت کے لیے میں خود کو بہتر طور پر تیار کر چکی تھی۔

یاسر کے دفتر سے ملنے والی رقم میں نے بینک میں فکس کروا دی، جہاں سے ہر ماہ مجھے ایک معقول رقم مل جاتی تھی۔ گھر میرا ذاتی تھا، اس لیے رہائش کے حوالے سے کوئی پریشانی مجھے نہیں تھی۔ عدت کے ختم ہوتے ہی میں نے اسکول میں جاب کی کوشش شروع کر دی۔ جلد ہی ایک اچھے اسکول میں مجھے معقول سیلری کی جاب مل گئی۔ خوشی اور ٹیپو کو میں نے شہر کے بہترین اسکول میں ایڈمیشن دلوا دیا۔ میری تنخواہ سے بچوں کی فیس اور گاڑی کا خرچہ اور بچوں کی پڑھائی کے اخراجات نکل جاتے تھے، جبکہ آنے والی رقم سے گھر کے دیگر اخراجات چلتے تھے۔ وقت کے ساتھ میں نے کچھ قرضہ لے کر اوپر کا پورشن بنوا دیا تھا اور اوپر ایک فیملی بطور کرایہ دار رہنے لگی تھی۔ یوں آمدنی مزید بڑھ گئی تھی اور آنے والے کرایہ کی رقم میں سے آدھی رقم قرضہ میں چلی جاتی تھی۔

میں اپنے بچوں کو دنیاوی اور دینی تعلیم دونوں کے لیے برابر برابر ٹائم دیتی تھی۔ ہمارے یہاں رمضان المبارک میں ظہر کی نماز کے بعد ہم لوگ قرآن پاک کی تلاوت کی سی ڈیز سنتے اور اپنی غلطیاں سُدھارتے اور اپنے تلفظ مزید بہتر بناتے تھے۔

اسی طرح سال پہ سال گزرتے رہے، گو کہ پچھلے کچھ سال میرے لیے بے حد کٹھن اور صبر آزما تھے۔ میں ساری ساری رات جاگ کر خدا کے حضور رو رو کر اپنے اور بچوں کے لیے دعائیں مانگتی۔ الحمدللہ آج میرے بچے جوانی کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔ میری تربیت اور کوششیں رائیگاں نہیں گئیں۔ میرے بچوں کی تعریف خاندان، محلے، اسکول غرض یہ کہ ہر جگہ کی جاتی ہے اور ان کی تعلیم و تربیت کی مثالیں دی جاتی ہیں۔

عاجزی، انکساری، محبت، شائستگی، میرے بچوں کی شخصیت کا خاصہ تھیں۔ تب ہی تو ہر کوئی انہیں رشک کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور جب وہ میری تعریفیں کرتا تو میری آنکھیں شکر سے بھیگ جاتیں اور میں خدا کے حضور جھک کر شکرانے ادا کرتی کہ اُس نے مجھے جس امتحان میں ڈالا۔ الحمدللہ اس میں کامیاب بھی رہی اور نمایاں پوزیشن بھی لی۔

خوشی میٹرک میں تھی اور ٹیپو نائنتھ کلاس میں تھا۔ میرے بچے جس اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ وہاں کے بچے لمبی لمبی گاڑیوں میں آتے تھے۔ زیادہ تر بچے امیر کبیر فیملیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ بہت سے بچے پیسے کی زیادتی اور بے تحاشا آزادی سے بگڑ بھی چکے تھے۔

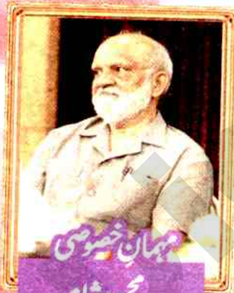
فورتھ اور ففتھ کلاس کے بچے آزادی سے موبائل استعمال کرتے تھے۔ پچھلے کچھ دنوں سے خوشی اور ٹیپو بھی موبائل فون لینے کی ضد کر رہے تھے۔ شہر کے حالات بھی آج کل کچھ زیادہ ہی خراب رہنے لگے تھے۔ اچانک ہی کہیں فائرنگ ہو جاتی تو کہیں بم بلاسٹ ہو جاتے اور بچوں کی گاڑی راستے میں پھنس جاتی۔ ان حالات میں، میں بہت پریشان ہو جاتی تھی۔ اس لیے وقت اور حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے سوچا کہ اس دفعہ ان کی سالگرہ پر دونوں بچوں کو موبائل گفٹ کر دوں گی، گو کہ میں سالگرہ اہتمام سے نہیں مناتی تھی لیکن...... بچوں کو گفٹ ضرور دے دیا کرتی تھی۔ دونوں کی سالگرہ مئی میں آتی تھی، لیکن ایک ہفتہ باقی تھا ابھی دونوں کی سالگرہ میں۔ آج میری سیلری ملنے والی تھی۔ اس لیے آج ہی میں نے موبائل لینے کا ارادہ کر لیا تھا۔ ویسے بھی موجودہ حالات میں موبائل ایک اہم ضرورت بن گیا تھا۔ بچے کہیں بھی ہوں ان ٹچ رہتے ہیں، اس لیے میں نے بھی اُن کی اس ضرورت کو محسوس کیا تھا۔

27ویں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ تقریب

2014ء



مدیرِ اعلیٰ منزہ سہام مرزا، سید شاہد حسن، مہتاب اکبر راشدی اور محمود شام اسٹیج پر



مہمانِ خصوصی
محمود شام
سینئر صحافی



صدرِ مجلس
مہتاب اکبر راشدی
ممبر قومی اسمبلی



اسپیکر
سید شاہد حسن
ایگزیکٹو ایڈیٹر قومی اخبار



ستائیسواں دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ 2014ء وصول کرنے والے رائٹرز کی ایک یادگار تصویر

خصوصی ایوارڈ یافتگان



رخسانہ سہام مرزا نے مہتاب اکبر راشدی کو خصوصی ایوارڈ پیش کیا



محمد اقبال زمان، محمود شام سے خصوصی ایوارڈ وصول کرتے ہوئے







فرزانہ آغا، سلمیٰ یونس اور درِدانہ نوشین خان نے اپنے خصوصی ایوارڈز مہتاب اکبر راشدی سے وصول کیے

تقریب میں موجود مہمانانِ گرامی



فرزانہ آغا، فاطمہ ثریا بجیا، عائشہ اسماعیل اور عامرہ عالم جبکہ پچھلی نشستوں پر رفعت سراج اور رضوانہ پرنس نمایاں ہیں



دلشاد نسیم، غزالہ عزیز، [illegible] مہدی، تسنیم [illegible] سلمیٰ [illegible] اور [illegible] حسنین [illegible] تقریب سے محظوظ ہوتے ہوئے

جب بریک ہوا تو ساری ٹیچرز اسٹاف روم میں جمع ہو کر چائے پینے لگیں اور میں بھی وہیں بیٹھ کر چائے پینے کے ساتھ ساتھ ٹیسٹ کا پیاں چیک کرنے لگی۔ تب ہی لائٹ چلی گئی اور میں کاپیاں اٹھائے جالی کی کھڑکی کی طرف آ گئی جہاں سے ہوا اچھی آ رہی تھی۔ دوسری طرف نسبتاً سنسان اسکول کا پچھلا گراؤنڈ تھا اور اندر سے اس کا نظارہ باہر صاف نظر آتا تھا لیکن باہر سے اندر دیکھنا ناممکن تھا۔ میں کرسی گھسیٹ کر کھڑکی کے پاس ہی آ بیٹھی اور دوبارہ کاپیاں چیک کرنے لگی۔ تب ہی کھڑکی کے اس پار ہونے والی مدھم سی گفتگو نے مجھے اپنی طرف مائل کرلیا۔ ساری ٹیچرز باتوں میں مصروف تھیں۔ آواز جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔ میں نے مارے تجسس کے اُٹھ کر کھڑکی کے پار دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ کلاس نائنتھ کا اسفند تھا اور اس کے ساتھ اس کی کلاس کا دوسرا بچہ سمیع تھا۔

”دیکھ سمیع! یہ نمبر تو اپنے موبائل میں فیڈ کرلے اور ہاں ذرا دل بھر کے تنگ کرنا اس نمبر کو۔ سالی مجھ سے بدتمیزی کرتی ہے اور ہاں یہ نمبر اپنے سارے دوستوں میں بانٹ دینا“ یہ آواز اسفند کی تھی۔

”او کے یار! تو فکر نہ کر...... اور سنا، وہ سی ڈی والی سے کیسے تعلقات ہیں تیرے......“ سمیع نے جواباً کہا۔

”ارے یار وہ تو گلے کا ہار بن گئی ہے، ملنا چاہتی ہے اور سُن تو میری یہ سم کچھ دن اپنے پاس رکھ لے۔ اپنی مما کو غلطی سے میں نے تنگ کر دیا تھا۔ کل میری مما پاپا سے میرا نمبر دے کر شکایت کر رہی تھی کہ اس نمبر سے انہیں کوئی تنگ کر رہا ہے۔ ذرا دیکھیں یہ کون ہے۔ میرے پاپا نے نمبر تو لے لیا ہے۔ لیکن......“ یہ کہہ کر سمیع نے اپنی سم اسفند کی طرف بڑھائی۔

”سُن یار اس سنڈے میرے ساتھ تو ہل پارک چلنا۔“

ارے یار...... وہ پنکی سے ملنا ہے پیچھے پڑ گئی ہے ملنے کے لیے! اسفند نے سم ہاتھ سے لے کر کہا۔ ساری رات وہ باتیں کرتی رہتی ہے۔ کل تو مما میرے کمرے میں آ گئیں۔ میں نے فوراً ہی کتاب آگے کر لی، وہ سمجھیں کہ میں پڑھ رہا ہوں“ اسفند کے جملے کے اختتام پر دونوں زور سے ہنس دیے۔

ادھر میرے ذہن میں دھماکے سے ہونے لگے۔ بمشکل پندرہ سولہ سالہ اسفند اور سمیع یہ کیسی باتیں کر رہے تھے اور...... اور کتنی آسانی سے اپنے والدین اور معصوم لڑکیوں کو دھوکا دے رہے تھے۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ بریک ختم ہو گیا تھا اور سب ٹیچرز کلاس لینے کے لیے چلی گئیں، لیکن میں وہیں بیٹھی رہ گئی تھی۔ اسی وقت ایک لمحے کے لیے اسفند اور سمیع میں مجھے ٹیپو کی شبیہ نظر آئی اور میں نے جھرجھری لے کر توبہ کی۔ بے شک موبائل وقت کی اہم ضرورت ہے لیکن...... آج کی اس نسل نے اسے کھلونا اور لطیفہ بنا دیا ہے۔ کھلونا اس لیے کہ وہ اس سے جس طرح چاہیں کھیل سکتے ہیں پھر لطیفے کی طرح اس پر ہنستے ہیں۔

خدانا خواستہ اگر میرے بچے بھی اس طرح...... اس کے بعد میرے سارے بدن پر جیسے کانٹے سے چبھنے لگے تھے۔ اللہ نہ کرے۔ میں بے ساختہ بڑبڑائی۔ جوان بچے تھے۔ دوسروں کو دیکھ کر دل میں وسوسہ جنم لے سکتا تھا، پھر شیطان تو ہر وقت ورغلاتا رہتا ہے۔ اگر خدانا خواستہ میرے بچے...... یا اللہ! میں تو مر ہی جاؤں گی۔ میں نے ایک بار پھر جھرجھری لی تھی۔

تب مجھے احساس ہوا کہ آج کل کے والدین چھوٹے چھوٹے بچوں کے ہاتھوں میں موبائل دے کر بے فکر ہو جاتے ہیں اور وہ یہ دیکھنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کرتے کہ بچے اس کا استعمال کس طرح کر رہے ہیں...... اور میں...... میں جانتے بوجھتے اپنے بچوں کو یہ تحفہ نہیں دوں گی۔ میں اپنی برسوں کی محنت اور تربیت کو کسی صورت داؤ پر نہیں لگاؤں گی۔ تب ہی میں نے فیصلہ کرلیا۔ گو کہ اس فیصلے سے میرے بچے مجھ سے ناراض ہو جاتے، لیکن ان کی کچھ دن کی ناراضگی مجھے منظور تھی۔ میں انہیں منا لیتی لیکن...... اپنے ہاتھوں سے انہیں ایسا تحفہ نہیں دے سکتی تھی کہ جسے دے کر میں بے سکون ہو جاتی۔ میں اپنے اس فیصلے سے بالکل مطمئن تھی اور آج بھی مجھے اس بات پر پورا پورا اطمینان ہے۔

☆......☆

چھٹی سچ بیانی

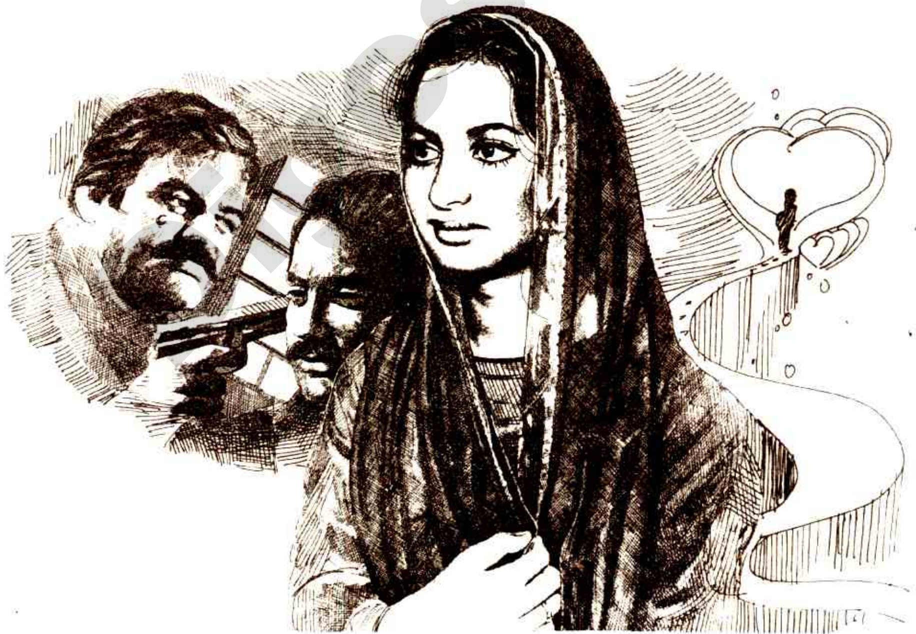
انوکھا رشتہ

عارف رمضان

خاندانی انتقام کی آگ میں جھلسنے والی ایک لڑکی کی داستانِ الم

''سلام! بڑے میاں کیسے ہیں؟ مَیں فلاں شہر سے آیا ہوں اور مجھے دوسرے شہر جانا ہے۔ یہاں میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے۔ کیا آپ میری تھوڑی سی رہنمائی کرسکتے ہیں؟'' پاس کھڑے نوجوان نے بڑی عمر کے شخص سے درخواست کی۔ بڑے میاں نے اس کو غور سے گھورا پھر پوری توجہ سے نوجوان اجنبی کی بات سنی۔
نوجوان نے اپنا نام آصف بتایا۔ وہ دوسرے شہر میں کسی کام سے جارہا تھا مگر راستے میں کسی وجہ سے اتر گیا جہاں اس کی کوئی جان پہچان نہیں تھی۔ وہ کچھ دیر یہاں رکا تو اس شہر کے بارے میں کچھ معلومات لینے میں مصروف ہوگیا۔
بڑے میاں جن کا نام دین محمد تھا، شکل وصورت سے کافی سمجھ دار اور بردبار تھے۔ اس نوجوان کی بات توجہ سے سننے کے بعد اسے قریبی چھپر ہوٹل میں لے گئے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے دوران موبائل نمبروں کا تبادلہ بھی ہوا پھر وہ ایک دوسرے سے اجازت لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔
اب یہ اجنبیت شناسائی میں تبدیل ہوچکی تھی۔ ان کا ایک دوسرے کو الوداع کہنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کے جگری دوست ہوں۔
ایک دن بعد ہی دین محمد کے موبائل پر ایک اجنبی نمبر سے کال آئی۔ دین محمد کا تعلق اَن پڑھ گھرانے سے تھا۔ وہ انگریزی تو کیا اردو بھی اچھے طریقے سے نہیں جانتا تھا۔ موبائل پر نظر ڈالی اور یہ سوچ کر کہ کسی جاننے والے کی کال ہوگی ریسیو کرلی۔
دوسری طرف کی آواز کچھ جانی پہچانی سی لگی۔ کال کرنے والے نے اپنا نام بتایا تو دین محمد کے چہرے سے اجنبیت غائب ہوگئی اور وہ اس سے یوں بات کرنے لگا جیسے کوئی بہت قریبی رشتے دار ہو۔
اب روزانہ ہی وہ دین محمد کو کال کرتا اور گھنٹوں باتوں میں مصروف رہتا۔
''ایک دوست ہے، بہت ہی اچھا انسان ہے بلکہ وہ مجھے اپنا چاچا کہتا ہے۔'' دین محمد نے گھر والوں کو اس نوجوان کے بارے میں بتایا کہ فون اُس نوجوان کا نام آصف ہے جو انہیں بس اسٹاپ پر ملا تھا۔
آصف کی بے تکلفانہ اور مخلصانہ باتوں نے دین محمد کو اس کا گرویدہ بنادیا۔ آصف کبھی دین محمد کو موبائل کا بیلنس بھیجتا تو کبھی پیسوں کا تبادلہ ہوتا۔
ان دونوں کی اپنائیت نے ایک نیا موڑ لیا۔ اب وہ ایک دوسرے کو گھر پر بھی مدعو کرنے لگے۔ کبھی دین محمد آصف کے شہر جاتا تو کبھی وہ دین محمد کے گاؤں آجاتا، دونوں کافی دیر تک بیٹھے گپیں ہانکتے۔ اس کی واپسی پر دین

محمد اپنے کسی بیٹے کے ذریعے بس اسٹاپ تک چھڑوا دیتا۔
دوسری جانب دین محمد کے محلے داروں اور اہل خانہ کو اس کا یوں ایک اجنبی نوجوان سے تعلقات بڑھانا کچھ مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ اسے کئی بار سمجھانے کی کوشش کی گئی مگر بے سود۔ وہ ہمیشہ سب کے اعتراض پر ایک بات کہہ کر ان کا منہ بند کر دیتا۔
''آصف میرے لیے بیٹوں جیسا ہے اور اسے یہاں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔''
دین محمد خود ایک سلجھا ہوا زمیندار اور اچھا انسان تھا جس کی وجہ سے کسی کی بھی اس کے آگے نہیں چلتی تھی۔
دین محمد اور آصف کے تعلقات کی وجہ سے اس کے گھر والے بہت تنگ تھے مگر ان باتوں سے دین محمد کو کوئی فرق نہیں پڑا۔ اسے آصف پر حد سے زیادہ یقین تھا۔ وہ ہر وقت اس کے اعلیٰ اخلاق کے گن گاتا رہتا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا ویسے ویسے دین محمد کا اعتماد آصف پر پختہ ہوتا جا رہا تھا۔ اب تو آصف اُس کے گھر پر کئی کئی راتیں بھی بسر کرنے لگا تھا۔ وہ دین محمد کے ساتھ کھیتوں میں کام کرواتا اور گھر میں بغیر کسی روک ٹوک آتا جاتا۔
دین محمد اپنی سب سے چھوٹی بیٹی معراج کی شادی کے بارے میں کافی پریشان تھا مگر آصف سے بھی اس کی نسبت طے نہیں کر سکتا تھا، کیوں کہ اُسے وہ اپنے بیٹوں جیسا سمجھتا تھا۔ معراج ہمیشہ آصف کے لیے کھانا لے کر آتی اور کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا تھا کہ آصف آتا تو معراج گھر میں اکیلی ہوتی تھی۔ یوں وہ ایک دوسرے کو دل ہی دل میں پسند کرنے لگے تھے۔ معراج کو ہمیشہ آصف کا انتظار رہتا تھا، وہ آصف کی راہ تکتی رہتی تھی۔
ایسے ہی دن گزرتے گئے اور معراج کی ننھی محبت پھل پھول کے ایک تناور درخت بن گئی۔ معراج سے اب اور انتظار نہیں ہو پا رہا تھا اور آخر کار اُس نے ایک دن آصف سے دل کی بات کہہ ہی ڈالی۔ ادھر آصف بھی جیسے اسی انتظار میں تھا، اُس نے بھی ظاہری طور پر اپنی محبت کا یقین دلا دیا۔ تاہم، آصف کے دل میں کچھ اور چل رہا تھا جسے وہ معصوم کلی نہیں جانتی تھی۔ آصف نے معراج کے منہ سے محبت کے یہ دو جملے سننے کے



لیے نا جانے کتنا انتظار کیا تھا۔ آج وہ گھر لوٹتے وقت بہت خوش تھا۔ اپنے شہر پہنچ کے وہ گھر جانے کے بجائے کہیں اور چلا گیا۔

☆......☆

کچھ سرگوشیوں کے بعد آصف کی آواز نمایاں تھی۔ وہ کسی سے کہہ رہا تھا: ''جس کے لیے برسوں انتظار کیا ہے آخر وہ دن آ گیا، اور اب اس سے مزید صبر نہیں ہو رہا۔ اس کام کو جلد سے جلد ہو جانا چاہیے۔'' دوسری طرف کسی خاتون کی آواز تھی جو اسے احتیاط سے کام کرنے کو کہہ رہی تھی۔ ''جلد بازی میں کوئی نقصان بھی ہو سکتا ہے، جہاں ہم نے اتنا صبر کیا ہے تھوڑا اور صبر کر لو تا کہ معاملات بہتر انداز میں انجام پائیں۔''

آصف کے دل میں نہ جانے کیا چل رہا تھا اور وہ کس سے اپنی راز داری شیئر کر رہا تھا؟ یہ ابھی تک کسی کو معلوم نہیں تھا۔ دوسری جانب معراج کو ہر چیز میں آصف نظر آنے لگا تھا، اسے اب زندگی صحیح معنوں میں زندگی لگنے لگی تھی۔ اب وہ دین محمد کی چھوٹی نادان بیٹی نہیں رہی تھی۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ اپنے والد سے کہہ دے کہ وہ اب چھوٹی نہیں رہی، سب کچھ سمجھنے لگی ہے مگر وہ کہہ نہیں سکتی تھی۔ لحاظ و مروت کا خیال رکھتے رکھتے کئی دن بیت گئے۔ اب تو آصف نے اُس سے ضد بھی کرنی شروع کر دی کہ وہ جلد از جلد اُس سے شادی کرنا چاہتا ہے، جس کے لیے اس نے اپنے گھر کے کچھ الٹے سیدھے مسائل بھی بیان کیے کہ اگر وہ اس سے فوراً شادی نہیں کرے گا تو اس کے گھر والے اس کی شادی کہیں اور کر دیں گے۔ آصف کی الٹی سیدھی باتوں نے معراج کو کافی حد تک جذباتی کر دیا تھا۔ آخر اس نے بھی کچی عمر میں سخت فیصلہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔

آصف کی شیطانی چالیں اپنا کام کر رہی تھیں۔ جو وہ چاہ رہا تھا سب کچھ ویسے ہی ہوتا جا رہا تھا۔ معراج کی معصومیت نے آصف پر اندھا اعتبار کیا تھا اور شاید آصف کی طرف سے اسے اس اعتبار کا بہت برا انجام ملنے والا تھا، کیوں کہ آصف کی معراج کے ساتھ بات چیت کے ساتھ کسی اور کے ساتھ خفیہ میٹنگز ایک سوالیہ نشان تھیں۔ آخر باتوں ہی باتوں میں معراج کو معلوم ہوا کہ اس کے ابا اس کی نسبت کسی اور سے جوڑنے جا رہے ہیں اور اس سلسلے میں انہوں نے اپنے بیٹوں سے مشاورت بھی کر لی ہے۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ بھائیوں کے پُرزور احتجاج پر اس کے ابا نے اس کے بارے میں اہم فیصلہ کرنے کا سوچ لیا ہے۔

معراج نے آصف کو بتایا کہ آج ابا محلے کے کسی لڑکے کے ساتھ اس کی شادی کی بات کر رہے تھے۔ معراج کے لہجے میں تشویش تھی مگر آصف کو اس بات کا کچھ خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ اس نے ہاں ہوں میں بات ٹال دی۔ معراج نے آصف کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور بات کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی تو آصف نے غصے میں کہا: ''پھر میں کیا کر سکتا ہوں، کیا تم میرے ساتھ بھاگ جانے کے لیے تیار ہو....؟'' یہ ایسی بات تھی جس کا معراج نے زندگی بھر سوچا تک نہیں تھا۔ اُسے آصف کا یہ رویہ بیگانہ سا لگا تھا۔ وہ کانپ اٹھی تھی اور گھبرائے ہوئے انداز میں پھٹی آنکھوں سے آصف کا چہرہ تکتی رہ گئی۔ اس کے پاس آصف کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ بات سن کے آصف بھی اُس کی طرح پریشان ہو جائے گا اور ابا سے اس کا رشتہ مانگ لے گا، مگر آصف نے تو دوسرا راستہ چنا تھا جس کے بارے میں معراج کا ننھا دماغ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے تو ہمیشہ شادیوں میں دلہن کی طرح خود کو سجا کر ڈولی میں آصف کے ساتھ رخصت ہونے کے خواب دیکھے تھے۔ اس نے رخصتی کے وقت دل کھول کر رونے، اماں کو ایک اچھی بیوی بن کر رہنے کا وعدہ کرنے کا بھی سوچ رکھا تھا۔

آصف کی باتوں نے اس کے سارے ارمانوں کا خون کر دیا تھا۔ اب اسے وہ فیصلہ کرنا تھا جس کے بعد زندگی رسوائیوں کی راہ پر گامزن ہو جاتی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ جس راہ کو چننے پر غور کر رہی ہے وہ مشکلات، کانٹوں اور بدنامیوں سے بھری ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس راہ پر چلنے سے نا صرف اس کا خاندان برباد ہوگا بلکہ اس کی آخرت بھی داؤ پر لگ جائے گی۔ اب چند لمحوں میں اسے فیصلہ کرنا تھا۔ وہ دماغ اور دل کو فیصلے کا اختیار سونپ کر خاموشی سے آصف کی طرف دیکھنے لگی۔ آخر دل، دماغ پر حاوی ہو گیا اور معراج نے زندگی کا سب

سے غلط فیصلہ کر ڈالا۔

رات کا دوسرا پہر شروع ہوتے ہی دین محمد کے گھر سے دو ہیولے نکل کر کچی سڑک پر آ گئے جہاں دو افراد موٹر سائیکلوں پر ان کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ موٹر سائیکل کی روشنی میں معلوم ہوا کہ دین محمد کے گھر سے نکلنے والے دو ہیولے آصف اور معراج کے تھے۔ معراج گھبرائی ہوئی خود کو ایک بڑی سی چادر میں سمیٹے آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا، بس کہیں کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جب کوئی آواز معراج کی سماعتوں سے ٹکراتی وہ چونک کر اپنے گھر کی دہلیز کی طرف دیکھتی۔ معراج اور آصف ایک موٹر سائیکل پر بیٹھے تو معراج نے آخری بار اپنے گھر کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اسے شاید اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا جسے آصف نے واضح محسوس کیا اور اس خطرے کے پیش نظر کہ کہیں معراج واپس نہ چلی جائے، موٹر سائیکل کی رفتار تیز کرتے ہوئے وہاں سے دور....اور دور ہوتا چلا گیا جب کہ معراج نے اس وقت تک اپنے گھر پر نظریں ٹکائے رکھیں جب تک کہ وہ اُس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔

☆......☆

معراج ایک بڑی کوچ کے ذریعے دوسرے شہر میں آ چکی تھی جسے اس نے پہلی بار دیکھا تھا، لیکن اسے شہر کی چکا چوند روشنی سے وحشت ہو رہی تھی اور رہ رہ کے گھر یاد آ رہا تھا۔ اسے گھر سے یوں چلے آنا بہت بُرا لگ رہا تھا۔ وہ خود کو دل ہی دل میں بُرا بھلا کہہ رہی تھی۔ ''ہاں....وہ بُری ہے، بہت بُری۔ اس نے اپنی محبت دینے والی ماں کو دکھ دیا ہے۔ سب سے الگ شفقت دینے والے باپ کو دھوکا دیا ہے۔'' اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا۔

وہ انہی خیالوں اور وسوسوں میں ڈوبی ہوئی تھی کہ کسی نے اسے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ وہ چونک پڑی اور اپنے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لینے لگی۔ اسے احساس تک نہیں ہوا کہ کچھ ہی لمحوں میں وہ اپنوں سے بیگانوں میں آ چکی ہے۔ اس کو آصف سمیت سارا کا سارا ماحول اجنبی لگا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ حقیقت میں خوف زدہ ہو گئی تھی۔

آصف اسے نیچے اترنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ اس نے گھبرا کے خود کو سمیٹتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا اور کوچ سے اتر آئی۔ کچھ لڑکوں نے آگے بڑھ کر اس کا مختصر سا سامان اٹھایا اور وہ پیدل چلتے ہوئے ایک بڑی سی حویلی کے دروازے پر پہنچ گئے۔ دروازے پر بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔ انہی لڑکوں میں سے ایک نے آگے بڑھ کر اسے کھولا اور حویلی میں داخل ہو گیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ واپس آیا اور سب کو اندر آنے کو کہا۔ معراج کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ بت بنی سب کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ اس کی ظاہری حالت سے صاف واضح تھا کہ جیسے وہ اپنے اس فیصلے سے ناخوش ہے اور اب اس کی سزا بھگتنے کے لیے خود کو تیار کر رہی ہے۔ حویلی کا صحن کافی بڑا تھا۔ لڑکے انہیں حویلی میں چھوڑ کر آصف کی ہدایت پر واپس چلے گئے، البتہ وہ جاتے ہوئے حویلی کو باہر سے دوبارہ تالا لگا کر گئے۔ جس نے معراج کو مزید پریشان کر دیا تھا۔

آصف اور معراج اکیلے تھے۔ اب معراج کو کچھ حوصلہ ملا تھا۔ وہ ان لمحوں کے لیے برسوں سے تڑپ رہی تھی۔ آخر وہ وقت آ گیا تھا کہ جب وہ آصف کے ساتھ اکیلے میں بلاخوف وخطر بیٹھ کر ڈھیر ساری باتیں کر سکتی تھی۔ وہ اسے اپنا بچپن بتانا چاہتی تھی اور اس سے اس کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔ آصف جسے وہ ہر وقت، ہر پل سوچتی تھی اور اپنے ہر خواب میں اسے ہی دیکھتی تھی، آج وہ خواب حقیقت بن گیا تھا۔ معراج کو پہلی بار ایسا لگا تھا کہ اس کا فیصلہ درست ہے۔ وہ بھی اپنی مرضی کی زندگی جینا چاہتی ہے اور اس کا یہ حق اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔

سورج ڈھلنے لگا تھا۔ آسمان پر ہلکی ہلکی کرنیں باقی تھیں۔ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی جسے سن کر معراج کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ آصف نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے انہی لڑکوں میں سے ایک ہاتھ میں شاپر لیے کھڑا تھا۔ آصف نے اس سے شاپر لیا اور معراج کے پاس رکھ کر اس لڑکے کے ساتھ باہر چلا گیا۔ کچھ دیر تک آصف اس سے باتیں کرتا رہا پھر اسے رخصت کر کے واپس آ گیا۔ شاپر میں کچھ کھانے کا سامان تھا اور کچھ دیگر ضروریات کی چیزیں تھیں۔ معراج کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ آصف کی آنے والے لڑکے سے بات چیت کے

متعلق پوچھے مگر اسے گستاخی سمجھ کر خاموش رہی۔ وہ آصف کے بارے میں یہ سوچنا بھی گناہ سمجھتی تھی کہ آصف اس کے خلاف بھی کوئی بات کرسکتا ہے۔

رات کے اندھیرے لمبے ہو رہے تھے اور محلے کے گھروں میں لوگ بتیاں بجھا کر سونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ معراج بیڈ ایک کونے میں سمٹی بیٹھی تھی۔ اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ مسلسل اپنی اماں اور ابا کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ نہ جانے ان کے ساتھ کیا بیتی ہوگی۔ اسے بھائیوں کا غصہ بھی ڈرا رہا تھا کہ اگر انہوں نے اسے ڈھونڈ لیا تو قیامت آجائے گی۔ اس کے دماغ میں وسوسوں کے جھکڑ چل رہے تھے جس کی وجہ سے اس کا سر بھی درد کے مارے پھٹ رہا تھا۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ متفکرانہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ آصف جو نیند کے سے انداز میں لیٹا ہوا تھا، فوراً اٹھ گیا جیسے وہ نیند میں کم اور انتظار میں زیادہ تھا۔ دروازے پر ایک خاتون اور بڑی عمر کے دو مرد تھے۔ آصف انہیں اندر لے آیا۔ اس نے خاتون کا تعارف اپنی خالہ اور مردوں کا تعارف خالو اور ان کے بھائی کے طور پر کرایا۔ وہ تینوں مسلسل معراج کو گھورے جارہے تھے۔ نہ جانے کیوں معراج کو ان سے خوف آنے لگا تھا۔ اسے ان کی نظروں میں سفاکیت محسوس ہو رہی تھی۔ کہتے ہیں، چھٹی حس انسان کو خطرے سے متعلق خود ہی آگاہ کردیتی ہے۔ معراج کی بھی چھٹی حس اس وقت مکمل طور پر بیدار ہو چکی تھی اور اسے آنے والے خطرے کے بارے میں آگاہ کررہی تھی۔

☆......☆

کافی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر وہ تینوں چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد معراج نے سکھ کی سانس لی۔ آصف دوسرے کمرے میں جا کر سو گیا، جب کہ معراج کو اندر سے دروازہ بند کرنے کی ہدایت بھی کر گیا۔ معراج کو اکیلے میں ڈر تو لگ رہا تھا مگر وہ بھی یہی چاہتی تھی۔ اس کا اکیلے رہنے کو دل چاہ رہا تھا۔ وہ کچھ دیر کے لیے بالکل تنہا رہنا چاہتی تھی۔ اس نے آصف کے جاتے ہی دروازہ اندر سے بند کیا اور دوبارہ بیڈ پر آکر لیٹ گئی۔ وہ اپنے خیالوں میں تھی کہ نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

معراج کے والدین اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نڈھال ہو چکے تھے۔ دین محمد کی عمر اگرچہ کافی تھی مگر بیٹی کے اس صدمے نے اس کی عمر میں بیسیوں برس کا اضافہ کردیا تھا۔ شام تک وہ بیٹی کی تلاش میں کبھی اِدھر تو کبھی اُدھر مارا مارا پھرتا رہا مگر کہیں کوئی سراغ نہ پا کر آخر کار اپنی قسمت پر روتا ہوا گھر لوٹ آیا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ لوگوں کو جواب دینے کی بجائے خود زمین میں دفن ہوجائے۔ کہتے ہیں کہ "انسان خود نہیں مرتا، اسے تو لوگ مار دیتے ہیں۔" دین محمد بھی لوگوں کو نظروں سے بچنے کے لیے راتوں رات گھر خالی کردینا چاہتا تھا مگر وہ کس کے پاس جاتا؟ اب تو کوئی اس کو اپنے پاس جگہ دینے کے لے تیار بھی نہیں تھا۔ اس پر زمین باوجود اپنی فراخی کے تنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ دوسری جانب ماں تھی جو روتے روتے تھک چکی تھی۔ اب تو اس کے آنسوؤں نے بھی جواب دے دیا تھا۔ بھائی صبح کے گھر سے نکلے نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ شاید ان کی غیرت گوارا نہیں کررہی تھی کہ وہ لوگوں کا سامنا کریں۔ معراج چند ہی لمحوں میں ہنستے بستے گھر کو ویران کر گئی تھی، ایسا ویران کہ نسلیں در نسلیں اس نشان کو نہ مٹا پائیں۔

☆......☆

آفتاب نے کھڑکی کی اوٹ سے سر نکالا تو معراج جیسے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اسے لگا تھا جیسے وہ اپنی ماں کے گھر پر ہو اور اب کافی دیر ہوگئی ہے۔ تمام کام ادھورے پڑے ہیں، مگر پھر اسے احساس ہوا کہ نہیں.... اب وہ ان سے سیکڑوں کلومیٹر دور نہ جانے کہاں پر ہے۔ اس کا دل زور زور سے رونے کو چاہ رہا تھا۔ اس کے انتہائی ضبط کے باوجود آنسو چھلک کر اس کے رخساروں پر پھسل گئے۔ اس نے دوپٹے کے پلّو سے آنسو پونچھے اور پھر خود کو سمجھانے والے انداز میں دلاسا دینے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

آصف نے آج کسی قاضی سے بات کر کے معراج سے باقاعدہ نکاح کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ معراج بھی یہی چاہتی تھی کہ اپنے اس رشتے کو جلد از جلد پاکیزگی بخشے جس کے لیے اس نے صبح ہی آصف سے بات کی تھی۔ آصف قاضی سے بات کرنے کا کہہ کر باہر چلا گیا تھا۔ دوپہر کے وقت آصف لوٹا تو اس کے ساتھ کچھ افراد بھی تھے اور بقول

آصف، اس کی خالہ بھی تھی۔ انہوں نے آصف اور معراج کو اکٹھے بٹھا کر نکاح کی تقریب کرنے کے انداز میں کچھ باتیں کیں، ایک صاف کاغذ پر انگوٹھے لگوائے اور چلے گئے۔ سب کے جانے کے بعد آصف کی خالہ معراج کے پاس آکر بیٹھ گئیں اور اسے مبارک باد دیتے ہوئے کچھ ضروری ہدایات دینے لگیں۔ معراج کو ان کی باتیں عجیب اور بری لگ رہی تھیں تاہم، وہ ان کی باتیں سنتی رہی۔

سب لوگ حویلی سے چلے گئے تھے اور معراج دل ہی دل میں بہت خوش تھی۔ وہ جیسا چاہتی تھی ویسا ہی ہو رہا تھا۔ اب وہ آصف کی ہو چکی تھی اور انہیں کوئی ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتا تھا۔ معراج نے آصف کے پاس بیٹھتے ہوئے پہلی بار اس کے ہاتھوں کو چھوا تھا۔ وہ اس کی گود میں سر رکھ کر سونے کے لیے بے تاب تھی۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد آصف کسی ضروری کام کا کہہ کر چلا گیا اور کافی دیر بعد اس کی واپسی ہوئی۔ معراج کو فکر سی لگی ہوئی تھی کہ آخر آصف اسے کیوں نہیں بتاتا کہ وہ کہاں چلا جاتا ہے۔

رات کافی گزر چکی تھی۔ معراج کی زندگی میں یہ رات سب سے اہم تھی۔ آج وہ آصف کی اپنی تھی اور اسے اس پہ فخر محسوس ہو رہا تھا۔ ادھر آصف بھی اس دن کے لیے بے تاب تھا۔ آصف اور معراج دو سے ایک ہو گئے تھے۔

صبح آصف نے معراج کو اٹھایا اور فوری تیار ہو کر آنے کا کہا۔ کچھ ہی دیر بعد دونوں کو ایک سفید رنگ کی گاڑی لینے کے لیے آئی اور دونوں اس میں سوار ہو گئے۔ معراج نے پوچھا بھی کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟ مگر آصف نے کچھ بتانے کی بجائے خاموشی اختیار کر لی۔ معراج کے بار بار اصرار پر آصف نے اتنا کہا کہ اب ہماری رہائش ایک دوسری جگہ پر ہوگی۔ معراج کو حیرت ہوئی مگر وہ خاموش ہو گئی۔ گاڑی ایک فلیٹ نما بلڈنگ کے پاس رک گئی۔ آصف نے سامان اٹھایا اور معراج کو ساتھ لے کر بلڈنگ کی تنگ سیڑھیاں چڑھتا ہوا ایک چھوٹے سے دو کمروں کے فلیٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ بلڈنگ کے تمام فلیٹس میں لوگ رہائش پذیر تھے۔ فلیٹ اگرچہ تنگ تھا مگر لوگوں کو دیکھ کر معراج کو اچھا لگا کہ اب اس کو اکیلے رہنے والا عذاب نہیں سہنا پڑے گا۔

معراج اور آصف ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کر

رہے تھے، مگر ہر بار معراج کو ایسا لگتا تھا جیسے آصف اسے سمجھنا ہی نہیں چاہتا۔ مگر وہ اسے اپنا وہم تصور کر کے ہر خیال جھٹک دیتی۔ دن اچھے گزر رہے تھے اور معراج خوش تھی، بس کبھی کبھار اپنے والدین کے بارے میں سوچ کر پریشان ہو جاتی تھی۔

دو ماہ کا مختصر عرصہ بیت گیا تھا۔ ایک دن آصف نے معراج کو کہیں جانے کے لیے تیار کیا اور ایک گاڑی میں بٹھا کر نکل پڑا۔ سفر کافی طویل تھا۔ معراج نے حیرت سے آصف سے پوچھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ مگر آصف نے صرف اتنا کہا، جہاں سے آئے تھے۔ اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ معراج کو آصف کا لہجہ اجنبی لگا تھا۔

رات کا اندھیرا چھانے لگا تھا جب ڈرائیور نے گاڑی سڑک کے کنارے لگائی۔ آصف نے معراج کو اترنے کا کہا تو معراج کو حیرت ہوئی کہ اس اندھیرے میں اور یوں اکیلی سڑک پر کیوں اترنے کا کہہ رہا ہے مگر آصف کے بار بار کہنے پر آخر وہ نیچے اتر آئی۔ باہر اندھیرے میں ہرے بھرے لہلہاتے کھیت عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔ معراج کو وہاں کا ماحول مانوس سا لگ رہا تھا۔ آصف نے معراج کو ساتھ لیا اور پیدل چلنا شروع کر دیا۔ معراج کو حیرت ہو رہی تھی کہ آخر آصف کو ہو کیا گیا ہے۔ وہ اس سے بار بار پوچھتی رہی مگر آصف کا لہجہ ہر بار پہلے سے زیادہ سخت ہوتا جا رہا تھا۔

آخر معراج نے رک کر آصف سے دوٹوک بات کرنی چاہی کہ آخر وہ اسے کہاں لے جا رہا ہے؟ تو آصف نے سخت غصے میں جواب دیا کہ وہ اسے اس کے گھر چھوڑنے جا رہا ہے۔ معراج کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ انتہائی غیر متوقع جواب سن کر اس کا گلا خشک ہونے لگا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب آصف نے کہا ہے۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جس آصف کے لیے اس نے اس قدر قربانیاں دی ہیں آج وہ ایسا بھی کر سکتا ہے۔ اس نے انتہائی بیٹھے ہوئے لہجے میں صرف اتنا پوچھا، ''کیوں؟'' جس پر آصف نے جواب دیا کہ اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں رہی۔ ہمارا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ معراج کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آصف کیا کہہ رہا ہے، کون سا مقصد اور اب وہ اس کو کیوں نہیں رکھنا چاہ رہا ہے؟ اور یہ کہ آصف ہم کا لفظ کیوں استعمال کر رہا ہے؟ وہ کچھ نہیں سمجھ سکی تھی۔ اس نے اپنے اندر ہمت پیدا کر کے ان سوالوں کے جواب پوچھے تو آصف نے سب کچھ کھل کر بتا دیا۔

دراصل آصف دین محمد کے لیے اجنبی ضرور تھا مگر ایسا نہیں تھا کہ وہ اسے نہیں جانتا تھا بلکہ وہ اسے بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ دین محمد اور اس کا شہر اس کے لیے اجنبی نہیں تھے۔ وہ کافی دنوں سے وہاں رہ رہا تھا اور دین محمد سے اتفاقاً نہیں بلکہ اس کے ساتھ روابط بڑھانے کے لیے ہی باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت ملا تھا۔ یوں وہ اس کے گھر تک رسائی چاہتا تھا۔ اس کی معاونت اس کی خالہ اور خالو کر رہے تھے جو دوسرے شہر میں رہتے تھے۔ دین محمد سے دوستی، اس کے گھر تک رسائی اور پھر گھر میں پہنچ کر اعتماد حاصل کر کے معراج کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھانا، یہ سب ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوا تھا۔

☆......☆

آصف کی خالہ جس کا نام نوراں تھا، اور اس کا خاوند فضل یہ سب کچھ کروا رہے تھے۔ وہ دراصل اپنی بیٹی کا بدلہ معراج سے لینا چاہتے تھے۔ معراج کا بڑا بھائی شاکر، نوراں کے گھر کے پاس ایک کارخانے میں کام کرتا تھا۔ اس کا گزر روزانہ نوراں کے گھر کے سامنے سے ہوتا تھا۔ شاکر شکل و صورت میں کافی اچھا دکھتا تھا۔ نوراں کی ایک نوجوان بیٹی ریشماں اس کو روز دیکھتی تھی۔ یوں دن گزرتے گئے اور ریشماں کا شاکر کو دیکھنا بھی چلتا رہا۔ ریشماں کو شاکر اچھا لگنے لگا تھا۔ ریشماں کا باپ فضل بھی اسی کارخانے میں کام کرتا تھا۔ وہ اپنے ابا کو کھانا دینے جاتی تو شاکر کہیں نہ کہیں کام کرتا نظر آ جاتا۔ آہستہ آہستہ ریشماں کو شاکر سے محبت ہونے لگی تھی۔ ایک دن جب ریشماں نے شاکر سے اپنی محبت کا اظہار کر دیا تو شاکر نے بھی خاموشی اختیار کر کے ہلکی سی ہاں کر دی تھی۔ یہ خاموش محبت وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط محبت میں بدل گئی۔ شاکر نے کارخانے کو خیر باد کہا تو ریشماں نے اپنی بڑی بہن کے ذریعے گھر والوں سے شاکر سے شادی کی بات کی مگر اس کے گھر والوں نے صاف انکار کر دیا کہ وہ کسی اجنبی سے اس کی شادی ہرگز نہیں کر سکتے۔

شاکر کو یہ بات بری لگی تاہم، اس نے اس پر کسی

خواتین کی محبوب قلم کار

کئی دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ یافتہ

رفعت سراج، جن کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔

رفعت سراج، وہ قلم کار، جن کو قلم کی حرمت کا پاس، زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔

رفعت سراج، وہ قلم کار جنہیں اپنی تحریر سے دھڑکنیں بے ترتیب کرنے کا ہنر خوب آتا ہے۔

گلابی کاغذ اور زرد پھول کے بعد......

نئے شاہکار ناول کے ساتھ، آپ کے روبرو

بہت جلد ماہنامہ ''دوشیزہ'' ڈائجسٹ میں ملاحظہ کیجیے۔

بس تھوڑا سا انتظار اور......

خاص ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ شاکر ہمیشہ کے لیے وہاں سے چلا آیا مگر دونوں کا موبائل پر رابطہ برقرار رہا۔ آخر ریشماں اور شاکر نے محبت کی ریت برقرار رکھنے کے لیے وہ فیصلہ کیا جو بعد میں معراج نے بھی کیا تھا۔ جب نوراں کو اس بات کا علم ہوا کہ ریشماں کو بھگا کر لے جانے والا شاکر ہے تو اس نے بدلے کی آگ میں جلنا شروع کر دیا۔ آخر کار اس کے شیطانی ذہن نے آصف کے ذریعے گناہ گار بھائی کی سزا اس کی معصوم بہن کو دینے کا منصوبہ تشکیل دیا جس پر عمل کرتے ہوئے آصف نے معراج کی زندگی کو کانٹوں سے بھر دیا تھا۔ اب معراج سب جان چکی تھی اور آصف کا چہرہ بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اتنے میں آصف نے اس پر ایک اور وار کیا۔ جسے سن کر وہ زمین میں گڑ گئی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ یہ سننے سے پہلے مر گئی ہوتی۔ اس اپنے وجود سے نفرت ہونے لگی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ آصف کا گلا دبا دے۔ آصف نے اسے بتایا تھا کہ وہ اس کی منکوحہ نہیں ہے۔ نہ کوئی قاضی آیا تھا اور نہ ہی کوئی نکاح ہوا تھا۔ وہ سب معراج کو رام کرنے کا گھناؤنا منصوبہ تھا اور جو کچھ معراج کے ساتھ دو ماہ تک ہوتا رہا تھا وہ سب غلط اور ناجائز تھا۔ معراج پر آن کے آن نہ جانے کتنے پہاڑ توڑے گئے تھے۔ آج اسے وہ سب یاد آرہا تھا کہ آصف بار بار گھر سے باہر کیوں جاتا تھا۔

جب ٹوٹی پھوٹی اور لٹی ہوئی معراج نے اپنے والدین کی دہلیز پر قدم رکھا تو اسے معلوم ہوا کہ وہاں ہنسی کی جگہ صرف خشک آنسو ہیں۔ اسے اپنا گھر اجنبی لگ رہا تھا۔ وہ جس چیز کی طرف دیکھتی وہی اُسے ناراض سی محسوس ہوتی۔ اماں کو دیکھ کر معراج زار و قطار روتے ہوئے ان سے لپٹ گئی۔ وہ زندگی میں پہلی بار اس قدر روئی تھی۔ ماں بھی کیا شفیق ہستی ہے۔ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود بیٹی کو گلے لگا کر چومتی جا رہی تھی اور روتے ہوئے اسے چُپ ہونے کو بھی کہہ رہی تھی۔ معراج کی واپسی کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پورے محلے میں پھیل گئی۔ دین محمد نے جیسے ہی سنا کہ اس کی بیٹی لوٹ آئی ہے وہ دیوانہ وار بھاگتا ہوا آیا اور اپنی بیٹی کو گلے لگا کر چومنے لگا۔ معراج ان کی گنہگار تھی اس لیے وہ کسی سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔ کیا عجیب منظر ہوتا ہے جب بچے اپنے والدین کی عزت خاک میں ملا دیتے ہیں، والدین تب بھی ان کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ اولاد انہیں زمین پر پھینک دے تب وہ اپنی ہتھیلیاں ان کے پیروں کے نیچے بچھا دیتے ہیں تاکہ انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔

ماں باپ نے تو اپنی نادان بیٹی کو معاف کر دیا تھا۔ انہیں محلے والوں کا بھی کوئی خوف نہیں تھا کہ وہ کیا کہیں گے۔ انہیں اپنی بیٹی واپس مل گئی تھی اور اب وہ اسے کھونا نہیں چاہتے تھے مگر وہ دونوں معراج کے بھائیوں سے خوف زدہ تھے، کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ وہ کبھی بھی اپنی بہن کو معاف نہیں کریں گے۔ اگرچہ معراج کو بھی ان کا ڈر تھا مگر اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر وہ اسے سزا دینا چاہتے ہیں تو دے دیں کیوں کہ وہ گناہ گار اور سزا کی مستحق ہے۔

بھائیوں کو باپ نے کسی نہ کسی طریقے سے سمجھا بجھا کر راضی کر لیا تھا اور وہ بھی معراج کو معاف کر چکے تھے مگر ایک بھائی اب بھی دل میں معراج کے لیے نفرت رکھتا تھا۔ ایک دن اس نے معراج کو اکیلا پا کر کلہاڑی سے اس کی گردن کاٹ دی۔ یہ دردناک منظر دیکھ کر ماں بے ہوش ہو گئی۔ معصوم معراج کچھ دیر تڑپی اور پھر گر گئی۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس پر پورا علاقہ سوگوار تھا۔ گھر کی ہر شے اس پر ماتم کناں تھی۔ بھائی کی غیرت یا جہالت نے معراج کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا۔

ادھر معراج کے ساتھ بیتنے والے واقعے کی خبر شاکر کو بھی ہو گئی تھی، جو ریشماں سے شادی کے بعد سے ہی گھر سے مفرور تھا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ ریشماں کی وجہ سے ہی اس کی معصوم بہن کے ساتھ اتنا بڑا دھوکا ہوا ہے، بعد ازاں اسے معراج کی موت کی خبر ملی تو اس نے ریشماں کو اس واقعے کا قصوروار ٹھہراتے ہوئے اسے بھی زندگی کی ڈور سے آزاد کر دیا۔ یوں شاکر اور ریشماں کی محبت سے شروع ہونے والی اس کہانی کا اختتام دو معصوموں کے قتل اور تین کو پھانسی کے پھندے پر لٹکا کر ہوا۔ آج بھی دین محمد کے گھر کے پاس سے گزرنے والوں کو ایسے لگتا ہے جیسے یہاں صدیوں سے کوئی نہیں رہ رہا۔ وہاں کی ویرانی دیکھ کر یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ رشتوں کی پہچان میں اگر غلطی ہو جائے تو اس کا انجام کچھ ایسا بھیانک بھی ہو سکتا ہے۔ دین محمد آج بھی ہر بیٹی میں اپنی معراج ڈھونڈتا رہتا ہے۔

☆......☆

کشف

مقصود احمد بلوچ

موت سے آہ کس کو رستگاری ہے، ایک محبت بھری کہانی

ایک نہ ایک دن انسان کی زندگی اس کا ساتھ چھوڑ جاتی ہے، لیکن یادیں کبھی بھی کسی کا ساتھ نہیں چھوڑتیں، کاش زندگی کی طرح یادیں بھی ساتھ چھوڑ جاتی، یادیں کوئی موسم کوئی جگہ کوئی لمحہ نہیں دیکھتی ہیں منہ اٹھائے چلی آتی ہیں۔ کبھی کبھی انسان کسی کی یادوں میں اتنا ڈوبا ہوا ہوتا ہے کہ اُسے وقت کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اس روز میں بھی کسی کی ظالم یادوں میں غرق تھا کہ اچانک میرے موبائل کی گھنٹی بجی، میں اچانک چونک گیا، جب موبائل کی اسکرین پر دیکھا تو نمبر اجنبی تھا۔ خیر میں نے کال اٹینڈ کی تو آگے سے باریک آواز میں ایک لڑکی بات کرنے لگی۔

''ہیلو! آپ مقصود بھائی بات کررہے ہو۔'' میں نے کہا جی میں مقصود ہی بات کررہا ہوں، بھائی میں نے میگزین میں آپ کی اسٹوری (اداس ہے زندگی) پڑھی ہے جو کہ مجھے بہت ہی اچھی لگی ہے۔ میں نے اس کے جواب میں اُس کا شکریہ ادا کیا۔ میں نے اس سے اس کا نام پوچھا تو اس نے اپنا نام کشف بتایا۔ اتنی سی بات چیت کے بعد کال ڈراپ ہوگئی، ابھی تقریباً پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ دوبارہ پھر اُس نمبر سے کال آنے لگی۔ میں نے کال اٹینڈ کی اور پوچھا۔

''جی اب کیا بات ہے۔'' تو وہ لڑکی کہنے لگی۔

''بھائی آپ سے ایک درخواست ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کہو کیا بات ہے۔'' تو وہ لڑکی کہنے لگی۔

''بھائی کیا آپ میری اسٹوری لکھو گے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں جی کیوں نہیں۔

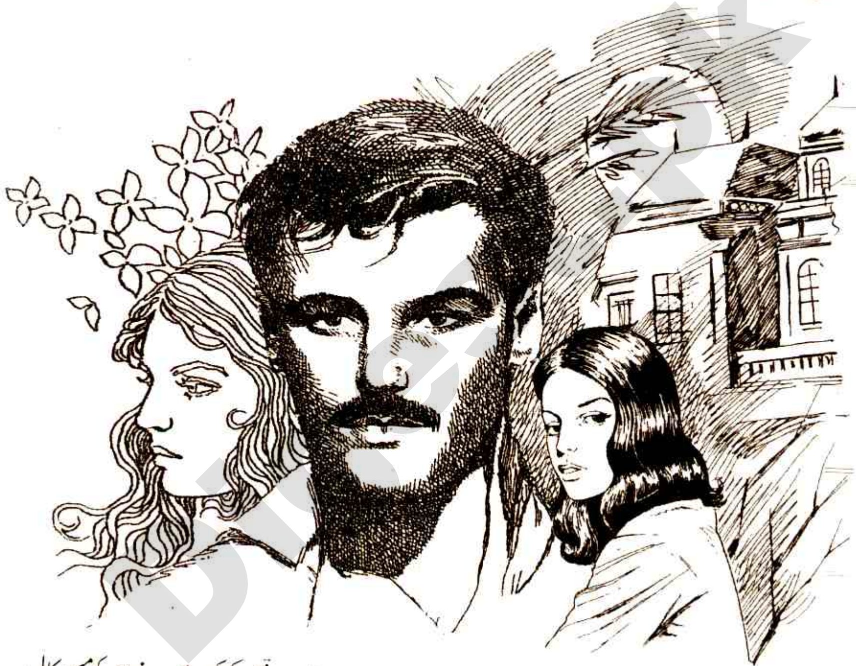
میری ہاں پر وہ بار بار میرا شکریہ ادا کرنے لگی۔ میں نے اس سے کہا اس میں شکریہ والی کوئی بات نہیں ہے اور ساتھ ہی مجھے اس کی آواز سے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ سسکیاں لے کر رو رہی ہے۔ میں نے اسے کہا میں ابھی فری ہوں تم اپنی داستان مجھے بتاؤ۔ اس نے پھر کچھ اس طرح سے اپنی داستان مجھے موبائل فون کے ذریعے سنائی۔

میرا نام کشف ہے اور میں نے ایک درمیانے طبقے میں آنکھ کھولی۔ ہمیں دو وقت کی روٹی عزت سے مل جاتی تھی اور آج کل کے اس مشکل ترین دور میں دو وقت کی روٹی بھی مل جائے تو بہت غنیمت ہے۔ میرے والد صاحب قصاب تھے۔ انہوں نے دکان پر اپنے ساتھ ایک لڑکا بھی رکھا ہوا تھا، جو ابو کا شاگرد تھا، یا پھر یوں کہہ لیں کہ ابو کے ساتھ مدد کرواتا تھا۔ میرے اُن دنوں میٹرک کے امتحانات ہو رہے تھے، میں جس راستے سے اسکول جاتی تھی، اسی راستے پر ہی میرے ابو کی شاپ تھی، ایک دن وہ لڑکا میرے

ابو کے ساتھ کسی کام کے حوالے سے ہمارے گھر آیا۔ ابو نے مجھے چائے بنانے کے لیے کہا۔ میں جب چائے لے کر اس کو دینے کے لیے اس کے سامنے آئی تو اس وقت میرا دل جیسے میرے قابو میں نہ رہا۔ وہ بہت ہی خوب صورت شخصیت کا مالک تھا۔ میں تو پہلی نظر دیکھتے ہی اُسے اپنا دل دے بیٹھی۔ مجھے اس بات کی آج تک سمجھ نہیں آئی کہ کچھ اجنبی چہرے اچانک ہی دل میں کیوں بس جاتے ہیں، میرے ساتھ بھی کچھ اس طرح ہی ہوا کہ اپنا سب کچھ اس اجنبی لڑکے کے حوالے کر بیٹھی تھی۔ میں اسے چائے دے کر واپس تو آ گئی، لیکن میرا دل مستقل اس کے بارے میں ہی

اس کو دیکھ کر دل کو بہت سکون ملتا۔

میں کتنی پاگل تھی جو کہ دِل ہی دِل میں اس سے محبت کرنے لگی تھی، پتا نہیں اس کا ردعمل کیا ہوگا میرے بارے میں، میں نے یہ چیز تو بالکل سوچی ہی نہیں تھی۔ بس دِل ہی دل میں اسے اپنا محبوب تصور کرنے لگی تھی۔ ایک دن میرے ابو جی باتھ روم میں گئے اُن کا موبائل چارجنگ کے لیے لگا ہوا تھا، میں موقع پاکر بابر کا موبائل نمبر تلاش کرنے لگی، ساتھ ہی ڈر بھی رہی تھی کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو شامت آ جائے گی۔ خیر قسمت نے میرا ساتھ دیا اور میں ابو کے موبائل سے اس کا نمبر نکالنے میں کامیاب ہوگئی۔



سوچے جا رہا تھا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ اس لڑکے کا کیا نام ہے؟ وہ کہاں رہتا ہے؟ بہرکیف دِن گزرتے رہے۔

میرے ابو جی گھر میں آ کر روز کاروبار کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ ابو کی ہی باتوں سے مجھے اس کا نام پتا چل گیا۔ اس کا نام بابر تھا۔ شکل صورت کی طرح نام بھی مجھے بہت پیارا لگا۔ میں جب بھی اسکول جاتی تو ابو کی شاپ کے سامنے سے گزرتی۔ بابر وہاں موجود ہوتا تھا۔

رات میں موقع دیکھ کر، میں نے اس کو مس کال دی، تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کے نمبر سے کال آنے لگی۔ میں نے کال اٹینڈ کی تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

"آپ کون ہو اور میرے نمبر پر کیوں مس کال کر رہی ہو۔" میں نے اس سے صاف جھوٹ بولا کہ میں نے تو کوئی مس کال نہیں کی۔ ایک سے دو دن تو میں نے اسے خوب تنگ کیا، پھر اس کے بعد میں نے اسے ایک میسج لکھا کہ میں

کشف ہوں اور آپ کا موبائل نمبر ابو کے موبائل سے لیا ہے اور ساتھ ہی میں نے اپنی محبت کا اظہار بھی کر دیا کہ بابر میں تم سے بے پناہ محبت کرنے لگی ہوں، جب میں نے آپ کو پہلی دفعہ اپنے گھر دیکھا تھا تو اپنا دِل ہار بیٹھی تھی۔ میری یہ تمام باتیں سن کر بابر خاموش رہا اور اس نے کسی بھی قسم کا کوئی اظہار نہیں کیا۔ اس کی خاموشی پر میں بہت پریشان ہوگئی کہ اللہ خیر کرے پتا نہیں اب کیا ہوگا۔ ڈر بھی رہی تھی کہ ہوسکتا ہے بابر کو یہ سب اچھا نہ لگا ہو اور وہ ابو کو بھی نہ بتادے۔ تھوڑی دیر بعد بابر کا میسج آیا۔ میں نے میسج پڑھتے ہی اس کو کال کی، سلام دعا کرنے کے بعد بابر نے مجھ سے پوچھا۔

''کشف جو کچھ آپ نے میسج میں لکھا ہے، کیا یہ بات سچ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہاں بابر، یہ سچ ہے، میں تم سے بہت زیادہ محبت کرتی ہوں۔''

میری یہ بات سنتے ہی بابر نے کہا۔

''اگر آپ کو مجھ سے محبت ہوگئی ہے تو کیا مجھے آپ سے محبت نہیں ہوسکتی ہے۔ مائی ڈیئر آگ دونوں طرف جل رہی ہے۔''

ہم سے محبتوں کی نمائش نہ ہوسکی
بس اتنا جانتے ہیں تمہیں چاہتے ہیں

اسی طرح ہماری محبت دن بدن پروان چڑھتی رہی اور نوبت ملاقات تک پہنچ گئی اور پھر ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

ہمیں ایک دوسرے کی محبت میں گم ہوئے تین سال کا عرصہ بیت گیا۔ ایک دن بابر سے میری ملاقات ہوئی تو بابر نے باتوں ہی باتوں میں مجھے ایک نئی بات بتائی۔ بابر نے کہا۔ ''کشف میری منگنی بچپن میں میری کزن سے ہوگئی تھی، لیکن میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا ہوں، اب شادی کروں گا تو بس آپ سے ورنہ نہیں۔''

پہلے تو یہ سن کر جیسے مجھ پر قیامت بیت گئی، پھر دل کو سمجھایا کہ میری وجہ سے بابر مشکل کا شکار نہ ہوجائے، میں نے بابر سے کہا۔ ''آپ کی منگنی نہ ہوئی ہوتی تو میں آپ سے ضرور شادی کرتی، لیکن اب نہیں۔ ہم ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے لیکن تمہاری منگیتر بھی ایک عورت ہے اور میں بھی ایک عورت ہوں اور ویسے بھی وہ آپ کے بچپن کی منگیتر ہے۔ اس کے دل میں بھی آپ بستے ہوں گے، لہٰذا آپ کو میری قسم آپ اس سے شادی کرلیں۔'' میری یہ بات سنتے ہی بابر کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور میری آنکھیں بھی نم ہوگئیں بابر نے مجھ سے کہا۔ ''کشف آپ نے اپنی قسم دے کر مجھے شادی کرنے پر مجبور کردیا ہے، ورنہ میں کسی بھی قیمت پر اس سے شادی نہ کرتا۔'' میرے کہنے پر کچھ دنوں کے بعد بابر کی شادی بہت ہی سادگی سے سرانجام پائی۔

بابر کی شادی ہونے کے بعد میں نے اس سے ملنا بہت کم کردیا اور فون پر بھی بات بہت کم ہوتی تھی۔ حالاں کہ بابر مجھ سے بڑے گلے شکوے کرتا رہتا۔ کشف تم بے وفا ہو۔ تم مجھے چھوڑ گئی ہو اور اسی طرح کی باتیں وہ کہتا رہتا۔ میں اسے ہر بار یہی کہتی تھی۔ بابر میری جان یہ بات نہیں ہے کہ میں آپ کو چھوڑ گئی ہوں یا میرا پیار جھوٹا تھا، بات یہ ہے کہ آپ کی اب شادی ہوگئی ہے آپ زیادہ سے زیادہ ٹائم اپنی بیوی کو دیا کرو۔ میری یہ باتیں سن کر وہ خاموش ہوجاتا۔ وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہا۔

بابر کی شادی کے ایک سال بعد اللہ پاک نے بابر کو چاند سا بیٹا دیا، جو کہ بالکل بابر کی کاپی تھا۔ جب مجھے اس کی خبر ملی تو مجھے بھی بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ کبھی کبھی انسان کی زندگی میں یہ خوشیاں بھی عارضی ثابت ہوتی ہیں، پھر اس کے بعد ساری زندگی رونا پڑتا ہے۔ بابر کے ساتھ بھی اس طرح ہوا۔ جب مجھے بابر کے ساتھ گزرے ہوئے وہ پل یاد آتے ہیں تو میرا دماغ گھومنے لگ جاتا ہے اور آنکھوں میں آنسو ہی آنسو ہوتے ہیں۔ میں اپنی کہانی کی طرف آتی ہوں۔

ہوا کچھ اس طرح کہ ایک رات تقریباً 12 بجے کا ٹائم تھا۔ بابر کی کال آئی کہ کشف میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں، میں نے پوچھا۔ ''کب؟''

بابر نے کہا۔ ''ابھی اور اسی وقت۔''

میں نے کہا۔ ''بابر آپ پاگل تو نہیں ہوگئے ہو۔ یہ بات آدھی رات کو کیسے ممکن ہے کہ میں آپ سے ملوں۔''

بابر میرے گاؤں سے اگلے گاؤں میں رہتا تھا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا، لیکن بابر اپنی ضد پر قائم رہا، آخرکار میں نے ہی ہتھیار ڈال دیے اور کہا۔ ''ٹھیک ہے آپ آجاؤ۔''

تھوڑی دیر گزرنے کے بعد پھر میرے نمبر پر کال آئی۔ ''کشف میں آپ کے گھر سے باہر کھڑا ہوں، پلیز

آپ دروازہ کھولو۔'' میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھول دیا۔ رات دو بجے کا وقت تھا۔ بابر نے میری طرف غور سے دیکھا اور اس طرح محسوس ہونے لگا جیسے مجھے آنکھوں کے راستے خود میں اتار رہا ہو۔

میں نے کہا۔ ''بابر کیا بات ہے آپ آج اتنے زیادہ پریشان کیوں ہو اور ساتھ گھبرائے ہوئے بھی لگ رہے ہیں۔'' بابر نے بس مجھ سے اتنی سی بات کی کہ کشف آج میرا دل بہت چاہ رہا تھا کہ میں آپ سے ملوں، پتا نہیں کیوں ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ تمہارا آخری دیدار ہو، اس لیے آپ کو مجبور کیا۔ جب بابر کی میں نے یہ باتیں سنیں تو رو پڑی۔

میں نے اس سے کہا۔ ''بابر آپ آج کس طرح کی باتیں کر رہے ہو، کیا ہوا ہے آپ کو؟ گھر میں تو سب خیریت ہے نا؟'' وہ کہنے لگا۔ ''ہاں سب خیریت ہے۔'' اس کے بعد بابر نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور جاتے وقت بس اتنا کہا۔ ''کشف اپنا بہت سارا خیال رکھنا اللہ حافظ۔'' میں نے دروازہ بند کیا اور واپس آ گئی اور اس سوچ میں ڈوب گئی کہ اللہ خیر کرے یہ آج پتا نہیں بابر کو کیا ہو گیا ہے، کیسی الٹی الٹی باتیں کر رہا تھا۔ اسی طرح سوچتے سوچتے رات کا باقی حصہ بھی گزر گیا۔

صبح ہو گئی مؤذن نے اذان دی۔ میں نے وضو کیا اور نماز پڑھ کر بابر کے لیے بہت ساری دعائیں کرنے لگی۔ نماز سے فارغ ہو کر اپنے روزمرہ کے کام میں مصروف ہو گئی۔ صبح کے آٹھ بج گئے تھے، جب میرا چھوٹا بھائی علی رضا دوڑتا ہوا گھر آیا اور امی کو بتانے لگا کہ بابر کا انتقال ہو گیا۔ جب اس کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی تو ایک دفعہ مجھے سب کچھ گھومتا ہوا نظر آیا، کچھ لمحہ تو مجھ پر سکتا طاری رہا۔ اس کے بعد جب ہوش سنبھالا تو میں نے بھائی سے کہا کہ یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو اور ایک زوردار تھپڑ بھی بھائی کے منہ پر مار دیا۔ کیوں اس طرح کا مذاق کر رہے ہو، کیوں جھوٹ بول رہے ہو۔ لیکن بھائی نے کہا۔ باجی اللہ کی قسم میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ بابر کا رات کو ایکسیڈنٹ ہوا ہے اور وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ لیکن میرا ذہن اس بات کو قبول کرنے کو تیار نہ ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہمارے گاؤں کی مسجد میں اس کے انتقال اور نماز جنازہ کا اعلان ہونے لگا، لیکن مجھے پھر بھی یقین نہ آیا۔ جب میں نے اس کے نمبر پر کال کی تو اس کے نمبر پر اس کے دوست نے اس خبر کو کنفرم کیا۔ میری تو جیسے دنیا ہی اُجڑ گئی۔ شادی کے بعد میں نے اس سے خود کو جان بوجھ کر علیحدہ کر لیا تھا کہ اس کی گھریلو زندگی متاثر نہ ہو اور اب اللہ نے میرے محبوب کو مجھ سے جدا کر دیا تھا۔

ہمارے گاؤں کی کچھ عورتیں اعلان سننے کے بعد باہر کے گاؤں جا رہی تھیں، میری امی بھی ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئیں، اُن کے ساتھ میں بھی اپنے محبوب کا آخری دیدار کرنے کے لیے اس کے گھر پہنچ گئی۔

بابر کے گھر میں کہرام برپا تھا۔ اس کی جوان موت پر ہر آنکھ اشک بار تھی۔ جب میں اس کے گھر میں داخل ہوئی تو میرا محبوب چارپائی پر ابدی نیند سو رہا تھا۔ جب اس کے منہ سے ایک عورت نے چادر ہٹائی تو اس کا چہرہ دیکھتے ہی میں اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی اور بے ہوش ہو کر گر گئی۔ مجھے نہیں پتا کہ کس نے میرے منہ میں پانی ڈالا، جب مجھے ہوش آیا تو میں پھر رونے لگی، آخر کار وہ وقت بھی آ گیا جب اس کو غسل وغیرہ دے کر جنازے کے لیے تیار کر دیا گیا۔ جب میں نے اس کو آخری دفعہ دیکھا تو خود پر قابو نہ پا سکی اور اس کے جسم کے ساتھ لپٹ گئی اور اونچا اونچا رونے لگی۔ پتا نہیں کس ظالم نے مجھے اس کی میت سے جدا کیا مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ جنازے کے بعد میرے بابر کے کو منوں من مٹی میں دفنا دیا گیا۔

بابر اور میری محبت ایک پاکیزہ محبت تھی، تبھی تو اس کو کشف ہو گیا تھا کہ وہ جلد ہی اس دنیا سے جانے والا ہے اسی لیے اس دنیا سے جاتے ہوئے میری تصویر اپنی آنکھوں میں بسا کر چلا گیا۔ آج بابر سے بچھڑے تین سال ہو گئے ہیں، لیکن اس کی یاد دل سے نہیں گئی، میرے گھر والوں نے بڑا زور دیا ہے کہ شادی کر لو لیکن میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اسی طرح بیٹھی رہوں گی لیکن شادی نہیں کروں گی، جب بابر سے میری شادی نہیں ہو سکی تو پھر کسی سے بھی نہیں۔ بس اب تو ایک ہی کام ہے اس کی یاد میں آنسو بہا لیتی ہوں اور اس کے لیے دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

میری یہ اسٹوری جو بھی پڑھے میری اس سے اپیل ہے کہ وہ دعائے مغفرت لازمی کرے، تاکہ میرے محبوب کو ایصال ثواب ملتا رہے۔

☆......☆

گُل دستہ

شاہدہ شکیل

حیرت وغم میں ڈوبی تنہائی کی شکار ایک ماں کی حسرتوں کی کہانی

میں روزانہ یونیورسٹی جاتے ہوئے صبح کے وقت ایک نسبتاً بزرگ مگر کافی فعال (Active) خاتون کو دیکھا کرتی جو روزانہ میرے گھر کے سامنے والے اسکوائر سے نکل کر رکشا کی تلاش میں اسٹاپ پر موجود ہوتی تھیں۔ ان کی اُداس اور ویران آنکھوں نے مجھے اُن سے بات چیت پر مجبور کردیا۔ ایک دن گفتگو کے دوران انہوں نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی جسے میں نے خوشی خوشی قبول کرلی، کیوں کہ میں خود بھی ان سے تفصیلی ملاقات کی متمنی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ان کی اُداس آنکھوں کے پیچھے یقیناً کوئی کہانی پوشیدہ ہے۔

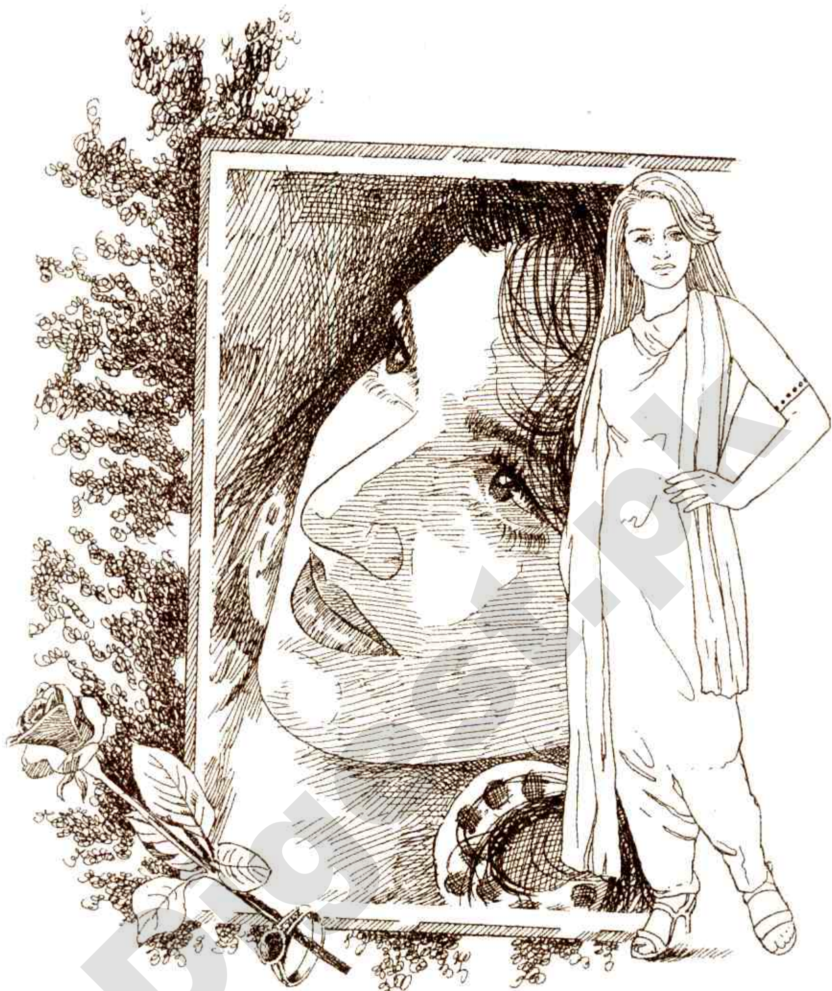
ایک شام میں گھر پر کافی بوریت محسوس کررہی تھی۔ تب اچانک مجھے وہ بزرگ خاتون یاد آگئیں اور میں امی سے اجازت لے کر ان کے گھر کی جانب روانہ ہوگئی، اُن کے گھر میں ان کے علاوہ کوئی اور موجود نہیں تھا، وہاں بھی ایک عجیب سی اُداسی پھیلی ہوئی تھی۔ گھر کے تمام دروازے اور کھڑکیاں یوں کھلے ہوئے تھے جیسے کسی کی آمد کے منتظر ہوں۔ باتیں ہوتی رہیں، وہ مجھ سے میری پڑھائی کا پوچھتی رہیں اور جب باتوں ہی باتوں میں، میں نے اُن سے ان کے اکیلے پن کی بات کی تو پہلے تو وہ خاموش ہوگئیں اور پھر کچھ توقف کے بعد اُن کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں، شاید میں نے اُن کی کسی دُکھتی رگ اور کسی دُکھ کو تازہ کردیا تھا؟

میرے بہت پوچھنے اور کریدنے پر انہوں نے بہت محتاط انداز میں اپنے اندر چھپے ہوئے کچھ غم میرے گوش گزار کیے کہ اُن کے ہنستے بستے گھر میں اُداسی نے کیسے ڈیرے جمالیے؟

انہوں نے اپنی کہانی کچھ یوں بیان کی کہ دس سال پہلے اپنے شوہر کے اچانک انتقال کے بعد اپنے دو بیٹوں کے ساتھ وہ اس گھر میں رہتی تھیں، ان کی ایک بیٹی ہے جس کی شادی وہ شوہر کی زندگی میں ہی کرچکی تھیں۔ دونوں بیٹے اپنی اپنی نوکری میں مصروف رہے۔ دونوں ماں کے فرمانبردار اور دُکھ سکھ کے ساتھی رہے۔

جب تینوں بچے چھوٹے تھے تو انہوں نے کچھ حالات کی وجہ سے ایک اسکول میں نوکری شروع کی تھی اور اب تک وہ اپنی انہی میڈم کے ساتھ وابستہ ہیں۔

شوہر کی وفات کے بعد عدّت پوری ہوتے ہی اللہ تعالیٰ نے فوراً اگلے دن ہی خانۂ کعبہ کی زیارت اور عمرہ کا انتظام کردیا اور وہ اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ عمرہ پر گئیں۔ وہاں سے واپس آکر بیٹوں کی شادی کرنے کا ارادہ کرلیا اور اللہ تعالیٰ نے وہ مرحلہ بھی بخوبی حل کرادیا۔



بہت خوب صورت اور خوشی کا زمانہ تھا وہ۔ دونوں بہوئیں ساتھ رہتی تھیں، کیوں کہ وہ خود پکانے کی شوقین تھیں لہٰذا تمام Cooking خود ہی کرلیا کرتیں۔ ایک سال بہت خوشیوں میں گزرا تو چھوٹے بیٹے نے اچانک علیحدہ ہونے کا پروگرام بنالیا، جسے انہوں نے بخوشی اور صبر سے قبول کرلیا۔ بڑا بیٹا ساتھ ہی رہا۔ اُسے اللہ تعالیٰ نے دو بیٹوں کی نعمت سے نوازا۔ بہت محبت اور پیار سے وقت گزرتا رہا۔ چھوٹا بیٹا کبھی کبھار آ جاتا، لیکن بہو نہیں آتی تھی، آج تک معلوم ہی نہیں ہوا کہ ان کو ان سب سے کیا شکایت ہے؟ پھر ابھی ایک سال پہلے اس ہنستے بستے گھر میں گویا بھونچال سا آ گیا جب بڑا بیٹا اچانک بلڈ پریشر ہائی ہونے کی وجہ سے گردوں کی بیماری کا شکار ہوا۔ وہ بیٹا مجھ سے بہت قریب اور محبت کرنے والا تھا۔ وہ اپنے دوستوں سے ہمیشہ کہا کرتا۔ ”میری امی، میری سب سے بڑی مددگار ہیں جن کے بغیر میں رہ ہی نہیں سکتا۔ وہ منٹوں میں گھر کے تمام مسائل کو حل کرلیتی ہیں۔“

یہ سب میں نے اس کی وفات کے بعد اس کے دوستوں کی زبانی سنا، کیوں کہ وہ بہت کم گو اور اپنے اندر

قائد اعظم زیارت میں

کوئٹہ اور زیارت میں قائد اعظم کے علاج کے جو مقامی انتظامات کیے گئے تھے وہ بہت معقول تھے اور جو ان کے ماہر معالجین تھے، وہ ہمارے ملک کے چوٹی کے ڈاکٹر تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس سلسلے میں اگر کسی کے دل میں کوئی شک وشبہ ہو تو دور ہو جانا چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ قائد اعظم کی شدید علالت کو صیغۂ راز میں رکھا گیا۔ اس کے متعلق جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں یہ کارروائی صرف قائد اعظم کی دلی خواہش کے احترام میں کی گئی ہوگی۔ آپ جانتے ہیں کہ ان کی تمام زندگی اپنے ذاتی معاملات کے بوجھ کو خود اٹھانے کی خوگر ہو گئی تھی وہ اپنی ذاتی تکالیف اور پریشانیوں کو تن تنہا سہنے کے عادی ہو گئے تھے اور انہیں ہرگز یہ پسند نہیں تھا کہ ان کے مہلک مرض کی اطلاع سے ان کے عقیدت مندوں اور جاں نثار قوم کو پریشان کیا جائے۔

(صدیق علی خان کی بے تیغ سپاہی سے اقتباس)

ہی سمت کر رہنے والا انسان تھا۔ وہ شام ایک قیامت سارے خاندان پر ٹوٹ پڑی۔ اس کا ایک بیٹا 5 سال اور ایک 3 سال کا تھا۔ بچوں کو تو خبر ہی نہیں ہونے دی کہ ان کا اتنا مشفق اور پیارا باپ اب دنیا میں نہیں رہا۔

انہیں دوسرے گھر میں دوستوں کے پاس بھجوا دیا تھا، کیوں کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ یہ معصوم بچے ساری زندگی باپ کی پچھلی باتیں بھول کر صرف یہی چہرہ کفن اور پھولوں میں لپٹا یاد رکھیں۔ بیٹے کی وفات کے بائیس دن بعد بہو کے والدین اسے گھر لے جانے کے ارادے سے آئے اور اُس نے خود شاید اپنی بہتری اور بھلائی سمجھتے ہوئے اپنے والدین کے ہاں چلے جانے کا ارادہ ظاہر کر دیا اور بچوں سمیت سب چلے گئے۔ شاید اللہ تعالیٰ نے اس کام میں بہتری لکھی ہوگی سب کے لیے جو یہ ہو گیا۔

اتنے بڑے گھر میں ایک مہینہ تو قریباً میں نے بالکل جاگتے اور باہر کا دروازہ بھی کھلا رکھتے ہوئے گزارا اور اپنے رب کے حضور ہمت، طاقت اور صبر ہی مانگا اور اس مالک نے مجھے یہ سب عطا کر دیا، کیوں کہ سب کچھ اُس ذاتِ باری تعالیٰ کے حکم اور لکھے ہوئے نصیب کے مطابق ہوتا ہے۔ اللہ ہی وہ برگزیدہ ہستی ہے جس نے تمام کائنات کا نظام سنبھالا ہے اور اپنے بندوں کی بہتری کے لیے ہر کام اپنے وقت پر انجام پا جاتا ہے۔ اس لیے اُن کو سب کے کہنے کے باوجود کسی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔

دوسرا بیٹا کبھی کبھار آتا رہا۔ کبھی چھٹی والے دن چکر لگاتا۔ ماں بھی اس کے ساتھ بیٹے کی قبر پر دعا کر آتی۔

پچھلے ہفتے ''مدرز ڈے'' پر شام کے وقت گھر کی کھڑکی سے بیٹے کی آواز آئی کہ ''مام! باہر آجایئے۔ یہاں اچھی ہوا چل رہی ہے۔'' میں نے اندر آنے پر اصرار کیا مگر جواب نفی میں ملا۔ میں باہر گئی تو اس کے ہاتھ میں پھولوں کا ایک گلدستہ تھا جو وہ اپنی محبتوں کے اظہار کے لیے لایا تھا اور مجھے سرپرائز کرنے کے لیے باہر بلایا تھا۔ میں نے اسے گلے سے لگا کر پیار کیا اور گلدستہ لے لیا۔ وہ باہر سے ہی چلا گیا، میرے دل میں ایک ہوک میں اٹھی کہ اب اولاد کے پاس اتنا بھی وقت نہیں رہا کہ وہ دو گھڑی بیٹھ کر ماں کا حال یا اس کے مسائل پوچھ سکیں؟ جبکہ بیٹی جو کہ بڑے خاندان میں رہتے ہوئے اپنے گھر کی تمام ذمہ داریاں پوری کر کے ہفتے کی دوپہر آتی ہے اور اتوار کی شام سے پہلے چلی جاتی ہے۔ ان خاتون کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے جنہیں وہ بہت برداشت اور صبر سے پونچھ رہی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ اب ایک ماں صرف ایک ''گلدستے'' کی مستحق رہ گئی ہے؟

اللہ تعالیٰ تمام بچوں کو ہدایت اور رہنمائی دے کہ کل کو اُن کو بھی اس عمر پہ آنا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ اللہ کبھی بھی ان بچوں کو کسی آزمائش میں نہ ڈالے کہ تب بھی ماں کا دل ہی تڑپے گا اور روئے گا۔

وہ ماں سب کے لیے دعا گو ہے۔ اپنے بیٹے، بیٹی، بہو، پوتے، نواسے۔ سب کے لیے اپنے رب سے بھلائی اور ان کی خوشی مانگتے ہوئے اس کے ہونٹ نہیں تھکتے۔ وہ شکر ادا کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس قابل کیا ہے کہ وہ محنت کر کے اپنی زندگی گزار رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو کسی کا محتاج نہ کرے اور ہمت، طاقت اور صحت کی دولت سے نوازے، جانے کب آنکھ بند ہو جائے۔



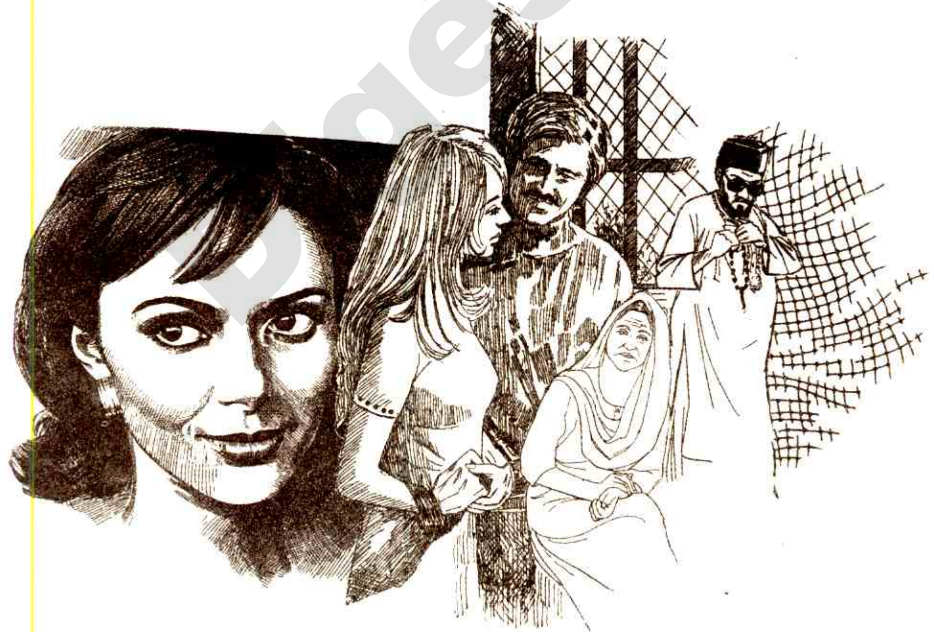
نویں سچ بیانی

عادت کی بھینٹ

فاطمہ بتول

خاموشی کی سزا بھگتنے والی ایک لڑکی کی سچی داستان

میرا نام فاطمہ ہے۔ میں نے خانیوال کے ایک مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے اردگرد غربت ہی غربت دیکھی۔ والد صاحب پینٹر تھے، مگر مستقل مزاجی نہ ہونے کی



وجہ سے ہمیشہ گھر میں تنگی رہی۔ اللہ زندگی دے ہمارے دادا جان کو، انہوں نے زندگی کے ہر موڑ پر ہماری بہت مدد کی۔ والد صاحب کو پڑھایا، ان کی شادی کی مگر ان کا جب جی چاہتا کام کرنے چلے جاتے، ورنہ فارغ گھر میں بیٹھے رہتے۔ دادا جان دوپہر کو کسی کے ہاتھ سبز راشن وغیرہ بھیج دیتے۔ والد صاحب نے جب دیکھا کہ ہمارے دادا جان راشن وغیرہ بھیج دیتے ہیں تو انہوں نے کام پر جانا بالکل چھوڑ دیا۔ دادا جان کے گھر کسی بچے کو بھیج دیتے کہ آج یہ بھیج دیں، آج وہ بھیج دیں۔

دادا جان کا کوئی مستقل کاروبار نہیں تھا۔ محنت مزدوری کرتے تھے۔ دادی جان وفات پا چکی تھیں۔ میری امی گاؤں کی سیدھی سادی عورت تھیں۔ انہوں نے کبھی ہماری تربیت اور مستقبل کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ ہم پانچ بہنیں ہیں، ان میں میرا نمبر دوسرا ہے۔ بڑی بہن کی شادی گاؤں میں ہوگئی تھی۔

میں دنیا کی باتوں اور غربت کے ہاتھوں وقت سے پہلے جوان ہوگئی۔ تب میرے ابو کو ہوش آیا کہ بیٹی کے بارے میں بھی سوچنا ہے۔ میرے ابو کی ایک عادت ایسی تھی کہ سارے خاندان والے ہم سے دور ہوتے چلے گئے۔ وہ یہ کہ اگر کسی کی تعریف کرتے تو اسے آسمانوں کی بلندیوں تک پہنچا دیتے اور کچھ عرصے بعد اس شخص سے ناراض ہو کر اسے زمین کی پستیوں تک لے آتے۔

والد صاحب کی اسی عادت نے میری بھی زندگی تباہ کردی۔

آج سے تقریباً دو سال قبل ایک شخص میرے والد کے پاس اپنے رشتے کے سلسلے میں آیا کہ مجھے کوئی رشتہ ڈھونڈ دیں۔ وہ میرے والد کے پرانے دوست کا بیٹا تھا۔ انہوں نے اسے میرے والد کے پاس بھیجا تھا۔ اس کا نام عابد تھا۔ اس کے چار بھائیوں کی شادی ہوچکی تھی۔ عابد سادا سی شکل صورت کا مالک تھا، مگر ان کی بہت ساری زمینیں تھیں۔ اچھے بھلے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ میرے والد نے فوراً میرا رشتہ ان کے سامنے رکھ دیا اور انہوں نے فوراً ہاں کردی اور وہ اسی وقت نکاح کرنے پر بضد ہوگئے۔

میرے والد نے ان کی یہ بات بھی مان لی اور اسی وقت گاؤں کے مولوی صاحب کو بلا کر میرا نکاح عابد کے ساتھ کردیا گیا اور رخصتی کے لیے ایک سال کا وقت لے لیا۔

میرے والد ان کی زمینیں اور دولت دیکھ کر سب کچھ بھول گئے۔ انہوں نے میرے دادا جان سے مشورہ کرنا بھی گوارہ نہیں کیا۔ نکاح کے بعد دادا جان کو خبر ہوئی تو وہ سخت ناراض ہوگئے۔ انہوں نے ان سے صرف ایک بات کہی کہ اگر انسان بکری لینے بھی جاتا ہے تو دو تین لوگوں سے مشورہ ضرور کرتا ہے۔ تم نے بیٹی دے دی اور ہمیں بتایا تک نہیں۔ اس بات پر ضرور ہمارا پورا خاندان ہم سے ناراض ہوگئے، مگر میرے والد کو کسی کی پروا نہیں تھی۔ انہوں نے لڑکے والوں کو کہہ دیا تھا تمام جہیز اور لڑکی کے کپڑے کھانا وغیرہ آپ لوگ کریں گے۔ میرے والد عابد کی تعریفیں کر کر کے نہ تھکتے تھے۔ عابد نے مجھے موبائل لے کر دیا۔ ہم گھنٹوں رات کو فون پر بات کرتے۔ سارا دن میسج پر بات ہوتی۔ ہفتے میں ایک دو بار عابد ہمارے گھر آتا تو والد صاحب اور والدہ اس کی خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑتے۔

دیکھتے ہی دیکھتے سال گزر گیا۔ عابد کے گھر والوں نے دل کھول کر روپیہ خرچ کیا۔ عابد امی کو رقم دے دیتا تھا اور ہم لوگ خود شاپنگ کرنے جاتے تھے اور قیمتی کپڑے اور دیگر اشیاء خریدتے تھے۔ پیسے کم ہوتے تو میں عابد کو فون کر دیتی تو وہ مزید پیسے ہمیں بھیج دیتا تھا۔

میری امی مجھ سے زیادہ اپنے اور چھوٹی بہنوں کے لیے خریداری کرتیں اور مجھے کہتیں کہ عابد سے اور پیسے مانگو۔ آخر شادی کا دن بھی آپہنچا، کھانا وغیرہ عابد نے پکوایا، غرض ہر قسم کا خرچہ لڑکے والوں نے برداشت کیا۔ میرے والد اور والدہ خوش تھے کہ ان کے سر سے وزن اُتر گیا۔

تمام مہمانوں کو عابد کی تعریفیں کر کے یہ بتایا جارہا تھا کہ عابد بہت بڑا زمیندار ہے اور لاکھوں کا مالک ہے۔ میں بیاہ کر عابد کے گھر آگئی تھی، مگر یہ دیکھ کر میں

حیران رہ گئی کہ جس عابد کی تعریفیں کر کے میرے امی، ابو نہ تھکتے تھے، اس کا گھر انتہائی سادا اور کچی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ مگر یہ سب چیزیں مجھے اچھی لگنے لگیں، کیوں کہ عابد بہت اچھے اخلاق کا ملک تھا۔ وہ بہت پیار کرنے والا شخص تھا، ہماری زندگی بہت اچھی گزرنے لگی۔ جیسے میں نے پہلے کہا کہ میرے والد کی عادت تھی کہ وہ پہلے آدمی کی تعریفیں کر کر کے اسے آسمان پر لے جاتے، پھر کچھ دنوں بعد اسی شخص کو زمین کی پستیوں تک گرا دیتے تھے۔ یہی کچھ میرے گزشتہ شوہر عابد کے ساتھ ہوا تھا۔

ابھی ہماری شادی کو چار ماہ ہوئے تھے کہ ایک دم میرے والد نے عابد میں کیڑے نکالنا شروع کر دیے۔ وہی عابد جس کی تعریفیں ہر آنے والے مہمان کے سامنے کی جاتی تھی۔ اب وہی عابد دنیا کا سب سے نکما اور نکھٹو بن گیا تھا، ہر آنے والے کے سامنے عابد کی کوتاہیاں بتائی جاتیں۔ ایک بار تو حد ہی ہوگئی۔ میں ایک ماہ بعد ملنے کے لیے امی کے گھر آئی تو امی ابو نے مجھے گھر بٹھالیا اور صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اب تم اس گھر میں واپس نہیں جاؤ گی۔ تین دن بعد جب عابد مجھے لینے آیا تو امی نے دروازہ کھولنے سے انکار کر دیا۔ عابد کافی دیر دروازہ بجاتا رہا۔ میرے نمبر پر کال کرتا رہا، مگر میرا موبائل ابو مجھ سے لے چکے تھے۔ ابو نے عابد سے ملنے سے انکار کر دیا۔ وہ بیچارہ میرے دادا ابو کے پاس گیا کہ مجھے بتائیں تو سہی کہ میرا قصور کیا ہے؟ دادا ابو نے ابو کو بلایا اور سمجھایا کہ تم کیا کرتے ہو، کیوں بچی کی زندگی تباہ کرنی ہے۔ اسے اپنے گھر بھیجو۔

مگر میرے ابو صرف ایک بات کہتے کہ مجھے وہ اچھا نہیں لگتا۔

میری تربیت اس قسم کی ہوئی تھی کہ میں اپنے حق میں کچھ بول بھی نہ سکتی تھی۔ جو امی ابو کہتے مجھے ماننا پڑتا۔ میں ایک قیدی بن کر زندگی گزارنے لگی تھی۔ چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا، اس عرصے میں عابد نے کس کس کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا اور کس کس کے آگے نہیں رویا کہ میرا قصور تو مجھے بتائیں، کس چیز کی کمی دی میں نے اپنی بیوی کو، کس جرم کی سزا مجھے دے رہے ہیں؟ مگر میرے والد پر کسی بات کا اثر نہ ہوتا، بلکہ جب عابد آتا، تو والد صاحب گھر سے باہر نکل جاتے تھے اور اگر راستے میں ملتا تو والد صاحب راستہ بدل لیتے تھے۔ آخر ایک روز میرے والد نے عابد سے طلاق کا مطالبہ کر دیا، جسے عابد نے سختی سے رد کر دیا کہ مر جاؤں گا، مگر طلاق نہیں دوں گا، گو کہ میری شکل صورت، کچھ خاص نہیں تھی، مگر عابد مجھ سے ٹوٹ کر پیار کرتا تھا جس کا احساس مجھے اب ہو رہا ہے۔ میں ایک بچے کی ماں بھی بننے والی تھی۔ آخر والد صاحب نے عدالت سے رجوع کر لیا۔ عابد نے یہ شرط رکھی کہ اگر میری بیوی فاطمہ عدالت میں بیان دے دے کہ میں عابد کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو میں اسے طلاق دے دوں گا۔

عابد کو اپنے پیار پر یقین تھا کہ میں کبھی ایسا بیان نہیں دوں گی، مگر...... میرے امی اور ابو نے سختی سے کہہ دیا کہ تم عدالت میں یہ بیان دو گی کہ میں عابد سے طلاق چاہتی ہوں۔ عابد بھی عدالت میں موجود تھا، امی ابو کے کہنے پر میں نے عدالت میں وہی کہا جو مجھے بتایا گیا، عابد کے دل پر کیا گزری ہوگی، میں نے اسی وقت عابد کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے، مگر میں بے حس ہو چکی تھی۔

آخر مجھے طلاق ہوگئی، طلاق کے کچھ عرصے بعد میں نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ آج میں اپنے امی ابو کے گھر زندگی گزار رہی ہوں، مجھے نہایت افسوس ہے کہ میں اپنے امی ابو کی عادت کے بھینٹ چڑھ گئی۔

مجھے آج تک سمجھ نہیں آیا کہ میرے ساتھ یہ سب کیوں ہوا؟ شادی کے وقت بھی میں نے ماں باپ کی عزت کا پاس رکھا لیکن انہوں نے ہی میری اور میرے بچے کی خوشیاں چھین لیں۔ شاید یہ میری بزدلی تھی۔ مجھے اپنے حق کے لیے آواز اٹھانی چاہیے تھی۔ وہ بے شک میرے ماں باپ تھے لیکن میں عابد کی بیوی اور اس کے ہونے والے بچے کی ماں بھی تھی، لیکن میرے والدین کی ضد اور اَنا کے ہاتھوں ہماری زندگی برباد ہوگئی۔ کبھی کبھی خاموشی بھی سزا بن جاتی ہے اور شاید یہ ہی میرا قصور تھا۔

☆......☆

ناکردہ گناہ



نصرت سرفراز

ناکردہ گناہ کی سزا پانے والی ایک عورت کی حیران کن کہانی

جب میں نے ایم اے میں جرنلزم کو بطور سبجیکٹ سلیکٹ کیا تو میرے ارادے بہت بلند تھے اور قلم کے ذریعے معاشرے کو سدھارنے کے عزائم میں بہت پختگی تھی لیکن جیسے جیسے عملی دنیا کی حقیقتوں سے شناسائی ہوئی اور دریائے صحافت میں غوطے لگائے تو معلوم ہوا کہ یہ تمام بلند و بالا ارادے ریت کی دیوار ثابت ہوئے اور یکے بعد دیگرے مسمار ہوتے چلے گئے۔

حقیقت کچھ یوں ہے کہ ہم معاشرے کا مکروہ چہرہ سامنے تو لا سکتے ہیں مگر اس چہرے کی کراہیت دور نہیں کر سکتے۔ ہم ظلم کے خلاف آواز تو بلند کر سکتے ہیں مگر ظالم کا گریبان پکڑنے کی صلاحیت ہم میں نہیں ہے۔ ہم ظلم سہنے والوں کی آواز خونِ دل سے صفحۂ قرطاس پر بکھیرنے کی صلاحیت ضرور رکھتے ہیں مگر مظلوم کو انصاف کی منزل تک نہیں پہنچا سکتے کہ اس منزل کا راستہ اس قدر پیچیدہ اور طویل ہے کہ عموماً ظالم ظلم کرتا رہتا ہے اور مظلوم انصاف تک پہنچتے پہنچتے اپنی ابدی آرام گاہ تک پہنچ جاتا ہے اور سکون سے سو جاتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالم کی رسی دراز کرتا ہے مگر بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ خالقِ کائنات ظالم کی رسی دراز کرتے کرتے ایک دم اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لیتا ہے اور اس دوران بعض اوقات ظالم کے ساتھ ساتھ مظلوم بھی اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا وصول کر لیتا ہے یعنی گیہوں اور گھن دونوں پس جاتے ہیں۔

تمہید طویل ہوتی جا رہی ہے مگر کیا کروں بتانے کا مقصد بس یہی ہے کہ ہم صحافی طبقہ مل کر بھی صرف ظالم کی نشاندہی کر سکتا ہے اور وہ بھی اپنی جان پر کھیل کر، لیکن مظلوم کو انصاف دلانا اس کے بس میں نہیں ہوتا۔ ہم تو بس سچائی اور حقائق صفحوں پر بکھیرتے چلے جاتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ مظلوم کی زندگی اتنی طویل ہو جتنا ہمارا نظامِ انصاف کا راستہ طویل ہے۔ پیشہ ورانہ ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے بعض ایسے واقعات علم میں آتے ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ انہیں سچی کہانیاں کے قارئین کے لیے تحریر کیا جائے تاکہ وہ معاشرے کی سفاکیوں سے لاعلم نہ رہ جائیں یہ واقعہ جو آج میں قلم بند کرنے جا رہی ہوں مبنی بر حقیقت ہونے کے باوجود ایک افسانہ معلوم ہوتا ہے۔

واقعہ یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ مجھے اپنے اخبار کے خواتین ایڈیشن کی کور اسٹوری کے لیے پاکستان کی دس محنتی اور کامیاب خواتین کا انٹرویو کرنا تھا جو کہ زندگی

کے مختلف شعبوں میں اپنی ذمہ داریاں بحسن و خوبی کامیابی کے ساتھ نبھارہی ہوں۔ اسی حوالے سے میں نے اسکول پرنسپل، بینکر، اینکر، ٹی وی آرٹسٹ، وی جے، سول انجینئر، پائلٹ، مایہ ناز ڈاکٹرز اور جیلر خواتین کی لسٹ مرتب کی۔ آج جو واقعہ میں آپ کو سنانے جارہی ہوں وہ سینٹرل جیل کراچی کی شعبہ خواتین کی ہیڈ جیلر کے انٹرویو کے دوران میرے علم میں آیا۔

میرا بنیادی مقصد تو کامیاب پاکستانی عورت کا انٹرویو کرنا تھا، مگر میری نظر ایک ایسی عورت پر پڑی جو پاکستانی تو تھی، مگر کامیاب نہ تھی جبھی تو زمین پر گھٹنے اپنے سینے سے لگائے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایسی یاسیت اور ویرانگی تھی کہ میں اُس کی طرف متوجہ ہوئے بنا نہ رہ سکی اور اپنے موضوع سے ہٹ کر جیلر سے یہ پوچھنے پر مجبور ہوگئی کہ یہ عورت کون ہے اور یہاں کیوں بیٹھی ہے؟ شاید کوئی اور موقع ہوتا تو یقیناً مجھے اپنے کام سے کام رکھنے کا مشورہ مفت میں ملتا جو اکثر ایسے اوقات میں میرے تجربے میں آتا رہتا ہے، مگر شاید کور اسٹوری بننے کا خمار اور خوشی ہی تھی کہ جیلر نے مہربانی فرما کر نہ صرف اُس کے بارے میں بتایا بلکہ میری ذاتی درخواست پر اُس سے کچھ دیر بات چیت کرنے کی اجازت بھی مرحمت فرمادی۔

ابتدا میں تو وہ کچھ بھی اپنے بارے میں بتانے کے لیے تیار نہ تھی، مگر شاید یہ میرے نرم لہجے اور التجا کا اثر ہی تھا کہ اُس نے اپنی المناک داستان مجھ سے شیئر کی۔ اُس کی کہانی من و عن اُسی کی زبان میں سچی کہانیاں کے قارئین کے لیے پیش خدمت ہے۔

میرا نام شہزادی ہے۔ میں اپنے ماں باپ کی پہلی اولاد تھی، لہٰذا میری پیدائش پر وہ دونوں کافی خوش تھے۔



یہ خدا کی مرضی ہی تھی کہ تین سال اکلوتا رہنے کا اعزاز بھی مجھے حاصل ہوا، ابا میری اماں کے پیر دھو دھو کر پیتا تھا۔ صحیح معنوں میں جورو کا غلام تھا۔ دو تین سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ مجھے تو کچھ یاد نہ تھا یہ سب باتیں تو مجھے میری دادی کے ذریعے معلوم ہوئیں جو کہ نابینا تھیں، مگر کان اور زبان تو رکھتی تھی۔ دراصل میری بد قسمتی کے دن وہیں سے شروع ہوئے جب اماں دوبارہ اُمید سے ہوئیں۔

میرے ابا کا کوئی خاص ذریعہ آمدنی تو نہ تھا، روزانہ کی بنیاد پر وہ چند روپے کما کر لاتے تھے۔ گھر میں افراد کی تعداد بھی کم تھی، لہٰذا یوں سمجھ لیں کہ بس ہم فاقہ نہیں کرتے تھے۔ کھانے پینے اور توانائی حاصل کرنے کی کوئی عمدہ غذا ہمیں میسر نہ تھی۔ پھل فروٹ وغیرہ تو آسمان سے تارے توڑ کر لانے کے مترادف تھا۔

میری دادی کے مطابق میں تین سال کی تھی مگر ایک سال کی لگتی تھی۔ بیمار نابینا دادی چارپائی پڑی رہتی تھیں اور ابا کو اپنی پڑی رہتی تھی۔ دادی بتاتی تھیں ہر رات تیرا پیو وظیفۂ زوجیت ایسی پابندی سے ادا کرتا تھا جیسے یہی وظیفہ اسے سیدھا جنت تک لے جائے گا۔ بیمار حاملہ بیوی کے حقوق تو اُسے یاد نہ رہتے، مگر نہ جانے کس مولوی کی یہ بات اُسے ضرور از بر تھی کہ وہ عورت جس کا خاوند اُسے بلائے اور وہ منع کر دے تو ستر ہزار فرشتے اُس پر رات بھر لعنت بھیجتے ہیں، شاید وہ مولوی یہ بتانا بھول گیا تھا کہ چھ ماہ کی حاملہ بیوی کو دن میں تین وقت کا کھانا کھلانا بھی خاوند کے فرائض میں شامل ہے، ورنہ یہ کھیل تو ہر روز جانور بھی کھیلا کرتے ہیں۔ بہر حال اماں کو پیٹ بھر کر روٹی تو نصیب نہ تھی، علاج کے لیے دوائی کیا خاک ملتی، جو کچھ گھر میں ہوتا وہ مجھ کو اور دادی کو کھلا دیتی، ابا تو باہر سے کھا پی کر آتا اور رات بھر شوہر ہونے کا خراج وصول کرتا کہ اُسے اس وصولی کا تو قانوناً حق حاصل تھا۔ وہ کوئی مجرم تو نہ تھا کہ اماں اس کی رپورٹ تھانے میں درج کراتی کہ کس طرح میرا جائز شوہر میری بیٹی کا باپ اُسے زندگی کے آخری کنارے کی طرف لے جا رہا تھا۔

دادی بتاتی تھیں میں چار سال کی تھی جب ایک رات اماں کو درد اُٹھا۔ ابا اپنی دھوتی سنبھالتا ہوا کمرے سے نکلا اور دادی سے بولتا ہوا گیا کہ میں دائی اماں کو لینے جا رہا ہوں، میں کمرے میں گئی تو اماں درد کے مارے تڑپ رہی تھی۔ میں نے اُسے گلاس بھر کر پانی پلایا تو وہ بولی۔ ہمیشہ خوش رہو بیٹا۔ یہ وہ آخری جملہ تھا جو میری ماں نے مجھ سے کہا تھا، پھر دائی اماں آ گئیں اور اُس نے مجھے دھکا دے کر کمرے سے باہر نکال دیا اور کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

بند کمرے سے آتی اماں کی چیخوں کی آواز میرا دل دہلا رہی تھی۔ میں کم عمر نا سمجھ بچی تھی۔ مجھے لگا دائی اماں میری اماں کو مار رہی ہے جبھی تو وہ رو رہی ہے اور واقعی وہ اماں کو مار ہی تو رہی تھی۔ میں نے دادی سے پوچھا۔ دائی اماں کیا کر رہی ہے تو وہ بولیں۔ دائی اماں تمہارے نئے بھائی کو دنیا میں لے کر آئے گی۔ بھائی تو کیا آتا اماں بھی چلی گئی۔ دائی اماں نے باہر آ کر اعلان کیا اللہ کی مرضی اور ابا بھی اللہ کی رضا پر خاموش ہو گیا۔ مرضی تو اللہ کی تھی مگر انسانوں کا عمل دخل بھی تھا کہ نہیں، یہ پوچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ سوئم تک محلے والوں نے خوب کھانا بھیجا۔ شاید زندگی میں پہلی مرتبہ ہم دادی پوتی نے پیٹ اور نیت بھر کر کھانا کھایا تھا۔

اماں کو مرے چوتھا دن تھا کہ رات کو دروازہ بجا۔ دروازہ کھلا تو دیکھا ابا کے ساتھ ایک عورت خوب گوٹا کناری کا زرق برق لباس پہنے کھڑی ہے۔ تیز خوشبو کی مہک میرے نتھنوں تک پہنچ رہی تھی۔ وہ گھر میں داخل ہوئی تو اماں نے پوچھا، کون ہے؟ میرا ابو بولا۔ تیری نئی بہو ہے اور مجھے کہا۔ تیری اماں ہے دادی دو ہتڑ سینے پر مار کر بولیں۔ ''آئے ہائے ظالم ابھی تو تیری پہلی جورو کا سوگ بھی ختم نہیں ہوا تو دوسری لے آیا۔''

ابا بولا۔ ''اماں سوگ تین دن کا ہوتا ہے اور آج چوتھا دن ہے۔'' واقعی مرد کی کوئی عدت تو ہوتی نہیں وہ آزاد ہے، ابا کو اپنے مطلب کی ہر بات خوب از بر تھی۔ ایک بار پھر وہی دن اور رات تھے ابا اور ابا میاں کا وظیفہ۔ جیسے جیسے میں بڑی ہوتی گئی۔ مجھے پتا چلتا رہا کہ یہ نئی ماں بہت چالاک ہے۔ اماں تو سارا دن کام میں لگی رہتی تھی اور رات کو ابا کی خدمت میں حاضر رہتی

تھی جب کہ نئی ماں تو سارے گھر کا کام مجھ سے کرواتی تھی اور خود سارا سارا دن پڑی سوتی رہتی تھی اور رات کو ابا کی خدمت اور ابا کی خدمت تو وہ بس اتنی ہی کرتی کہ رات کو دودھ وہ اپنے ہاتھوں سے گرم کر کے ابا کو پلاتی تھی اور ابا مزے سے خراٹے بھرتا سو جاتا تھا۔ یہ بات تو بہت سالوں بعد میری سمجھ میں آئی کہ سارا دن کام کاج کو ہاتھ نہ لگانے والی اماں رات کو دودھ کا گرم گلاس اپنے ہاتھوں سے ابا کو کیوں پیش کرتی ہے اور وہ دودھ لاتا کون ہے جسے پی کر ابا اتنا غفیل سو جاتا تھا اور پھر اماں باہر صحن میں چارپائی ڈال کر مزے سے سو جاتی۔ نئی اماں کی اس کارروائی کے باوجود ایک نہ دو پورے چھ بچے اس کے پیدا ہوئے، جن میں سے تین دائی کو پیارے ہو گئے۔ خود تو وہ جونک کی جنی تھی جو ہر بار دائی کے ہاتھوں زندہ بچ نکلتی تھی۔ ویسے دیکھا جائے تو یہ دائی بھی پورے گاؤں کی عورتوں کے لیے ملک الموت سے کم نہ تھی۔ سخت استخوانی ہاتھ، کرخت مردانہ چہرہ اور بھاری آواز۔ بڑی قسمت کی دھنی زچہ ہوتی جو اس کے ہاتھوں بچہ صحیح سلامت اس دنیا میں آ جاتا اور وہ خود بھی زندہ رہ جاتی۔

نابینا دادی کا وجود میرے لیے کسی دولت سے کم نہ تھا۔ وہ آنکھوں سے نابینا ضرور تھی مگر دل کی بینا تھی۔ دل سے اُسے سب دکھائی دیتا تھا۔ نئی ماں کا میرے ساتھ ناروا سلوک اور ابا کے ساتھ اس کا سلوک بھی مگر وہ لاچار کچھ کر سکنے پر قادر نہ تھی۔ جب دن بھر کی تھکی ہاری رات کو میں سونے لیٹتی تو دادی اپنے نرم نرم مہربان ہاتھوں سے میرا سر سہلاتی اور میں نیند کی پُرسکون وادیوں میں ہو جاتی۔

میری حقیقی بدنصیبی کے دن تو تب شروع ہوئے جب دادی اپنے نرم ہاتھوں والے وجود کے ساتھ منوں مٹی اُوڑھ کر سو گئیں۔ اس وقت تک میں چودہ سال کی ہو چکی تھی۔ دادی کی آنکھ بند ہونے کی دیر تھی کہ رازو نے اپنا رشتہ دوبارہ میرے گھر بھیج دیا جو وہ پہلے بھی دادی کی زندگی میں بھیج چکا تھا مگر انہوں نے صاف منع کر دیا تھا کہ ابھی میری دھی بہت چھوٹی ہے، مگر نئی اماں تو چالاک ہونے کے ساتھ ساتھ لالچی بھی تھی۔ ہمارے گھر پر غربت نے اپنے پَر پھیلائے ہوئے تھے تو رازو کے گھر کو دولت کی دیوی نے اپنے پروں تلے چھپایا ہوا تھا ایسے میں یہ کون دیکھتا ہے کہ یہ دولت کہاں سے آئی ہے۔ وہ شرابی ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر جرائم میں بھی ملوث تھا۔ جب ہی تو ان پڑھ ہونے کے باوجود دولت اُس کے گھر کی باندی تھی۔ اُس نے رشتہ دینے کے ساتھ ہی پھل اور مٹھائی کے ٹوکرے، نئی اماں کے جوڑے، ابا کا سوٹ تین نئی دھوتیاں اور تو اور باورچی خانے میں مہینہ بھر کا راشن ڈلوا کر نئی اماں سمیت ابا کا بھی منہ بند کر دیا اور یوں میں میکے کی بدقسمتی سمیٹ کر سسرال کی قید بامشقت میں آ گئی یہ عقدہ بعد میں کھلا کہ اس سے پہلے بھی وہ گھر کا خرچہ اٹھایا کرتا تھا تبھی تو اماں دودھ کے گلاس بھر بھر کر ابا کو پیش کرتی تھی۔ یہاں پیٹ بھر کر کھانا تو ضرور ملتا تھا مگر اس کھانے کا خراج بھی سود کے ساتھ وصول کیا جاتا تھا۔ میں نے تو مرد کا عورت کے حصول کے لیے ابا کا خوشامدانہ طرزِ عمل ہی دیکھا تھا مگر یہاں تو اس حصول کے لیے خوشامدانہ کے بجائے وحشیانہ طرزِ عمل اختیار کیا جاتا تھا۔

شہزادی کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ بہ رہے تھے۔ باجی کوئی نکاح نامے پر دستخط کیے بغیر یہ کام کرے تو زمانے بھر میں اس کی تھو تھو ہوتی ہے۔ تھانے میں رپورٹ درج کرائی جاتی ہے، مگر پکے کاغذ پر انگوٹھا لگانے کے بعد مرد بند کمرے میں کتنا بااختیار ہوتا ہے، یہ میرا دل ہی جانتا ہے اور میرا وجود اس کا گواہ ہے۔ میں کبھی کمرے میں جانے سے انکار کرتی تو میری ساس کہتی۔ جا بی بی جا یہ تو مرد کا حق ہے وہ جیسے چاہے اسے استعمال کرے۔

شادی شدہ زندگی میرے لیے عقوبت خانے سے کم نہ تھی۔ وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے پکی عمر کا مرد اور میں نازک سی کلی، ہر رات وہ مجھے ایسی آزمائش سے گزارتا کہ ہر دن میں دعا کرتی کہ یا اللہ اس دن کی رات نہ آئے پھر ایک دن کی ایسی کالی رات آئی کہ میں اُس عقوبت خانے سے نکل کر اس زندان خانے میں آ گئی۔ اس بات کا گواہ تو پورا گھر ہی تھا کہ میں اپنے خاوند کے ساتھ تنہائی میں جانے سے گھبراتی تھی اور یہی ڈر میرے ناکردہ گناہ کا

واحد گواہ ٹھہرایا گیا۔

اُس کالی رات میری ساس سمیت پورا گھر کسی شادی میں گیا ہوا تھا صرف میں اپنے خاوند کا مشقِ ستم بننے کے لیے تنہا گھر میں موجود تھی۔ میں مرجانے کا حوصلہ تو رکھتی تھی مگر کسی کو مارنے کی ہمت میرے اندر ہرگز نہ تھی مگر میرے ہاتھوں میرے خاوند کی موت واقع ہوگئی لیکن اس میں ذرہ برابر بھی میرا قصور نہ تھا لیکن یہ ماننے کے لیے کوئی تیار نہ تھا اور رہی میری گواہی تو ایک تو وہ ویسے ہی آدھی اور ملزم عورت کی تو آدھی گواہی بھی نہیں رہتی۔

سارا گھر بشمول میری ساس کے اپنے بیٹے کی موت کا ذمہ دار مجھے ٹھہرا رہا تھا۔ میری کسی نے ایک نہ سنی، سو میں چپ چاپ مجرم قرار دے دی گئی۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ اُس رات جب رازو گھر آیا تو اُس کے ہاتھ میں قیمے کی تھیلی تھی جو اُس نے مجھے پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”جا جلدی سے اسے پکا کر روٹی بنا کر لے آ۔ ساتھ مل کر کھانا کھاتے ہیں“ اور پھر! اُس نے مجھے آنکھ ماری اور میں لرز کر رہ گئی۔ بہر حال مرتی کیا نہ کرتی، میں اُس کی قانونی اور شرعی بیوی تھی۔ اُسے مجھے ہر طرح سے استعمال کرنے کا حق حاصل تھا اور پھر وہ ہوگیا جس کا میں نے خواب میں بھی کبھی سوچا نہ تھا۔

میں جو ہر دن کے رات میں نہ ڈھلنے کی دعا مانگا کرتی تھی، میری ساری زندگی کالی رات پر محیط ہوگئی۔ میری بے گناہی کا کوئی گواہ کوئی ثبوت نہ تھا اور میری بات کا کسی کو یقین نہ تھا کہ میں تو ویسے ہی اپنے خاوند سے ڈرتی تھی اور پناہ مانگتی تھی اسی لیے مجھ پر الزام تھا کہ میں نے اُسے عدم کی راہ دکھادی، مگر یہ تو قدرت کا کھیل تھا میں تو خوامخواہ ہی بیچ میں پس گئی۔

دراصل اُس اندھیری رات میں لائٹ کے بغیر جو قیمہ میں نے اُسے پکا کر کھلایا تھا اُس میں پکانے کے دوران کہیں سے ایک چھپکلی گر گئی۔ میرے فرشتوں کو اس بات کا علم نہیں ہوا اور میں نے روٹی کے پرات کے ساتھ وہی قیمہ ڈال کر اپنے خاوند کے آگے رکھ دیا۔ لائٹ ابھی تک آئی نہ تھی، موم بتی بھی اپنی طبعی عمر پوری کر کے بجھ چکی تھی۔ میری پتا نہیں خوش قسمتی تھی کہ بدقسمتی کہ اپنے خاوند کے اصرار کے باوجود آنے والے وحشیانہ لمحوں کی چاپ نے میری بھوک مٹادی تھی۔ پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے بعد وہ جو سلوک میرے ساتھ کرتا تھا اگر عرش بھی دیکھ لیتا تو کانپ اُٹھتا۔

میں لرزتے قدموں خالی برتن لے کر باورچی خانے میں داخل ہوئی تو لائٹ آچکی تھی۔ میں نے پلیٹ دھونے کے لیے نلکا کھولا تو قیمے کا بچا کھچا حصہ نیچے گرا۔ یہ کیا ہے میں نے گھبرا کر پلیٹ رکھ دی یہ تو چھپکلی کا سر ہے، مجھے قے آ گئی۔ چھپکلی کا کچلا ہوا دھڑ اور سر، میں بھاگ کر کمرے میں آئی، دیکھا تو میرا خاوند اپنا پیٹ پکڑے الٹیاں کر رہا تھا، اسی اثناء میں دروازہ بجا۔ میری ساس اور دیگر گھر والے گھر میں داخل ہوئے، اس وقت تک الٹیاں کرکر کے رازو کی حالت غیر ہوچکی تھی، اسپتال پہنچتے پہنچتے اُس نے دم توڑ دیا۔

میری ساس نے واویلا کردیا کہ بہو نے اکیلے گھر میں موقع پاکر میرے بیٹے کو کھانے میں زہر دے کر ہلاک کردیا، ورنہ ایسا ہٹا کٹا مرد کیسے چٹ پٹ مرجاتا۔ وہ بھی اس رات جب کہ گھر پر کوئی تھا بھی نہیں۔ میری چھپکلی والی حقیقی کہانی ایک من گھڑت داستان بنائی گئی۔ فوراً پولیس بھی آ گئی اور مجھے میرے ہی خاوند کے قتل کے الزام میں یہاں لے آئی۔

ساس سمیت سارے گواہ میرے خلاف تھے اور ثبوت یہ تھا کہ میں اپنے خاوند کے ساتھ تنہائی میں جانے سے ڈرتی تھی۔ وجوہات کیا تھیں نہ میں شرم کے مارے بتاسکتی تھی، نہ ہی کسی کو اصل حقیقت جاننے سے سروکار تھا۔ میرا اُسے مارنے کا کوئی ارادہ نہ تھا، مگر قدرت نے اُس سے انتقام لے لیا تھا اور میں ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہی ہوں۔ میری سچائی گواہ اور ثبوت کے بغیر کسی عدالت میں ثابت نہیں ہوسکتی تھی۔ وکیل کرنے کے وسائل میرے پاس نہ تھے، یہاں تک کہانی سُنا کر شہزادی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں بحیثیت ایک صحافی کامیاب خواتین کا انٹرویو کرنے جیل پہنچی تھی۔ ایک بدقسمت بنت حوا کی سچی داستان اپنے ساتھ لے کر واپس لوٹ آئی کہ اس کی سچائی سوائے اللہ کی عدالت کے کسی اور جگہ بغیر ثبوت اور گواہ کے ثابت نہیں کی جاسکتی تھی۔

☆......☆

گیارہویں سچ بیانی

محبت کی کسک



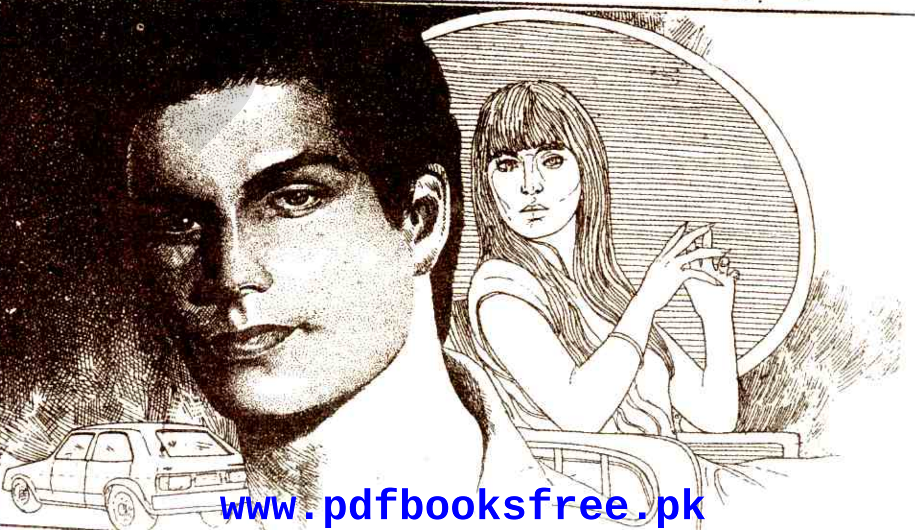
عبدالغفار عابد

موبائل فون سے جنم لینے والی ایک عورت کی عبرت خیز کہانی

آج صبح سے بارش ہو رہی تھی، موسم بہت خوش گوار تھا۔ یہ مارچ کے آخری دن تھے۔ آج میں نے اپنے دوست سعید کے ساتھ بورے والا جانا تھا۔ جہاں کی ہریالی اور تاحد نگاہ سبزہ دلوں کو موہ لیتا اور آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے۔ میں بارش کے رکنے کا انتظار کر رہا تھا تا کہ اپنے دوست سعید کے پاس پہنچ جاؤں۔ بارش اب کافی حد تک رک چکی تھی۔ میں نے اپنی بائیک باہر نکالی ہی تھی کہ میرے موبائل کی گھنٹی بجنا شروع ہوگئی۔ میں نے کال ریسیو کی، دوسری طرف سے ایک لڑکی بول رہی تھی کہ کیا آپ غفار صاحب بات کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا کہ جی میں غفار ہی بول رہا ہے۔''

''آپ کون ہیں۔'' میں نے پوچھا۔

''میں نسیم بات کر رہی ہوں بُورے والا سے، مجھے آپ کا نمبر سعید بھائی نے دیا ہے، دراصل میں نے اپنی داستان آپ سے لکھوانی ہے۔'' میں نے کہا۔



''نسیم میں سعید بھائی کے پاس ہی جا رہا ہوں، وہاں پہنچ کر آپ سے رابطہ کرتا ہوں۔'' نسیم نے او کے کہہ کر کال کاٹ دی۔ میں نے اپنی بائیک لی اور سعید کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے سعید کو نسیم کی کال کے بارے میں بتایا۔ سعید نے کہا کہ ہاں غفار بھائی میں ہی آپ کا نمبر اُسے دیا تھا، دراصل وہ اپنی کہانی لکھنا چاہتی ہے۔ وہ رشتے میں میری کزن ہے۔ آج میں نے بورے والا جانا ہے، سوچا آپ کو ساتھ لے چلوں، نسیم اور آپ کی آمنے سامنے بات ہوگی تو زیادہ بہتر ہے۔ نسیم کو میں نے بتادیا ہے کہ ہم دونوں آرہے، نسیم نے ہم سے ملنے کا پروگرام بنالیا ہے۔ ہم بات ہی کررہے تھے کہ اتنی دیر میں چائے آگئی، ہم نے چائے پی اور ٹھیک ایک گھنٹے بعد ہم نسیم کے پاس پہنچ گئے۔ سعید نے میرا اور نسیم کا تعارف کرایا۔

غفار صاحب مجھے سعید بھائی نے بتایا کہ آپ کہانیاں لکھتے ہیں، میں چاہتی ہوں کہ یہ کہانی شائع ہوتا کہ وہ لڑکیاں جو جذباتی ہو کر محبت میں غلط قدم اٹھالیتی ہیں وہ ایسا کرنے سے گریز کریں اور اپنے ماں باپ کے سمجھانے پر انہیں غلط نہ سمجھیں کیوں کہ وہ ہمارے اپنے ہوتے ہیں اور ماں باپ سے بڑھ کر بھلا کون اولاد کا بھلا چاہ سکتا ہے۔ میں نے کہا۔ آپ مجھے اپنی داستان سنائیں، میں اس کو کہانی کی صورت میں لکھنے کی پوری کوشش کروں گا، تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد نسیم نے اپنی داستان سنانا شروع کی، آئیے ہم سب نسیم کی داستان نسیم کی زبانی سنتے ہیں......

میں جس گھر میں پیدا ہوئی وہاں دولت بہت زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں تھی۔ میں چار سال کی ہوئی تو والدین نے مجھے اسکول میں داخل کرادیا۔ مجھے پڑھائی کا بے حد شوق تھا، جب میں نے میٹرک کیا تو ابو نے مجھے کالج میں داخل کرادیا، کالج کا ماحول دیکھ کر میں بھی اس ماحول میں اِن ہونے کی کوشش کرنے لگی۔ پیسے کی مجھے پروا نہیں تھی، جتنے مجھے چاہیے ہوتے میں لے لیتی، ایک دن میں نے ابو سے کہا کہ مجھے موبائل لے کردیں ابو نے فوراً میری خواہش پوری کردی۔

دن گزرتے گئے F.A میں میری فرسٹ پوزیشن آئی، تھرڈ ایئر میں ابھی میرا دوسرا دن ہی کہ مجھے کال آئی۔ میں نے او کے کیا تو ایک لڑکا بات کررہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ کون۔''

لڑکا بولا۔ ''میں شہزاد بول رہا ہوں۔'' میں آپ کا کلاس فیلوں ہوں اور میں بہت تنہا ہوں اور آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ دوستی جو کسی پاکیزہ رشتے میں بدل جائے۔ اگر آپ نے مثبت جواب دیا تو میں آپ کو پانے کی پوری کوشش کروں گا۔'' میں نے بغیر سوچے، سمجھے ہاں کردی۔ تقریباً مہینہ بھر ہماری بات چیت ہوتی، موبائل پر ہوتی رہی اب شہزاد مجھ سے ملاقات پر زور دینے لگا تھا، پھر ایک روز ملنے کا وعدہ کرنے کے بعد ہم نے کال ختم کردی۔ دوسرے دن ہم ایک کیفے میں ملاقات کررہے تھے، وہ یعنی شہزاد بار بار مجھے کسی نہ کسی بہانے دیکھنے کی کوشش کرتا۔ ملاقات کے بعد ہماری محبت میں مزید گرم جوشی آگئی تھی، اسی طرح وقت گزرتا رہا۔ ہم فون پر باتیں کرتے، SMS کرتے، میں اس کی محبت میں اس قدر ڈوب گئی کہ جب تک میں اس سے بات نہ کرلیتی مجھے چین نہیں آتا تھا۔ اب تو کسی چیز میں دل نہیں لگتا تھا، اسی طرح ہماری محبت پروان چڑھتی گئی، لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ شہزاد میرے ساتھ دھوکا کررہا ہے۔ شہزاد کو میری دولت اور میرے جسم سے پیار تھا، محبت تو برائے نام تھی شہزاد کی اصلیت کا مجھے اس وقت پتا چلا جب وہ تنہائی میں مجھ سے ملنے کی تکرار کرنے لگا۔ اب گھر والوں کو میری شادی کی فکر لگ گئی۔ میں نے B.A کرلیا تو ابو نے کہا کہ اب تعلیم کو ختم کردو اتنا ہی بہت ہے۔ ہم تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں شہزاد نامی لڑکے سے محبت کرتی ہوں، وہ میرا کلاس فیلو ہے اور شہزاد سے ہی میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔ گھر والوں نے کہا ٹھیک ہے۔ پہلے لڑکا ہم دیکھیں گے اس کے بعد فیصلہ کریں گے۔ میں نے کہا کہ میں کل ہی شہزاد کو گھر بلا لیتی ہوں، میں نے یہ خوشخبری شہزاد کو سنائی کہ گھر والے مان گئے ہیں۔ آپ ابو سے مل لیں۔ شہزاد نے کہا کہ پہلے ہم دونوں ملتے ہیں۔ میں نے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے بعد میں، میں آپ کے گھر والوں کو ملوں گا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے اور یوں میں اس سے ملاقات کے لیے پہنچ گئی۔ سب سے پہلے اس کو میں نے شادی والی خوش خبری سنائی، لیکن شہزاد بہت سیریس تھا

اور خاموش رہا، مجھے بڑی حیرانگی ہوئی۔ میں نے شہزاد سے پوچھا۔ ''کیا آپ کو خوشی نہیں ہوئی۔'' تو شہزاد کی آنکھوں میں آنسو آنا شروع ہوگئے۔

''میں تڑپ اٹھی۔'' میں نے کہا۔ ''شہزاد سچ سچ بتاؤ آخر بات کیا ہے۔'' تو شہزاد اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا کہ نسیم میری جان جو بھی ہوا ہے بہت غلط ہوا ہے، لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ آپ سے مجھے واقعی محبت ہوجائے گی۔ میں تو وقت گزاری کررہا تھا، پتا ہی نہیں چلا کہ آپ سے محبت ہوگئی اور شہزاد کی یہ بات سن کر کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہوں مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا۔ شہزاد نے کہا کہ میں دو بچوں کا باپ بھی ہوں، میں نے شہزاد کی باتیں سنیں واپس گھر آکر اپنے والدین کو سب کچھ بتادیا۔ جہاں میری شادی والدین کرنا چاہتے تھے وہاں میری شادی ہوگی۔ آج میں اپنے گھر بہت خوش ہوں، بیٹے حارث اور بیٹی شگفتہ سے گھر میں ہر وقت رونق لگی رہتی ہے۔ پہلی محبت کی کسک لیکن ابھی باقی ہے۔ میں آج بھی شہزاد کو جب یاد کرتی ہوں تو آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ میرے میاں چیچہ وطنی لکڑ منڈی میں اپنا کاروبار کرتے ہیں فرنیچر کا، میری شادی کو تقریباً سات سال کا عرصہ گزر گیا ہے۔ ایک روز میری امی کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی تو مجھے میرے شوہر اقبال امی کے ہاں چھوڑ آئے امی کے ہاں آئے ہوئے تھے تین دن ہوئے تھے کہ ایک دن میں اپنی چھوٹی بہن نسرین کے ساتھ بازار گئی تو مجھے شہزاد مل گیا۔ شہزاد نے کہا کہ نسیم میں نے آپ کی محبت میں سب کچھ چھوڑ دیا، بیوی، بچے اپنا گھر بار۔ اگر آپ مجھے سہارا دینا چاہتے ہیں تو میں حاضر ہوں۔ میں نے شہزاد سے کہا کہ یہ ناممکن ہے۔ اور شکر ہے کہ میں آپ جیسے شخص سے محفوظ رہی جو میرے لیے اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ سکتا ہے وہ کسی روز مجھے بھی چھوڑ سکتا ہے۔ یہ کہہ کر میں اپنی بہن کے ساتھ گھر آگئی۔ نسیم کی یہ کہانی لکھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ یہ دونوں طرف سے ایک وقتی جذبہ تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ختم ہوگیا ہاں اتنا ضرور ہوا کہ نسیم نے عقل سے کام لیا اور کوئی بڑی ٹھوکر کھانے سے قبل ہی سنبھل گئی ورنہ اس راہ پہ چلنے والے ہمیشہ ٹھوکر کھا کے منہ کے بل ہی گرتے ہیں۔

☆......☆

مکھنی



ارشد علی ارشد

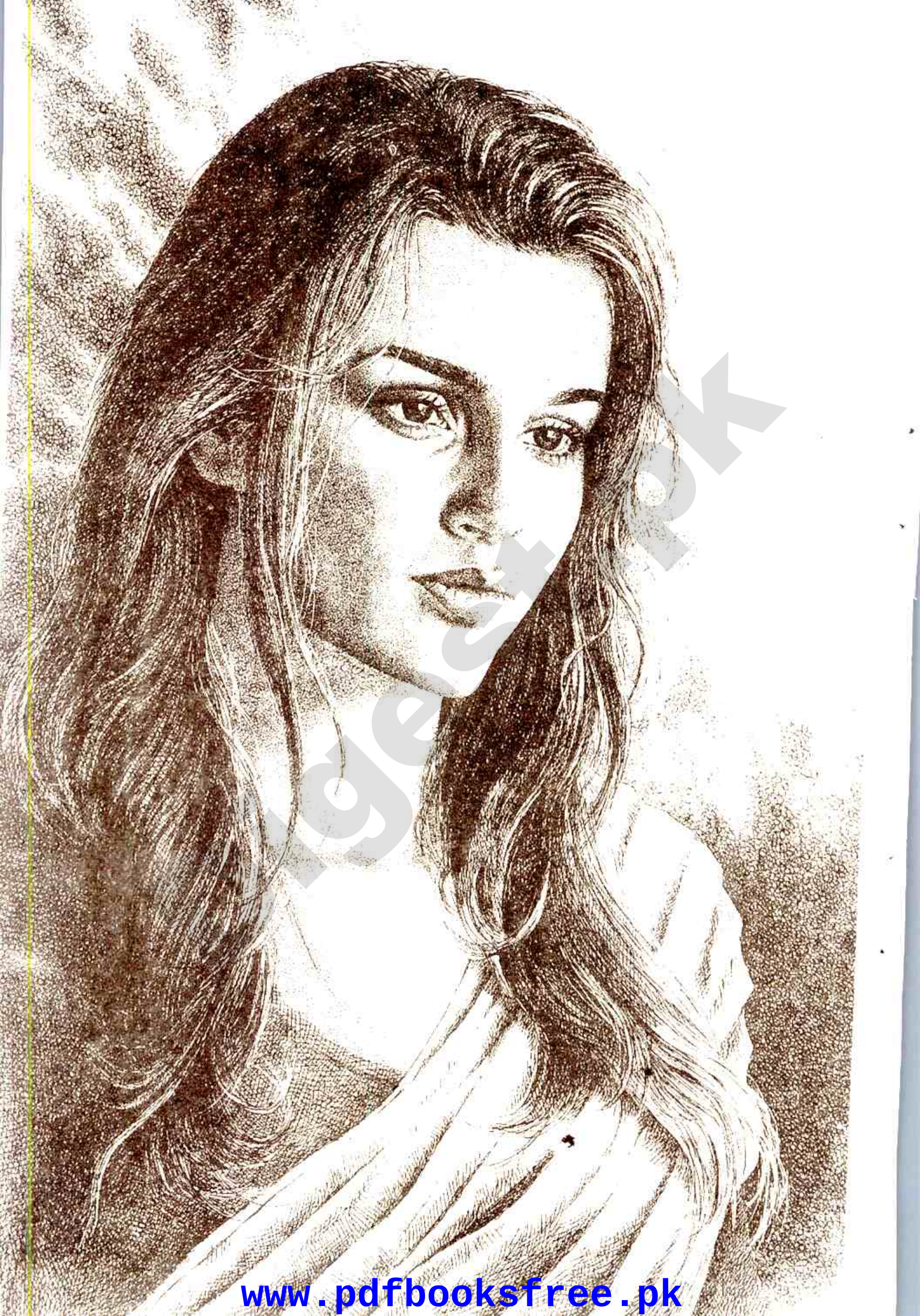
ابوظہبی سے خیال اور حقیقت کی قید سے آزاد دوشیزہ کی ایک حیرت انگیز، ناقابلِ فراموش سرگزشت

ایک مافوق الفہم اسرار بھری عجوبہ داستان

قسط نمبر 17

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

مکھنی ایک نہایت ذہین و سمجھ دار، اوروں سے مختلف سوچ، خیالات، نظریات اور غیبی طاقت رکھنے والی گاؤں کی ایک لڑکی ہے جو اپنے ماں باپ، دو بھائیوں اظہر اور مظہر، ایک بہن سکھاں اور محبت میں ناکام، غیر شادی شدہ پھپو ذکیہ کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔ سکھاں کو اپنے کالج فیلو سانول سے محبت ہوگئی ہے، مکھنی محبت اور عشق کے حوالے سے باتیں کرتے ہوئے اپنی بہن سکھاں کو سفید چونے کی دیوار کو اپنی غیبی طاقت سے پردۂ اسکرین بنا کر ماضی میں مجاہدین اسلام کا ایک لشکر دکھاتی ہے:
محبت اور عشق کی باتیں کرتی، گتھیاں سلجھاتی اور مسلمانوں کے عظیم ماضی و اسلاف کے کارنامے بتاتی اور دکھاتی مکھنی، سکھاں سے وعدہ کرتی ہے کہ وہ سانول سے اُس کے رشتے کے سلسلے میں گھر والوں سے بات کرے گی۔ مکھنی کے بھائی اظہر کی دبئی روانگی سے پہلے شادی کردی جاتی ہے۔ مکھنی اسی دوران میں سانول کے گھر اُس سے ملنے جاتی ہے۔ ایک روز سکھاں کالج سے لوٹ رہی ہوتی ہے تو چوہدری اللہ رکھا کا بیٹا چوہدری راحیل اُسے روک کر پریشان کرتا ہے اور پھر ایک روز جب سکھاں اپنی ماں کے ساتھ جارہی ہوتی ہے تو چوہدری راحیل دوبارہ وہی حرکت کرتا ہے۔ اس دوران میں سکھاں کا باپ اس کی منگنی فاطمہ خالہ کے دیورسے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ایک روز یوں بھی ہوتا ہے کہ چوہدری اللہ رکھا، مکھنی کا راستہ روک لیتا ہے۔ مکھنی اس کو برا بھلا کہتی ہے تو وہ اسے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے لیکن مکھنی اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ چوہدری اللہ رکھا اپنے کارندوں کے سامنے اس بے عزتی پر مکھنی کو دھمکی دیتا ہے کہ اب میرے حجرے میں تیرا ناچ ہوگا اور پھر ایک روز چوہدری اللہ رکھا کے کارندے مکھنی کو اغوا کر کے اس کی کوٹھری کی شکل میں موجود حجرے میں پہنچادیتے ہیں۔
چوہدری اللہ رکھا کے حجرے میں مکھنی اس کی خواہشات پوری کرنے کی بجائے موقع ملتے ہی چوہدری اللہ رکھا کی رائفل سے اسے قتل کردیتی ہے۔ مکھنی کو چوہدری کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلیا جاتا ہے اور پھر سکھاں تھانے میں آکر بتاتی ہے کہ چوہدری اللہ رکھا کے بڑے بیٹے چوہدری مشتاق نے اسے پیغام بھیجا ہے کہ اگر سکھاں کے لیے چوہدری راحیل کا رشتہ قبول ہے تو ہم مکھنی کو معافی کے بعد دیت کے قانون سے رہائی دلوا سکتے ہیں۔ اسی دوران میں لیڈی انسپکٹر شبانہ کو مکھنی سے تفتیش کے لیے بلایا جاتا ہے۔ مکھنی اُسے دیوار پر محمد بن قاسم کا نظارہ کر کے دہلا دیتی ہے اور وہ تھانے دار کے گھر تک پہنچ جاتی ہے۔ مکھنی کے معاملات سے خائف ہو کر تھانے دار اُسے لے کر گاؤں آتا ہے جہاں مکھنی کے قاتل ہونے کے گواہ اپنے بیان سے مکر جاتے ہیں۔ مکھنی تھانے دار سے رہائی حاصل کرنے کے بعد اپنے گھر آتی ہے۔
گھر آکر اسے پتا چلتا ہے کہ اس کا ابا فالج کے باعث چارپائی سے لگ گیا ہے، پھر کچھ دن بعد اس کے ابا کا انتقال ہوجاتا



ہے، جبکہ اس کا بھائی، باپ کی موت سے پہلے ہی دبئی چلا جاتا ہے۔ اسی دوران میں اس کی شادی بلاول سے ہو جاتی ہے۔
مکھنی اور بلاول نے اپنے بیٹے کا نام معاویہ رکھا ہے، معاویہ چار سال کا ہو گیا ہے لیکن باتیں بہت ذہانت کی کرتا ہے۔
مکھنی کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے، کبھی وہ کہیں ہوتی ہے اور پھر غیر محسوس طریقے سے ماورائی قوت کے تحت وہاں سے کوسوں دور جا پہنچتی ہے۔

جب مکھنی کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ خود کو انتہائی آرام دہ بیڈ روم میں پاتی ہے۔ کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوتی ہے اور کمرے میں ایک وجیہ نوجوان ادھیڑ عمر کی باوقار سی ایک خاتون اور جینز اور جیکٹ میں ملبوس ایک خوب صورت لڑکی اندر داخل ہوتے ہیں۔ آہستہ آہستہ کمرے میں لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے اور وہ سب قطار میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

امن مکھنی سے وہ سارے حالات و واقعات بیان کرتا ہے کہ کس طرح وہ لوگ لاہور میں دریا راوی کے کنارے موجود تھے اور مکھنی انہیں بے ہوشی کی حالت میں ملی تھی۔ مکھنی امن سے کہتی ہے کہ وہ مسلمان ہے۔ مکھنی کو اپنا شوہر بلاول اور بچہ معاویہ یاد آتا ہے وہ سوچتی ہے خاندان والوں کے بارے میں جاننے کے لیے اس کا لاہور کا سفر ضروری ہے۔ لیکن اس سے پہلے وہ امن کے خاندان کے اوہان وقلوب میں اہم پیغام پہنچانا چاہتی تھی اور اس کے لیے وہ اس دن کے انتظار میں تھی جب تمام لوگ خاص اہتمام کے ساتھ اکٹھے ہو کر اس کے روبرو پیش ہوتے تھے اس کے لیے مکھنی کو ایک خالی سفید دیوار چاہیے تھی جب سب لوگ اکٹھے ہو گئے تو مکھنی انہیں ہندو مذہب کے بارے میں سمجھاتی ہے کہ سمجھ نہیں آتا کہ پڑھے لکھے لوگ جانوروں، بیل کچھوا، پیپل تلسی وغیرہ کو کیسے مقدس سمجھتے ہیں۔ دنیا کے سارے عقیدے توحید پر مبنی ہیں پھر وہ انہیں اسلام کی بابت سمجھاتی ہے اور ان لوگوں کو اسلام کی دعوت دیتی ہے۔ مکھنی کی بات سے وہاں ہلچل مچ جاتی ہے اور وہ لوگ اس کے مخالف ہو جاتے ہیں، تب امن مکھنی کو گھر چھوڑنے کا کہتا ہے، کیوں کہ وہ لوگ اسے قتل کرنا چاہتے ہیں، مکھنی وہاں سے فرار ہو کر انکل فہیم کے گھر پہنچ جاتی ہے۔

فہیم مکھنی کو اس کے گاؤں مہر داد نگر چھوڑ آتے ہیں۔ راستے میں وہ سانول کے کھیتوں کے قریب ٹھوکر کھا کر گر جاتی ہے سانول جیسے ہی اسے اُٹھانے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔ مکھنی کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے سانول مکھنی کو اپنے گھر لے جاتا ہے، سانول کا باپ مکھنی کو گھر سے نکل جانے کو کہتا ہے کہ کہیں اس کی وجہ سے کوئی مصیبت ان پر نہ آ جائے۔ سانول مکھنی کو روکنے کی کوشش کرتا ہے مگر مکھنی انکار کر دیتی ہے اور اپنے گھر پہنچ جاتی ہے۔

مکھنی کو نیند میں احساس ہوتا ہے کہ گھر کا دروازہ بری طرح پیٹا جا رہا ہے۔ وہ بھاگ کر کمرے سے باہر نکل آتی ہے اور سمجھ جاتی ہے کہ مہر داد نگر والوں کو اس کے لوٹ کے آنے کی اطلاع مل چکی ہے۔ گاؤں کے لوگ دروازہ توڑ کر گھر میں داخل ہو جاتے ہیں اور مکھنی کو گھیر لیتے ہیں۔ وہ تمام لوگ مکھنی کے دیکھے بھالے تھے، مگر اس وقت ان کے چہروں پر اجنبیت اور سفاکی تھی۔ وہ لوگ اس سے کہتے ہیں کہ تو یہاں کیوں آتی ہے؟ تیری وجہ سے کتنے گھر تباہ ہو گئے۔ وہ کہتے ہیں کہ بہتر یہی ہے کہ اسے دھکے دے کر مہر داد نگر سے باہر نکال دیا جائے۔ مکھنی کا دل لوگوں کی باتیں سن کر لہولہان کر رہا تھا، مگر وہ جانتی تھی کہ اس وقت چپ رہنا ہی دانشمندی تھی۔ مکھنی پر بے تحاشہ تشدد کیا جاتا ہے مگر اس نے زبان پر چپ کا تالا لگایا ہوا تھا۔ اسی وقت چوہدری مشتاق وہاں پہنچ جاتا ہے۔ وہ مکھنی کو دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ آج تو مہر داد نگر کے بھاگ جاگ اُٹھے ہیں، یہاں رحیم اللہ ترکھان کی دھی مکھنی آ گئی ہے۔ چوہدری کے ارادے اور تیور دیکھ کر مکھنی خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ مکھنی کو رسیوں سے باندھ کر گھوڑے کے ساتھ دوڑایا جاتا ہے۔ مکھنی زمین پر گھسیٹے جانے سے بری طرح زخمی ہو جاتی ہے۔ اچانک رسی ٹوٹ جاتی ہے اور مکھنی قلابازیاں کھاتی ہوئی بے ہوش ہو جاتی ہے۔

مکھنی کو جب ہوش آتا ہے تو وہ ایک جنگل میں ہوتی ہے۔ وہ ہمت کر کے اٹھتی ہے اور ایک سمت چلنے لگتی ہے۔ مکھنی کا دل مطمئن تھا وہ سوچتی ہے کہ یہ جو میں ایک جگہ سے دوسری جگہ بلا روک ٹوک پہنچ رہی ہوں، یہ اللہ تعالیٰ کی منشا ہے۔ حالات جس نہج پر لے چلیں چلنا ہوگا۔ تب مکھنی کا ذہن جست بھرتا ہے اور مکھنی پیر سید مہر علی شاہ رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر واقع گولڑہ شریف میں خود کو موجود پاتی ہے۔

مکھنی مزار پر موجود لوگوں کو پیر مہر علی شاہؒ کے حالات زندگی بتاتی ہے اور کہتی ہے کہ پیر صاحب سے محبت کا حق یہ ہے کہ ان کی تعلیمات پر عمل کیا جائے۔ آج ہم کیوں دھڑوں میں منقسم ہیں، چند مفاد پرست مولویوں کے حق میں گلے پھاڑ کر نعرے لگاتے ہیں اور حق و سچ کی بات بتانے والوں سے دور بھاگتے ہیں خدا اور اسلام کو سمجھیے اور پہچانیے۔ یہ کہہ کر مکھنی وہاں سے چل پڑتی ہے۔ مزار کے راستے میں وہ ایک شخص کو دیکھتی ہے جو گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا اور لوگ اسے چھیڑ چھیڑ کر جا رہے تھے۔ مکھنی کہتی ہے کہ تم لوگ پیر مہر علی شاہؒ کے مزار پر جا رہے ہو، مزار پر جانے والوں کو ایسی حرکتیں زیب نہیں دیتیں۔ تب مکھنی اس کوڑھ زدہ شخص کے ساتھ بیٹھ جاتی ہے۔ اور ایک بزرگ شخص کو پانی لانے کا کہتی ہے۔ وہ کوڑھ زدہ آدمی مکھنی کو خود پر بیتی داستاں سناتا ہے، جس کی وجہ سے وہ اس

حال میں مزار پر موجود ہے۔تب مکھنی اسے کہتی ہے کہ ''جب قارون زندہ دفن ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا۔''اے موسیٰ وہ تجھ سے معافیاں مانگتا رہا مگر تو معاف نہ کر سکا، مجھے اپنی عظمت کی قسم ہے مجھ سے ایک بار بھی معافی مانگتا تو میں معاف کر دیتا۔ مکھنی کہتی ہے تو کیا ہم قارون سے بھی برے ہیں؟ ہمیں تو امت محمد ﷺ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ جو مہربان اللہ قارون کو معاف کرنے کے لیے تیار بیٹھا ہو، غفور الرحیم رب اپنے حبیب کی امت کو کیسے معاف نہیں کرے گا بس اس کے لیے ہمیں صدق دل سے معافی مانگنی ہوگی۔''

(اوراب آگے پڑھیے)

''م۔ میں مانگوں گا اپنے اللہ سے۔''اور صدق دل سے تائب ہو جاؤں گا۔کوڑھ زدہ شخص کا لہجہ دیکھ کر مجھے یقین ہو چلا کہ وہ ضرور تائب ہوگا۔

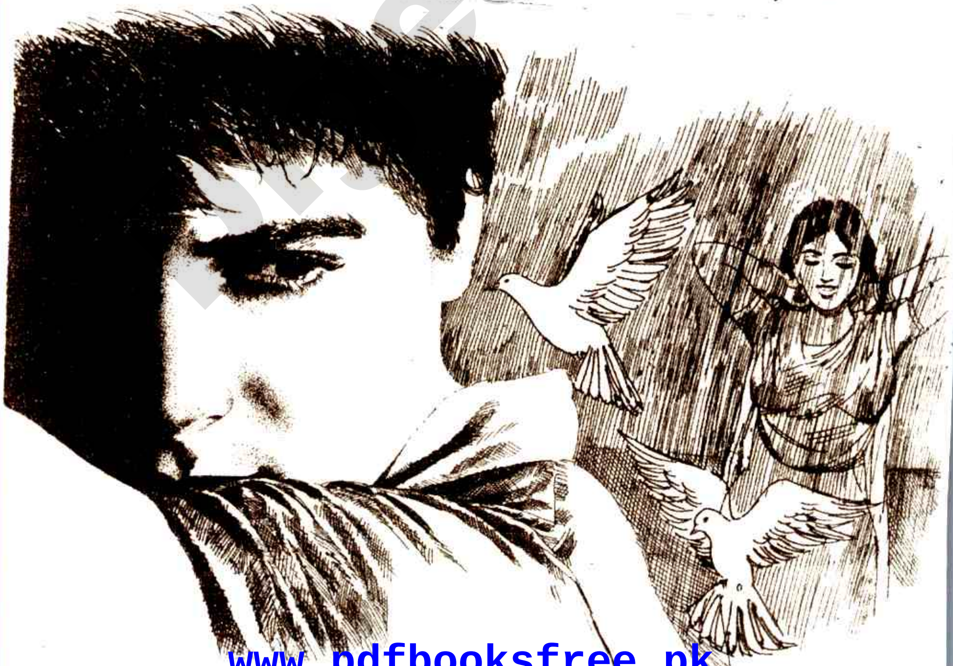
باتیں کرتے ہوئے ہم بہت ست روی سے مزار کی طرف جا رہے تھے۔میں نے نظریں اُٹھا کر دیکھا۔ابھی ہم مزار سے بہت دور تھے۔میں نے رفتار بڑھانے کا سوچا مگر پھر رک گئی۔بڑے میاں پانی کا بھرا کٹورا لے آئے تھے۔میں نے اس کے ہاتھ سے کٹورا لیا اور راستے کے کنارے پر بیٹھ گئی۔بڑے میاں مجھے پُرتجسّس نگاؤں سے دیکھ رہے تھے۔میں یہاں بیٹھ جاؤں۔کوڑہ زدہ شخص نے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

جی بیٹھ جایئے۔کہتے ہوئے میں نے اول وآخر درود شریف پڑھا اور درمیان میں ایک بار سورۂ فاتحہ اور تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر پانی پر پھونک ماری۔پانی کا کٹورا کوڑھ زدہ شخص کو دیتے ہوئے میں نے کہا۔

روئی لے کر جہاں زخم ہیں وہاں پانی لگاتے رہنا۔ممکن ہو تو مزار پر جا کر غسل کر لیں۔غسل کرتے وقت تھوڑا سا دم شدہ پانی دوسرے پانی میں ملا دینا۔

ٹھیک ہے۔اس نے کٹورہ لینے کے بعد کہا۔آپ نے مجھے معاف کر دیا نا۔میں نے سنا ہے حقوقِ العباد ادا نہ ہوں تو حقوق اللہ کبھی پورے نہیں ہوتے۔

''میں نے آپ کو معاف کر دیا ہے۔آپ بھی مجھے معاف کر دیں۔''میں کہہ کر کھڑی ہوگئی اور اسے بتایا۔



''اب میں چلتی ہوں۔'' میری طرف سے وہ مطمئن ہوا تو میں واپس مڑ گئی۔
میں ابھی تھوڑی دور ہی گئی تھی کہ کسی شخص نے مجھے پکارا۔
''مکھنی......''
میں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔ ایک اور آواز سنائی دی۔
''ارے رمضان وہ دیکھو مکھنی۔''
میں نے دیکھا لوگوں کی بھیڑ کو چیرتے ہوئے دو اشخاص میری طرف بھاگے چلے آرہے تھے۔ میں نے انہیں پہچان لیا تھا۔ وہ مہر داد نگر کے چوہدری مشتاق کے بندے تھے۔ میں نے جھنجلا کے سوچا۔ تم لوگ باز نہیں آؤ گے۔
اگلا خیال مجھے یہ آیا کہ ان کے ہاتھ آنے کا مطلب ہے میں پھر سے مہر داد نگر کے ظالم چوہدری کے حجرے میں پہنچ جاؤں گی۔ میرے دل نے ذہن کو حکم دیا۔ بھاگ مکھنی۔ ذہن نے فیصلہ کیا، خود کو بچانے کے لیے میرا بھاگنا ضروری ہے۔ جس طرف لوگوں کی زیادہ بھیڑ تھی میں اس طرف بھاگ پڑی تاکہ بھیڑ میں گم ہو جاؤں۔ ویسے بھی یہ ان کی مخالف سمت تھی۔ بھاگتے ہوئے میں نے مڑ کر دیکھا وہ بھی میرے تعاقب میں بھاگ پڑے ہیں۔ ہمارا درمیانی قافلہ تقریباً سو میٹر کا تھا۔ وہ کوڑھ زدہ شخص سے ہی ابھی پندرہ بیس میٹر پیچھے تھے۔ لوگ مجھے یوں بھاگتا ہوا دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔
''اے بیٹی کیوں بھاگ رہی ہو۔''
''رکو کیا مشکل ہے۔''
''تم کیوں بھاگ رہی ہو۔'' لوگوں کی متفرق باتیں میرے کانوں میں پڑ رہی تھیں، مگر میں رُکی نہیں۔ ایک مبہم سی امید ضرور تھی کہ اتنے سارے لوگ ہیں۔ میرا دفاع کریں گے اور میں چوہدریوں کے آدمیوں کے ہتھے چڑھنے سے بچ جاؤں گی، مگر دوسرا خیال زیادہ قوی تھا۔ جب گولیاں چلتی ہیں تو ہر کسی کو اپنی جان کی فکر ہوتی ہے اور مجھے یقین ہے چوہدری کے آدمی یہاں دو تین بندے گرانے سے بھی باز نہیں آئیں گے۔ میں نے مڑ کر دیکھا، وہ لوگ کوڑھ زدہ شخص کے قریب سے گزر رہے تھے۔ دفعتاً کوڑھ زدہ شخص اٹھا اور دو میں سے ایک کو دبوچ لیا۔ وہ لوگ اس کی توقع نہیں کر رہے تھے۔ کوڑھ زدہ شخص جونک کی طرح اس کی ٹانگ سے لپٹ گیا تھا۔ دوسرا شخص بھی اپنے ساتھی پر پڑنے والی اچانک آفت کو رک کر حیرت سے دیکھنے لگا۔ میں خود حیرت سے رک گئی تھی۔ شاید کوڑھ زدہ شخص مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ چیختے ہوئے بولا۔
''بھاد مکھنی بھاد۔ (بھاگ مکھنی بھاگ)'' اس کی چیختی ہوئی آواز نے مجھے اپنی نازک پوزیشن کا احساس دلایا اور میں پھر سے بھاگ پڑی۔ پیچھے کا آخری منظر جو میں نے دیکھا وہاں بہت سے لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ مجھے دور جانے کا موقع میسر آچکا تھا۔ میں نے تیزی سے روڈ پر آتے ہی ٹیکسی پکڑی اور اس منزل کی جانب رواں دواں ہو گئی جس کا مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔

☆......☆

میں جب چوہدری کے بندوں سے بھاگ کر نکلی تو ذہن میں کوئی منزل واضح نہیں تھی۔ ہموار و ناہموار راستوں پر ٹیکسی بھاگتی رہی اور میں سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے سوچتی رہی۔ جب متفرق سوچوں کے گھوڑے ادھر اُدھر بھاگے تو خود بخود منزل کا تعین ہوتا چلا گیا۔ جب ذہن میں منزل واضح ہوئی تو میں نے اس پر پلاننگ سے سوچا اور طے کیا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔ انکل فہیم نے جو لفافہ مجھے دیا تھا۔ اس میں ایک لاکھ کی خطیر رقم موجود تھی۔ گھر جاتے ہوئے میں نے لفافہ اپنے پاس محفوظ کر لیا تھا۔ جب رستم سے بڑی چادر لی تھی تو لفافہ چادر کے کونے میں رکھ کر اسے گانٹھ دے دی تھی۔ گاؤں میں بڑی بوڑھی عورتیں اسی طرح پیسے محفوظ کیا کرتی ہیں۔ چادر تا حال میرے جسم پر موجود تھی اس لیے پیسے بھی محفوظ رہے۔ ان پیسوں نے مجھے اب کام دینا شروع کیا تھا۔ میں نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا۔ اپنے لیے کپڑے اور کچھ دوسرا سامان خریدا اور راولپنڈی کے متوسط ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لے لیا۔
اب میں راولپنڈی کی اڈیالہ جیل کے مرکزی دروازے کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے نظریں اُٹھا کر جیل کی بڑی بڑی دیواروں کو دیکھا اور ایک طویل سانس کھینچی۔ اس جیل میں میرا غیرت مند بھائی مظہر وقت کے کلنڈر میں زندگی

کے دن پورے کر رہا تھا۔ مجھے بڑی مشکلوں سے ملاقات کا وقت دیا گیا تھا۔ شاید ڈھائی تین سالوں میں مظہر بھائی کی پہلی ملاقات آئی تھی۔ ایک بڑی توند والے ادھیڑ عمر پولیس مین کے ہمراہ چند راہداریاں پاس کر کے میں ایک کمرے میں پہنچ گئی۔ اس کمرے میں سامنے جیل کا کمرہ تھا، بڑی بڑی سلاخوں اور جالی والا ویران کمرہ۔ ''یہاں بیٹھو۔ آتا ہے تھوڑی دیر میں۔'' موٹی توند والے نے مجھے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ جاتے ہوئے دروازے کے پاس رُک کر بولا۔ صرف تیس منٹ ہیں تیرے پاس اکتسویں منٹ میں، میں آؤں گا۔ تمہیں باہر ہونا چاہیے۔ میں نے آہستہ سے سر ہلایا۔ وہ چلا گیا۔ میرے اندر جذبات کا ایک طوفان اُٹھ رہا تھا۔ گئی رتوں کے سارے مناظر میری آنکھوں میں منجمد ہو گئے تھے۔ رحیم اللہ ترکھان کا ہنستا بستا گھر میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔

تیز مزاج، غصے اور غیرت سے لبالب بھرا ہوا میرا ابا رحیم اللہ۔ ٹھنڈے اور دھیمے مزاج کی ماں خورشید۔ میرے دکھ سکھ کی ساتھی سکھاں اور پھوپھو۔ فرمانبرداری کی زندہ مثال دونوں بھائی اظہر اور مظہر۔ میری اکلوتی چہیتی بھابھی رانی۔ مہر داد نگر میں اس گھر کے اندر کتنی خوشنما اور کھلکھلاتی بہاریں اُترتی تھیں۔ ہر طرف خوشیوں کے پھول برستے تھے۔ محبتوں کی شبنم اُترتی تھی اور پیار کی ہوائیں چلتی تھیں، مگر یک لخت سرور کے سارے لمحات لہولہان ہو گئے۔ ہاتھوں سے خوشیوں کے پیالے گر کر چکنا چور ہو گئے۔ بہاریں خزاں میں بدل گئیں، وقت کے شجر پر غموں کے پھول اُگنے لگے۔ سورج کی میٹھی کرنیں آگ برسانے لگیں۔ ہنستا بستا گھر بے سروسامانی، ویرانی اور ظلمت کا گڑھ بنا گیا۔ حالات کی سلگتی ہواؤں نے اس کے باسیوں کو خزاں رسیدہ پتوں کی طرح ادھر اُدھر اُڑا دیا۔

میری آنکھوں میں آنسوؤں کی کرچیاں چبھنے لگیں۔ جیل کا کمرہ دھندلانے لگا۔ میں نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا، جالی کے اس پار کا منظر ابھی خالی تھا۔ ابھی تک مظہر بھائی نہیں آیا تھا۔ میرے اندر کی آگ کے شعلے جل کر کوئلہ بننا شروع ہو گئے تھے۔ سوچوں اور یادوں کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ جی چاہا کہ اُٹھ کر بھاگ جاؤں۔ ایک ایسی دنیا میں چلی جاؤں جہاں ایسا کچھ نہ ہو۔ میرے تعاقب میں ماضی کی سوچیں اور یادیں نہ آ سکیں یا میں پھر سے اس کیفیت میں چلی جاؤں جس میں مجھے اپنے آپ کا ذرا بھی ہوش نہیں تھا۔ نہ شہر ذات کی آگہی تھی، نہ رشتوں کی کوئی پہچان تھی۔

میرے دل کے سارے زخم جل اُٹھے تھے۔ میرا اندر سلگ رہا تھا اور باہر کراہ رہا تھا۔ میرے بدن میں زبردست ارتعاش اُمڈ آیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ میں اپنے وجود کا بوجھ سہار نہ سکتی اور نیچے گر پڑتی۔ آہٹ نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ میں نے چہرہ اُٹھا کر دیکھا۔ سلاخوں کے اُس پار جالی کو پکڑے ہوئے مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ میں میکانکی انداز میں کھڑی ہو چکی تھی۔

''مم...... منھنی۔''

''بھائی......'' میں اس طرف بھاگ پڑی۔ چند میٹر کا فاصلہ میں نے بھاگ کر طے کیا۔

''منھنی...... تُو......''

''مظہر بھائی۔'' یہاں پہنچ کر الفاظ دم توڑ چکے تھے۔ سانس کا اُتار چڑھاؤ تیزی پکڑ چکا تھا۔ دل کی دھڑکن بڑھے جا رہی تھی۔ وقت جیسے تھم گیا تھا، مظہر بھائی نے دونوں ہاتھوں کی کھلی ہوئی ہتھیلیاں جالی پر رکھ دیں۔ میں نے اس کے ہاتھوں پر جالیوں کے اس پار اپنے ہاتھ رکھ دیے۔ غمگساری کے ان لمحات میں زبانیں چپ ہو گئیں اور آنکھیں برسنے لگی تھیں۔ کچھ دیر کمرے میں آہیں اور سسکیاں گونجتی رہیں، پھر مجھے خیال آیا میرے پاس صرف آدھا گھنٹہ ہے۔ میں نے دوپٹے سے آنکھیں صاف کیے اور خود کو سنبھالا۔ میرے دیکھا دیکھی مظہر بھائی نے بھی آنسوؤں سے بھیگا چہرہ صاف کیا۔ میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''یہ۔ یہ کیا ہو گیا مظہر بھائی۔ ہمارے ہنستے بستے گھر کو کس کی نظر لگ گئی ہے؟''

''پتا نہیں منھنی قسمت ہمارے ساتھ بڑی اندوہناک کھیل کھیل گئی ہے۔''

''تم کیسے ہو مظہر بھائی؟''

"اب بالکل ٹھیک ہوں مکھنی۔ آج تمہیں اپنے سامنے دیکھ کر پھر سے جی اُٹھا ہوں۔"
"تم کیسی ہو مکھنی۔"
"آپ کے سامنے ہوں مظہر بھائی۔ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے میری ہر طرح کی حفاظت کی ہے۔" تھوڑے سے توقف کے بعد میں نے کہا۔
"آنکھیں ترس گئی تھیں گھر کے کسی فرد کو دیکھنے کے لیے، آج سکون مل گیا ہے۔"
"تم مہر داد نگر گئی تھیں؟"
"ہاں بھائی وہیں سے پتا چلا کہ آپ اڈیالہ جیل میں قید ہو۔"
"مکھنی میں نے چوہدری راحیل کی لاش گندے نالے میں پھینک کر اسے مہر داد نگر والوں کے لیے نشانِ عبرت بنا دیا تھا، مگر خود ہمیشہ بے سکون ہی رہا۔ حلق میں ایک پھانس سی اٹک گئی تھی۔ اس کی چبھن مجھے ہر لحمہ مضطرب اور پر سکون رکھتی تھی۔ آج تجھے سامنے دیکھ کر سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے۔ میں اب ہنستے مسکراتے تختہ دار پر لٹک جاؤں گا۔"
"نہیں بھائی نہیں۔ انشاءاللہ آپ کو پھانسی نہیں ہوگی۔"
"مکھنی مجھے سزائے موت سنائی جا چکی ہے۔ عین ممکن تھا کہ پھانسی کے پھندے پر لٹکا بھی دیا جاتا، مگر بیچ میں جمہوری حکومت کا تختہ الٹا گیا ہے۔ اس سے بہت سے کام آگے پیچھے ہو گئے ہیں۔"
"مجھے پتا ہے بھائی کہ آپ کو سزا سنائی جا چکی ہے، مگر میں سپریم کورٹ میں اپیل کروں گی۔"
"مکھنی شاید اس اپیل کا بھی کوئی فائدہ نہ ہو۔ میں نے خود پہلی پیشی پر ہی اقرار جرم کر لیا تھا۔ اس بات کو چھوڑ دو میری بہن یہ بتاؤ۔ کمینے چوہدری راحیل نے اغوا کر کے تمہیں کہاں رکھا تھا، میں نے تو ان کے دونوں گھر اور فارم ہاؤس سارا کھنگال لیا تھا، مگر وہاں تم کہیں نہیں تھیں۔"
"بھائی وہ کمینہ مجھے پہلے ہی مہر داد نگر سے نکال کر لے گیا تھا۔"
"مہر داد نگر سے باہر۔ مظہر بھائی بری طرح چونک پڑا۔ کہاں مکھنی؟"
"ہاں بھائی مہر داد نگر میں اس نے مجھے نہیں رکھا تھا۔ کہتے ہوئے میں نے مختصراً مظہر بھائی کو سارا قصہ سنایا۔ اس روداد میں سے وہ تمام باتیں جو میرے ساتھ غیر معمولی اور غیر مرئی طور پر رونما ہوئی تھیں، حذف کر دی تھیں۔"
"مجھے انکل فہیم مہر داد نگر چھوڑ گئے تھے۔ بہت عظیم انسان ہیں انکل فہیم۔ میں جتنے بھی دن ان کے گھر رہی انہوں نے مجھے سگی بیٹی سے بڑھ کر چاہا۔ میں سیدھا اپنے گھر گئی تھی، جاتے ہی مجھے پتا چلا وہاں تالا لگا ہوا ہے۔ آپ اڈیالہ جیل میں ہیں اور گھر والوں کا کچھ پتا نہیں۔" میں نے جالی کے گول گول سوراخوں سے مظہر بھائی کی انگلیاں پکڑ کر کہا۔
"بھائی! امی، سکھاں، پھوپھو، اظہر بھائی اور بھابی سب کہاں ہیں۔ سب ٹھیک تو ہیں نا؟ آپ کو ملنے آتے ہیں؟"
"مکھنی تمہیں پتا ہے ابا کے شریک (چچا کے بیٹے) کافی عرصہ پہلے مہر داد نگر سے روات چلے گئے تھے۔ میں نے گھر والوں کو راتوں رات نکالا اور روات کی راہ لی۔ میرا پروگرام تھا کہ انہیں کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچا کر پھر تمہیں تلاش کروں گا۔ روات پہنچے تو انہیں پہلے سے حالات کا علم ہو چکا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر پریشان ہو گئے اور بغلیں جھانکنے لگے، بلکہ چاچا رحمت اللہ نے تو واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ پُتر ہم چوہدریوں کی دشمنی مول نہیں لینا چاہتے۔ میں نے ان پر لعنت بھیجی اور امی سے مشورہ کرنے کے بعد سوہاوا کی راہ لی۔ سوہاوا میں امی کی خالہ کی کافی بڑی فیملی رہائش پذیر ہے۔ امی کی خالہ 80 سال کی عمر میں بھی حیات ہیں۔ ہم سیدھا سوہاوا پہنچے، وہ لوگ مالی طور پر اتنے مستحکم نہیں تھے، لیکن ہمیں خندہ پیشانی سے ملے۔ میں نے راستے میں ہی گھر والوں کو بتا دیا تھا کہ فی الحال ان سے اصل صورت حال پوشیدہ رکھی جائے۔ کسی مناسب موقع پر بتا دیا جائے گا۔ اگر انہوں نے بھی ہمیں رکھنے میں حیل حجت کی تو کوئی تیسرا ٹھکانہ ہمارے پاس نہیں تھا، مگر انہوں نے پہلا سوال ہی تمہارے بارے میں پوچھا۔ میں نے انہیں بتایا۔ مکھنی رحمت چاچا کے ہاں رک گئی ہے۔ مجھے معلوم تھا ان لوگوں کی رحمت چاچا کے ساتھ لگتی نہیں۔ وہ خاموش

ہو گئے مگر کلی طور سے مطمئن نہیں ہوئے تھے، کیوں کہ وہ ابا کے جنازے میں شریک ہوئے تھے اور انہیں پتا تھا کہ تم نے چوہدری اللہ رکھا کو قتل کیا ہے۔ بہر حال یہ بھی غنیمت تھا کہ انہوں نے مزید نہیں کریدا۔

تین چار دن بڑی مشکلوں سے کٹے۔ دن رات میرے دل و دماغ میں تمہاری شبیہ مسلط رہی، مجھے کسی پل چین نہیں تھا اور میں چوبیس گھنٹے یہی سوچتا رہتا کہ تمہیں کہاں تلاش کروں۔ گھر والے الگ سے پریشان تھے، ہم ایک دوسرے سے پوچھتے تو نہیں تھے، مگر ہر کسی کی آنکھ میں ایک ہی سوال محو گردش تھا۔ مکھنی کہاں ہوگی؟ پانچویں دن میں نے پھر مہر داد نگر جانے کا حتمی فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوچا ابھی چوہدری نثار اور مشتاق باقی ہیں۔ میں ان دونوں کی بوٹی بوٹی کر دوں گا مگر اپنی بہن کو بازیاب کر کے چھوڑوں گا۔ میں نے انہیں بتایا کام کی تلاش میں راولپنڈی جا رہا ہوں۔ میں سوہاوا سے نکل آیا۔ راستے میں مختلف سوچیں میرے گرد گھیرا تنگ کرنے لگیں۔ میں نے سوچا آج نہیں تو کل سوہاوا والے بھی میرے گھر والوں سے تنگ آ جائیں گے۔ معاشی طور پر وہ بھی غیر مستحکم ہیں۔ تین افراد کا اضافی بوجھ کیسے برداشت کریں گے۔

''تین افراد کا۔''

''ہاں مکھنی!'' روات سے جب ہم چلے تو رانی بھابھی نے آگے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ آپ لوگوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں مگر میرا ہے۔ میں اپنے ماں باپ کے گھر جاؤں گی۔ وہ وہیں سے علیحدہ ہو گئی تھی، میرا جی چاہا تھا کہ چوہدری راحیل کی طرح اس کے بھی ٹکڑے کر دوں، مگر مجھے امی نے روک لیا اور رانی کو جانے کی اجازت دے دی تھی۔

''اوہ۔'' میرے منہ سے بے اختیار ہنکارا نکلا، پھر بھائی اس کے بعد کیا ہوا۔

میں نے پہلے کچھ پیسے کمانے کا سوچا تا کہ گھر والوں کو علیحدہ کرائے کے مکان میں رکھ سکوں۔ راولپنڈی جانا میرے لیے خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لیے میں نے گجرانوالہ کا رُخ کیا، مگر چوہدری کے ہاتھ بہت لمبے تھے۔ شومئی قسمت گجرانوالہ بائی پاس پر مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ تھانے میں مجھے جیسے ہی موقع ملا، میں نے اظہر بھائی کو خط لکھ بھیجا اور اسے ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ ساتھ ہی اسے جلد لوٹ آنے کی تاکید کی اور کچھ روپے سوہاوا بھیجنے کی درخواست بھی کی۔ دو ماہ بعد اظہر بھائی دبئی سے لوٹا تو گھر والوں کو میری گرفتاری کا پتا چلا۔ وہ سب روتے پیٹتے اظہر کے ساتھ میری ملاقات کو آئے۔ میں نے پہلی پیشی پر ہی اقرار جرم کر لیا تھا۔ اس لیے میری سزائے موت یقینی تھی، مگر میں نے یہ بات امی کو نہیں بتائی۔ میں نے اظہر سے درخواست کی کہ اب دبئی واپس مت جاؤ، گھر والوں کو سنبھالو۔ اس نے مجھے تسلی بخش جواب دیتے ہوئے کہا۔

''تم فکر نہ کرو مظہر میں انہیں سنبھال لوں گا۔''

''مظہر پتر میری مکھنی کا کیا ہوگا۔'' اچانک امی نے روتے ہوئے پوچھا۔ ان کے الفاظ اور آنسوؤں نے میرے دل پر گھونسا رسید کیا۔ مجھے اپنے اقرار جرم پر بہت پچھتاوا ہوا۔ مجھے تھانے سے بھاگ کر اپنی بہن کو تلاش کرنا چاہیے تھا۔ تمہارا ذکر چھیڑا تو کوئی بھی خود پر کنٹرول نہ رکھ سکا۔ سبھی دھیمی آواز میں رونے لگے تھے۔ میں نے اظہر سے کہا۔

''اظہر بھائی آپ پہلی فرصت میں مکھنی کے اغوا کی ایف آئی آر کٹوائیں چوہدریوں کے خلاف اور اپنے تئیں مکھنی کو تلاش کرنے کی کوشش کریں۔''

اظہر نے میرے سامنے ہر کام کی ہامی بھری تھی، مگر جب سسرال رانی کے پاس گیا تو سب کچھ بھول گیا۔ دو ماہ بعد اس نے کمال یہ دکھایا کہ بیوی رانی کو لے کر واپس دبئی بھاگ گیا۔ یہ خبر مجھے امی اور سکھاں نے آنسوؤں کے بیچ سنائی تھی۔ میرے ساتھ ان کی وہ ملاقات بھی آخری ثابت ہوئی۔ اس کے بعد مجھے ملنے کوئی نہ آیا۔ مظہر بھائی لحہ بھر کو خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے دل پر ضبط کے پتھر رکھ لیے تھے۔ میں فقط دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ آگے بولو مظہر بھائی۔

مجھے موت کی سزا سنائی جا چکی تھی۔ میں جیل پہنچ گیا تھا۔ جیل میں میرے مراسم چند نامی گرامی غنڈوں کے ساتھ جڑ

گئے۔ میں نے بھی قتل کیا تھا۔ وہ بھی اپنے علاقے کے بااثر شخصیت کو اس لیے میرا رعب و دبدبہ بھی جیل میں قائم تھا۔ خیر گجر اور میرا افضل عرف کالو دونوں ہی اہم بندے تھے۔ چھٹے ہوئے غنڈے اور ایک بڑی سیاسی پارٹی سے وابستہ تھے۔ مخالف پارٹی کے انہوں نے آٹھ دس بندے مار دیے تھے۔ ان کے پیچھے بہت بڑے بڑے ہاتھ تھے، سزائے موت ہونے کے باوجود انہیں مکھن سے بال کی طرح جیل سے نکال لیا گیا تھا۔ ایک دن دونوں مجھے ملنے آئے اور بولے۔ ہمارے یار کچھ کام بتا۔

میں نے ان کے چہروں کی طرف دیکھا۔ منیر گجر بولا۔

''کیا دیکھ رہے ہو میرے یار۔ یقین نہیں ہم پر۔''

''یقین تو ہے یار۔ پر سوچ رہا ہوں تمہیں اس جھنجٹ میں دیکھنا چاہیے یا نہیں۔'' میری بات سن کر اس نے بلند قہقہہ لگایا۔ اس کی ہنسی میں کالو بھی شریک تھا۔ وہ کالو سے بولا۔

''لوکر لوگل۔ جھنجٹ'' اس نے پھر سے بلند قہقہہ لگایا۔ ''ارے میری جان ہم تو دن رات موت اور زندگی کا کھیل کھیلتے ہیں۔ تم کہہ رہے ہو جھنجٹ۔ اوئے چھڈ یار۔ کام بول۔''

''میں نے کہا مہر داد نگر میں چوہدری نثار نامی ایک شخص ہے۔ چوہدری راحیل کا بڑا بھائی اسے اٹھانا ہے۔''

''بس۔'' کالو نے ایسے کہا جیسے یہ کام اس کے لیے انتہائی معمولی نوعیت کا ہے۔ میں نے کہا۔

''کالو اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ سنا ہے پنجاب کے چیف منسٹر تک پہنچ ہے ان کی۔'' کالو اور منیر گجر نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا۔

''کالو نے کہا۔'' لے بھئی گجر ہم تو اسے بڑا بہادر سمجھتے تھے پر اس کا حال یہ ہے کہ ہمیں چوہدری نثار سے ڈرا رہا ہے۔

''ارے مظہر تو نے خود اس کا بھائی گرا دیا اور ہمیں ڈرا رہا ہے۔ ہم اسے اٹھائیں گے نہیں خنجر سے گردن پر لکیر بنائیں گے۔'' آئی سمجھ۔

''نہیں گجر اسے مارنا نہیں ہے۔ صرف اٹھانا ہے۔ اس سے مجھے کچھ پوچھنا ہے۔''

''کیا پوچھنا ہے۔ ہمیں بتاؤ ہم اس کے گلے میں انگلی ڈال کر سب کچھ اُگلا لیں گے۔''

''نہیں یار سمجھا کرو نا۔ میں بتادوں گا تم لوگوں کو فی الحال اسے اغوا تو کرو۔''

''چھڈ گجر شہزادہ جو کہتا ہے مان لے یار۔''

''ٹھیک ہے کالو۔ سن مظہر آئندہ دو تین دنوں تک چوہدری کو اٹھا کر تجھے اطلاع دیتے ہیں۔ وہ چلے گئے۔''

''میں بالیقین کہہ سکتا تھا وہ کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔ ایک ہفتہ بعد وہ پھر مجھے ملے اور خوش خبری سنائی کہ میرا دیرینہ دشمن چوہدری نثار ان کا مہمان بن چکا ہے۔ اب اگلی بات بتا اس کا کیا کرنا ہے۔''

میں نے اب تک ان سے اصل بات پوشیدہ رکھی تھی۔ اب بتانا ضروری تھا، میں نے کہا۔ گجر تم دونوں میرے بہترین دوست، غمگسار اور ہمدرد ہو، مجھے امید ہے تم دونوں میری لاج رکھو گے۔ کہتے ہوئے میری آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ گجر بولا۔

''اوئے مظہر۔ ہم غنڈہ صفت لوگ ضرور ہیں پر یاروں کے یار ہیں۔ جس سے یاری لگ گئی سمجھ لگ گئی، پھر جان بھی چلی جائے تو پیچھے نہیں ہٹتے ہیں، دیکھتے نہیں ہو تمہارے کہنے پر ہم نے مہر داد نگر میں جا کر چوہدری کو اغوا کر لیا ہے۔''

یہی بات تو مجھے دلاسا دیتی ہے گجر۔ میں نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے انہیں بتایا۔ میری چھوٹی بہن مکھنی کو چوہدری راحیل نے اغوا کیا تھا۔ وہ تو اپنے منطقی انجام کو پہنچ چکا ہے۔ اب چوہدری نثار ہی بتا سکتا ہے کہ مکھنی کہاں ہے۔

''اوہ اچھا تو اصل ماجرہ یہ ہے۔'' گجر نے ہنکارا بھرتے ہوئے کالو کی جانب دیکھا۔ میں نے کہا۔ میرے یاروں چوہدری سے ہر صورت پوچھنا ہے مکھنی کہاں ہے۔

''میرے یار تو فکر نہ کر چوہدری نثار کیا اس کا باپ بھی بتائے گا کہ بہن مکھنی کہاں ہے۔''

وہ چلے گئے مجھے ڈھارس ہوئی کہ مکھنی تیرا پتا چل جائے گا، مگر مقدر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دو دن بعد مجھے پتا چلا کالو اور گجر دونوں مارے جا چکے ہیں۔ جس مخالف سیاسی پارٹی کے انہوں نے دس بندے گرائے تھے۔ انہوں نے بدلہ لے لیا تھا۔ اس کے بعد مجھے کوئی ملنے نہیں آیا۔ گھر والوں کو شاید علم ہی نہیں کہ مجھے اڈیالہ جیل منتقل کر دیا گیا ہے۔ میرے دل و دماغ میں واحد بوجھ تھا کہ پتا نہیں تو کہاں اور کس حال میں ہوگی۔ آج یہ بوجھ بھی اُتر چکا ہے۔ اب فکر ہے تو امی، سکھاں اور پھوپھو کی۔

''آپ فکر نہ کریں مظہر بھائی۔ میں یہاں سے سیدھا سوہاوا جاؤں گی۔ ان کا پتا کروں گی اور چار پانچ دنوں تک انشاء اللہ ہم سب آپ کو ملنے آئیں گے۔''

''اللہ کرے مکھنی وہ تمہیں سوہاوا میں ہی ملیں۔'' مظہر بھائی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ اب تک وہاں قیام پذیر ہوں گے، وہ کیوں مظہر بھائی۔

مکھنی جیسے حالات ہم پر ٹوٹے تھے۔ ان غم ناک دنوں میں اپنا خون سفید ہوگیا تھا۔ اظہر انہیں دشت و بیاباں میں بے سروسامانی کی حالت میں چھوڑ کر دبئی بھاگ گیا تھا۔ سوچو تو دور کے رشتہ داروں سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ انہیں طویل عرصے سے تک پناہ دیں گے۔

''یہ ضروری نہیں بھائی مظہر کہ وہ خالہ خدیجہ کے گھر میں ہی ہوں۔ سکھاں پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی ہے۔ مجھے یقین ہے اس نے کہیں نوکری کر لی ہوگی اور گھر کی کفالت خود کر رہی ہوگی۔'' میری بات پر مظہر بھائی خاموش ہوگیا۔ میں نے کہا۔ سوہاوا جا کر مجھے کم از کم ان کے موجودہ ٹھکانے کا پتا تو چل جائے گا۔

''تمہیں سوہاوا پتا ہے مکھنی۔ تم کبھی وہاں گئی ہو۔''

''نہیں مظہر بھائی۔ کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ امی دو تین بار گئی بھی تھیں، مگر ساتھ کبھی سکھاں ہوتی تو کبھی پھوپھو۔ آپ مجھے راستہ بتا دیں میں پہنچ جاؤں گی۔''

''مکھنی تم یہاں سے سیدھی فیض آباد چلی جاؤ۔ وہاں سے تمہیں براہ راست سوہاوا کی ٹویوٹا ہائی لکس مل جائے گی۔ خالہ خدیجہ سوہاوا شہر میں نہیں ہے بلکہ مضافاتی گاؤں ساونڑاں میں ہے۔ ساونڑاں جانے کے لیے تمہیں سوہاوا سے با آسانی فورڈ ویگن مل جائے گی۔ سنا ہے اب رکشے بھی شروع ہو چکے ہیں۔ اور سن۔''

''چل بھئی ملاقات کا وقت ختم ہو چکا ہے، مظہر بھائی کی بات ادھوری رہ گئی۔'' موٹی توند والا کانسٹیبل آدھمکا تھا۔ میں نے اس کی طرف التجائیہ نظروں سے دیکھا۔ شاید پانچ دس منٹ مزید مل جائیں مگر وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

''چل کڑیے (لڑکی) آدھا گھنٹہ توں (سے) 2 منٹ وَد (زیادہ) ہوگئے ہیں۔''

میں نے مظہر بھائی کی طرف اُداسی سے دیکھا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ اور ہر قسم کے جذبات سے عاری ہوگیا تھا۔ میری آنکھیں پرنم ہوگئی تھیں۔ جیل کا منظر دھندلا ہونے لگا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

''رب راکھا بھائی۔'' کہتے ہوئے میں مڑ گئی۔

''رب تیری حفاظت کرے بہنا۔'' مجھے عقب سے مظہر بھائی کی آواز سنائی دی، میں نے دل میں آمین کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔



باہر کے مناظر بصیرت افروز تھے، مگر میں آنے والے حالات میں الجھی ہوئی تھی۔ گاڑی کی رفتار اور مخصوص آواز مجھے ماں کی طرح لوری دینے لگی تھی، میں نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔ زندگی کے ملبوس پر حالات کے الجھے ہوئے پیوند بڑھتے جا رہے تھے۔ گاڑی راولپنڈی سے نکل کر روات میں داخل ہوئی تو مہر داد نگر کی یادوں نے دبوچ لیا۔ مظہر بھائی نے بتایا تھا۔ روات سے آگے مندرہ پھر گوجر خان اور اس کے بعد سوہاوا کا چھوٹا سا شہر آئے گا۔ گاڑی چلتی رہی، رُکتی رہی، مناظر پیچھے سرکتے رہے اور میں سوچوں کی وادی میں بھٹکتی رہی۔ وقت سے پہلے میں خالہ خدیجہ کے گھر

ساونڑاں پہنچ کر امی کے سینے میں چھپ کر رو رہی تھی۔ کبھی دھیان میں سکھاں کا معصوم چہرہ ابھر آتا اور کبھی پھوپھو کی باتیں ذہن میں چلنے لگتی۔ گاڑی رک چکی تھی مگر مجھے دھیان نہیں تھا۔ کلینر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''باجی سوہاوا آ گیا ہے۔''

میں نے بوکھلا کر ادھر اُدھر دیکھا۔ دائیں بائیں گاڑیوں کا رش اور بندوں کی چہل پہل نظر آئی۔ میں نے کلینر سے پوچھا۔ ''یہ کون سا اسٹاپ ہے؟''

''سوہاوا بس اسٹاپ ہے جی۔ تھوڑا سا توقف کے بعد پھر بولا۔ ''باجی سوہاوا ہی آخری اسٹاپ ہے۔''

''میں نے دوپٹا درست کیا، چادر سے بدن کو ڈھانپا اور نیچے اُتر آئی۔ گاڑی کا کلینر ٹائر میں ہوا چیک کر رہا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

یہاں گاؤں ساونڑاں جانے کے لیے گاڑی کہاں سے ملے گی۔ میری آواز سن کر اس نے سر اُٹھا کر مجھے دیکھا۔ وہ چودہ پندرہ سال کی عمر کا لڑکا تھا۔ چہرے پر داڑھی کے نوخیز بال اور نوجوانی کی شادابی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ وہ گندے کپڑوں اور الجھے ہوئے بالوں میں بھی خوب صورت دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے لحظہ بھر سر کھجایا پھر دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہاں چلی جائیں۔ وہیں سے مختلف گاؤں کے لیے رکشے اور ویگن مل جائیں گی۔''

''بھائی مجھے ساونڑاں جانا ہے۔'' میں نے ایک بار پھر اسے یاددہانی کراتے ہوئے کہا تاکہ میں غلط راستے پر نہ چلی جاؤں۔ ''باجی وہاں سے کھڑبوٹ، چنڈا میرا، چیرنا، سرجلال شاہ، ساونڑاں۔ تمام دیہاتوں کی سواری مل جائے گی۔''
اس بار اس نے تفصیل بتائی تو مجھے بہت پیارا لگا۔ میں نے محبت سے کہا۔

''بہت شکریہ بھائی خوش رہو۔'' میں نے دیکھا اس بار اس کے چہرے پر خوش گوار مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔ وہ شاید کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر میں اپنے مطلوبہ مقام کی طرف چل پڑی تھی۔

ضلع گوجر خان کی تحصیل سوہاوا ایک چھوٹا سا شہر ہے جہاں ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز میسر تھی۔ سوہاوا کا بازار روایتی بازاروں جیسا تھا۔ دکانوں کی بھرمار نہ تھی مگر کم بھی نہیں تھی۔ بائی سائیکل، موٹر سائیکل، تانگے، رکشے اور پیدل چلنے والوں کا کافی رش تھا۔ دکانوں کے سامنے ریڑی بانوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ ساونڑاں کی ویگن تک پہنچنے کے لیے مجھے زیادہ تگ و دو نہیں کرنا پڑی۔ پرانے ماڈل کی تھکی ماندی فورڈ ویگن کے قریب لڑکا آوازیں کس رہا تھا۔ کھڑبوٹ، ساونڑاں آ جاؤ جی ساوئڑاں جانے والے۔ میرا رُخ اس کی طرف ہوا تو وہ لپک کر میری جانب آیا۔ ''باجی کہاں جانا ہے۔''

''ساونڑاں۔''

''بیٹھو جی بیٹھو۔ دو سواریاں کم ہیں ابھی چلتے ہیں۔'' اس نے گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں اندر سوار ہوئی تو وہ پھر سے چلانے لگا۔ آ جاؤ جی کھڑبوٹ، ساونڑاں جانے والے۔ ڈرائیور نے پرانا حربہ آزماتے ہوئے گیئر لگا کر گاڑی کو تھوڑا سا آگے بڑھایا تو باہر سے کلینر چلایا۔

''استاد روک کے...... دو سواریاں آ رہی ہیں۔''

ویگن جیسے ہی فل ہوئی کنڈیکٹر نے دروازہ بجاتے ہوئے کہا۔

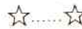
''چل استاد ڈبل اے۔''

مجھے ڈرائیور کے عقب میں سیٹ ملی تھی۔ یہ خواتین کے لیے مخصوص سیٹ تھی، میرے ساتھ ایک تیس پینتیس سالہ عورت اپنے چار سالہ بچے کے ہمراہ بیٹھی ہوئی تھی، اس کے ساتھ دو نوجوان لڑکیاں براجمان تھیں، باقی ویگن کی تمام سیٹوں پر مردوں کا قبضہ تھا۔

گاڑی چلتے ہی میں نے بغلی عورت کو دیکھا۔ وہ قبول صورت عورت تھی، بیٹے کو اپنی گود میں بٹھانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ وہ بدک بدک کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

''باجی مجھے ساونڑاں جانا ہے، میں پہلی بار جارہی ہوں اور۔''
''ارے تمہیں ساونڑاں جانا ہے۔'' میری بات کاٹتے ہوئے وہ فوراً چہک کر بولی۔ میں بھی ساونڑاں جاؤں گی، میرا نام شگفتہ ہے۔ یہ میرا بیٹا ہے فاروق۔ بڑا شیطان ہے جی اور ساونڑاں کس کے گھر جارہی ہو۔ وہ نان اسٹاپ بولنے لگی تھی۔ آواز بلند تھی اس لیے دونوں نوجوان لڑکیاں بھی اُسے دیکھنے لگی تھیں۔ اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔
''تیرا نام کیا ہے۔ تُو نے بتایا نہیں۔''
''میرا نام مکھنی ہے۔'' میں نے آواز دھیمی رکھتے ہوئے کہا۔
''مکھنی تُو کس کے گھر جارہی ہے۔'' اس نے فوراً سوال داغ دیا، پھر جواب سُنے بغیر بولی۔ ''تُو اکیلی ہے یا پیچھے مرد بھی ہے؟'' شگفتہ انتہا درجے کی باتونی عورت تھی۔ میں پچھتا رہی تھی کہ اس سے بات ہی کیوں کی۔ دونوں لڑکیاں شگفتہ کی طرف اشارہ کرکے ہنس رہی تھیں۔ شگفتہ نے فاروق کو گود میں دباتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔
''مکھنی تُو ساونڑاں کس کے گھر جارہی ہے۔''
''وہاں میری خالہ کا گھر ہے۔'' میں جواب دینے کے بعد شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ وہ بال سے کھال اُتارنے والی عورت تھی، اس لیے مجھے ڈر تھا وہ خالہ کا حدود اربعہ ضرور پوچھے گی، مگر اس بار اس کا بیٹا اچھل کر کھڑا ہوا تو وہ اسے ڈانٹنے لگی۔ میں نے تھوڑی سی مزید کروٹ لی اور اپنا دھیان باہر کرلیا، تقریباً آدھا گھنٹہ بعد کنڈیکٹر نے آواز لگائی۔
''چل بھئی ساونڑاں والے۔''
''اوئے گاڑی روکنا اُترنا ہے ہمیں۔'' شگفتہ نے فوراً کہا۔ کنڈیکٹر نے آواز لگائی۔
''اُستاد گاڑی روک کے۔ بندے اُتارنے ہیں یہاں۔''
گاڑی رکتے ہی شگفتہ کی گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔
''اے مکھنی تُو نے بتایا نہیں تیری خالہ کون ہے؟ اور تُو آئی کدھر سے ہے۔ ہم نے پہلے تو تمہیں ساونڑاں آتے جاتے نہیں دیکھا۔''
''میری خالہ کا نام خدیجہ ہے اور میں پہلی بار یہاں آئی ہوں۔''
''خدیجہ کون؟'' اس نے پوچھا پھر خود ہی بولی، وہی جس کا پچھلے سال انتقال ہوگیا تھا۔ شگفتہ کی بات سن کر مجھے دھچکا لگا۔ میں اس شش و پنج میں تھی کہ اسے ہاں کہوں یا نہ۔ میں خود نہیں جانتی تھی پچھلے سال مرنے والی خدیجہ نامی خاتون میری خالہ تھی یا کوئی اور۔ میں نے بات ٹالتے ہوئے پوچھا۔
''شگفتہ باجی آپ کا گھر کہاں ہے۔'' وہ فوراً بولی۔
''میرا گھر وہی خالہ منگوے کے ساتھ والا گھر میرا ہے نا۔'' اس نے ہاتھ نچاتے ہوئے جواب دیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اس نے سرخ اینٹوں والے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔
''مکھنی وہ رہا تمہاری خدیجہ خالہ کا گھر۔'' میں نے ایک نظر مکان کی طرف دیکھا اور اس کا شکریہ ادا کرکے اس طرف چل پڑی، پیچھے سے شگفتہ نے آواز لگائی۔
''ارے سن مکھنی۔ میرے گھر ضرور آنا۔ آج شام کو ہی آجانا۔''
''جی ضرور آؤں گی۔'' میں نے جواب دیتے ہوئے قدم تیز کردیے مبادا وہ پیچھے ہی نہ آجائے۔
سرخ اینٹوں والا مکان میرے سامنے تھا۔ میری کیفیت یک لخت بدل گئی تھی، دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ شگفتہ کی قربت کی ساری شگفتگی لمحوں میں غائب ہوچکی تھی۔ ذہن میں سیکڑوں خیالات اُمڈ آئے تھے۔ نجانے کون سی خبر سننے کو ملے، یا پھر شاید قسمت کی دیوی مہربان ہوجائے۔ میں امی کے سینے میں لگ کر گزشتہ برسوں کے سارے غم بھلادوں۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر داخل ہوئی تو سامنے چارپائی پر خالہ خدیجہ کے اکلوتے بیٹے بھائی نور کو بیٹھے ہوئے پایا۔ نور بھائی ابا کے جنازے میں شرکت کے لیے مہرداد نگر آئے تھے، مجھے دیکھتے ہی اس نے فوراً پاؤں چارپائی سے نیچے

لٹکائے اور چپل پہن کر کھڑے ہو گئے۔
''آؤ آؤ ملکھنی بسم اللہ ہے'' وہ کہتے ہوئے میرے قریب چلے آئے، پھر کمرے کی طرف منہ کر کے آواز لگائی۔
''عائشہ...... عائشہ دیکھو ملکھنی آئی ہے، خالہ خورشید کی بیٹی مہر دادنگر والی۔'' اگلے چند لمحوں میں سارے گھر والے میرے گرد جمع ہو چکے تھے۔
میری متلاشی نگاہیں امی، سکھاں اور پھوپھو کو ڈھونڈ رہی تھیں، مگر ان میں سے ایک بھی کہیں نظر نہیں آئی، حال احوال پوچھنے کے بعد میں نے امی کا پوچھا تو جواب ملا۔
''ملکھنی ہم نے خالہ کو بہت روکنا چاہا تھا مگر وہ بھائی مظہر کے جاتے ہی واپس جانے پر بضد تھی، پھر بھی ہم نے انہیں بضد ایک ماہ تک روکے رکھا، لیکن ایک ماہ بعد وہ سکھاں اور پھوپھو سمیت یہاں سے چلی گئی تھی۔''
''نور بھائی انہوں نے کچھ بتایا تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہیں۔''
''ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی۔'' نور نے سوچتے ہوئے کہا، پھر روئے سخن اپنی بیوی عائشہ کی طرف کرتے ہوئے بولا۔
''کیوں عائشہ تمہیں خالہ نے کچھ بتایا تھا۔''
''نہیں ملکھنی۔ واضح کچھ نہیں کہا۔ ہاں البتہ جاتے سمے اتنا ضرور کہا تھا کہ مظہر پتر کو راولپنڈی میں کام مل گیا ہے۔ ہم نے انہی کے پاس جانا ہے۔''
میں نے سرد آہ کھینچی۔ مظہر بھائی تو اڈیالہ جیل میں قید ہے، امی نے ایسا کب کہا ہوگا اور کہا بھی ہو تو اصل بات بتانے میں کوئی مجبوری مانع ہوگی۔
''ملکھنی تو کہاں تھی؟ سنا ہے تمہیں مہر دادنگر کے کسی چوہدری نے اغوا کر لیا تھا۔'' عائشہ بھابھی کے لہجے میں طنز تھا۔
''بھابھی جس چوہدری نے مجھے اغوا کیا تھا مظہر بھائی نے اس کے جسم کے دس ٹکڑے کر کے مہر دادنگر کے گندے نالے میں پھینک دیے تھے۔'' میں نے غصے میں جواب دیا۔ میرے لہجے کی تلخی کو نور بھائی نے محسوس کر لیا تھا۔ وہ فوراً بولے۔
''بیٹی ماہ نور جلدی جاؤ ملکھنی کے لیے کچھ لسی پانی کا بندوبست کرو۔''
''نہیں نور بھائی مجھے جانا ہوگا۔''
''ارے ایسے کیسے ملکھنی اتنی دور سے آئی ہو۔ سوکھے منہ کیسے جانے دیں گے۔ ماہ نور جاؤ بیٹی۔ نرگس تم بھی جاؤ بہن کے ساتھ فوراً کھانا تیار کرو۔''
نور بھائی کے بے حد اصرار پر میں نے دوپہر کا کھانا وہاں کھایا اور ظہر کی نماز ادا کر نے نکل آئی۔



میں ایک بار پھر انجان منزل کی راہی بن کر جسم کا بوجھ بے انت سمت دھکیلنے لگی تھی، سست اور نڈھال قدم جدھر کو آئے اُٹھنے لگے۔ ذہن میں کوئی واضح منزل نہ ہو تو راہوں سے پوچھا نہیں جاتا، بس جدھر کو منہ آئے اسی جانب قدم بڑھتے رہتے ہیں۔ میرا دماغ گھن چکر بنا ہوا تھا۔ ساری سوچیں ایک ہی گرداب میں گھومنے لگی تھی۔ گھر والے کہاں ہوں گے، بظاہر ان کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ میری طرح وہ بھی بے منزل کی مسافر تھیں، کہاں گئی ہوں گی؟ کٹی پتنگ کو ہوا جہاں مرضی آئے لے اُڑتی ہے۔ انہیں وقت کے ستم گزیدہ حالات کہاں پہنچ رہے ہوں گے؟ آخر کہیں تو انہوں نے ڈیرہ جمایا ہوگا، کیوں کہ یہ ایک دو دنوں کی بات نہیں تھی۔ سالوں بیت گئے تھے، مگر کہاں؟ یہ سوال میرے ذہن میں ہتھوڑے کی طرح برسنے لگا تھا۔ امی، سکھاں اور پھوپھو کا غم پورے جسم میں تحلیل ہو کر پھوڑے کی طرح دکھنے لگا تھا۔ جس علاقے سے میں گزر رہی تھی وہ دیہی علاقہ تھا۔ ساونڑاں ویران اور بے رونق سا گاؤں تھا۔ یہاں لوگوں کا بہت رش تھا۔ جوان، بوڑھے، بچے، مرد وزن، آتے جاتے لوگوں کو دیکھ کر میں نے نتیجہ اُخذ کیا کہ آگے یا تو کوئی شادی ہے یا پھر ماتم۔ دوسرا خیال زیادہ قوی تھا۔ لوگ عام حلیوں میں تھے۔ میں بھی انہی لوگوں میں شامل تھی۔ کسی نے مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی۔ میں نے ساتھ چلتی ہوئی عورتوں کی ٹولی میں سے ایک عورت سے پوچھا۔

''خالہ! یہ اتنے سارے لوگ کہاں جارہے ہیں۔ آگے کوئی موت ہوگئی ہے کیا؟'' میرے سوال پر ٹولی کی تمام عورتوں نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ ان کے دیکھنے کے انداز سے میں سمجھ گئی میرا قیاس قطعی غلط ہے، بہرحال میں جواب سننے کے لیے خاموش رہی۔ وہ عورت بولی۔

''لگتا ہے تم کسی دوسرے علاقے سے آئی ہو۔'' عورت نے پُرسوچ نظریں میرے چہرے پر جماتے ہوئے پوچھا، پھر بولی۔

وہ سامنے سرجلال شاہ گاؤں ہے، گاؤں میں سرجلال شاہ کا مزار بھی ہے۔ آج وہاں عرس ہے یہ سارے لوگ عرس پر جارہے ہیں۔ عورت نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ اب میرا ان سے علیحدہ ہونا بہتر تھا۔ اگر ساتھ چلتی رہی تو بہت سے سوالات کا سامنا کرنا پڑتا۔ میں نے قدم آہستہ کرلیے۔ ایک دو نے پلٹ کر مجھے دیکھا مگر کہا کچھ نہیں۔ میں نے سوچا، رات سر پر کھڑی ہے۔ سوہاوا جاتے جاتے شام ہوجائے گی۔ رات کہاں بسر کروں گی۔ سرجلال شاہ کا مزار میرے لیے بہترین چھت تھا۔ عرس کی رونقیں یقیناً دو یا تین دنوں تک جاری رہیں گی۔ ان دنوں میں، میں کچھ بہتر پلاننگ کرسکتی تھی۔

میں سرجلال شاہ کے مزار پر پہنچ گئی۔ یہاں وہ سب کچھ ہورہا تھا جو اس قسم کے عرسوں پر عموماً ہوا کرتا ہے۔ احاطے میں ایک طرف لوگوں کا الگ جم گھٹا نظر آرہا تھا۔ میں اس طرف ذرا قریب ہوئی تو پتا چلا جم گھٹ میں ایک شخص پرسوز آواز میں کلام باہوؒ پڑھ رہا تھا۔ کلام پڑھنے والے کی آواز میں انوکھا درد نمایاں تھا۔ اس کے گرد لوگوں کی کافی بھیڑ لگی ہوئی تھی، میں خاموشی سے لوگوں کی بھیڑ میں ایک طرف دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ پُردرد آواز ہوا کے دوش پر لہراتی ہوئی میری سماعت سے ٹکرانے لگی۔ مجھے ایسے لگا جیسے ماں لوری سنا رہی ہے۔ میری آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ آنکھیں بند ہوتے ہی مولوی بابا کا مزار سامنے آکھڑا ہوا۔ میرے اندر سے ایک ہوک اُٹھی اور پورے جسم کو چیرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ کلامِ باہو پڑھنے والے کی آواز لے پر گونج رہی تھی۔

تسبیح پھری تے دل نہ پھریا کی لینڑاں تسبیح پھڑ کے ہُو
علم پڑھیا تے ادب نیوں سکھیا کی لینڑاں علم نوں پڑھ کے ہُو

میری بند آنکھوں سے آنسو جاری ہونے لگے۔ سلطان باہو کے کلام پر توجہ دی تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ چہرہ آنسوؤں سے بھیگتا جارہا تھا۔ میری پوری توجہ کلام پر مرکوز تھی۔ اُدھر درباری راگ میں اگلا مصرعہ اٹھایا جارہا تھا۔

چلے کٹے تے کج وی نہ کھٹیا کی لینڑاں چلیاں ویڑ کے ہُو
جاگ بنا دُود جمکے نہ باہو پاویں لال ہووے کڑ کڑ کے ہُو

یہ مصرعہ چابک کی طرح میرے جسم پر برسا۔ میرے منہ سے بے اختیار سسکی نکل گئی۔ الفاظ بمع مفہوم اپنی پوری جزئیات کے ساتھ میرے اندر اُترنے لگے۔ دودھ کو دہی میں بدلنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ دودھ میں پہلے تھوڑا سا دہی یا لسی ملائی جائے۔ دودھ میں ملانے والی چیز کو جاگ کہتے ہیں۔ بنا جاگ کے دودھ کبھی دہی میں نہیں بدلتا، چاہے اسے اُبال اُبال کر سرخ ہی کردیا جائے۔ مسلمان کے لیے اپنے ایمان میں جاگ ڈالنا ضروری ہے اور وہ جاگ ہے عشقِ رسول ﷺ۔ حج بھی ہو، زکواۃ بھی ہو، نماز بھی ہو، سب کچھ ہو مگر دل میں عشقِ رسول ﷺ نہ ہو تو سارے عمل رائیگاں ہیں۔ عمل کو معراج تک پہنچانے کے لیے دل میں عشقِ رسول ﷺ ضروری ہے۔

میری آہیں سسکیوں میں بدلنے لگیں۔ مجھے اپنے چار سو ایک پُراسرار سا ہالہ محسوس ہونے لگا تھا۔ میں ہولے ہولے کانپنے لگی تھی، ادھر پڑھنے والے کی لے پورے عروج پر تھی۔ آواز کی پُرسوزی بلندیوں کو چھو رہی تھی۔

تن مَن میرا پُرزے پُرزے جیویں درزی دِہاں لیراں ہُو
اِنا لیراں دی گل کفنی پا کے تے رلساں ملنگ فقیراں ہُو

میرے گرد تنا ہوا پراسرار ہالہ پھیلنے لگا۔ میری سسکیاں چیخوں میں بدلنی لگیں، میں ہوش کی دنیا سے نکل کر مدہوشی کی وادی میں چلی گئی۔ میرے پاؤں تھرکنے لگے اور ہاتھ فضا میں بلند ہوگئے۔ درباری راگ کی لے دوبارہ اٹھائی گئی۔

تَن مَن میرا پُرزے پُرزے جیویں درزی دِیاں لیراں ہُو۔

میں اٹھ کر دھمال ڈالنے لگی۔ اس بارئے کی اٹھان نرالی تھی۔ دنیا جہاں کا کرب آواز میں سمٹ آیا تھا۔ میرے تھرکتے قدموں میں جیسے بجلیاں بھر گئی تھیں۔ اچھلتے کودتے میرا سانس پھولنے لگا تھا۔ شاید ارد گرد لوگوں کا شور بھی بلند ہونے لگا تھا، مگر مدہوشوں کو ہوش والوں کی خبر نہیں ہوتی۔ آگہی کی دنیا بھی بڑی کرب انگیز ہے۔ ہر مصرعہ میرے خون کی گردش کو جلا بخش رہا تھا۔ اچانک ہی گھنگرو کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ چھن، چھن، چھن میرا تھرکتا جسم تھم گیا۔ پاؤں کو جیسے بریک لگ گئی۔ لمحوں میں، میں مدہوشی سے ہوش میں لوٹ آئی۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو سیکڑوں لوگوں کو اپنے ارد گرد دائرے کی شکل میں کھڑا پایا۔ کسی نے میرے پاؤں کے قریب گھنگرو پھینک دیے تھے۔ دیکھنے والوں کو شاید بنا گھنگروں کے دھمال کا لطف نہیں آتا۔ ایک وہ گھنگرو تھے جو چوہدری اللہ رکھا نے اپنی حویلی میں میری جانب پھینکے تھے، بدلے میں دو گز نیچے زمین میں جا پہنچا۔ اب ایک بار پھر میدان میں گھنگرو پڑے ہوئے تھے۔ میڈم خانم کے کوٹھے پر میں نے بجتے گھنگروں کی بہت سی آوازیں سنی تھیں۔ انم سے ایک بار میں نے کہا تھا۔ انم مزار کے گھنگروں اور کوٹھے کے گھنگروں میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اگر گھنگرو باندھنے ہی ہیں تو مزار کے باندھیں۔ آج اُس بات کو عملی جامہ پہنچانے کا وقت آ چکا تھا۔ لوگ مجھے دیکھ رہے تھے اور میں گھنگروں کو گھور رہی تھی، گھنگرو نہ زمین پر تھے نہ میری آنکھوں میں بلکہ دونوں کے درمیانی خلا میں پڑے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں مقام سونپنا تھا۔ زمین یا پھر آنکھیں۔ زمین پر چلے گئے تو کبھی میرے پاؤں تک نہیں آ سکتے۔ آنکھوں تک رسائی حاصل کر لی تو معتبر ہو جائیں گے۔ کلامِ باہو پڑھنے والا بھی تھم گیا تھا۔ جب میں نے جھک کر گھنگرو اٹھائے تو وہ پوری طاقت سے پڑھنے لگا۔

الف اللہ چنبے دی بوٹی میرے من وچ مُرشد لائی ہُو

نفی اس بات دا پانڑی مِلیا ہر رگِ ہرجائی ہُو

میں نے گھنگرو باندھ کر دایاں پاؤں زمین پر مارا۔ چھن کی آواز بھری، پھر بایاں پاؤں مارا۔ چھن کی آواز پھر ابھری۔ پاؤں کی ایڑی زمین پر زور سے ماری آواز کچھ تیز ہوگئی۔ چھن۔ بایاں اور پھر دایاں پاؤں اوپر تلے زمین پر پٹش کیے تو گھنگرو ساز کی طرح بجنے لگے۔ چھن، چھنا چھن، چھن۔ اب زمین پر پاؤں مارنے کا تسلسل بڑھنے لگا تھا۔ گھنگرو کی چھن چھنا چھن میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی میں مدار میں گھومنے لگی تھی۔ کلامِ باہو جاری تھا۔

اندر بوٹی مُشک مچایا تے جان پھلنڑ تے آئی ہُو

میرے اندر بھی عشق والی بوٹی پھوٹ پڑی تھی۔ بہت جلد میں ہوش مندی سے مدہوشی میں چلی گئی۔ مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ میں کتنی دیر تک یہ تماشا کرتی رہی۔ مجھے ہلکا سا محسوس ہوا تھا جیسے لہرا کر زمین پر گر پڑی ہوں۔ گرنے کے بعد باقی سارے احساسات مٹتے چلے گئے تھے۔ جب ہوش آیا تو چند عورتوں کو خود پر جھکے پایا۔ آنکھیں کھولتے ہی وہ ذرا پیچھے کو ہٹیں۔ وہ تین بوڑھی عورتیں تھیں، ایک مہربان ہاتھ میری پیشانی پر آیا ساتھ ہی نسوانی آواز سنائی دی۔

"طبیعت کیسی ہے بیٹی؟"

میں اپنے بدن میں ہلکی سی تھکاوٹ کے سوا کوئی دوسری غیر معمولی چیز محسوس نہیں کر رہی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں۔" میں نے جواب دیا، کچھ دیر بعد مجھے بیتے ہوئے واقعات یاد آئے۔ میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دوسری عورت بولی۔

"لیٹی رہو بیٹی یہاں تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ آرام کرو۔"

میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ یہ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ ہر قسم کے ساز و سامان سے عاری۔ فقط فرش پر چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا میرے گلے میں چار مختلف موتیوں کی مالائیں پڑی ہوئی ہیں۔ پیروں میں گھنگرو نہیں تھے۔ میں نے فوراً مالائیں اُتارنا چاہیں تو قریب بیٹھی ہوئی عورت فوراً بولی۔

"رہنے دے بیٹی۔ پیر صاحب کے حکم پر ہم نے پہنائی ہیں۔" میں نے اس کی طرف دیکھا مگر میرے ہاتھ رُکے

نہیں۔ میں نے مالائیں اُتارتے ہوئے کہا۔ ''نہیں مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے اُتار کر چاروں مالائیں عورت کو تھما دیں اور کھڑی ہوگئی۔

میں نے ان سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ٹائم کیا ہے۔'' جواب ملا۔ صبح کے چھ بج رہے ہیں۔ میں جواب سُن کر چونک پڑی۔ میں نے بے اختیار پوچھا۔ ''کیا میں پوری رات یہاں سوئی رہی ہوں۔!''

''ہاں بیٹی! ہم تمہیں دربار سے اٹھا کر یہاں گھر لے آئی تھی۔ پیر صاحب کا حکم تھا آپ کی خدمت کی جائے۔'' اس کا جواب سن کر میں نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

''یہ پیر صاحب کون ہیں؟''

''یہاں کے سجادہ نشین ہیں بیٹی۔ کیا وہ یہاں آئے تھے۔''

''نہیں بیٹی انہوں نے صرف تمہیں وہاں دربار میں دھمال ڈالتے دیکھا تھا، اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہم چاروں نے کہا۔''

''بیٹھ جاؤ بیٹی میں ناشتا لاتی ہوں۔''

''نہیں مجھے اب جانا ہے، میں نے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا، عقب سے وہی عورت بولی۔

''بیٹی کچھ کھا پی لے۔ پھر چلی جانا۔''

جانے دے زیب النساء پیر صاحب کا حکم ہے رُکے تو خدمت کرنا جانا چاہے تو جانے دینا روکنا مت۔

میں جلدی سے باہر نکل آئی، چلتے ہوئے میں نے اپنے آپ پر دھیان دیا، دھمال ڈالتے وقت جس مدار میں گھر گئی وہی تھی۔ اس سے بدن میں ہلکا سا درد اٹھ رہا تھا، اس کے علاوہ کوئی غیر معمولی چیز محسوس نہیں ہوئی، کپڑے، سلیپر، دوپٹا، چادر سبھی کچھ ویسے کا ویسا تھا۔ حتیٰ کہ چادر کے پلّو سے بندھی رقم بھی جوں کی توں موجود تھی، میں نے سکون کا سانس لیا اور قدم تیز کر دیا۔ میں جلد سے جلد اس جگہ سے دور ہو جانا چاہتی تھی، کافی دیر چلنے کے بعد میں نے سوچا کسی سے پوچھ کر سوہاوا کے لیے گاڑی پکڑی جائے، ایک راہ گیر سے میں نے پوچھا۔

''سنو بھائی مجھے سوہاوا جانا ہے۔ یہاں کوئی گاڑی۔'' میری بات کاٹ کر وہ بولا۔ ''تھوڑا آگے چلی جاؤ۔ کھڑ پوٹ سے ویگن مل جائے گی۔'' وہ بہت جلدی میں تھا کہتا ہوا اپنی راہ میں ہولیا۔ میں اس طرف چل پڑی جس طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔

خصوصیات، ثقافت و کلچر میں تقریباً تمام دیہات یکساں ہوتے ہیں، ساونڑاں پھر سر جلال شاہ اور اب کھڑ پوٹ، کم و بیش ایک جیسے تھے، صرف نام کا فرق تھا۔ ویگن کی تلاش میں، میں نے ادھر اُدھر نگاہیں دوڑائیں تو ایک شخص پر نظر پڑتے ہی میں محاورتاً نہیں حقیقتاً اچھل پڑی۔ وہ شخص مخالف سمت میں جا رہا تھا، میں نے غور سے اسے دیکھا، وہی چال ڈھال، الجھے ہوئے بال، پاؤں میں ہوائی چپل، میلے کپڑے اور چال میں سستی۔ ہاں وہی ہے۔ بالکل وہی ہے، میرے دل نے خوشی کا نعرہ لگایا۔ میں اس طرف بھاگ پڑی۔

عبداللہ...... رکو عبداللہ، بھاگتے ہوئے میں نے اسے آوازیں دیں، میری آواز اس نے سن لی تھی، وہ پلٹ کر مجھے دیکھ رہا تھا، میں بھاگتی ہوئی اس کے نزدیک پہنچ گئی اور اکھڑی ہوئی سانس بحال کرنے لگی، اس نے مجھے دیکھ کر اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا اور بولا۔ دھت تیرے کی، کہتے ہوئے وہ زور زور سے ہنس پڑا۔

ہی ہی ہی۔

میں سمجھی وہ مجھے دھتکار رہا ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا، وہ میرا ہاتھ پکڑ کر زمین پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

بیٹھ بیٹھ یہیں بیٹھ جا ملکھنی۔ وہ کہتے ہوئے بیٹھ چکا تھا، میں خود بخود اس کے زور سے اس کے ساتھ بیٹھتی چلی گئی۔

☆......☆

(اس حیرت انگیز اور اسرار بھرے ناقابلِ فراموش سلسلے کی اگلی کڑی آئندہ ماہ پڑھیے)

پردیس سے پہلی کہانی

گونگی ماں



ملک عاشق حسین ساجد

ماں کے پیار کے احساس کو اُجاگر کرتی ایک پُراسرار تحریر

سارا دن گاؤں کے مردوں، عورتوں اور بچوں کا ریٹائرڈ صوبیدار یوسف علی کے گھر آنا جانا لگا رہا۔ کوئی آ رہا تھا اور کوئی جا رہا تھا۔ یوسف علی کے گھر میلے کا سماں تھا۔ اس کے گھر کا ہر فرد خوش و نازاں تھا۔ وہ ہر آنے والے کو خوش آمدید کہتے اور واپسی پر صوبے دارنی زبیدہ بیگم ہر ایک کو دروازے پر آ کر ایک مسکراہٹ سے خدا حافظ کہتی۔ صوبے دارنی کے گھر نہ تو کسی کی شادی تھی اور نہ ہی کسی بچے کی سالگرہ تھی، مگر پھر بھی ان کے گھر میں خوشیوں کی بارات اتر آئی تھی۔

یوسف علی کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔ بیٹا جمیل سب سے بڑا تھا۔ یوسف علی نے فوج کی ملازمت کے دوران جمیل کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی، تو اس نے تعلیمی میدان میں کامیابیاں سمیٹیں اور پھر مزید تعلیم کے لیے وہ یورپ چلا گیا۔ وہاں تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے جرمنی میں ملازمت کر لی اور پھر اسے وہاں کی شہریت بھی مل گئی، مگر وہ اپنے گاؤں، گھر، والدین اور بہنوں کو نہیں بھولا تھا۔ وہ ہر سال ان سے ملنے پاکستان ضرور آتا اور رشتے داروں، عزیزوں کے لیے تحفے بھی لاتا۔ اس عرصے میں یوسف علی ریٹائر ہو گیا اور گاؤں میں آ کر رہنے لگا۔ جمیل ہر ماہ گھر والوں کو ایک معقول رقم بھی بھیجتا تھا جس سے ان کی گزر بسر بہتر انداز میں ہو رہی تھی۔

یوسف علی چوں کہ فارغ ہوتا تھا، اس لیے اس نے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لیے گھر کے ساتھ ہی ایک باغ بنا لیا تھا۔ وہ سارا دن پودوں کی حفاظت اور تراش خراش میں مصروف رہتا۔ اس نے کچھ پرندے بھی پال رکھے تھے۔ کبوتروں اور مرغیوں کا اسے بہت ہی شوق تھا۔ فوج میں ملازمت کے دوران اس نے آرمی آڈیٹوریم میں ایک ڈاکومینٹری فلم دیکھی تھی جو پرندوں کے بارے میں تھی۔ اس فلم میں ایک ایسی مشین دکھائی گئی تھی جو انڈوں سے چوزے نکالتی تھی۔ اس نے جمیل سے فرمائش کی اب کی بار وہ پاکستان آئے تو وہ چوزے نکالنے والی مشین ضرور ساتھ لائے۔ چناں چہ اس نے اپنے والد کی فرمائش پوری کر دی اور چوزے نکالنے والی مشین لے آیا۔

وہ ایک عجیب و غریب مشین تھی اور وہی عجیب و غریب مشین دیکھنے کے لیے گاؤں کے لوگ ان کے گھر آ جا رہے تھے اور صوبے دارنی زبیدہ بیگم بڑے فخر سے ان کو وہ مشین دکھا کر اور اس کی خوبیاں بتا رہی تھی، جو انڈوں کو سیتی تھی اور ایک ہی وقت میں سیکڑوں بچے نکل آتے تھے۔

یوسف علی نے مشین کو آزمانے کے لیے پورے پچاس انڈے اکٹھے کر کے مشین میں رکھ دیے اور پھر ان

سے چوزے نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔ مخصوص وقت گزرنے کے بعد یوسف علی نے مشین کے اندر جھانکا تو اس کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھل اٹھا، وہ خوشی سے چلایا۔

''زبیدہ!......ادھر آؤ جلدی سے۔''

زبیدہ دوڑی ہوئی آئی تو یوسف علی بولا۔

''سب بچے نکل آئے ہیں، ایک انڈا بھی خراب نہیں ہوا۔'' زبیدہ کا چہرہ بھی چوزوں کو دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھا......وہ چوزوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''یہ کتنے نازک، پیارے اور خوب صورت ہیں۔ اب دیکھتے ہیں کہ ان میں سے کتنے مرغ ہوں گے اور کتنی مرغیاں؟'' دونوں میاں بیوی اور ان کی بیٹیاں بھی خوش تھیں۔ ایک بیٹی نے یوسف علی سے پوچھا۔

''ابا جان! انڈے مشین میں رکھ دینے سے آپ ہی بچے کیسے بن گئے؟'' یوسف علی کی سمجھ میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی۔ وہ کچھ دیر اس گتھی میں الجھا رہا اور پھر اکتا کر بولا۔

''کیسا وقت آ گیا ہے......کیسی کیسی نئی باتیں دیکھنے میں آ رہی ہیں۔ مجھے خود سمجھ نہیں آیا کہ یہ کیسے ہو گیا ہے۔'' پھر ان کی بیٹی بھی خاموش ہو گئی اور کوئی مزید سوال نہ کیا۔ انہوں نے مل کر چوزوں کو انکیوبیٹر سے باہر نکالا اور پھر ان کو زمین پر چھوڑ دیا۔ نازک نازک چوزوں کو دیکھ کر سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

چار دن بعد یوسف علی ان چوزوں کو باغ میں لے گیا۔ باغ کیا تھا، ایک بڑا سا پولٹری فارم تھا، جہاں محلے بھر کی مرغیاں اور ان کے بچے بے ہنگم بھاگ دوڑ کیا کرتے تھے۔ اڑوس پڑوس کی مرغیاں بھی اپنے اپنے چوزوں کو لے کر یوسف علی کے باغ میں آ جاتی تھیں اور سارا دن کوڑا کرکٹ اور مٹی کرید کر اپنی اور اپنے بچوں کے پیٹ کی آگ بجھاتیں۔ مشینی بہن بھائی بھی ان میں شامل ہو جاتے اور خوب لڑائی جھگڑا کرتے اور اودھم مچاتے اور کبھی سانجھے شکاریوں کی طرح مل جل کر زمین



کریدتے اور کیڑے مکوڑے کھانے میں لگے رہتے۔
دن تو ان ہنگاموں میں گزر جاتا۔ مگر جب شام ہوتی تو مشینی چوزوں کو ایک انجانا سا تلخ احساس بے چین کر دیتا، کیوں کہ اردگرد سے آنے والی مرغیوں کے بچے چوں چوں کرتے اپنی اپنی ماؤں کے پروں میں جا کر دبک جاتے، مگر مشینی ماں کی کوکھ سے پیدا ہونے والے چوزے یتیم اور بے آسرا بچوں کی طرح غم زدہ اور اُداس نگاہوں سے ان کو تکتے رہتے۔

☆......☆

یوں ہی چند ہفتے گزر گئے، اب وہ چوزے بڑے ہو گئے تھے اور ان کی شکلوں سے نر اور مادہ کا فرق واضح ہو گیا تھا۔ یوسف علی اور اس کے گھر والوں نے چند چوزوں کے نام بھی رکھ لیے تھے، خاص کر ان کے جو تیز و طرار تھے۔ وہ چُنوں، مُنوں، پرنس اور گوری کے نام سے پکارے جاتے تھے...... ایک شام یوسف علی نے جب چوزوں کو دڑبے میں بند کیا تو مُنوں کو دیر تک نیند نہ آئی۔ اس نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے چُنوں کو آہستہ سے آواز دی، نیند اسے بھی نہیں آئی تھی اور وہ بھی ننھی منی سوچوں کے تانے بنے میں مصروف تھا۔ وہ دوسری آواز پر چونکا اور پوچھا۔ ”کیوں مُنوں...... کیا بات ہے؟“

”یہ جو باغ میں دوسرے چوزوں کے ساتھ تین بڑی بڑی ”بیبیاں“ گھومتی پھرتی ہیں، وہ ان کی کیا لگتی ہیں؟“

چُنوں کچھ دیر خاموش رہا، پھر کہنے لگا۔

”صحیح بات تو میں نہیں جانتا...... مگر کہتے ہیں کہ یہ ان کی مائیں ہیں۔“

”مائیں۔“ مُنوں کی حیرت سے جیسے چیخ نکل گئی...... ”مگر یہ مائیں کیا ہوتی ہیں؟“ مُنوں نے پوچھا۔

”مُنوں...... میں تمھیں کیا بتاؤں۔“ چُنوں نے رندھے ہوئے گلے سے کہا اور چپ ہو گیا۔

”چُنوں...... چُنوں۔“ مُنوں نے اسے ٹھونگا مارا۔

”کیا ہے؟“

”کل کسی دوسرے چوزے سے پوچھیں گے کہ ماں کیا ہوتی ہے؟“

”ہاں، ہاں، ٹھیک ہے۔ کل کسی سے معلوم کریں گے۔“

☆......☆

اگلی صبح چوزے باغ میں پہنچے تو مُنوں نے ایک دوسرے چوزے سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”بھائی! کیا آپ بتائیں گے کہ ماں کسے کہتے ہیں؟“

اس چوزے نے زوردار اور طنزیہ قہقہہ لگایا...... مُنوں کے دل پر گویا آری سے چل گئی...... مگر پھر بھی اس نے درد بھرے لہجے میں اپنا سوال پھر دہرایا۔

”ہاں، بھائی جی! بتائیں نا...... ماں کیا ہوتی ہے؟“

اس چوزے نے مُنوں کی طرف دیکھا تو اسے اس کی یتیم سی صورت پر ترس آ گیا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

”ماں...... بس ماں ہی ہوتی ہے۔“

اس جواب سے مُنوں کے پلے کچھ نہ پڑا۔ اس نے پھر اس کی منت سماجت کی اور نہایت ہی جذباتی سا ہو کر کہنے لگا۔ ”بھائی! بتائیں نا، ماں کیا ہوتی ہے؟ ماں کس کو کہتے ہیں؟“

دوسرا چوزہ پہلے تو مسکرایا پھر بولا۔ ”بات یہ ہے مُنوں بھائی! تم بن ماں کے یتیم لوگ نہیں جان سکتے کہ ماں کیا ہوتی ہے؟“ مُنوں کے لیے ”یتیم“ نیا لفظ تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”یتیم کس کو کہتے ہیں؟“

”سب سے بدنصیب مخلوق ہوتی ہے یہ۔“ دوسرے چوزے نے کہا۔ ”مگر ہم یتیم اور بدنصیب کیوں ہیں؟“ مُنوں نے پھر سوال کیا۔

”مُنوں! ہم تم تو مرغی، مرغے ہیں۔ یہ انسان بھی یتیم اور بدنصیب ہم سے بڑھ کر بھی ہوتے ہیں۔“

اس چوزے کی باتیں پہیلیوں سے کم نہ تھیں۔ مُنوں کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا اور وہ خاموش اور اُداس ہو گیا۔ رات کو اس کی دڑبے میں بیٹھے ہوئے چُنوں سے ملاقات ہوئی تو اس نے پوچھا۔

”مُنوں! کچھ پتا چلا...... ماں کیا ہوتی ہے؟“

”نہیں۔“ مُنوں رنجیدہ سا ہو کر بولا۔

”میں نے بھی ایک دوسرے چوزے سے پوچھا تھا۔“ چُنوں بولا، ”وہ کہنے لگا۔“ یتیم لوگ نہیں جان سکتے کہ ماں کیا ہوتی ہے اور یتیم وہ ہوتا ہے جس کے ماں باپ نہ ہوں۔ مُنوں کی لُغت میں ایک نئے لفظ کا اضافہ ہو گیا تھا۔

”چُنوں! یہ باپ کیا ہوتا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میرے خیال میں ایک سایہ ہوتا ہے۔“

''مگر یہ کرتا کیا ہے؟''
''اپنے بچوں کو دھوپ نہیں لگنے دیتا شاید۔''
مُنوں نے ایک لمبی ''ہوں'' کی، ایک آہ بھری اور خاموش ہوگیا۔

☆......☆

اگلے روز دونوں دن بھر اُداس، اُداس سے رہے...... چند دنوں بعد ایک واقعہ رونما ہوگیا۔ مشینی چوزے اور دوسرے محلے داروں کی مرغیاں اور چوزے باغ میں حسبِ معمول دانا دُنکا اور کیڑے مکوڑے چگ رہے تھے کہ ایک بلّی کہیں سے باغ میں آ گئی۔ وہ اچانک ایک بڑے سے چوزے پر جھپٹی اور اس کی ٹانگ پکڑ لی، باغ میں کھلبلی مچ گئی۔ چوزے، مرغے اور مرغیاں اِدھر اُدھر بھاگنے لگے...... چوزے کی ماں نے جو اپنے بچے کو چیختے چلاّتے دیکھا، تو وہیں دُور سے ایسی اڑان بھری کہ سیدھی بلّی کے منہ پر گری اور چونچیں اور پنجے مار مار کر اسے عاجز کر دیا۔ آخر بلّی نے چوزے کو چھوڑ کر اس کی ماں کو دبوچ لیا، اتنے میں یوسف علی دوڑا آیا۔ بلّی اسے دیکھتے ہی اپنا شکار چھوڑ کر دُم دبا کر بھاگ گئی۔ یوسف نے زخمی مرغی اور چوزے کی مرہم پٹی کر دی...... بلّی کے بھاگ جانے کے بعد ہوش ٹھکانے آئے تو چُنوں بولا۔
''مُنوں! اب پتا چلا ہے کہ ماں کس کو کہتے ہیں۔''
''ہاں بھائی چُنوں!'' مُنوں نے کہا۔ ''ماں جان دے کر بھی اپنے بچے کی حفاظت کرتی ہے۔''
''بالکل ٹھیک کہا تم نے، ماں اپنے بچوں کو بچانے کی خاطر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتی ہے۔''
چُنوں نے اس کی تائید کی۔

☆......☆

ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ باغ میں چوزے حسبِ معمول خوراک کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ چُنوں اور مُنوں کے ساتھ پرنس بھی تھا۔ اچانک ایک چیل آسمان کی بلندی سے آئی، جھپٹا مارا اور پرنس کو اپنے پنجوں میں دبوچ، یہ جا، وہ جا...... چُنوں، مُنوں کے ہوش گم ہوگئے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہوا؟ وہ دونوں ذرا سنبھلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ تمام مرغیاں اپنے اپنے بچوں کو پَروں کے نیچے چھپائے بیٹھی ہیں۔ چیل کو ماؤں والے چوزوں پر جھپٹنے کی جرأت نہ ہوئی اور وہ یتیم پرنس کو لے اُڑی۔ اس المناک سانحے پر مُنوں کی زبان سے صرف چند الفاظ نکل سکے۔
''چُنوں! پرنس ہم سے دُور چلا گیا ہے۔''
''ہاں...... بہت دُور، نہ جانے کہاں؟'' چُنوں نے کہا اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

☆......☆

چُنوں، مُنوں اور پرنس۔ اس چوزے کی عیادت کو گئے تھے۔ جب اسے بلّی نے زخمی کیا تھا۔ اب اس کی ماں ان کے پاس پرنس کی تعزیت کے لیے آئی تھی۔ وہ اظہارِ افسوس کر کے جانے لگی تو مُنوں بولا۔
''کاش! ہماری بھی ماں ہوتی...... تو پھر بھائی پرنس یوں نہ جاتا۔''
''تمہاری ماں ہے بھئی!!'' مرغی نے کہا...... اس کے لب و لہجے میں گہرا طنز تھا۔ ''ہماری ماں......'' دونوں نے حیرت سے بیک آواز پوچھا۔
''ہاں بھئی! وہ جو صوبے دار صاحب کے برآمدے میں لوہے کی بڑی سی الماری رکھی ہوئی ہے نا...... وہی تمہاری ماں ہے، اس سے پوچھو کہ اس نے تمہارے بھائی کی حفاظت کیوں نہ کی؟''
یہ کہہ کر مرغی تو چلی گئی، مگر ان دونوں کو ایک نئی اُلجھن میں ڈال گئی۔

☆......☆

اس رات حبس بہت زیادہ تھا۔ صوبے دار صاحب نے چوزوں کو آنگن میں کھلا چھوڑ دیا۔ چُنوں اور مُنوں، رات بھر انکوبیٹر کے گرد چکر کاٹتے رہے اور چُوں چُوں کرتے رہے۔ صبح ہوئی تو صوبیدار صاحب یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ مُنوں...... مشین کے پاس مرا پڑا ہے اور چُنوں مشین کے گرد چکر کاٹ رہا ہے اور تھکی ہوئی آواز میں چُوں چُوں کر رہا ہے۔ مشین پر چونچ کے نشان لگے ہوئے ہیں۔ جیسے وہ ساری رات اس کے گرد گھومتے اور چونچیں مارتے رہے تھے۔
صوبے دار صاحب کو دیکھ کر چُنوں چُپ ہوگیا اور انہیں یوں دیکھنے لگا، جیسے وہ ان سے پوچھ رہا ہو۔
''صوبے دار صاحب! ہماری ماں گونگی کیوں ہے؟۔''

☆......☆

پردیس سے دوسری کہانی

کیوں یہ کھیل کھیلا

فوزیہ جاوید

ایک ایسی لڑکی کی کہانی جو خود ہی اپنی موت کا سبب بن گئی

میں ابھی کام سے تھکا ہارا لوٹا تھا۔ کچھ کام کی پریشانی تھی کہ آج کل کاروبار ٹھیک نہیں چل رہا تھا اور کچھ پریشانی مجھے اپنی بیوی عالیہ کی تھی۔ ہماری شادی کو صرف دو ماہ ہوئے تھے۔ ہم بہت خوش باش زندگی بسر کر رہے تھے، مگر کچھ دنوں سے عالیہ نے عجیب وغریب حرکتیں شروع کر رکھی تھیں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ میں جیسے ہی گھر میں داخل ہوا تو میری چار جوان بہنیں، اماں اور دو چھوٹے بھائی ایک چارپائی کے اردگرد جمع تھے۔ ایک تو مجھے اپنے کاروبار کی پریشانی تھی اور پھر جس طرح میری اماں بہنیں اور بھائی چارپائی کے نزدیک کھڑے تھے، اس منظر نے میرے حواس چھین لیے، میں تقریباً بھاگتا ہوا چارپائی کے نزدیک پہنچا۔

''بھائی دیکھیں نا بھابی کو کیا ہو گیا۔'' میری تینوں بہنیں رو رہی تھیں۔

''اماں کیا ہوا عالیہ کو؟'' عالیہ پسینے میں شرابور تھی۔

اس کی پلکیں لرز رہی تھیں۔ وہ گردن کو دائیں بائیں ہلا کر کچھ بول رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر میں بھی گھبرا گیا۔

''کیا پتا پتر۔ اچھی بھلی کھانا کھا کر اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی کہ اچانک ہمیں چیخ کی آواز آئی۔ ہم بھاگ کر آئے۔ بجلی گئی ہوئی تھی۔ ہم بمشکل اُٹھا کر اسے صحن میں لائے، تب سے اس کی یہی حالت ہے۔''

مجھ سے اپنی بیوی کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ میں چارپائی کے پاس بیٹھا اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ وہ کچھ کچھ ہوش میں آنے لگی تھی پھر اس نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں۔

''کیا ہوا عالیہ؟ تم ٹھیک ہو نا؟ جیسے ہی اس نے آنکھیں کھولیں، میں نے بے تابی سے اس کی طبیعت کا پوچھا۔ میری طرف دیکھ کر وہ رونا شروع ہو گئی اور جلدی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہنے لگی۔

''ظفر پلیز مجھے اس گھر میں نہیں رہنا ہے، اس کمرے میں نہیں رہنا۔'' وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ میں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور پوچھا ''کیوں نہیں رہنا؟ کیا ہوا ہے؟ تمہیں اماں یا میری بہنوں سے کوئی شکایت ہے؟''

فی الوقت یہی وجہ میرے ذہن میں آئی تھی، کیوں کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ہماری شادی کو صرف دو ماہ ہوئے تھے اور کچھ لڑکیاں جلدی ایڈجسٹ نہیں ہوتیں سسرال میں اور کبھی کبھار

سسرال والوں کی طرف سے بھی کچھ مسائل پیدا ہوجایا کرتے ہیں۔

''نہیں یہاں سب بہت اچھے ہیں، مگر اس گھر میں کوئی آسیب ہے جو یہاں مجھے نہیں رہنے دے رہا۔ پلیز ظفر آج تو اس نے میرا گلہ دبانے کی بھی کوشش کی ہے، پلیز ظفر مجھے الگ کمرہ دیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے بری طرح رونا شروع کردیا۔

ہم سادہ لوح لوگ تھے۔ آسیب وغیرہ کے متعلق کافی باتیں سن رکھی تھیں، اس لیے یقین کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔

کاروبار بھی ٹھیک نہیں جا رہا میں الگ گھر کیسے؟''

ایک طرف تو مجھے اپنی ماں اور بہنوں کا خیال تھا کہ انہیں اکیلا چھوڑ کر میں کیسے کوئی اور گھر لے لوں، کیوں کہ مجھے پتا تھا کہ اماں یہ گھر نہیں بیچنے دیں گی اور نہ ہی خود یہاں سے کہیں اور رہنے پر راضی ہوں گی اور دوسری طرف مجھے اپنی بیوی کی فکر کھائے جارہی تھی۔ کچھ دنوں میں اس کی طبیعت کافی خراب ہوچکی تھی۔

''بھائی پلیز ہم اکیلے رہ لیں گے، ویسے بھی مدثر اور مبشر ہمارے ساتھ ہیں نا۔ آپ بھابھی کو لے کر کسی



''ہاں پتر دیکھ تو کیا حالت ہوگئی میری نوں کی۔ اللہ جانے کس بدبخت کی نظر لگ گئی، تو اِسے الگ گھر لے دے۔'' اماں تو عالیہ پر صدقے واری جاتی تھیں۔ بہو کی یہ حالت دیکھ کر وہ خود بھی رو رہی تھیں۔

''مگر اماں آپ کو پتا ہے میرے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہے۔ ابھی شادی پر تو اتنا پیسا خرچ ہوا ہے اور

اور گھر میں شفٹ ہوجائیں۔ ہم سے بھابھی کی یہ حالت نہیں دیکھی جارہی۔''

اماں اور بہنوں کے اصرار پر میں نے کرائے کے مکان کے لیے کوشش شروع کردی کہ تھوڑے کرائے پر کسی مناسب سے مکان کا بندوبست کرلوں اور جب عالیہ ٹھیک ہوجائے تو واپس اماں کے پاس آجاؤں۔

کرائے کا مکان ڈھونڈنے میں مجھے کافی دقت پیش آ رہی تھی۔ اسی طرح مسلسل دس روز گزر گئے۔ عالیہ کو اب دورے بھی پڑنے شروع ہو گئے تھے کبھی وہ خود کو مارنے لگتی، کبھی گھر کے برتن توڑ دیتی، کبھی اونچی آواز میں رونا شروع کر دیتی۔

ایک دن عالیہ کی امی میرے سامنے رو پڑیں اور مجھ سے کہنے لگیں کہ کسی عامل بابا سے رجوع کروں، وہی اس مسئلے کا حل نکال سکتا ہے۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ ہم متوسط گھرانے کے سادہ لوح لوگ ہیں، لہٰذا جس راہ پر کوئی لگاتا، ہم چل پڑتے۔ مجھے بھی ان کی باتوں میں وزن نظر آیا۔ میں نے اپنے ایک جاننے والے سے بات کی۔ اس نے ایک پہنچے ہوئے عامل بابا کا مجھے کارڈ دیا جس پر لکھا تھا کہ ہر کام سو فیصد گارنٹی کے ساتھ، میری کچھ امید بندھی اور میں نے ان عامل بابا سے رابطہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ بیوی کو لے کر میرے آستانے پر آ جاؤ، مگر میں نے انہیں بتایا کہ میری بیوی کی حالت ایسی نہیں کہ اُسے آستانے پر لا سکوں، لہٰذا آپ گھر تشریف لائیں اور گھر آ کر علاج کرنے کا الگ سے ہدیہ لے لیں۔ عامل بابا نے مجھے کہا کہ وہ 50 ہزار لیں گے۔ چوں کہ رقم بہت زیادہ تھی مگر مجھے عالیہ کا علاج ہر صورت کروانا تھا۔ میں نے پیسوں کی پروا نہیں کی اور حامی بھر لی۔ جس دن میں عامل بابا کو گھر لایا، اس دن میں نے نوٹ کیا کہ عالیہ بہت پریشان تھی۔ اس دن اُسے معمول کی طرح دورے بھی نہیں پڑے، مگر میں ان سب باتوں کو عامل بابا کے آنے کی برکت سمجھ رہا تھا۔ مجھے خوشی بھی ہو رہی تھی کہ عالیہ جلدی ٹھیک ہو جائے گی، مگر ایک بات جو مجھے کھٹک رہی تھی وہ یہ تھی کہ عالیہ کے علاج کا دورانیہ بڑھتا جا رہا تھا۔ پہلے عامل بابا میرے سامنے ہی کچھ پڑھ پڑھ کر عالیہ پر دم کرتے مگر اب اکیلے کمرے میں انہیں عالیہ کے ساتھ دو دو گھنٹے گزر جاتے۔ اس دوران اندر سے عالیہ کے چیخنے کی آوازیں بھی آتیں مگر ہم باہر بیٹھے یہ دعا کرتے رہتے کہ عالیہ پر سے آسیب اُتر جائے۔

اس روز صبح سے ہی نہ جانے کیوں میرا دل پریشان تھا، جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ میں مستقل عالیہ کی بیماری کے متعلق سوچ رہا تھا۔ کئی روز علاج کو گزر گئے تھے، آج بھی عامل بابا نے آنا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد عامل بابا آ گئے اور عالیہ کے ساتھ کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ آج نہ تو عالیہ کے چیخنے کی آوازیں آئیں، نہ ہی عامل بابا کی کوئی آواز۔ میرا دل پر گھبراہٹ سی طاری ہونے لگی۔ اس سے پہلے کہ میں اندر جاتا۔ عامل بابا باہر آ گئے۔ انتہائی گھبرائی ہوئی حالت میں بار بار کندھے پر رکھے رومال سے اپنا ماتھا خشک کر رہے تھے۔

"کیا ہوا عامل بابا؟ عالیہ ٹھیک تو ہے نا؟" مجھے عامل بابا کی حالت تشویش میں مبتلا کر رہی تھی۔

"بہت ہی خطرناک آسیب تھا، ضد میں آ کر اس نے عالیہ کی جان لے لی۔ میں بھی بہت مشکل سے جان بچا پایا ہوں۔"

امّاں نے یہ سنتے ہی اسی وقت بین ڈالنا شروع کر دیے اور سینہ پیٹتی کمرے کی طرف بھاگیں۔ میں جو عامل بابا کی بات پر ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا، اندر کی جانب بھاگا۔ عالیہ بیڈ پر اوندھی لیٹی ہوئی تھی، اماں نے جلدی سے اُسے سیدھا کیا۔ عالیہ کا رنگ پیلا زرد ہو رہا تھا، جیسے کسی نے اس کے جسم سے سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ میں نے اس کے ناک کے آگے ہاتھ رکھا مگر وہ سانس نہیں لے رہی تھی۔ نبض بھی چیک کی۔ ہمیں یقین ہو گیا کہ عالیہ مر چکی ہے۔

میری بہنوں اور امّاں کا خوف سے بُرا حال تھا اور میرا تو وہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، دو مہینے ہوئے تھے شادی کو، اپنی بیوی سے محبت ایک فطری امر تھا۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ہمارا ساتھ یہیں تک تھا۔ خیر شام ہونے سے پہلے ہی ہم نے اس کی تدفین کا بندوبست کر دیا۔ عالیہ کے گھر والے بھی بُرے حال میں ہمارے گھر پہنچے۔ وہ بھی سادہ اور شریف لوگ تھے، ہماری طرح انہیں بھی یقین آ گیا کہ عالیہ کی موت آسیب کی وجہ سے ہوئی ہے۔ امّاں اتنی خوف زدہ ہو گئیں کہ قل خوانی کے فوراً بعد پنڈی خالہ کے گھر چلی گئیں اور میری بہنیں اور بھائیوں کو بھی ساتھ لے گئیں۔ انہوں نے مجھے بھی چلنے کو کہا مگر مجھے اس گھر

میں عالیہ کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا، سو میں نے کاروبار کا بہانہ بنا کر سہولت سے انہیں منع کر دیا۔

میری زندگی کا وہ دن سب سے زیادہ تکلیف دہ تھا، جس دن مجھے عالیہ کی موت کی حقیقت کا علم ہوا۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی میں آج صرف اس بات کے لیے تڑپتا ہوں کہ کاش وہ دن میری زندگی میں نہ آیا ہوتا یا میں بھی اماں کے ساتھ پنڈی چلا گیا ہوتا۔ کاش مجھے حقیقت کا علم نہ ہوتا۔ اس حقیقت کا علم مجھے عالیہ کے مرنے کے ٹھیک دس دن بعد ہوا۔

ہوا کچھ یوں کہ میری طبیعت اس دن بہت خراب تھی، اس لیے میں اپنی دکان پر نہیں گیا۔ گھر میں ہی آرام کر رہا تھا کہ مجھے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ پہلے تو میں سمجھا کہ میرا وہم ہے مگر دروازہ مسلسل کھٹک رہا تھا۔ چار و ناچار مجھے اُٹھ کر دروازہ کھولنا پڑا۔ سامنے ایک لڑکی نقاب میں کھڑی تھی، اس نے پہلے مجھے سلام کیا۔

''جی فرمایئے! میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

مجھے شش و پنج میں دیکھ کر اس نے اپنا نقاب اُتار دیا اور بولی۔

''ظفر بھائی میں رضیہ ہوں عالیہ کی سب سے اچھی سہیلی۔''

پھر مجھے یاد آیا کہ اسے میں نے اپنی شادی پر عالیہ کے گھر دیکھا تھا۔ مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر ایک بار پھر بولنے میں پہل اُسی نے کی۔

''ظفر بھائی اندر آنے کو نہیں کہیں گے؟'' میں نے چپ چاپ راستہ چھوڑ دیا وہ خود ہی بولتی بولتی اندر آ گئی۔

''عالیہ کہاں ہے ظفر بھائی؟ کافی دن سے میری اس سے بات ہی نہیں ہوئی فون پر۔ سوچا جا کر خود مل آؤں۔ وہ موصوفہ تو شادی کے بعد سسرال کو ہی پیاری ہو گئیں۔'' وہ بلا تکان بولتے ہوئے صحن ہی میں رک گئی۔

''کیا بات ہے ظفر بھائی؟ آپ کی طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی اور عالیہ کہاں ہے؟ گھر میں اتنی خاموشی کیوں ہے؟''

میرے چہرے کے اُڑے رنگ اور آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ خود بھی تھوڑی دیر کے لیے گھبرا گئی۔

میں نے بغیر بولے وہیں صحن میں پڑی چارپائی پر اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور آہستہ آہستہ اُسے ساری بات بتا دی۔ پہلے وہ منہ کھولے میری باتیں حیرت سے سنتی رہی جیسے اسے یقین ہی نہ آ رہا ہو، مگر کچھ ہی دیر میں وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بہت ضبط کے

باوجود میں بھی خود پر کنٹرول نہیں کر پایا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ ہم دونوں چپ چاپ روتے رہے پھر وہ جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ جب تک بیٹھی رہی مجھے محسوس ہوتا رہا کہ شاید وہ مجھے کچھ بتانا چاہتی ہے مگر بتا نہیں پا رہی۔ میں دروازہ بند کرنے کے لیے اس کے پیچھے دروازے تک آیا وہ جیسے ہی دروازہ سے باہر قدم رکھنے لگی ایک دم پھر رک گئی اور پیچھے مڑ کر میری جانب دیکھا۔

''ظفر بھائی میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی انگلیوں کو مروڑ رہی تھی، جیسے اُسے بات بتانے کے لیے الفاظ نہ مل رہے ہوں۔

''جی بولیں۔''

''ظفر بھائی عالیہ پر کوئی آسیب نہیں تھا۔'' الفاظ تھے کہ جیسے میرے سر پر بم پھٹا تھا۔ میں پاگلوں کی طرح اس کا منہ تکے جا رہا تھا اور پھر دروازے پر کھڑے کھڑے ہی اُس نے مجھے پوری بات بتا دی۔

''ظفر بھائی دراصل عالیہ کا شروع سے ہی خواب تھا کہ جہاں اس کی شادی ہو وہ لڑکا اکیلا ہو اور وہ اس کے ساتھ گھر میں اکیلی رہی، مگر اس کی قسمت میں آپ تھے اور آپ کی فیملی بھی تھی۔ وہ مجھے بتاتی تھی کہ آپ سب لوگ بہت اچھے ہیں، مگر پھر بھی وہ گھر والوں کے ساتھ ایڈجسٹ نہیں کر پا رہی تھی۔ شادی کے فوراً بعد اُس نے مجھ سے بات کی کہ وہ آپ سے کہہ کر الگ گھر میں رہے گی، مگر جب اُس نے دیکھا کہ آپ اپنی ماں اور بہنوں سے بہت پیار کرتے ہیں تو اس نے مجھے اپنے منصوبے کا بتایا کہ وہ کس طرح آپ کے ساتھ الگ گھر میں رہ سکتی ہے۔ جب اس نے مجھے بتایا کہ وہ آسیب اور جن وغیرہ کا ڈراما کرے گی اور ویسی ہی حرکتیں کرے گی اور کہے گی کہ اس گھر میں آسیب ہیں جو مجھے مارنا چاہتے ہیں تو آپ اُسے الگ گھر لے کر دینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ میں نے جب اس کا منصوبہ سنا تو لرز گئی کہ عالیہ الگ رہنے کے لیے کس حد تک جا رہی ہے۔ میں نے اُسے بہت سمجھایا مگر وہ اپنی ضد کی پکی تھی۔ وہ جس دن اس طرح کا ڈراما کرتی مجھے فون کر کے ضرور بتاتی کہ آپ لوگ آہستہ آہستہ الگ گھر کے لیے راضی ہو رہے ہو۔

مجھے اس کی ذہنیت پر بہت افسوس ہوتا۔

میں نے کئی بار کوشش کی کہ آپ کو حقیقت سے آگاہ کر دوں مگر اس نے مجھے قسم دی تھی کہ اگر میں نے آپ کو یا اس کے گھر والوں کو بتایا تو وہ خود کو نقصان پہنچائے گی، پھر جب کچھ دن پہلے آپ نے عامل بابا سے اس کا علاج شروع کروایا تو ایک دن مجھے اس کا فون آیا وہ فون پر بہت رو رہی تھی، کیوں کہ عامل بابا کو پتا چل گیا تھا کہ اس پر کوئی آسیب نہیں، لہٰذا عامل بابا نے ڈرا دھمکا کر اس سے سچ اگلوا لیا، پھر اس دن کے بعد عامل بابا نے اس کی عزت سے کھیلنا شروع کر دیا۔ عامل بابا اُسے ڈراتا دھمکاتا تھا کہ اگر اس نے کسی کو بتایا تو وہ اُسے کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑے گا۔ وہ آپ کو سب کچھ بتانا چاہتی تھی، مگر وہ ڈر گئی تھی کہ وہ آپ کی نظروں میں گر جائے گی، مگر میں اُسے بار بار اکساتی رہی کہ وہ آپ کو اعتماد میں لے کر سب کچھ سچ بتا دے پھر اچانک میرا اس سے رابطہ ختم ہو گیا۔ میں نے موبائل پر کافی کوشش کی مگر نمبر بند ملا۔ میں بہت شرمندہ ہوں ظفر بھائی اگر میں آپ کو بتا دیتی تو شاید یہ سب نہ ہوتا۔

میں صُم بُکم کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ وہ خود ہی معذرت کر کے دروازے سے باہر نکل گئی۔

مگر میری سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں منجمد ہو چکی تھیں۔ میں وہیں دروازے کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

کوئی عورت کیسے اتنا بڑا کھیل کھیل سکتی جس میں اس نے اپنی عزت بھی گنوا دی، وہ بھی محض ایک الگ گھر کے لیے۔ وہ مجھ سے تو کہتی ایک بار، بات تو کرتی۔ مگر کاش اتنا بڑا کھیل نہ کھیلتی، اس کھیل نے اُسے الگ گھر کیا دینا تھا، اس نے تو اس کی جان ہی لے لی تھی۔

کاش وہ ایسا کھیل نہ کھیلتی۔

☆......☆

کانٹوں کی زمین



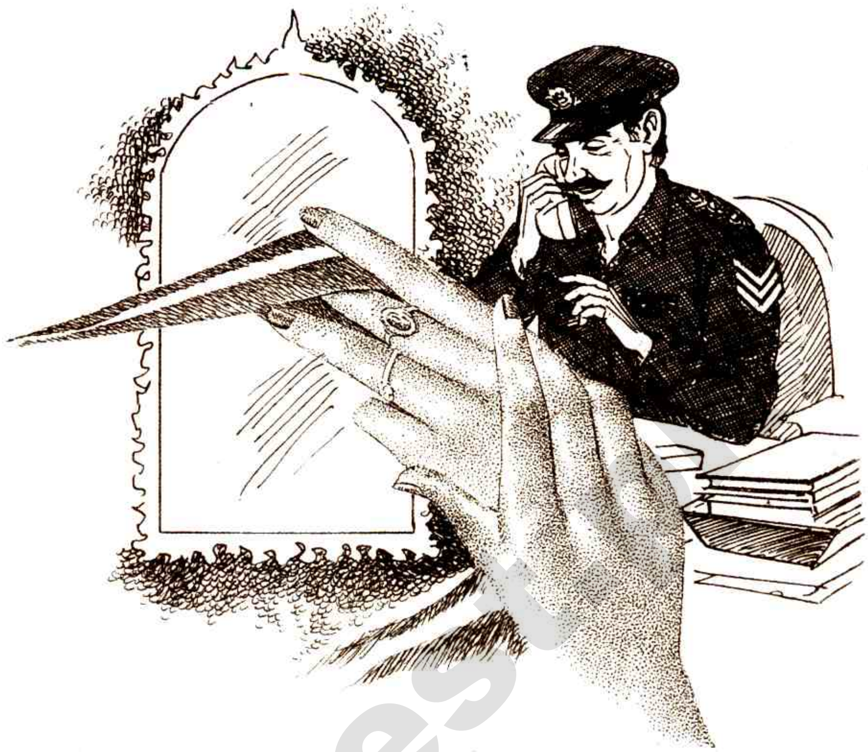
شعبان کھوسہ

گھر سے بھاگی ہوئی ایک پریمی لڑکی کی عبرت خیز داستان

میں اُس لڑکی کو ہمیشہ کی طرح ندی کے کنارے بیٹھا ہوا پاتا تھا۔ جہاں پہاڑوں آب شاروں سے آتا صاف ستھرا ٹھنڈا میٹھا پانی سبک رفتاری سے رواں رہتا اوراس میں اس کا عکس بڑا بھلا لگتا۔ وہ جب ندی پر پانی بھرنے کے لیے آتی تھی، تو نہ جانے کن سوچوں میں گم رہتی تھی۔ وہ ہمیشہ ہی پریشان سی نظر آتی تھی اور کبھی کبھی تو اس کی آنکھوں سے آنسو کی لڑیاں نکل کر گالوں کو چھو لیتی تھیں۔ میں اس لڑکی کو یوں پریشان دیکھ کر خود بھی پریشان سا ہو جاتا تھا۔ چوں کہ میں حساس طبیعت کا مالک تھا، اس لیے لڑکی کی پریشانی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ میں دل میں سوچتا تھا کہ اس معصوم سی لڑکی کو ایسی کون سی پریشانی یا دُکھ لاحق ہے، جو یوں ندی پر بیٹھ کر پانی کو گھورتی رہتی ہے اور آنسوؤں کی لڑیاں اس کی آنکھوں سے رواں رہتی ہیں۔ میری مجبوری یہ تھی کہ میں اس لڑکی سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا، کیوں کہ پاس ہی ندی کے کنارے پر ان کا جھونپڑی نما گھر واقع تھا، جس میں زندگی کی شاید ہی کوئی سہولت میسر ہو، جسے دیکھ کر انسان کے چہرے پر خوشی کی سرخی دوڑے۔ اس جھونپڑی نما گھر کو چاروں طرف سے جھاڑیوں کی چار دیواری بنا کر چھپانے کی کوشش کی گئی تھی، تاکہ جنگلی جانوروں سے حفاظت رہے۔

پولیس چوکی سے جھونپڑی صاف نظر آتی تھی جہاں میری ڈیوٹی تھی، اس لیے میں اگر لڑکی کے ساتھ بات کرتے ہوئے دیکھا جاتا تو لڑکی کے ساتھ ساتھ میری بھی شامت آجاتی۔ یہاں کے رہنے والے کسی غیر مرد کو اپنی عورت کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اپنی بدنامی سمجھتے تھے اور وہ سوچے سمجھے بغیر دونوں کو کاروکاری کردیتے تھے، یعنی دونوں اُن کی دونالی بندوق کا شکار ہو جاتے یا پھر اُس شخص کو معاوضہ یعنی مقامی زبان میں اُس کو (چٹی) بولتے ہیں، وہ ادا کرنا پڑتا تھا، جو ایک طرح سے غیر لڑکی سے بات کرنے کا جرمانہ یا جان بچانے کا ہرجانہ تھا، مگر میں اس معصوم لڑکی کو دُکھ میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لیے میں لڑکی سے بات کرنے کی ترکیب سوچ رہا تھا کہ کسی طریقے سے لڑکی سے بات ہو جائے اور مجھے اس کی پریشانی کا سبب معلوم ہو سکے۔

میں صبح سویرے کوئٹہ ہیڈ کوارٹر سے بذریعہ ٹرین روانہ ہوا اور شام کو جعفر آباد پہنچ گیا، پھر میں تھانے اطلاع دے کر سیدھا اپنے بڑے بھائی کے گھر چلا گیا۔ وہاں نہا دھو کر میں فریش ہوا اور کھانا کھانے کے بعد سو گیا۔ صبح اٹھا تو بھابی نے ناشتا تیار کیا ہوا تھا۔ میں ناشتا کر کے تھانے



پہنچا تو تھانے والوں نے مجھے 238 آر ڈی کا مراسلہ تھما دیا۔ میں تھانے سے روانگی لکھوا کے جائے تعینات کی طرف روانہ ہوگیا۔

جعفر آباد سے سینڑی پنہور کی طرف ایک کھٹارہ بُس کے علاوہ کوئی اور سواری نہیں جاتی تھی اور وہ بھی مسافروں سے بھری ہوتی تھی، اللہ کا نام لے کر میں بس پر سوار ہوگیا، گورنمنٹ کی مہربانی سے روڈ نہ ہونے کے برابر تھے۔ جگہ جگہ پر پتھر اور گڑھے پڑے ہوئے تھے، اس سے اچھا ہوتا روڈ کچا ہی رہتا تو کم از کم جھٹکے تو کم لگتے۔ ہر جھٹکے پر سر چھت سے لگ کر نیچے آ جاتا تھا اور میں اپنے محکمے والوں کو دل سے دعائیں دے رہا تھا۔

اللہ اللہ کر کے چار بجے کے قریب میں اپنی منزل پر پہنچا، سینڑی پنہور ایک چھوٹا سا پس ماندہ گاؤں تھا، جہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر جھونپڑی نما گھر بنے ہوئے تھے۔

پورے گاؤں میں جھونپڑی نما ایک ہوٹل تھا اور مٹی کے گارے سے بنی دو دکانیں تھیں، اسی جھونپڑی نما ہوٹل سے ایک کپ چائے پی کر میں نے ہوٹل کے مالک سے اپنی مطلوبہ چوکی کا پتا پوچھا اور اسی طرف پیدل روانہ ہوگیا، اندھیرا پھیلنے والا تھا، میں جلد سے جلد اپنی جگہ پر پہنچنا چاہتا تھا، پولیس چوکی پٹ فیڈر کینال کے ساتھ بنی ہوئی تھی۔ یہاں رہنے کے بعد آہستہ آہستہ مجھے علاقے کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوگیا تھا اور یہاں کے لوگوں کے بارے میں بھی کافی حد تک معلومات حاصل ہوگئی تھی۔

یہ علاقہ تقریباً سارے کا سارا پسماندہ تھا۔ تعلیم تو نہ ہونے کے برابر تھی ایک دو اسکول تو تھے، اس میں بھی علاقے کے سرداروں نے اپنے ڈیرے بنائے ہوئے تھے یا پھر بھیڑ، بکریوں اور گائے بھینسوں کے باڑے بنائے ہوئے تھے۔ اگر کسی دن بھولے سے استاد یا بچے

اسکول آ بھی جاتے تو ان کو بھیڑ بکریوں کے درمیان بیٹھنا پڑتا تھا۔ ٹیچر کبھی آتے تو کبھی مہینہ بھر غائب رہتے۔ جس دن ٹیچر نہیں آتے تھے، اُس دن سردار کا کمدار بچوں کو بھیڑ بکریاں چرانے کے لیے بھیج دیا کرتا تھا۔

گاؤں کے اکثر غریب کسان ان ہی سردار کے یہاں کھیتی باڑی کرتے تھے اور کچھ ان کے ہی گھروں میں کام کاج کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔ یہاں کے لوگ اکثر ''زن'' اور ''زمینوں'' پر جھگڑا کرتے اور مرمر مٹنے پر آ جاتے تھے۔ ہر سردار نے اپنے گوریلے پال رکھے تھے، دن ہو یا رات، لوٹ مار، موٹر سائیکل، ٹریکٹر چھیننے کی واردات ہر روز ہوتی تھیں اور اغوا برائے تاوان جیسی وارداتیں عام تھیں، تقریباً ہر شخص اپنے پاس رائفل رکھنا فخر سمجھتا تھا۔ ان کے پاس دووقت کی روٹی کھانے کے لیے ہو یا نہ ہو لیکن وہ رائفل ضرور اپنے پاس رکھتے تھے۔

☆......☆

صبح جب میں ڈیوٹی کے لیے اٹھا تو اُسی قریبی جھونپڑی نما گھر سے لڑکی کی چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں، جھونپڑی پولیس چوکی سے قریب ہونے کی وجہ سے لڑکی کی چیخیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ میں چوکی سے باہر نکلا اور جھونپڑی کی طرف دیکھنے لگا، چوکی سے جھونپڑی صاف نظر آ رہی تھی۔ ایک آدمی بری طرح اُس لڑکی پر تشدد کر رہا تھا اور ایک بوڑھی عورت لڑکی کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

یہ سب دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں جا رہا تھا۔ میں ایک دم تیز قدم اٹھا تا جھونپڑی کی طرف جانے لگا تو مجھے میرے ساتھی نے روک لیا۔

''یار یہ اِن کا گھریلو مسئلہ ہے، کیوں مصیبت اپنے گلے میں ڈال رہے ہو، اس کے کہنے پر میں واپس چوکی کے اندر جا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب میں باہر نکلا تو دیکھا کہ لڑکی مٹکا لیے ندی کے کنارے بیٹھی اپنی ناک صاف کر رہی تھی۔ اُس کی ناک سے خون بہ رہا تھا۔ اور وہ برابر روئے جا رہی تھی، تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ لڑکی پانی سے بھرا ہوا مٹکا سر پر رکھ کر واپس جھونپڑی میں چلی گئی۔ لڑکی کا یہ حال دیکھ کر مجھے اُس پر بڑا ترس آ رہا تھا اور میرے اندر اس کے بارے میں جاننے کا تجسس اب اور بھی بڑھ رہا تھا۔

دوسری صبح جب میں ڈیوٹی پر پہنچا تو خود بہ خود میری نظریں جھونپڑی کی طرف اُٹھ گئیں، اُس لڑکی اور بوڑھی عورت کے سوا وہ آدمی مجھے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا، میں چوکی سے کرسی نکال کر باہر لان میں بیٹھ گیا۔ آج مجھے اس لڑکی سے اس کے بارے میں پوچھ کر رہنا تھا، تھوڑی دیر بعد لڑکی مٹکا لے کر ندی کے کنارے پر آ گئی۔ میں نے اپنے ساتھی کو بلایا کہ وہ چوکی کا خیال کرے، میں نے اُس لڑکی کی طرف اشارہ کیا کہ میں اس کے پاس جا رہا ہوں اور تم ذرا اِدھر اُدھر خیال رکھنا۔ میں جب لڑکی کے پاس پہنچا تو وہ اپنے خیالوں میں گم پانی کی طرف گھور گھور کر دیکھ رہی تھی، اس معصوم لڑکی اور اس کی حالت دیکھ کر مجھے اس پر ترس آ رہا تھا۔ میں لڑکی سے مخاطب ہونے کے لیے بات کرنے کا سرا ڈھونڈ رہا تھا اور لڑکی کے نام کا تو مجھے پتا ہی نہیں ہے، اس سے بات کیسے کروں۔ میں نے ہمت کر کے لڑکی سے کہا۔ ''ذرا پانی ملے گا۔''

وہ ایک دم سے ایسے اُچھلی جیسے اس کو کسی بچھو یا سانپ نے کاٹ لیا ہو، وہ بہت گھبرائی ہوئی اور خوف زدہ سی لگ رہی تھی۔ وہ میرے یوں پکارنے اور اچانک یہاں آنے پر بار بار اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ انہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔

''میرے پاس تو کوئی ایسا برتن نہیں صاحب جس سے آپ کو میں پانی دوں۔''

''کوئی بات نہیں، آپ مٹکے کے ڈھکن میں پانی ڈال کر دے دو۔'' اُس نے ندی سے مٹکے کے ڈھکن سے پانی نکال کر دے دیا۔

''آپ کا نام کیا ہے'' میرے یوں پوچھنے پر وہ ذرا گھبرا گئی۔

''جی جی میرا نام...... نام کوئی نہیں ہے۔''

''کیا آپ کے ماں باپ نے آپ کا کوئی نام نہیں رکھا۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا یہ بتاؤ وہ آدمی آپ کو کیوں مارتا ہے۔''

''جی وہ مجھ کو نہیں مارتا ہے صاحب۔'' اُس نے مجھ سے ایک دم جھوٹ بولا، کیوں کہ یہ تماشا میں دیکھ چکا تھا۔

''صاحب میں جا رہی ہوں، میرا آدمی آ جائے گا۔''
''دیکھو مجھ سے گھبراؤ مت، میں آپ کو کچھ نہیں کروں گا۔ میں آپ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں، وہ آپ کو اس طرح بے دردی سے کیوں مارتا ہے، میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ میں اِن سے بات کروں گا۔''
''پلیز صاحب جی ایسا مت کرنا، وہ مجھ کو اور بھی زیادہ مارے گا۔''
''اچھا ٹھیک ہے میں اُس سے بات نہیں کرتا، پر مجھے اپنے بارے میں ضرور بتاؤ گی۔''
جی صاحب جی، جب موقع ملا تو آپ کو ضرور بتاؤ گی۔ اچھا اب میں چلتی ہوں صاحب جی، یہ کہہ کر وہ مٹکا اُٹھا کر تیزی سے گھر کی طرف چلی گئی اور میں واپس اپنی چوکی پر آ گیا۔
پہلے تو وہ ندی کے کنارے کچھ دیر بیٹھ بھی جاتی تھی، لیکن پھر اُس دن کے بعد سے اُس نے وہاں پر بیٹھنا بھی چھوڑ دیا۔ میں جب بھی اُس کی طرف جانے کی کوشش کرتا، وہ مٹکا اُٹھا کر تیزی سے جھونپڑی کی طرف چلی جاتی، اس کے یوں چلے جانے سے میں پریشان ہو جاتا تھا۔ کچھ دنوں بعد میری ڈیوٹی تبدیل ہو گئی اور میں شام کو ڈیوٹی سرانجام دینے لگا۔ ایک روز میں شام کو ڈیوٹی پر پہنچا تو تھوڑی دیر بعد وہ کپڑے اٹھائے ندی کی طرف آ رہی تھی۔
میں ہمیشہ کی طرح کرسی نکال کر باہر بیٹھ گیا، وہ مجھ کو دیکھ کر پریشان ہوئی اور ایک دم رُک گئی، میں کرسی سے اُٹھ کر اندر بیٹھ گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ لڑکی میری وجہ سے پریشان ہو، میں نے یہ سوچ کر لڑکی کا پیچھا کرنا چھوڑ دیا تھا کہ کم از کم بیچاری کو کپڑے دھونے اور پانی بھرنے کی تو آزادی ہو، اگر وہ اپنے بارے میں نہیں بتانا چاہتی تو کیوں میں اس کو تنگ کروں، میں نے اس لڑکی کا خیال دل سے نکال دیا، ایک دن میں چوکی کے باہر کرسی ڈالے بیٹھا ہوا تھا کہ مجھے اس لڑکی کی آواز سنائی دی۔
''صاحب جی۔'' میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو لڑکی کو اپنے پیچھے کھڑا پایا۔ وہ مجھ سے مخاطب تھی۔
میں نے کہا۔ ''جی حکم کریں۔''
''وہ صاحب جی میں آپ کے لیے چاول کی روٹی اور ساگ لائی ہوں، آپ کھالیں۔'' میں نے شکریہ کے ساتھ اُس سے کھانا لے لیا، پھر میں نے اُس سے کہا کہ تم تھوڑی دیر کے بعد برتن لے جانا، لیکن وہ وہیں بیٹھ گئی اور اُس نے کہا۔ ''نہیں صاحب کھانا آپ ابھی کھالیں، بعد میں نہیں آ سکوں گی۔''
''کیوں؟''
''اس لیے کہ میرے مرد گھر آ جائیں گے۔''
میں نے کہا۔ ''تم ان سے ڈرتی کیوں ہو۔'' یہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گئی اور کچھ دیر بعد بولی۔
''اس لیے کہ میں اِن کی اپنی نہیں ہوں۔ آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اب اس دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ میں نے اپنی نادانی کی وجہ سے اپنے خونی رشتے کھو دیے ہیں۔ اپنی چھوٹی سی پھول سی بچی، اپنے ماں باپ، بہن بھائی سب، جس کی سزا میں آج پا رہی ہوں اور آج میں اِس آدمی کے ساتھ در بہ در ہوں۔ میرے قبیلے والے ہم دونوں کے خون کے پیاسے ہیں۔''
میں نے کہا۔ ''وہ بھلا کیوں۔'' یہ سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے اور اس نے جھلملاتی آنکھوں سے کہا۔ ''کیوں کہ میں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہوں۔''
میرے منہ سے ایک دم نوالہ گر گیا۔
''یہ آپ کیا کہہ رہی ہو۔''
''ہاں صاحب میں گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہوں۔ اِس سے پہلے بھی میری شادی ہوئی ہے اپنے چچا زاد کزن سے۔''
''اس کا مطلب یہ ہے تم نے اس شخص سے نکاح پہ نکاح کیا ہوا ہے۔'' اس نے گردن جھکا کر کہا۔
''جی صاحب۔''
''ایسی کیا مجبوری آن پڑی تھی کہ تم اس شخص کے ساتھ، اپنوں کو چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوئی ہو۔''
''صاحب جی...... فی الحال تو میں جا رہی ہوں، کل آ کر تسلی سے اپنی کہانی بتاؤں گی۔ ابھی میرا آدمی آ جائے گا۔'' یہ کہہ کر وہ برتن سمیٹ کر جھونپڑی کی طرف چلی گئی اور میں آنے والی کل کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔
دوپہر کا وقت تھا۔ میں چوکی سے باہر بیٹھا درخت کے نیچے ہوا خوری کر رہا تھا کہ وہ سامنے سے آتی ہوئی نظر آئی۔ وہ میرے قریب آ کر زمین پر ہی بیٹھ گئی۔ حال

احوال کے بعد اُس نے اپنی کہانی اس طرح شروع کی۔
میں نے جب اس دنیا میں آنکھ کھولی تو میرا نام آسیہ رکھ دیا گیا، گھر میں غریبی بہت تھی۔ امی ابو سارا دن کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ میرے بعد چار بھائی اور تین بہنیں پیدا ہوئے۔ جب میں تھوڑی بڑی ہوئی تو امی ابو کے ساتھ کھیتوں پر کام کرنے جانے لگی۔ ہمارے گھر کے سامنے دوسرے قبیلے کا ایک گھر تھا۔ میں جب بھی امی ابو کے ساتھ کھیتوں پر کام کرنے جاتی، تو دانیال اپنے گھر کے سامنے کھڑا ہوتا۔ ہر روز ہم دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے سے چار ہوتی تھیں، اس پر نظر پڑتے ہی میں اپنی آنکھیں نیچی کر لیتی۔ دانیال اپنی بیوی، دو بچوں اور اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتا تھا، وہ بھی ہماری طرح کھیتوں میں کام کرتے تھے، دانیال کا دیکھنا مجھے اچھا لگتا تھا، لیکن حیا اور شرم کی وجہ سے میں اس سے نظریں کم ہی ملاتی تھی، پھر جب میں تھوڑی اور بڑی ہوئی تو میرا رشتہ میرے چچازاد کزن کے ساتھ کر دیا گیا اور ایک سال بعد میں بیاہ کر اپنے چچا کے گھر آ گئی۔
کچھ ہفتے تو سکون سے گزرے۔ اس کے بعد گھر کی ساری ذمے داری میرے اوپر آن پڑی۔ گھر کا سارا کام مجھے کرنا پڑتا تھا۔ گھر کا کام ختم نہیں ہوتا تھا کہ کھیتوں پر سے بلاوا آ جاتا تھا۔ کھیتوں میں کولہو کے بیلوں کی طرح کام لیا جاتا تھا، ساس اور نندوں کی تو چھٹی ہوگئی تھی۔ وہ تو بس اپنی مرضی کے کام کرتی تھیں۔ شوہر صبح سویرے ہی کام کے لیے نکل جاتے تھے تو رات کو ہی ان کی واپسی ہوتی تھی۔ میں کام کر کے جب تھک جاتی تو رات بھی میرے لیے کسی عذاب سے کم نہیں ہوتی تھی۔ گھر میں گنتی کی چند چارپائیاں تھیں، جس پر سسر، ساس اور نندیں قبضہ جما کر سو جاتے۔ شوہر اگر موڈ میں ہوتے تو اپنے ساتھ سونے دیتے، اگر نہیں ہوتے تو مجھے لات مار کر نیچے گرا دیتے، میں مجبوراً چادر بچھا کر وہیں زمین پر ہی سو جاتی۔ خون کا رشتہ ہوتے ہوئے بھی میرے ساتھ غیروں جیسا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ اگر کبھی غلطی سے اپنے ماں باپ سے اپنی تکلیف کا ذکر کر بھی دیتی، تو وہ دن میرے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔ ساس، سسر، دیور، شوہر مار مار کر میرا بُرا حال کر دیتے تھے۔ ایک دن مار پیٹ سے تنگ آ کر میں میکے آ گئی۔ کہتے ہیں باپ کا گھر ایک بیٹی کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ ہوتی ہے، جہاں وہ خود کو محفوظ سمجھتی ہے، یہی سوچ کر میں میکے آ گئی تھی، لیکن مجھے یہاں بھی بے دردی سے ٹھکرا دیا گیا۔ ابو نے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا۔
''تیرا جینا مرنا اب وہاں پر ہے۔ اُس گھر سے تیرا جنازہ ہی نکلنا چاہیے۔''
یہ کیسے ماں باپ ہیں جو مجھے جیتے جی جہنم کے عذاب دھکیل رہے ہیں۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر میں نے دُکھ اور غصے میں آ کر خودکشی کرنے کی کوشش کی۔
گھر میں ادھڑے ہوئے بجلی کی تار تھی، اُن کو پکڑ لیا، لیکن گھر والوں نے مجھے مرنے بھی نہیں دیا، شام کو ابو میرا ہاتھ پکڑ کر سسرال چھوڑ آئے۔ ظلم کا سلسلہ مجھ پر اسی طرح جاری رہا اور مجھے کوئی راستہ سوجھ نہیں رہا تھا اس سے جان چھڑانے کا۔ ایک روز میں گھر کے پاس ہی نلکے سے پانی بھر رہی تھی اور پاس ہی دانیال کھیتوں میں کام کر رہا تھا، اُس نے اشارے سے مجھ سے پانی مانگا میں نلکے سے پانی بھر کر اُس کے پاس لے گئی۔ دانیال نے پانی پی کر برتن میرے حوالے کیا اور مجھ سے حال احوال پوچھا اور میں مٹکا اٹھا کر واپس گھر آ گئی، پھر میں جب بھی شام کو نلکے سے پانی بھرنے آتی تو وہ اپنی زمینوں پر کام کرتا ہوا ملتا۔ اس طرح روز ہماری باتیں ہونے لگیں، میں اپنے دل کی ساری باتیں دانیال سے کرتی۔ اس دوران میں پیٹ سے ہوگئی اور ایک پھول سی بچی کو جنم دیا، میرے اوپر ظلم کا سلسلہ چلتا رہا، گھر کا کام اور کھیتوں میں سارا دن کام کر کے میں اپنی بچی کو وقت بھی نہیں دے پا رہی تھی۔ میری بچی انتہائی کمزوری کا شکار ہوگئی۔ ایک دفعہ میری بچی بہت بیمار ہوگئی۔ میں نے اپنے سسر اور شوہر کو منتیں کر رہی تھی کہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ یہ بہت بیمار ہے، ورنہ میری بچی مر جائے گی، لیکن ان ظالموں کو مجھ پر اور نہ ہی اس بچی پر کوئی ترس آیا، میں بچی کو اٹھا کر میکے آ گئی۔ جہالت کی انتہا تھی۔ میری بچی کو دوائی دے کر ٹال دیا گیا، بچی بخار میں تپ رہی تھی، میں نے امی ابو کی منتیں کیں کہ مجھے اپنے شوہر سے طلاق دلواؤ

پر وہ نہیں مانے، پھر میں نے اپنے گھر والوں کو دھمکی دی کہ اگر تم نے مجھے وہاں دوبارہ بھیجا اور اس سے طلاق نہیں دلوائی تو میں گھر چھوڑ کر کہیں اور چلی جاؤں گی۔

شام کو شوہر مجھے لینے آئے تو امی ابو نے مجھے زبردستی اُن کے ساتھ بھیج دیا۔ دوسرے دن میں دانیال سے ملی اور اس سے کہا کہ وہ مجھے یہاں سے کہیں دور لے جائے۔ دانیال بھی اس شرط پہ راضی ہوا کہ ہم بچی کو نہیں لے جائیں گے۔ میں نے دانیال کی منتیں کی کہ بچی میرے بغیر مر جائے گی۔ اُس کا کوئی خیال رکھنے والا نہیں ہے، لیکن دانیال نہیں مانا۔ میں نے مجبور ہوکر دانیال کو کہا کہ کل شام مجھے آکر لے جائے۔ دانیال نے رات کا وقت دے دیا۔ میرے پاس اور تو کچھ تھا نہیں، بس دو تین جوڑے کپڑوں کے تھے، اس کی گٹھڑی باندھ کر دانیال کا انتظار کرنے لگی۔ گھر والے سارے سو چکے تھے۔ میری بچی مسلسل رو رہی تھی، اُسے ہلکا سا بخار بھی تھا میں نے ایک گولی پیس کر بچی کو پلا دی اور آخری بار اسے اپنی چھاتی سے لگایا اور اُسے سلا دیا۔ جب میں گھر سے باہر نکلنے لگی تو میری معصوم بچی کی رونے کی آواز مجھے پھر آنے لگی، لیکن میں گھر سے باہر نکل چکی تھی۔ یوں اپنی بلکتی بچی کو چھوڑ کر میں آزاد فضا میں سانس لینے کے لیے چل چکی تھی۔

میں اور دانیال جب گھر سے نکلے تو باہر طوفان باد و باراں اپنی شدتوں پر تھا، جیسے جیسے ہم آگے بڑھ رہے تھے وہ طوفان کی شکل میں ڈھل چکا تھا، طوفان میں مٹی ریت اُڑ رہی تھی اور ساتھ ہی زوروں کی بارش بھی ہو رہی تھی۔ مجھے رہ رہ کر اپنی پھول سی بچی کی یاد آ رہی تھی، جو نہ جانے کس حال میں تھی۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ کوئی اسے کمرے میں لے بھی جائے گا یا وہ باہر ہی بارش میں بھیگتی رہے گی، اندھیرا گہرا ہونے کے ساتھ ساتھ کیچڑ ہمارے پاؤں میں چپک گئی تھی، جس سے تیز چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ ہماری کوشش تھی کہ جتنا جلد ہو سکے ہم گاؤں سے دور نکل جائیں۔ بجلی کے کوندے لمحہ بھر کے لیے دھرتی کو روشن کرتے تھے اور پھر دوبارہ وہی تاریکی چھا جاتی تھی۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں اور میں پوری طرح خوف زدہ بھی تھی کہ نہ جانے آگے کیا ہوگا؟ میں دانیال کا ہاتھ پکڑے اس کے ساتھ لگ کر چل رہی تھی اور دانیال بھی میرا ہاتھ پکڑے تیزی کے ساتھ انجان راستوں کی طرف رواں دواں تھا۔

اب میدانی علاقہ ختم ہو چکا تھا اور صبح ہونے والی تھی۔ سورج اپنی روپہلی کرنیں پہاڑوں کی چوٹیوں اور سبزہ زاروں پر بکھیرنے کو تھا کہ مجھے دور سے پہاڑوں کے نیچے کچھ جھونپڑیاں نظر آئیں جو ہرے بھرے کھیتوں کے بیچ ایستادہ بڑا دل فریب منظر پیش کر رہی تھیں۔ وہیں کھیتوں میں مرغیاں اپنے چھوٹے چھوٹے چوزوں کو لیے سیر کر رہی تھیں اور گائے بھینسیں چارہ کھانے میں مست تھیں۔ خرگوشوں کی ٹولیاں ادھر سے اُدھر پھدکتی پھر رہی تھیں۔ میں تو اس حسین منظر کو دیکھ کر اس میں ہی کھو سی گئی تھی کہ اچانک مجھے دانیال نے ٹہوکا دے کر چونکا دیا۔ ”کہاں کھو گئی ہو۔“ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتی، دانیال مجھے لیے ہوئے ایک جھونپڑی نما کمرے میں داخل ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں پر دو خواتین بیٹھی ہوئی تھیں، جو توے پر روٹی پکا رہی تھیں۔ اِن میں سے ایک نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور میں ایک طرف ہو کر اس کے سامنے کی طرف بیٹھ گئی۔ دانیال پتا نہیں کہاں چلا گیا تھا۔ اتنا لمبا سفر کر کے میں بہت تھک گئی تھی، ان میں سے ایک خاتون نے مجھے آرام کرنے کو کہا اور وہ مجھے اپنے ساتھ ایک دوسری جھونپڑی میں لے گئی۔ جھونپڑی کے اندر زمین پر کھجور سے بنی ہوئی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ وہ آرام کرنے کا کہہ کر چلی گئی اور مجھے اس فرش پر لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ شام کے وقت جب میری آنکھ کھلی تو میری نظریں دانیال کو تلاش کر رہی تھیں۔ مجھے بڑے زور کی بھوک بھی لگی ہوئی تھی۔ میں نے جھونپڑی سے ہی دانیال کو آواز لگائی تو ایک بوڑھی عورت میرے پاس آئی۔ میں نے دانیال کا پوچھا تو اُس نے انکار میں سر ہلا دیا، جیسے کہ اسے کچھ نہیں معلوم۔ میں نے اماں کو کہا کہ شدید بھوک لگی ہوئی ہے، مجھے روٹی لا کر دو۔ بوڑھی اماں نے مجھے روٹی لا کر دے دی میں نے تھوڑا سا کھانا کھایا اور بوڑھی اماں برتن لے کر واپس چلی گئی۔

میں کھانا کھانے کے جھونپڑی سے باہر نکلی تو مجھے باہر مرد ہی مرد نظر آئے۔ ان سب کے کاندھوں پر کلاشنکوف، رائفلیں اور بندوقیں لٹکی ہوئی تھیں۔ میں ڈر کر

واپس جھونپڑی میں آ گئی۔ میں اللہ اللہ کر رہی تھی کہ دانیال مجھے کہاں لے آیا ہے۔ دو دن کے بعد دانیال آیا اور مجھے چلنے کو کہا۔ میں نے دانیال سے پوچھا۔ "آپ دو دن سے کہاں تھے۔" اُس نے کسی بات کا جواب نہیں دیا، بس اُس نے اتنا کہا کہ یہاں سے جلدی نکلو ہم بہت لیٹ ہو گئے ہیں، میں نے کپڑوں کی گٹھڑی جو بندھی ہوئی رکھی تھی اٹھائی اور دانیال کے ساتھ چلنے لگی۔ کافی دور چلتے رہنے کے بعد میں نے دانیال سے پوچھا۔ "اب کہاں جانا ہے۔"

دانیال نے کہا۔ "یہ دوسرے قبیلے والے ہیں، دوسرے گاؤں میں میرے جاننے والے اور میرے قبیلے کے لوگ ہیں۔ وہاں پر ہم زیادہ محفوظ رہیں گے۔" اب دانیال مجھے کسی اور کے گھر لے آیا تھا، یہ شاید کسی سردار کا گھر تھا۔ چار دیواری گارے کی مٹی سے بنی ہوئی تھی اور اندر بھی بنگلا نما گھر تھا، گھر کے چاروں طرف مورچے بنے ہوئے تھے۔

دو دن بعد دانیال ایک مولوی صاحب کو لے آیا جو غالباً کسی مسجد کے پیش امام تھے۔ سفید چوغہ پہنے، سر پر خاکی پگڑی اور گھنی داڑھی اور پھر ہم دونوں کا نکاح پڑھوایا گیا۔ میں اسی بنگلے پر کام کرنے لگ گئی۔ دانیال ہم سے دو تین دن بعد سے ملنے کے لیے آ جاتا تھا۔ میں نے اُن سے اپنے گھر والوں کا پوچھا تو اُس نے بتایا کہ ہمارے گھر والوں کو ہمارے بھاگنے کا پتا چلا تو وہ لوگ اپنی زمین اور گھر چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے ہیں۔

دانیال نے مزید بتایا کہ میرے قبیلے والے ہم دونوں کو تلاش کر رہے ہیں اور وہ ہمارے خون کے پیاسے ہیں۔ کسی نے ہماری مخبری کر دی ہے اور اس نے میرے قبیلے والوں کو بتایا ہے کہ ہم اس گھر میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔

رات کے دو بجے کا وقت تھا۔ کہ مجھے باہر شور کی آواز سنائی دی، پھر ایک دم فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ اس دوران دانیال بھاگتا ہوا میرے پاس آیا اور مجھے کہا کہ بھاگو، ہم پر حملہ ہو گیا ہے۔ میرے ساتھ باقی گھر والی خواتین کو بھی پچھلے راستے سے باہر نکالا گیا۔ دوسری صبح پتا چلا کہ میرے چاچو اور دو کزن اس حملے میں مارے گئے ہیں۔ ہمارا جینا حرام ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ہم ایک دو دن سے زیادہ ایک جگہ پر نہیں رہتے تھے۔ ہم گمنام سی زندگی گزار رہے تھے، مجھ سے دانیال نے کہا کہ میرا یہاں سے دور کسی اور جگہ پر ایک دوست ہے۔ اگر میں اپنے قبیلے کے درمیان رہوں گا تو ہو سکتا ہے میرے قبیلے میں سے کوئی شخص ہم دونوں کو مار نہ دے۔ دانیال اپنے قبیلے میں سے مجھے یہاں لے آیا، اس جگہ کا صرف دانیال کے دوست کو پتا ہے یہ جو بوڑھی عورت ہے، وہ دانیال کے دوست کی جاننے والوں میں سے ہے۔ یہاں دانیال نے کاشتکاری کے لیے کسی سردار سے زمین لے لی ہے اور ساتھ ساتھ زمینوں پر مزدوری بھی کرنے لگے ہیں۔ دانیال کو اپنے گھر والے بہت یاد آ رہے تھے اس بات کو لے کر دانیال روز مجھ سے لڑائی کرتا ہے۔

میں نے اپنے سارے واپسی کے راستے کھودیے ہیں اپنے گھر والے، اپنی معصوم بچی۔ میں اب کیا کروں۔ "صاحب جی" میرے لیے نہ سسرال میں سکھ تھا اور نہ میکے میں ہے۔ میں بہت مجبور ہو کر واپسی کی ساری کشتیاں جلا کر نکلی ہوں۔

صاحب جی میرے لیے ہر جگہ کانٹوں کی زمین ہے۔ گھر سے اس لیے نکلی تھی کہ شاید دانیال کے ساتھ خوش رہوں گی، لیکن یہاں بھی میرے لیے کوئی سکھ نہیں ہے۔ میں تو در بہ در ہو گئی ہوں۔ مجھ کو گھر سے بھاگنے پر میرے گھر والوں نے مجبور کیا۔ اگر مجھے کسی سے ذرا سا بھی سکھ ملتا تو میں ہرگز گھر سے باہر نہیں نکلتی۔

مجھے پتا ہے صاحب جی، میرے قبیلے والے مجھے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اور وہ مجھے ایک نہ ایک دن ضرور مار دیں گے، یہ کہتے ہوئے آسیہ کے آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی نکل کر اس کے گالوں پر بہہ گئے۔

"کیا تمہیں معلوم ہے نکاح پر نکاح کر کے تم جرم اور گناہ کی مرتکب ہوئی ہو اور قانون کے مطابق تمہیں اس کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔" میں نے قدرے سرزنش کے انداز میں اس سے کہا۔ میری بات سن کر اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

"میرا خیال ہے تم نے کافی سزا بھگت لی ہے اس لیے انسانیت کے ناتے میں تمہاری مدد کے لیے تیار ہوں۔ میں تم کو شہر لے چلتا ہوں۔ تم وہاں ہر طرح سے

محفوظ رہوگی۔'' اس نے کہا۔

''نہیں صاحب جی، بس یہی میری قسمت ہے۔ یا تو میں ایک دن اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں ماری جاؤں گی یا پھر ساری عمر دُکھ کے ان کانٹوں پر جلتی رہوں گی۔''

آسیہ نے اپنی داستانِ عالم سنانے کے بعد کھانے کے برتن سمیٹے اور اپنے جھونپڑی نما گھر کی طرف چلی گئی۔

رات کے تقریباً تین بجے کا وقت تھا۔ میں اور میرا ساتھی چوکی پہ موجود تھے کہ ایک دم جھونپڑی کی طرف سے فائرنگ کی آواز آئی۔ میں نے اور میرے ساتھی نے رائفل سنبھالی اور جھونپڑی کی طرف بھاگے۔ میں نے اندھیرے میں فائرنگ شروع کردی۔ ہماری جوابی کارروائی سے ملزم فرار ہوگئے۔ ہم جب جھونپڑی میں پہنچے تو دانیال اور آسیہ خون میں لت پت تڑپ رہے تھے۔ میں نے فوراً تھانے اطلاع دی۔ گاڑی پہنچنے سے پہلے ہی دونوں دم توڑ چکے تھے۔ ضروری کارروائی کے لیے لاشیں قریبی شہر کے سول اسپتال لے گئے۔ اس کے بعد میں نے زمیندار کو بلایا کہ آسیہ اور دانیال کے ورثا کو بلایا جائے۔ وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں اس کے ساتھ کوئی معاملہ نہ ہوجائے۔ میں نے کہا ''آپ مجھے جگہ وغیرہ کا پتا بتائیں، پولیس اُسے خود تلاش کرلے گی۔'' آسیہ اور دانیال کے گھر والوں کو بلایا گیا، تو ان دونوں گھرانوں نے لاشیں لینے سے انکار کردیا، پھر ہم نے مل کر آسیہ اور دانیال کا جنازہ پڑھوا کر دفنا دیا۔

میں آج بھی اکثر سوچتا ہوں کہ یہ جہالت کی انتہا ہے۔ لوگ اپنی ماں، بیٹیوں، بہنوں کے ساتھ ظلم کی انتہا کرتے ہیں۔ ماں باپ کا گھر بیٹیوں کے لیے پناہ گاہ ہوتی ہے اور وہاں پر وہ خود کو محفوظ بھی تصور کرتی ہیں۔ اگر اُن کے دُکھ سکھ میں گھر والے ان کا ساتھ نہیں دیں گے اور اُن کو بوجھ سمجھیں گے، تو پھر بیٹیاں کہاں جائیں گی؟ میں تو بس اتنا کہوں گا کہ اگر ہم اپنی بیٹیوں کو نظر انداز کردینا شروع کردیں گے تو وہ پھر آسیہ ہی کی طرح گھر سے نکلنے پر مجبور ہوں گی۔ لیکن ساتھ ہی بیٹیوں سے بھی یہ کہوں گا کہ ایسا قدم اٹھانے سے پہلے اپنی ناموس، اپنے خاندان کی عزت کا خیال رکھیں کیوں کہ کمان سے نکلا تیر کبھی واپس نہیں آتا۔

☆......☆

آتشِ جنُوں



سلیم فاروقی

ایک شعلہ صفت نوجوان کی سرگزشت۔ وہ اپنے ملک سے غداروں کا نام ونشان مٹا دینا چاہتا تھا۔ اِس معرکے میں اُس نے اپنا سب کچھ ہار دیا لیکن حوصلہ نہیں ہارا

چٹان سا حوصلہ رکھنے والے نوجوان کی رُوداد، آخری کڑی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

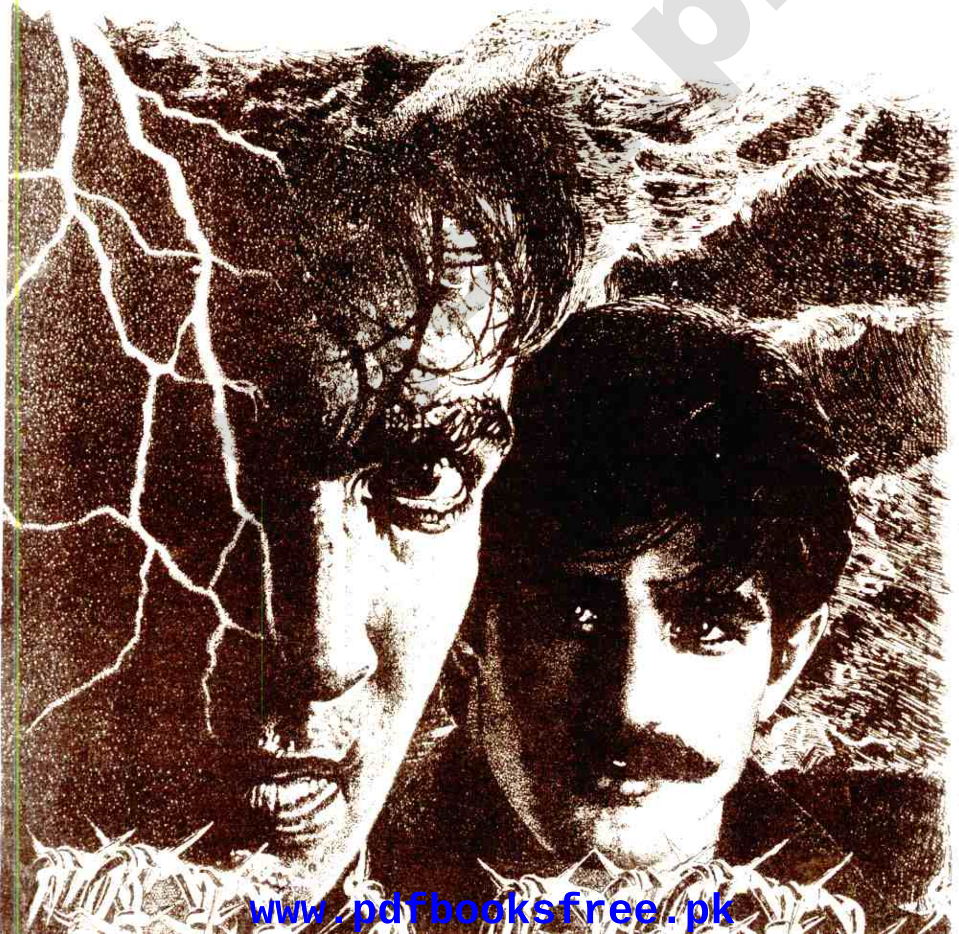
عمران اور ارسلان دو بھائی ہیں ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے والے نہایت جرأت منداور اپنی عزت وانا کے لیے زمانے سے لڑ جانے والے...... ارسلان کچھ لاابالی ہونے کے ساتھ بہت زیادہ جذباتی بھی ہے جبکہ عمران بہت سمجھدار اور سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے والا۔ عمران کا ایک دوست راشد ہے جس کی سمندر میں لانچیں چلتی ہیں۔ عمران اور ارسلان راشد کی لانچ پر سمندر کی سیر کے لیے جاتے ہیں۔ سفر کے دوران میں اُن کا راشد کی لانچ پر کام کرنے والے ایک جرائم پیشہ ملازم غنی اور اس کے ساتھیوں سے جھگڑا ہوتا ہے۔ غنی راشد کی لاعلمی میں اس کی لانچ کو غیر قانونی کام کے لیے استعمال کررہا ہوتا ہے۔ راشد انہیں پولیس کے حوالے کردیتا ہے۔ اس عمل کے بعد راشد کے پاس دھمکی آمیز فون آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غنی کسی بڑے جرائم پیشہ گروہ کا آلۂ کار ہے۔ راشد کے گھر حملہ کرنے والوں کا تعلق ایک ایرانی علی اکبر مشہدی سے ہے جو ایک بین الاقوامی گینگ کا ڈان ہے۔ راشد کا مرڈر ہوجاتا ہے اور پھر مشہدی کے آدمی عمران اور ارسلان کی بہن شائستہ کو گھر سے اغوا کرکے لے جاتے ہیں۔ دوسری طرف پولیس عمران کو تھانے لے جاکر شدید تشدد کا نشانہ بناتی ہے۔ تھانے میں عمران پر شدید تشدد کا سلسلہ جاری ہوتا ہے کہ ارسلان اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے وہاں چھڑانے آجاتا ہے۔ عمران جب گھر پہنچتا ہے تو اُس کے گھر والے خصوصاً چھوٹا بھائی عدنان اس کی حالت پر سخت پریشان ہوجاتا ہے۔ اسی دوران میں پولیس عمران کے گھر پر ریڈ کرتی ہے اور اُس کے گھر سے ہیروئن برآمد کرتی ہے۔ عمران کی والدہ کا انتقال ہوجاتا ہے۔ اُس کے والد بھی اس غم کے باعث زندگی چھوڑ کر موت کے مہمان ہوجاتے ہیں۔ عمران اور ارسلان غم سے نڈھال تھے جبکہ ان کے چھوٹے بھائی عدنان پر تو سکتہ سا طاری ہوگیا تھا۔ ماں باپ سے محرومی کے بعد اُن کی دہشت گردوں اور پولیس سے جنگ جاری ہوتی ہے کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ عدالت میں اُن کا کیس لڑنے والا بیرسٹر بھی پولیس کے ساتھ مل گیا ہے۔ انہیں اطلاع ملتی ہے کہ شائستہ نے خودکشی کرلی ہے...... عمران اور ارسلان اپنی بہن کے اغوا کار مشہدی سے اپنی بہن شائستہ کی ڈیڈ باڈی کا مطالبہ کرتے ہیں...... عمران اور تیمور شائستہ کو تلاش کرتے کرتے حاکم خان کے اڈے پر پہنچ جاتے ہیں مگر شائستہ حاکم خان کے غنڈوں کو زخمی کرکے پہلے ہی فرار ہوجاتی ہے۔ تیمور حاکم خان کو ہلاک کردیتا ہے۔ وہ دونوں حاکم خان کے سیف سے ضروری کاغذات لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ مشہدی فون کرکے ان کاغذات میں سے ایک ریڈ فائل کا تقاضہ کرتا ہے مگر عمران اسے فائل دینے سے انکار کردیتا ہے۔ ٹیلی فون پر مشہدی اور عمران کی تلخ کلامی ہوتی ہے۔ مشہدی اسے دھمکیاں دیتا ہے اور ملٹری انٹیلی جنیس کو اس کے پیچھے لگادیتا ہے۔ اسی دوران میں عمران کا ایک دشمن غنی بلوچ عمران سے آملتا ہے۔

جان محمد جو کہ مشہدی کا آدمی ہے لیکن اصل میں وہ عمران کے لیے کام کر رہا ہے۔ اخبار میں خبر چھپتی ہے کہ معروف سماجی کارکن اور تاجر عبدالحمید راجپوت کو ہوٹل میں پراسرار طور پر قتل کر دیا گیا ہے۔ عمران اس حقیقت سے واقف ہے کہ قتل ہونے والا دراصل ''را'' کا ایک سفاک اور خونی ایجنٹ ونود تھا، جو گزشتہ بائیس برس سے پاکستان میں مقیم تھا۔ وہ یہ معلومات اخبار کو مہیا کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں ان کے ذہن میں معروف انگلش روزنامے کے چیف ایڈیٹر اور کالم نگار وقار الحسن کا نام آتا ہے۔ عمران انہیں فون کر کے ملاقات کے لیے کہتا ہے اور اپنے ہمراہ ہاشم کو بھی لے جاتا ہے۔

عمران وقار الحسن کو اپنی فیملی ٹریجڈی کے بارے میں بتاتا ہے کہ کیسے ان لوگوں کی دشمنی مشہدی سے ہوئی اور وہ لوگ ارسلان کو مردہ سمجھتے رہے، جب کہ وہ دہلی کی تہاڑ جیل میں ہے۔ تب وقار الحسن انہیں اپنے انڈیا جانے اور ''را'' کی قید میں رہنے کے واقعات کی تفصیل بتاتے ہیں۔

بلوچ عمران کو بتاتا ہے کہ اس کی بہن شائستہ کا پتا چل گیا ہے اور وہ تفصیل بتانے گھر آ رہا ہے۔ بلوچ شائستہ کے متعلق بتاتا ہے کہ وہ آج کل میرپور خاص میں کسی پیر کی حفاظت میں ہے۔ عمران اپنے ساتھیوں کے ہمراہ شائستہ کی تلاش میں میرپور خاص کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔

ممتاز سومرو انتہائی خوش اخلاق اور پڑھا لکھا وڈیرہ ہے، جو درحقیقت ارسلان کا دوست ہے۔ عمران ممتاز سومرو کو ساری کہانی سناتا ہے اور شائستہ کے متعلق بتاتا ہے کہ وہ پیر احسان الحق کی قید میں ہے ممتاز ان لوگوں کو تسلی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر اس پیر کی پہنچ صدر



امریکہ تک بھی ہے تو بھی شائستہ کی رہائی میری ذمہ داری ہے، وہ لوگ ممتاز سومرو کے ہمراہ پیر احسان الحق کی حویلی پہنچتے ہیں، ممتاز پیر صاحب سے عمران کا تعارف کرواتا ہے اور کہتا ہے کہ ان کی بہن کچھ لوگوں کی قید میں ہے اور یہ اس کی رہائی چاہتے ہیں اور جس شخص کی قید میں ان کی بہن ہے اس کا نام پیر احسان الحق ہے اپنا نام ممتاز سومرو کے منہ سے سن کر پیر احسان سخت غصے اور طیش میں آ جاتا ہے اور انہیں وہاں سے جانے کے لیے کہتا ہے، تب تیمور پیر احسان پر جھپٹ پڑتا ہے اور خنجر اس کے گلے پر رکھ کر شائستہ کی بازیابی کا مطالبہ کرتا ہے، ممتاز سومرو اس سے کہتا ہے کہ ان لوگوں کا تعلق انڈر ورلڈ سے ہے لہٰذا اپنے آدمیوں کو ہدایت دو کہ شائستہ کو یہیں لے آئیں، تب پیر احسان بخشل کو فون کر کے شائستہ کو لانے کا کہتا ہے، کچھ ہی دیر بعد بخشل شائستہ کو کمرے میں لے آتا ہے، شائستہ عمران کو دیکھ کر اس سے لپٹ جاتی ہے۔ عمران بہن کو تسلی دیتے ہوئے کہتا ہے کہ تم نے بہت آنسو بہا لیے اب آنسو بہانے کی باری دشمنوں کی ہے، میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ عمران تیمور کو وہاں سے نکلنے کا کہتا ہے اور پیر احسان کو بھی ساتھ لے جانے کا کہتا ہے اور وہ لوگ وہاں سے ممتاز کی شہر سے باہر والی حویلی پہنچ جاتے ہیں وہاں پہنچ کر وہ پیر احسان سے کہتے ہیں کہ وہ اپنے آدمیوں کو فون کر کے بتادے کہ وہ حیدرآباد ایک وفاقی وزیر سے ملنے جارہا ہے۔ ممتاز تیمور کو کہتا ہے کہ میں نے احسان سے پچھلے بہت سے حساب برابر کرنا ہیں۔ عمران تیمور سے کہتا ہے کہ اس ڈبا پیر کو لباس سے محروم کردو۔

سب اس انکشاف پر حیرت زدہ تھے کہ پیر احسان الحق مسلمان نہیں تھا، پیر احسان اپنا نام رمیش چند بتاتا ہے۔ ممتاز کہتا ہے کہ اسے ملٹری انٹیلی جنس کے حوالے کردیتے ہیں وہ خود اس سے اگلوالیں گے کہ یہ کون ہے اور یہاں کیا کررہا ہے؟ تیمور اس سے پوچھتا ہے کہ اس نے شائستہ کو اپنی قید میں کیوں رکھا ہوا تھا۔ تب وہ بتاتا ہے کہ اس کے ایک دوست نے کہا تھا کہ ایک لڑکی میرے دوست کی قید سے فرار ہو کر تمہارے علاقے کی طرف گئی ہے، تم اسے اپنے پاس رکھ لو۔ عمران اس سے پوچھتا ہے کہ کیا اس کا تعلق ''را'' سے ہے۔ پیر احسان الحق (رمیش) یہ سوال سن کر گھبرا جاتا ہے۔ پیر احسان الحق (رمیش) اقرار کرتا ہے کہ اس کا تعلق ''را'' سے ہے اور وہ گزشتہ پینتیس برس سے یہاں کام کررہا ہے۔

عمران وقارالحسن کو فون کرتا ہے اور انہیں پیر احسان الحق کے بارے میں بتاتا ہے کہ اس کا نام رمیش چند ہے اور وہ ''را'' کا ایجنٹ ہے۔ وہ انہیں پولیس کی نفری اور چینل کی کیمرا ٹیم بھیجنے کے لیے کہتا ہے۔ وقارالحسن آرمی، پولیس اور اپنی چینل ٹیم کے ہمراہ میر پور خاص ممتاز کی حویلی پہنچ جاتے ہیں اور وہاں سے وہ سب پیر احسان الحق کی حویلی میں سرچ آپریشن کے لیے نکل جاتے ہیں۔ آپریشن کی کوریج وقارالحسن کا چینل Live دکھاتا ہے۔ تمام تر کارروائی کے بعد وقارالحسن کراچی روانہ ہوجاتے ہیں۔

بلوچ عمران کو بتاتا ہے کہ مشہدی کے دو خاص آدمی پولیس نے گرفتار کرلیے ہیں اور مشہدی خود انڈر گراؤنڈ چلا گیا ہے، جبکہ مشہدی کی بیٹی ڈولی کراچی میں ہے۔ بلوچ کہتا ہے کہ ڈولی کے ذریعے ہم مشہدی کو بلیک میل کریں گے اور اس کو بھی اسی صدمے سے دوچار کریں گے جو شائستہ کے اغوا کے بعد عمران نے برداشت کیا۔

عمران کے پاس مشہدی کا فون آتا ہے، وہ عمران کو دھمکی دیتا ہے کہ کرائے کے جو قاتل میں نے بلائے تھے وہ تمہاری تلاش میں ہیں، تم جب بھی میر پور خاص سے کراچی آؤ گے تمہاری کرائے کے ان قاتلوں سے ملاقات ضرور ہوگی، آج کا دن تمہاری زندگی کا آخری دن ہے۔

ممتاز عمران کو بتاتا ہے کہ حویلی کو پولیس والوں نے گھیر رکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ڈی آئی جی نے حکم دیا ہے کہ جب تک رمیش چند کی نشاندہی پر اس کے ساتھی پکڑے نہیں جاتے آپ لوگ باہر نہیں جاسکتے۔ عمران ممتاز سے کہتا ہے کہ تم ڈی آئی جی سے بات کرو ہمیں ابھی کراچی کے لیے نکلنا ہے۔ بلوچ بتاتا ہے کہ اطلاع ملی ہے کہ راستے میں ہم پر حملہ ہوسکتا ہے لیکن فکر کی کوئی بات نہیں ہم پوری تیاری کے ساتھ آئے ہیں۔

ممتاز انہیں گارڈز کے ہمراہ کراچی چھوڑنے آتا ہے۔ شائستہ بھی کراچی پہنچ کر نارمل ہوجاتی ہے، عمران کو انکل وقار کے ذریعے ''را'' کے ان ایجنٹوں کے نام اور پتے مل جاتے ہیں جو پاکستان اور بھارت میں سرگرم تھے۔

بلوچ عمران کو آکر بتاتا ہے کہ مشہدی کا بلایا ہوا کرائے کا قاتل ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے اور گمان ہے کہ قطب الدین کے جلسے میں کوئی گڑبڑ ہو، کیوں کہ قطب الدین صاحب مشہدی کے دشمن ہیں اور میرے ہی ایک آدمی کو کہا گیا ہے کہ اس مہمان کو ایک سوٹ کیس پہنچایا جائے جس میں جدید نوعیت کا اسلحہ ہوگا۔ عمران کہتا ہے کہ اپنے آدمی کو ہدایت کرو کہ وہ کوئی بھی بہانہ بنا کر وہاں لیٹ پہنچے اس وقت تک ہم بھی وہاں پہنچ جائیں گے۔

(اب آگے ملاحظہ کیجیے)

''یہاں میں یہ ہی تو طے کرنے آیا تھا۔ ٹائم بھی بتادو واجہ!''

''ہم اپنی کارروائی دو بجے کے بعد ہی کریں گے۔'' میں نے کہا۔ ''اس وقت عموماً ہوٹل کا اسٹاف بھی اتنا مستعد نہیں ہوتا اور کمروں میں مقیم لوگ بھی گہری نیند میں ہوتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے واجہ!'' بلوچ نے کہا۔

''پھر میں ایک بجے تک یہاں پہنچ جاؤں گا۔''

وہ جانے کے لیے اٹھا تو میری نظر تیمور پر پڑی۔ وہ نہ جانے کس وقت خاموشی سے کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔

بلوچ کے جانے کے بعد تیمور نے کہا۔ ''بھیا! کہاں جانے کی تیاری ہے اور وہ بھی اتنی راز داری کے ساتھ؟''

''تم نے سن تو لیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟'' میں مسکرایا۔

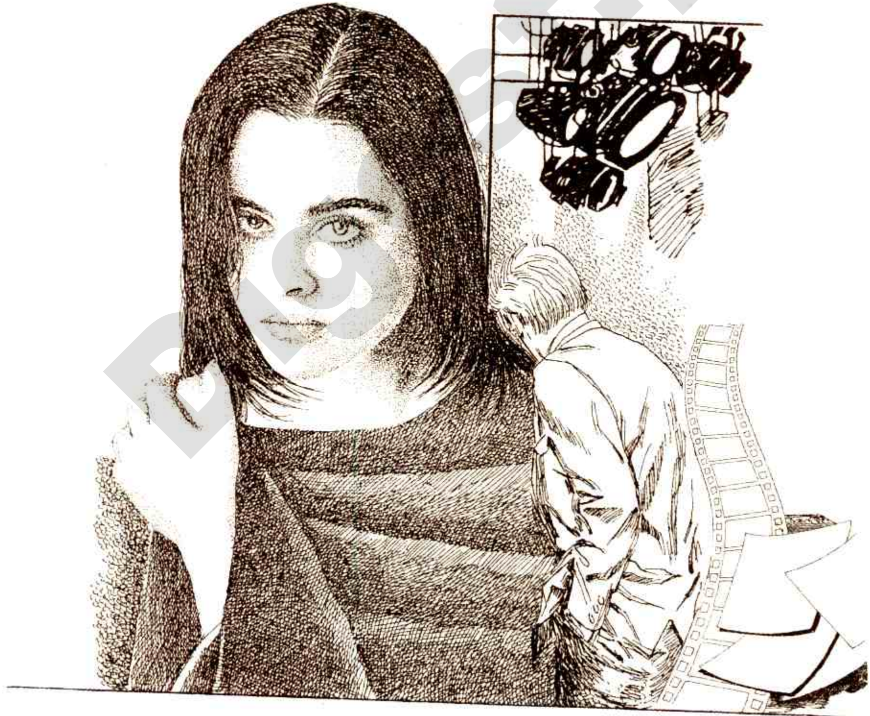
''میں نے صرف اتنا سنا ہے کہ آپ دو بجے کے بعد بعد کسی ہوٹل میں کوئی کارروائی کریں گے۔'' تیمور نے منہ بنا کر کہا۔ ''مشہدی کے ایک کرائے کے قاتل کا سراغ ملا ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ شیرٹن میں مقیم ہے، ہم اس کے چکر میں وہاں جا رہے ہوں۔''

''اور آپ نے مجھ سے مشورہ کرنا تک گوارا نہیں کیا۔ مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا؟'' اس کے لہجے میں شکایت سے زیادہ احتجاج تھا۔ ''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میری موجودگی کی وجہ سے آپ کا کام بگڑ جائے گا؟''

''احمق ہو تم!'' میں نے ہنس کر کہا۔

''ابھی میں نے صرف بلوچ سے بات کی ہے، میں نے یہ کب طے کیا ہے کہ میں وہاں اکیلا جا رہا ہوں، ظاہر ہے،



میں تم سے بھی مشورہ کروں گا اور ہاشم سے بھی۔ ہم سب مل کر ہی پلان ترتیب دیں گے۔''

''تو پھر میں ہاشم بھائی کو بھی بلا ہی لوں۔'' تیمور نے سنجیدگی سے کہا۔

اس کے بلانے سے پہلے ہی ہاشم کمرے میں داخل ہوا، تیمور ہنس کر بولا۔''ارے، میں نے آپ کا نام لیا اور آپ آ گئے۔'' میں نے ہاشم کو بھی بتایا کہ ہم آج کسی مشن پر جا رہے ہیں۔

''میرے خیال میں وہاں زیادہ بھیڑ بھاڑ مناسب نہیں رہے گی، میں اور تیمور ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھ کر آپ کا انتظار کریں گے بلکہ آپ ایسا کریں کہ اپنے سیل فون پر میرا یا تیمور کا نمبر ڈائل کر کے اسے اپنی جیب میں ڈال لیں اور اس کا اسپیکر آن کر دیں تاکہ ہمیں صورت حال کا علم رہے۔''

''اسپیکر آن کرنے میں ایک خدشہ یہ بھی ہے کہ اگر اتفاقیہ طور پر ہوٹل کے کسی ملازم یا ویٹر سے تمہاری بات ہو گئی تو ہمارا شکار خود چوکنا ہو جائے گا۔ تم فکر مت کرو، میرے فون کا مائیکروفون بہت حساس ہے اور وہ ارد گرد کی آوازوں کو بالکل واضح انداز میں کیچ کر لیتا ہے، پھر اس وقت تو بالکل سناٹا ہو گا، صرف میری، بلوچ یا اس غیر ملکی کی آواز ہو گی۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' ہاشم نے کہا۔

''تیمور! تمہارے ایک خنجر کی ضرورت پڑے گی۔'' میں نے کہا۔

تیمور کھسیانا ہو کر بولا۔''آپ دونوں خنجر اپنے پاس ہی رکھ لیں، یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے کی بات ہے؟''

☆......☆

اس مشن کے لیے ہاشم نے لینڈ کروزر کا انتخاب کیا تھا، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس گاڑی کا انجن بہت مضبوط ہوتا ہے، دوسری اور اہم وجہ یہ تھی کہ اس کی سیٹوں کے نیچے ہاشم نے خفیہ خانے بنا رکھے تھے اور ان میں ہر طرح کا اسلحہ تھا، یہ درست ہے کہ ہمیں ہوٹل کے اندر اس کی ضرورت نہیں پڑ سکتی تھی، لیکن ہوٹل سے باہر کسی بھی قسم کی صورت حال سے واسطہ پڑ سکتا تھا۔ ممکن ہے وہ غیر ملکی اکیلا نہ ہو یا ہوٹل کے ارد گرد مشہدی یا اس کی اپنی کرمنل تنظیم کے کچھ آدمی موجود ہوں۔

ہم دس منٹ کے اندر اندر شیرٹن پہنچ گئے، ڈرائیونگ سیٹ پر حسب معمول تیمور تھا۔ اس کے ساتھ ہاشم بیٹھا تھا۔ میں اور بلوچ گاڑی کی عقبی نشست پر تھے، ہمارے جسموں پر اس وقت بہترین سوٹ تھے، مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ بلوچ کوٹ میں خاصی الجھن محسوس کر رہا ہے۔

تیمور گاڑی کو سیدھا ہوٹل کے پورچ میں لے گیا، اس نے ہمیں وہاں ڈراپ کیا اور گاڑی ہوٹل کے نکاسی کے دروازے کی طرف بڑھا دی۔

گیٹ پر کھڑے ہوئے دربان نے ہمیں سلام کیا، جواب میں بلوچ نے دربان کے ہاتھ پر پانچ سو روپے کا نوٹ رکھ دیا۔ ہم اندر داخل ہوئے تو ہوٹل میں ہماری توقع سے زیادہ رونق تھی، کاؤنٹر کلرک بھی خاصا مستعد اور چاق چوبند لگ رہا تھا۔ میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور کاؤنٹر کی طرف دیکھے بغیر ہاشم کا نمبر ملاتا ہوا لفٹ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ بلوچ میرے پیچھے پیچھے یوں مؤدب انداز میں چل رہا تھا جیسے وہ میرا اسیکر یٹری ہو۔

ہوٹل میں داخلے کے وقت بھی اس نے بہت مضحکہ خیز حرکت کی تھی، وہ اسکینر سے گزرنے کی بجائے وہاں کھڑے ہوئے سیکورٹی گارڈ سے بغل گیر ہو گیا۔ گارڈ بھی شاید اسے جانتا تھا اس لیے وہ بس اس سے خوب گھل مل کر باتیں کرنے لگا۔ ان کی گفتگو کے دوران میں، میں نے اپنا سیل فون اور چابیاں وغیرہ اسکینر کے ساتھ بنے ہوئے اسٹینڈ پر رکھیں اور خود بھی اسکینر سے گزرے بغیر دوسری طرف جا کر چابیاں اٹھا لیں اور بلوچ کی طرف دیکھا۔

اس نے جلدی سے کہا۔''سوری سر یہ بہت دن بعد ملا تھا اس لیے......'' پھر وہ سیکورٹی گارڈ سے ہاتھ ملا کر تیزی سے میرے پیچھے آ گیا۔

ہم لفٹ کے نزدیک پہنچے تو وہاں پہلے سے ایک امریکن لڑکی اور دو مقامی افراد موجود تھے۔

لفٹ میں سوار ہونے کے بعد جب لڑکی نے پانچویں فلور کا بٹن دبایا تو میرا ماتھا ٹھنکا کیوں کہ ہمیں بھی پانچویں فلور پر

جانا تھا، دونوں مردوں میں سے ایک نے چھٹے اور دوسرے نے آٹھویں فلور کا بٹن دبایا تھا۔ لفٹ میں اس وقت لفٹ بوائے بھی موجود نہیں تھا، ممکن ہے رات کے اس پہر ان لوگوں کی ڈیوٹی آف ہوجاتی ہو۔

لفٹ پانچویں فلور پر پہنچی تو وہ لڑکی باہر نکلی، ہم بھی لفٹ سے باہر آ گئے، ہمیں کمرا نمبر پانچ سو سات میں جانا تھا، لڑکی کا رخ اسی طرف تھا جدھر کمرا نمبر پانچ سو سات تھا۔

یہ ایک نئی پریشانی کھڑی ہوگئی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس لڑکی سے پوچھا۔ ''ایکسکیوزمی مس؟ کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ روم نمبر فائیو او ایٹ کس طرف ہوگا۔ میں یہاں پہلی دفعہ آیا ہوں۔'' میرا لہجہ خالص امریکن تھا۔

''روم نمبر فائیو او ایٹ؟'' لڑکی زیر لب بڑبڑائی۔ ''مجھے فائیو او سیون میں جانا ہے، آپ کا مطلوبہ روم اس کے سامنے یا پھر برابر میں ہوگا۔'' اس نے جواب دیا، اس نے روم نمبر پانچ سو سات کا نام لیا تو میری کھوپڑی پھک سے اُڑ گئی، اس کا مطلب تھا کہ یہ لڑکی بھی اس کمرے میں جا رہی تھی۔

اتنی انگلش تو بلوچ بھی سمجھ لیتا تھا وہ تو اس سے کہیں زیادہ انگلش نہ صرف سمجھتا تھا بلکہ بول بھی لیتا تھا۔

اس کے چہرے پر بھی پریشانی کے تاثرات تھے۔

میں نے مسکرا کر لڑکی کا شکریہ ادا کیا اور چلنے لگا۔ لڑکی لہراتی، بل کھاتی ہم سے آگے نکل گئی۔

بلوچ نے کہا۔ ''یہ تو ہمارے لیے پریشانی کی بات نہیں بلکہ آسانی ہوگئی۔'' وہ سرگوشی میں بول رہا تھا۔ ''اب ہمیں کمرے کا دروازہ کھلوانے میں بھی کوئی دشواری نہیں ہوگی۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے قدم بڑھانے لگا۔

روم نمبر پانچ سو آٹھ اس کمرے کے عین سامنے تھا جس میں ہمیں جانا تھا۔

ہم کمرا نمبر پانچ سو آٹھ پر ٹھہر گئے، لڑکی نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی، اندر سے کوئی بھاری آواز میں بولا۔

''کون ہے؟''

''انجلی!'' لڑکی نے جواب دیا۔

ہم بہ ظاہر تو کمرا نمبر پانچ سو آٹھ کی طرف دیکھ رہے تھے لیکن ہماری ساری توجہ اس لڑکی کی طرف تھی۔

فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور کسی نے خفیف سا دروازہ کھول کر اس بات کی تصدیق کی کہ دروازے پر واقعی انجلی ہے یا پھر کوئی اور ہے۔ دروازے کا رُخ ایسا تھا کہ اندر سے دیکھنے والے کی نظر ہم پر نہیں پڑی ہوگی۔

اس نے انجلی کے لیے دروازہ کھول دیا۔ اس وقت اس کی نظر ہم پر پڑی، انجلی اندر داخل ہوئی اور اس سے پہلے کہ دروازہ دوبارہ بند ہوتا، بلوچ بجلی کی طرح لپکا اور دروازہ کھولنے والے کو دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔ میں بھی لپک کر اس کے پیچھے اندر داخل ہوگیا۔

میں نے لات مار کے دروازہ بند کردیا اور فوراً ہی اسے لاک کردیا۔

یہ سب چند لمحوں میں ہوگیا، لڑکی نے چیخنے کے لیے منہ کھولا لیکن میں نے لپک کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کی کنپٹی پر ہلکا سا ایک ہاتھ رسید کردیا، دوسرے ہی لمحے وہ میری بانہوں میں جھول گئی، میں نے اسے بے دردی سے بیڈ پر پھینک دیا۔

بلوچ اس شخص سے گتھم گتھا تھا، اس نے روم میں گھستے ہی بری طرح جکڑ کے اسے چکرا کر رکھ دیا تھا۔

وہ لمبا تڑنگا امریکن تھا، اس کے جسم پر ریچھ کی طرح گھنے بال تھے، اس وقت وہ صرف ایک برموداٹراؤزر میں ملبوس تھا۔ جسم پر بنیان تک نہیں تھی، اس کے سر کے بال بہت گھنے اور براؤن تھے اور جسم کسی گینڈے کی طرح مضبوط تھا۔

میں نے اچانک ریوالور نکالا لیا اور اس سے کہا۔ ''بس رک جاؤ ورنہ......'' میں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ریوالور دیکھ کر وہ یوں ساکت ہوگیا جیسے چابی سے چلنے والے کھلونے کی چابی ختم ہوگئی ہو لیکن اس کے چہرے پر خوف یا دہشت کے آثار نہیں تھے۔

''کون ہو تم لوگ اور یہ کون سا طریقہ ہے کسی کے کمرے میں داخل ہونے کا؟'' وہ درشت لہجے میں بولا اور ہتھیلی کی پشت سے اپنے ہونٹوں سے بہنے والا خون صاف کیا تھا۔

بلوچ نے اس کے چہرے پر خاصی زوردار ٹکر ماری تھی، مجھے یقین تھا کہ اس کا ایک آدھ دانت بھی ہل گیا ہوگا بلوچ کی اس ٹکر سے ہی وہ قابو میں آیا تھا ورنہ وہ یقیناً بلوچ کو بھی زخمی کر دیتا۔

اپنا خون دیکھ کر تو وہ آپے سے باہر ہوگیا اور چیخ کر بولا۔ ''میں پوچھ رہا ہوں کہ تم لوگ کون ہو اور یہاں کیا لینے آئے ہو؟'' پھر وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''ویسے میرا نام ہوٹل کے لاکر میں محفوظ ہے۔

پھر میں نے اسے غیرمحسوس انداز میں بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی طرف سرکتے دیکھا۔

''اپنی جگہ سے حرکت کروگے تو کھوپڑی تربوز کی طرح بکھر جائے گی۔'' میں نے کرخت لہجے میں کہا۔

''تم آخر ہو کون؟'' میں نے آگے بڑھ کے اس کے منہ پر تھپڑ مارنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش مجھے مہنگی پڑی۔ اس نے ایک قدم پیچھے ہٹا کر دوسرے پیر سے میرے سینے پر بھرپور لات رسید کر دی، میں اُچھل کر کمرے کی دیوار سے ٹکرایا۔ میری آنکھوں کے آگے نیلے پیلے دائرے سے رقص کرنے لگے اور ایسا محسوس ہوا جیسے سانس لینے میں اٹک گیا ہو، میں نے سر جھٹک کر اپنے اوسان بحال کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ کوئی چیز اُڑتی ہوئی میری طرف آ رہی ہو، میں غیرشعوری طور پر بیٹھ گیا۔ وہ غیرملکی تھا جس نے مجھ پہ چھلانگ لگائی تھی لیکن اب دیوار سے ٹکرا کر میرے ہی اوپر ڈھیر ہوگیا تھا۔

میری حالت اب قدرے سنبھل چکی تھی۔

میں نے اس کے بڑے بڑے بال اپنے دائیں ہاتھ سے پکڑ کر انہیں بے رحمی سے کھینچا اور جب اس کا چہرہ میرے سامنے آیا تو میں نے اس کے چہرے پر اتنی زور سے گھونسا مارا کہ اس کے کئی دانت ٹوٹ گئے۔ اس کے حلق سے کسی زخمی درندے کی سی غراہت نکلی اور اس نے مجھ پر دوبارہ حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن یہ حملہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی اندھا نیم جان ہو کے اپنے دشمن کو مارنے کے لیے ہوا میں لاٹھی چلائے۔

میں نے بیٹھے ہی بیٹھے اسے اپنی دونوں ٹانگوں کے ذریعے دور اُچھال دیا، پھر میں نے اچھل کر کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن مجھے احساس ہوا کہ ابھی مجھ میں وہ توانائی نہیں ہے جس کے ذریعے میں بیٹھے بیٹھے اُچھل سکوں۔

''کیا نام ہے تیرا؟'' میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

میرا نام ایڈی ہے۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ ''اور تم لوگوں کو یہ حرکت بہت مہنگی پڑے گی، میں تمہارے ہی ملک کے اعلیٰ حکام کے کہنے پر یہاں آیا تھا اور یہاں ٹیلی کمیونی کیشن کے شعبے میں سرمایہ کاری کرنا چاہتا تھا، میرا سفارت خانہ ایک طوفان برپا کر دے گا۔''

''اچھا بکواس بہت ہو چکی۔'' بلوچ نے کہا۔

''یہ بتاؤ، تم یہاں کس کی دعوت پر آئے تھے؟''

''لیکن میں تمہیں کیوں بتاؤں، تم مجھ سے یہ سوال کرنے والے ہوتے کون ہو؟''

وہ فرش پہ بیٹھا ہوا تھا، جواب میں بلوچ نے اس کے سینے پر زوردار لات رسید کر دی اور ڈپٹ کے بولا۔ ''سوال کرنے کا حق صرف ہمیں ہے۔''

وہ اچھل کر سائیڈ ٹیبل کے پاس گرا، وہیں اس کا سیل فون رکھا ہوا تھا، اس نے ہاتھ بڑھا کر سیل فون اٹھانے کی کوشش کی لیکن بلوچ کی دوسری لات نے اسے دوبارہ زمین پر پھینک دیا۔

''تم یہاں ٹیلی کمیونیکشن کے شعبے میں سرمایہ کاری کرنے آئے ہو؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''تم ٹیلی کمیونی کیشن کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''میں اسٹیٹس (States) میں اپنی ٹیلی کمیونی کیشن کمپنی چلا رہا ہوں۔'' اس نے دوبارہ ہتھیلی کی پشت سے منہ سے بہنے والا خون صاف کیا۔

''بلوچ!'' میں نے کہا۔ ''اس کے کمرے کی تلاشی لو۔'' یہ جملہ میں نے اردو میں ادا کیا تھا۔

بلوچ نے پہلے اس کی الماری کھولی، اس میں کپڑوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ صرف ایک سوٹ کیس تھا۔ بلوچ نے وہ بریف کیس نکال لیا۔ ایڈی تڑپ کر بولا۔ ''تم بریف کیس رکھ دو، اس میں میرے انتہائی ضروری ڈاکومنٹس ہیں اور میرے بزنس کا پلان ہے۔''

''خاموشی سے اپنی جگہ پڑے رہو۔'' میں نے ڈپٹ کر کہا۔ پھر بلوچ نے بیڈ کے سائیڈ ریک پر رکھا ہوا لیپ ٹاپ اٹھایا، اس کا کور بھی اس کے نزدیک ہی پڑا تھا، اس نے لیپ ٹاپ کور میں ڈال کر اپنے کندھے پر لٹکا لیا۔

''دیکھو، تم لوگ اچھا نہیں کر رہے ہو!'' ایڈی نے کہا۔

''اس لیپ ٹاپ میں میرا انتہائی اہم ڈیٹا ہے۔'' ایڈی نے ہذیانی انداز میں کہا۔ ''میرا سفارت خانہ تمہیں چھوڑے گا نہیں۔''

''اب یہ بکواس کرے تو اس کے منہ میں تکیے کا غلاف ٹھونس دینا۔'' میں نے بلوچ سے انگریزی میں کہا تا کہ ایڈی بھی سمجھ جائے۔ ''اور اس کے ہاتھ پیر بھی باندھ دو۔''

''میں تو کہتا ہوں نا کہ اس کی کھوپڑی میں ایک گولی اتار دیں تا کہ یہ کبھی بولنے کے قابل ہی نہ رہے۔''

''تم اس بھرے پُرے ہوٹل میں مجھے گولی نہیں مار سکتے۔'' اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''تم فکر مت کرو، میرے ریوالور پر سائلنسر چڑھا ہوا ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔''

''ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے بلوچ!'' اس لیے تلاشی ذرا جلدی لے لو۔''

بلوچ نے اپنی جیب سے واقعی سائلنسر نکال کر مجھے دے دیا اور بولا۔ ''اب اگر، ذرا سی بھی آواز نکالے تو اس کی کھوپڑی میں گولی اتار ہی دینا والجہ؟''

یہ کہہ کر وہ پھر تلاشی میں مصروف ہو گیا۔

اس نے بیڈ کے سائیڈ ریک تو پہلے ہی دیکھ لیے تھے، پھر بلوچ نے جھک کر بیڈ کے نیچے دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ اس کی غفلت تھی کہ وہ بیڈ کے نیچے جھانکتے وقت نہ صرف ایڈی کے بالکل نزدیک ہو گیا بلکہ اس کی طرف سے بالکل بے پروا بھی ہو گیا۔

ایڈی ایسے ہی کسی موقع کی تلاش میں تھا۔

اس نے جھپٹ کر بلوچ کی گردن اپنے دونوں مضبوط ہاتھوں میں جکڑ لی اور غرا کر بولا۔ ''اپنا ریوالور پھینک دو مسٹر ہیرو ورنہ تمہارے اس ساتھی کی گردن میں ماچس کی تیلی کی طرح توڑ دوں گا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے بلوچ کے جسم کو پلٹ کر اپنی ڈھال بنا لیا۔ ''جلدی کرو۔'' وہ غرایا۔

''میرے پاس بھی وقت بہت کم ہے۔ مجھے لوگوں کی گردن توڑ کر بہت تسکین ملتی ہے۔ دنیا بھر میں انڈر ورلڈ کے لوگ مجھے ''گردن توڑ بخار'' کے نام سے پکارتے ہیں۔''

اس کے لہجے میں کچھ ایسی بات تھی کہ مجھے محسوس ہوا، یہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ کر بھی گزرے گا۔

بلوچ کا رُخ چھت کی طرف تھا اور وہ ایڈی کے جسم پر تقریباً لیٹا ہوا تھا، اس صورت میں نہ وہ اپنے ہاتھوں سے کام لے سکتا تھا، نہ اس کی گرفت سے اپنی گردن چھڑا سکتا تھا۔

میں نے مجبوراً اپنا ریوالور فرش پر پھینک دیا۔

اس دھینگا مشتی میں بلوچ کا ریوالور بھی گر گیا۔ ایڈی نے فوراً وہ ریوالور اٹھا لیا اور بلوچ کو اپنے جسم سے سامنے کی طرف دھکیل کر خود پھرتی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ یقیناً جم جانے کا عادی تھا ورنہ اتنی پھرتی کی توقع کسی عام آدمی سے نہیں کی جا سکتی۔

بلوچ نے تلاشی کے بعد اس کا بریف کیس، لیپ ٹاپ، سیل فون، والٹ سب ایک تکیہ کے غلاف میں بھر کے اسے سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

''اب تم بتاؤ کہ تم کون ہو اور یہاں کیا لینے آئے ہو؟'' ایڈی غرا کر بولا۔ ''تمہارے ساتھی کے ریوالور پر بھی سائلنسر فٹ ہے اس لیے فائر کرنے میں مجھے بھی کوئی مشکل نہیں ہوگی، جلدی کرو، میرے پاس بھی وقت کم ہے۔'' اس نے

ریوالور لہرا کر کہا۔

بلوچ اب کافی حد تک سنبھل چکا تھا اور اُٹھ کے کھڑا ہو ہی رہا تھا کہ ایڈی دھاڑا۔ ''تم وہیں لیٹے رہو۔'' بلوچ ایک مرتبہ پھر لیٹ گیا لیکن مجھے اس کے چہرے پر شدید غصّے اور بے بسی کے تاثرات نظر آ رہے تھے۔

اچانک کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی، میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔

''کون ہے؟'' ایڈی نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''دروازہ کھولو ایڈی۔'' باہر سے کوئی خاص امریکن لہجے میں بولا۔ ایڈی کے چہرے پر چمک سی نمودار ہوئی اور اس نے پھرتی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

دوسرے ہی لمحے تین آدمی دندناتے ہوئے کمرے میں گھس آئے۔ میں مایوس ہو گیا، میرا خیال تھا کہ آنے والے تیمور اور ہاشم ہوں گے، میرا سیل فون اب بھی آن تھا اور وہ ہماری ایک ایک بات سن رہے ہوں گے۔

''کون ہو تم؟'' آنے والے نے پوچھا، وہ بھی امریکن ہی تھا، پھر اس نے زمین پر لیٹے ہوئے بلوچ کو دیکھا اور بولا۔ ''ایڈی! تم نے تو دشمنوں پر پہلے ہی قابو کر لیا ہے۔''

بلوچ غیر محسوس طریقے پر کھسکتا ہوا اس ریوالور تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے اچانک وہ ریوالور اٹھا کر میری طرف پھینک دیا۔ میں جانتا تھا کہ بلوچ نے اپنی پنڈلی پر کوئی خنجر باندھ رکھا ہوگا یا اس کے پاس کوئی دوسرا ریوالور بھی ہوگا۔

ایڈی سمیت اب وہ چار ہو گئے تھے اور بہ یک وقت ان ''شارپ شوٹرز'' سے نہیں نمٹ سکتا تھا۔

ریوالور تو میرے ہاتھ میں آ ہی چکا تھا...... میں نے کمرے میں چلتے ہوئے واحد انرجی سیور کو نشانہ بنایا۔ کمرا دوسرے ہی لمحے تاریکی میں ڈوب گیا۔ پھر گولی کی آواز کے ساتھ ہی اک کرب ناک انسانی چیخ بھی سنائی دی۔ گویا بلوچ بھی ایکشن میں آ گیا تھا۔ گولی لگتے ہی ان لوگوں نے بھی شاید کسی قسم کی حرکت نہ کرنے میں بہتری سمجھی تھی۔

دوسرے ہی لمحے میں ایک جست میں کمرے سے باہر تھا۔ بلوچ بھی چھپکلی کی طرح رینگتا ہوا باہر آ گیا تھا۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں تکیے کا وہ غلاف بھی تھا جس میں اس نے ایڈی کا سامان بھرا تھا۔

مجھے یہ فکر بھی تھی کہ فائرنگ کی آواز سن کر ہوٹل کی سیکورٹی کا عملہ حرکت میں آ جائے گا۔

کمرے میں جو لوگ موجود تھے وہ باہر نکلنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ ان لوگوں نے اوپر آنے سے پہلے لفٹ میں ایک اسٹول پھنسا کر اسے روک لیا تھا۔ مجھے زینے پر بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

ہم دونوں کچھ دور تک کرالنگ کرتے رہے، پھر نتائج کی پروا کیے بغیر اُٹھ کر بھاگے، وہ کوری ڈور آگے جا کر انگریزی کے حرف ''L'' کی شکل میں گھوم گیا تھا۔

ہم دوسری طرف کمرے میں تھے کہ ہمیں زینے پر بہت واضح طور پر بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ اب ہم لفٹ کے ذریعے بھی نیچے نہیں آ سکتے تھے کیوں کہ لفٹ تک پہنچنے کا راستہ بھی زینے کے پاس ہی سے گزرتا تھا۔

میں نے ایک کمرے کے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو دروازہ اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔

اندر کمروں کی بناوٹ کچھ ایسی تھی دروازے اور کمرے درمیان چھوٹا سا ایک کوری ڈور تھا، کمرے میں کوئی ہلکی آواز میں ہنسا تو مجھے احساس ہوا کہ یہ کمرا خالی نہیں ہے بلکہ اس میں کوئی ٹھہرا ہوا ہے۔ دوسرے ہی لمحے مجھے نسوانی ہنسی کی آواز سنائی دی اور کوئی عورت بولی۔ ''دیکھو کمال! تمہاری خاطر میں نے اپنا گھر بار سب کچھ چھوڑ دیا ہے۔ اب تم مجھے دھوکا دینے کا تصور بھی مت کرنا ورنہ میں اپنی جان دے دوں گی۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو سائرہ!'' کسی مرد کی آواز آئی۔ ''میں بھی ملتان کی بھری جاگیر چھوڑ کر آیا ہوں لیکن تم فکر مت کرو۔ میرے اکاؤنٹ میں اتنا روپیہ ہے کہ میں یہاں کوئی بہت اچھا اور بڑا کاروبار کر سکتا ہوں، پھر میرے ابا جی زیادہ دن مجھ سے ناراض نہیں رہیں گے۔ ہاں، تمہارے ابّو چوہدری کرم دین اور تمہارے بھائی کلہاڑیاں اور رائفلیں لے کر تمہاری تلاش میں گھوم رہے ہوں گے۔''

میرے پیچھے پیچھے بلوچ بھی اندر آ گیا تھا۔ اس نے دروازہ بولٹ کیا تو ہلکی سی آواز آئی۔
سائرہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ''کمال! دروازے پر کوئی ہے!''
''دروازہ لاک ہے۔'' کمال نے کہا۔
''آخر کون ہوسکتا ہے؟'' پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''تم گھبراؤ مت، میں دیکھتا ہوں۔''
کپڑوں کی سرسراہٹ سنائی دی، پھر کسی کی بہت خفیف سی آہٹ سنائی دی۔
میں نے پلک جھپکتے ہیں اپنے بغلی ہوسٹر سے ریوالور نکالا اور ایک دم اس کوریڈور سے نکل کر اس کے سامنے آ گیا۔
آنے والا مجھے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا، ریوالور دیکھ کر گویا اسے سکتہ ہو گیا۔
بلوچ نے جمپ لگائی اور اس عورت تک پہنچ گیا جو منہ کھول کر چیخنے ہی والی تھی۔
بلوچ نے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ لگا دیا اور سفاک لہجے میں بولا۔ ''اگر تمہارے حلق سے ذرا سی بھی آواز نکلی تو میں تمہاری کھوپڑی اُڑا دوں گا۔''
عورت کیا وہ بیس بائیس سال کی خوب صورت اور پرکشش لڑکی تھی، بلوچ کو دیکھ کر وہ سہم کر رہ گئی اور اس کی چیخ حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔
''کک...... کون ہو تم؟'' کمال نے ہکلا کر کہا۔ ''سائرہ...... کو...... میں زبردستی...... اپنے...... ساتھ نہیں...... لایا ہوں...... بلکہ...... یہ اپنی مرضی سے...... آئی ہے۔'' کمال نے رک رک کر کہا۔
''خاموش رہو۔'' میں نے اسے جھڑک دیا۔ ''یہ تمہارا اور سائرہ کا معاملہ ہے، ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں کہ تم اسے اغوا کر کے لائے ہو یا وہ خود ہی تمہارے ساتھ آئی ہے۔''
''پھر...... تم...... لوگ...... کون ہو؟''
''کچھ بدمعاش ہمارے پیچھے ہیں۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔
''ہمیں بس کچھ دیر کے لیے یہاں پناہ چاہیے، ہماری ذات سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''
میری بات سن کر کمال کی جان میں جان آئی اور وہ طویل سانس لے کر بولا۔ ''لیکن میں کیسے یقین کرلوں کہ تمہیں سائرہ کے باپ یا اس کے بھائیوں نے نہیں بھیجا ہے؟''
''ایسے یقین کرلو کہ اگر ہمیں ان لوگوں نے بھیجا ہوتا تو ہم جب تک اپنا کام کر کے واپس جا چکے ہوتے، تم سے اتنی دیر بات چیت نہ کرتے۔''
بلوچ نے بھی سائرہ کے منہ سے ہاتھ ہٹا دیا تھا۔ وہ ابھی تک سہمی ہوئی تھی اور گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔
بلوچ نے معذرت خواہانہ انداز میں سائرہ سے کہا۔
''سوری میڈم! مجھے یہ رویہ اختیار کرنا پڑا ورنہ آپ چیخ چیخ کر ہوٹل کی سیکورٹی کو یہاں اکٹھا کرلیتیں۔''
''اگر یہ بات ہے۔'' کمال نے کہا۔
''تو آپ لوگ جب تک چاہیں یہاں چھپے رہ سکتے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''
اچانک میرے سیل فون کی بیل بجی تو کمال نے چونک کر مجھے دیکھا، میں نے جیب سے سیل فون نکال کر دیکھا، وہ ہاشم کی کال تھی۔ میں نے آن کا بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا۔
ہاشم نے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔ ''کامران صاحب! کہاں ہیں آپ لوگ؟''
''ہم ابھی ہوٹل میں ہی ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔
''تمہیں معلوم نہیں ہوسکا کہ ہم کس مشکل سے اپنی جان بچا کر وہاں سے فرار ہوئے تھے؟''
''مجھے غلط فہمی ہوگئی۔'' ہاشم نے کہا۔
''میں تو یہ سمجھتا رہا کہ آپ نے دشمنوں کو قابو میں کرلیا ہے اور......''

''ہم نے قابو میں کر لیا تھا لیکن اچانک ہی پانسہ پلٹ گیا ہے۔'' میں نے کہا۔
''بہ ہر حال، ہم نے آپ کا راستہ صاف کر دیا ہے، اب آپ بھی وہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔'' ہاشم نے کہا۔
''ٹھیک ہے، ہم یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں، تم ہمارا انتظار کرو۔''
''ہم بہت پہلے آپ تک پہنچ چکے ہوتے لیکن بلوچ سے اچانک رابطہ منقطع ہو گیا۔'' ہاشم نے کہا۔
''ساتھ لائن کٹ گئی یا پھر بلوچ کے سیل فون کی بیٹری لو ہو گئی، اس صورت میں ہم آپ کو کال بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اس سے دشمن چوکنا ہو جائے۔''
''ٹھیک ہے'' میں نے کہا۔
''تم ہمارا انتظار کرو۔ اگر ہوٹل کی سیکورٹی آڑے نہ آئی تو ہم فوراً ہی باہر آ جائیں گے۔ اگر ہمیں آنے میں آدھے گھنٹے سے زیادہ لگے تو تم لوگ اوپر آ جانا یا مجھے کال کر لینا میں اپنا سیل فون وائبریشن پر لگا دیتا ہوں؟'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔
کمال بہت غور سے میری بات سن رہا تھا، اس کے چہرے پر ایک مرتبہ پھر خوف کی پرچھائیاں نمودار ہو رہی تھیں، اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''کوئی پولیس وغیرہ کا چکر تو نہیں ہے جناب؟''
''اگر ہو بھی تو تمہیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔
''پولیس سے ہم نمٹیں گے تم نہیں۔'' پھر میں نے بلوچ سے کہا۔
''تم اپنا سیل فون چیک کرو، اس کی بیٹری لو ہے یا پھر لائن کٹ گئی تھی۔''
''میں نے ابھی اپنا سیل فون چیک کیا ہے واجہ!'' بلوچ نے کہا۔
''اس کا بیٹری لو (Low) ہو گیا ہے، اسی لیے ان لوگ گھروں کو کچھ معلوم نہیں ہوا۔''
ہوٹل میں داخلے سے پہلے ہاشم نے بلوچ کے سیل فون پر کال کر کے اسے جیب میں رکھنے کو کہا تھا تا کہ ان لوگوں کو ہمارے بارے میں معلوم ہوتا رہے۔
اب سائرہ کے چہرے پر بھی اطمینان تھا اور کمال بھی مطمئن نظر آ رہا تھا۔
اچانک دروازے پہ دستک ہوئی تو میرے ساتھ کمال اور سائرہ نے بھی چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔
میں نے کمال سے کہا۔ ''ہم لوگ باتھ روم میں چلے جاتے ہیں' باہر یا تو ہوٹل کی سیکورٹی کے لوگ ہوں گے یا پھر ہمارے دشمن ہوں گے۔'' پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''کوئی بھی ہو، تم ان لوگوں کے ساتھ بہت اعتماد سے بات کرنا اور سختی سے اپنی لاعلمی کا اظہار کرنا بلکہ تھوڑا بہت غصہ بھی دکھانا کہ رات کے اس پہر ان لوگوں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔''
''میں نے بلوچ کو باتھ روم میں جانے کا اشارہ کیا، پھر خود بھی باتھ روم میں گھس گیا لیکن میرے کان پوری طرح سے باہر کی آوازوں پر تھے اور بلوچ کی طرح میں نے بھی اپنا ریوالور نکال لیا تھا۔
آخری لمحے کو بلوچ کو تکیے کے اس غلاف کا خیال آیا جو وہ دشمنوں کے کمرے سے لایا تھا اور اب سائرہ کے بیڈ پر پڑا ہوا تھا، وہ بجلی کی سی تیزی سے باہر نکلا اور وہ تھیلا یعنی تکیے کا غلاف لے کر پھر واش روم میں آ گیا۔
اسی وقت دروازے پر پھر دستک ہوئی، کمال نے جھنجلا کر پوچھا۔ ''کون ہے بھئی؟''
''ہوٹل سیکورٹی!'' باہر سے آواز آئی۔ ''دروازہ کھولیے۔''
کمال نے شاید دروازہ کھول دیا تھا، دوسرے ہی لمحے دروازہ زوردار آواز میں بند ہونے کی آواز آئی، پھر کمرے میں ایک سے زائد افراد کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔
''کون ہو تم لوگ؟'' کمال کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''ابے اتنی جلدی بھول گیا؟'' مجھے ایک اجنبی آواز سنائی دی۔
کمال ہکلا کر بولا۔ ''شش...... شفیق...... بھائی؟...... آپ؟''

''تو کیا سمجھتا تھا کہ سائرہ کو لے اُڑے گا اور ہم چپ کر کے بیٹھے رہیں گے۔''
''دیکھیے شفیق بھائی! سائرہ اپنی مرضی سے آئی ہے، میں نے اسے اغوا نہیں کیا ہے۔'' کمال نے سنبھل کر کہا۔
''یہ کہانی تو بعد میں پولیس کو تیری لاش سنائے گی یا پھر سائرہ کی لاش!'' پھر کڑچ کی ایسی آواز سنائی دی جیسے کسی نے اپنے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹایا ہو۔
میں نے بلوچ کو اشارہ کیا اور ایک دم باتھ روم سے نکل آیا۔ ''اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔'' میں گرج کر بولا۔ ''ورنہ تمہاری کھوپڑی تربوز کی طرح بکھر جائے گی۔''
''تت...... تم کون ہو؟'' ریوالور بردار تھوک نگل کر بولا۔
''پہلے یہ کھلونا زمین پر ڈال دو۔'' میں نے اس کے ریوالور کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے دو ساتھی یا تو خالی ہاتھ تھے یا پھر انہوں نے کوئی ہتھیار نکالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ ''جلدی کرو۔'' میں گرج کر بولا۔
میرے گرج دار تحکمانہ لہجے سے گھبرا کر اس نے ریوالور زمین پر ڈلوا دیا۔
''آپ...... کون ہیں بھائی؟'' اس نے شکستہ لہجے میں پوچھا، اس کا سارا غصہ ہوا ہو گیا تھا۔
''پولیس'' میں نے ڈپٹ کر کہا۔ ''مسٹر کمال نے مجھے پہلے ہی اطلاع دی تھی کہ کچھ لوگ ان کی جان کے دشمن ہو رہے ہیں، میں ابھی اتفاقاً ادھر سے گزر رہا تھا کہ مجھے ان کا خیال آیا اور میں ادھر چلا آیا، اب بتاؤ تم لوگ کیا چاہتے ہو؟''
''سر، آپ ہی انصاف کریں۔'' شفیق سراپا احتجاج بن گیا۔ ''یہ میری بہن کو ورغلا کر پنجاب سے یہاں لایا ہے۔''
''تمہاری بہن کوئی ننھی بچی ہے کہ اس کے ورغلانے پر یہاں آ گئی؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''اور اگر تمہیں کوئی شکایت ہے تو تم پولیس کے پاس جاؤ، قانون اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کیوں کر رہے ہو؟'' پھر میں اچانک گرج کر بولا۔ ''تم دونوں بھی اپنے ہاتھ اٹھاؤ اور دیوار کی طرف رُخ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔''
میرے اشارے پر بلوچ نے بہت مہارت سے ان کی تلاشی لی اور ان کی جیبوں سے بھی ایک ایک درّہ مار کہ پستول برآمد کر لیا، اس نے شفیق کی تلاشی بھی لے ڈالی، اس کی جیب سے تقریباً پچاس ہزار روپے کے کرنسی نوٹ، ایک کنگھا اور ڈرائیونگ لائسنس برآمد ہوا، بلوچ نے بڑھ کر شفیق کا ریوالور بھی اٹھا لیا تھا۔
''پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' شفیق نے پوچھا۔
''تم سب سے پہلے تو متعلقہ تھانے میں اپنی بہن کے اغوا کے رپورٹ درج کراؤ۔''
''وہ تو میں کرا چکا ہوں۔'' شفیق نے جلدی سے کہا۔
''تو پھر اب اسی پولیس اسٹیشن والے کوئی کارروائی کریں گے۔'' میں نے بےزاری سے کہا۔
''لیکن وہ پولیس اسٹیشن تو سیالکوٹ میں ہے، میں سیالکوٹ سے ان کا پیچھا کرتے ہوا یہاں تک آیا ہوں۔''
''تمہارے آنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' میں نے کہا۔ ''کارروائی تو پولیس ہی کرے گی۔''
''آپ بھی تو پولیس کے افسر ہیں۔'' شفیق نے کہا۔
''آپ ہی کوئی کارروائی کیوں نہیں کرتے؟''
''میں صرف تمہارے کہنے پر ان معزز شہریوں پر اغوا کا الزام لگا دوں؟ اس کے لیے پولیس پارٹی وہاں سے آئے گی، وہ پہلے یہاں کے متعلقہ پولیس اسٹیشن کو اطلاع دے گی پھر کوئی کارروائی ہو گی۔''
میری بات سن کر اس کے چہرے پر مایوسی کے سائے گہرے ہو گئے۔
''اور تم یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس اس ریوالور کا لائسنس ہے؟''
''لائسنس...... تو جی ہے...... لیکن......''
''لیکن کیا؟'' میں نے تلخ لہجے میں پوچھا۔
''لیکن میں اسے ساتھ نہیں لایا۔'' میں نے کہا۔

''تم جانتے ہو کہ تم نے قانون کی دفعات کی خلاف ورزی کی ہے، ان ہی دفعات کے تحت تم کئی برس تک جیل کی ہوا کھا سکتے ہو، پہلی بات یہ کہ تم بغیر لائسنس کا اسلحہ لیے گھوم رہے ہو، دوسری بات یہ کہ اگر تمہارے پاس لائسنس ہے بھی تب بھی تم ریوالور ساتھ لے کر نہیں گھوم سکتے، اس کے لیے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا خصوصی اجازت نامہ ہوتا ہے۔'' پھر میں اس کے دونوں ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ ''تم لوگوں کے پاس ان پستولوں کے لائسنس ہیں؟''

''نہیں جی!'' ان میں سے ایک بولا۔ اس کی آواز کوے سے مشابہہ تھی۔

''گویا تم دونوں بھی جیل کی ہوا کھا سکتے ہو، آج کل ملک میں جس قسم کے حالات ہیں تم جانتے ہی ہو۔ تم پہ تو بہت آسانی سے دہشت گردی کا مقدمہ بھی بن سکتا ہے۔''

میری بات سن کر شفیق کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا، اس سے زیادہ غیر حالت اس کے ساتھیوں کی تھی، وہ دونوں بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہے تھے اور میری طرف رحم طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

آخر کوے جیسی آواز والے نے کہا۔ ''صاحب جی! ہم لوگ بے قصور ہیں، ہمیں تو بھائی شفیق کراچی گھمانے لایا تھا۔''

''اس غیر قانونی اسلحے سمیت؟'' میں نے تلخ لہجے میں پوچھا، پھر میں بلوچ سے مخاطب ہوا۔ ''گرفتار کر لو انہیں اور پولیس اسٹیشن لے چلو۔''

''سر! یہ لوگ اتنی دور سے یہاں آئے ہیں، یہاں تو کوئی ان کی ضمانت کرنے والا بھی نہیں ملے گا۔''

''پھر کیا کیا جائے؟'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

''سر! آپ نے کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی، ان لوگوں کا قصور ضرور ہے لیکن انہیں ایک موقع ضرور دیں۔''

''اچھا......'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''اگر تم کہتے ہو تو میں ان کے ساتھ رعایت کر دیتا ہوں، پھر میں شفیق سے مخاطب ہوا۔ ''چلو بھاگو یہاں سے۔''

''کیا ہم لوگ جائیں؟'' شفیق نے بے یقینی سے پوچھا۔

''ہاں بھاگ جاؤ۔'' بلوچ نے کہا۔

''اس سے پہلے کہ صاحب کا ارادہ بدل جائے، تم لوگ یہاں سے نکل جاؤ اور آئندہ کبھی قانون ہاتھ میں لینے کی کوشش مت کرنا۔''

وہ تینوں وہاں سے ایسے بھاگے کہ ایک لمحے کی تاخیر بھی ہو گئی تو میں اپنا ارادہ بدل دوں گا۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ سر!'' کمال نے کہا۔

''اگر اس وقت آپ یہاں نہ ہوتے تو ہم دونوں کی لاشیں پڑی ہوتیں۔''

''خطرہ ابھی ٹلا نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ شفیق اس قسم کا انسان نہیں لگتا کہ اتنی آسانی سے ہمارا پیچھا چھوڑ دے گا۔''

''پھر...... پھر...... مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' کمال نے پوچھا۔

''تم ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ چلو، بعد میں کچھ سوچیں گے۔''

''میں چیک آؤٹ کر کے آتا ہوں۔'' کمال نے کہا، پھر وہ سائرہ سے مخاطب ہوا۔ ''تم جب تک اپنا سامان سمیٹ لو۔''

''چیک آؤٹ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے ہوٹل میں ایڈوانس رقم جمع کرائی ہوگی؟''

''ہاں، میں نے ایک دن کا کرایہ ایڈوانس دیا ہے۔''

''بس تو پھر پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم دونوں میرے ساتھی کے ساتھ باہر نکل جاؤ، میں تمہارا سوٹ کیس لے کر آتا ہوں۔''

''واجد! ان لوگوں کو تم لے جاؤ۔'' بلوچ نے کہا۔

''میں بعد میں ان کا سامان لے کر آجاؤں گا، مجھے یہاں سے نکلنے میں آسانی رہے گی، ہمارا بھی ایک دو

آدمی ادھر ہوتا ہے۔"

مجھے خیال آیا کہ جب ہم ہوٹل میں داخل ہوئے تھے تو کسی نے بھی ہماری تلاشی لینے کی کوشش نہیں کی تھی ورنہ فائیو اسٹارز ہوٹل میں تو بغیر چیکنگ کے آج کل کوئی اندر داخل ہی نہیں ہوسکتا۔

"ٹھیک ہے، میں ان دونوں کو لے کر نکل رہا ہوں، تم سامان لے کر آ ؤ، ہاں اپنا سامان مت بھول جانا۔"

اس وقت سائرہ نے عجلت میں نہ صرف اپنے اور کمال کے کپڑے ایک سوٹ کیس میں کر دیے تھے بلکہ اس نے نہ جانے کس وقت واش روم میں جا کر اپنا لباس بھی تبدیل کر لیا تھا۔

"چلو! تم لوگ میرے ساتھ آ ؤ۔" میں نے ان دونوں سے کہا۔

"ذرا احتیاط سے واجہ!" بلوچ نے کہا۔ "وہ آدمی شفیق ابھی ہوٹل کے باہر ہی موجود ہوگا، اس کا ریوالور تو ہم نے چھین ہی لیا لیکن اس کی گاڑی میں تو ہتھیار ہوسکتا ہے۔"

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور ہاشم کا نمبر ڈائل کیا، اس نے پہلی ہی گھنٹی پر کال ریسیو کر لی اور بولا۔ "آپ کہاں ہیں؟ کسی دوسری مصیبت میں تو نہیں پھنس گئے؟"

"تم گاڑی گیٹ پر لاؤ، ہم لوگ نیچے آ رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

پھر ہم لوگ لفٹ سے جانے کی بجائے زینے سے نیچے اترے اور اطمینان سے ٹہلتے ہوئے ہوٹل سے باہر آ گئے۔ ہاشم اور تیمور گیٹ کے بالکل نزدیک لینڈ کروزر میں موجود تھے، مجھے دیکھتے ہی تیمور ڈرائیونگ سیٹ سے اترا اور عقبی نشست کا دروازہ کھول دیا، میں نے پہلے سائرہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا، پھر کمال کے بیٹھنے کے بعد ہی خود بھی بیٹھ گیا۔

"بلوچ کہاں ہے؟" تیمور نے پوچھا۔

"بلوچ وہ سامنے سے آ رہا ہے۔" ہاشم نے ہوٹل کے مین گیٹ کی طرف اشارہ کیا، اس کے ایک سائڈ میں سوٹ کیس اور دوسرے میں وہی تکیے کا غلاف تھا، تیمور نے بٹن دبا کر ڈکی کھول دی، بلوچ نے سامان پیچھے رکھا، پھر ہاشم کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

اس کے بیٹھتے ہی تیمور نے جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

تیمور یا ہاشم میں سے کسی نے کمال اور سائرہ کے بارے میں نہیں پوچھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر میں ضروری سمجھوں گا تو فوری طور پر انہیں کچھ بتا دوں گا ورنہ گھر پہنچ کر تو تفصیلی بات چیت ہوگی۔

"تیمور!" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "دھیان رکھنا کہ ہمارا تعاقب نہ کیا جائے۔"

"میں آپ کے کہنے سے پہلے ہی محتاط ہوں۔" تیمور نے کہا۔ "کوئی گاڑی مسلسل ہمارا پیچھا کر رہی ہے۔"

"یہ ارجن یا اس کے ساتھی تو نہیں ہیں؟" میں نے کہا، پھر پرخیال انداز میں بولا۔ "شفیق اور اس کے ساتھی بھی ہوسکتے ہیں۔"

"روڈ اس وقت سنسان ہے۔" تیمور نے کہا۔ "انہیں ڈاج دینا مشکل ہوگا۔"

"پھر تم انہیں کیا اپنے پیچھے لگا کر اپنے گھر تک لے جانا چاہتے ہو؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ ان سے یہیں کہیں نمٹ لیں۔" تیمور نے کہا اور اچانک گاڑی کی رفتار خطرناک حد تک بڑھا دی، ایک موڑ گھومتے ہی اس نے گاڑی کو سڑک کے کنارے روکا اور اس کی لائٹس آف کر کے اسے کچے میں اتار دیا۔

پھر وہ اور ہاشم پھرتی سے باہر آ گئے، بلوچ بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ گاڑی بھی تیز رفتاری سے آئی اور اسی رفتار سے سیدھی گزر گئی۔ تیمور اور دوسرے لوگ جلدی سے گاڑی میں بیٹھے، تیمور نے گاڑی کو یوٹرن لیا اور اسی خوفناک رفتار سے گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔ اس کی ہیڈ لائٹس اور بیک لائٹس بھی آف تھیں۔

"ذرا سنبھل کر تیمور!" میں نے کہا۔ "ہم لوگوں کو زندہ سلامت واپس پہنچنا ہے۔"

''آپ فکر مت کریں بھیا! میں گاڑی کو ہمیشہ قابو میں رکھتا ہوں۔''

''روڈ ویران ہو تو اس پہ چلنے والے اکا دکا گاڑیوں والے اس خوش فہمی میں رہتے ہیں کہ ان کے علاوہ اس وقت سڑک پر کوئی نہیں ہے، اچانک کسی کراسنگ پر، کسی راؤنڈ اباؤٹ پر خوف ناک تصادم بھی ہو جاتا ہے۔''

''ارے بھیا! آپ تو فضول میں ڈر رہے ہیں، لیجیے ہم گھر پہنچ گئے، اگلی گلی میں ہمارا بنگلا ہے۔''

میں نے باہر جھانکا لیکن اندھیرے کے باوجود میں سمجھ گیا کہ تیمور غلط نہیں کہہ رہا ہے۔

اگلے دو منٹ کے بعد ہم گھر کے گیٹ پر تھے۔

نادیہ بے چینی سے برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔

مجھے دیکھتے ہی وہ پھٹ پڑی۔ ''عمران صاحب! آپ کو تو کسی کا خیال رہتا ہی نہیں ہے۔ کیا آپ ایک کال نہیں کر سکتے تھے کہ میں......''

میں نے سائرہ اور کمال کی طرف اشارہ کیا تو وہ بولتے بولتے رک گئی۔

''ہمارے مہمان ہیں۔'' میں نے نادیہ سے کہا۔ ''انہیں ذرا کمرے تک بھجوا دو اور انہیں کسی بھی قسم کی تکلیف نہیں ہونا چاہیے۔'' پھر میں نے نادیہ کا تعارف کرایا۔ ''یہ نادیہ ہیں اور یہ سائرہ اور کمال!''

نادیہ نے رسمی طور پر سائرہ سے ہاتھ ملایا وہ نہ جانے کیا سمجھ رہی تھی اور سائرہ کو بہت عجیب سی نظروں سے گھور رہی تھی۔

بلوچ ان لوگوں کا سوٹ کیس لے کر آیا تو میں نے نادیہ سے کہا۔ ''ان کا سامان بھی کمرے میں بھجوا دینا۔''

''آیئے۔'' نادیہ نے سائرہ اور کمال سے کہا۔ ''میں آپ کو کمرا دکھا دوں۔''

اس کے جانے کے بعد ہم لوگ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے، اس بھاگ دوڑ میں بھوک بھی چمک گئی تھی اور اب یوں بھی ایک، ڈیڑھ گھنٹے بعد صبح ہونے والی تھی۔

نادیہ واپس آئی تو میں نے کہا۔ ''تم پہلے ہمارے اچھے سے ناشتے کا بندوبست کرو، پھر اپنے ہاتھ کی ایک ایک گرما گرم کافی پلا دینا۔''

''کھانا، ناشتا سب تیار ہے۔'' نادیہ نے سرد لہجے میں کہا۔ ''لیکن یہ چکّر کیا ہے؟ یہ لوگ کسی بھی طرف سے جرائم پیشہ تو نہیں لگتے، آپ لوگ اب تک جرائم پیشہ افراد کو پکڑ پکڑ کر لایا کرتے تھے، اب کیا اغوا برائے تاوان کا دھندہ بھی شروع کر دیا ہے؟''

اس کے جلے کٹے لہجے پر میرے ساتھ ساتھ ہاشم اور تیمور کو بھی ہنسی آ گئی۔

''تم تو دانت نہ ہی نکالو تو اچھا ہے۔'' نادیہ نے تیمور سے کہا۔ ''ورنہ......''

''ورنہ کیا؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

پھر اسے شروع سے لے کر آخر تک سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔

بلوچ تو ساتھ تھا لیکن تیمور، ہاشم اور نادیہ کے لیے یہ نئی خبر تھی۔

''ان دونوں کو ساتھ کیوں لے آئے؟'' ہاشم نے کہا۔ تم تو پریشانیاں ڈھونڈتے ہو۔''

''ہاشم!'' میں نے سنجیدگی سے کہا، اگر میں ان دونوں کو ساتھ نہ لاتا تو یہ آج نہیں تو کل مارے جاتے، ویسے ابھی تک میں نے بھی نہیں سوچا ہے کہ مجھے ان کے لیے کیا کرنا ہے۔''

''کرنا کیا ہے؟'' تیمور نے کہا۔ ''کل کوئی قاضی بلائیں اور ان دونوں کا نکاح پڑھوا دیں۔''

''بات اتنی آسان نہیں ہے تیمور!'' میں نے کہا۔ ''سائرہ ایک بڑے خاندان کی لڑکی ہے، اس کے گھر والے چین سے نہیں بیٹھیں گے، اس کا صرف ایک حل ہے کہ ان دونوں کی کورٹ میرج کروا دی جائے۔''

''واہ، کیا زبردست حل ہے۔'' تیمور نے کہا۔ ''کامران بھائی زندہ باد، کامران بھائی......''

میں نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ خاموش ہو گیا۔

نادیہ کچھ کہے بغیر وہاں سے اُٹھ کر چلی گئی، میں بھی اُٹھ گیا کہ ذرا ایک نظر سائرہ اور کمال کو دیکھ لوں، میں جانتا تھا کہ نادیہ نے انہیں کس کمرے میں ٹھہرایا ہوگا۔

وہ دونوں ابھی تک جاگ رہے تھے اور آپس میں باتیں کررہے تھے۔

اچانک سائرہ کی آواز آئی۔ ''کمال! مجھے تو یہاں بھی کچھ گڑبڑ لگتی ہے، مجھے یقین ہے کہ اس شخص کا پولیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔'' کمال نے کہا۔ ''پولیس والے ہوٹلوں کے کمروں میں پناہ نہیں لیتے۔''

''مجھے ایک اور خدشہ بھی ہے۔'' سائرہ نے کہا۔ ''یہ لوگ اگر ہمیں بھائی شفیق کے حوالے کردیں اور ان سے بھاری رقم کا مطالبہ کریں تو وہ یہ بھی کردے گا، چاہے اسے اپنی زمین کا کچھ حصّہ بھی کیوں نہ بیچنا پڑے۔''

''تم کیسی باتیں کررہی ہو؟'' کمال نے کہا۔

''وہ ہمارا محسن ہے، ہماری جان بچائی ہے اس نے، تم نے دیکھا نہیں کہ ان لوگوں نے بھائی شفیق کی جیب سے نکلنے والی رقم انہیں واپس کردی تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ ڈیڑھ، پونے دو لاکھ روپے تو ہوں گے؟''

میں نے دروازے پر دستک دی تو شفیق خاموش ہوگیا، میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور بولا۔ ''آپ لوگوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک کہہ دیجیے گا۔ کوریڈور میں ہمارا ایک ملازم موجود ہے، وہ آپ کی ایک آواز پر یہاں آجائے گا۔''

''آپ نے ابھی تک اپنا نام بھی نہیں بتایا؟'' کمال نے کہا۔

''اس کا موقع ہی نہیں ملا۔'' میں نے کہا۔

''میرا نام کامران ہے۔''

''کامران صاحب! آپ کی بیگم تو بہت غصّے والی ہیں، وہ......''

''وہ میری بیگم نہیں ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''آپ نادیہ کی بات کررہی ہیں نا؟''

''جی ہاں، وہ آپ کی بیگم نہیں ہیں؟'' سائرہ نے حیرت سے پوچھا۔

''ابھی تک تو نہیں ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''آئندہ شاید ہوجائیں۔''

''میں تو ان کے اسٹائل ہی سے سمجھ گئی تھی کہ......''

''اچھا اب فضول باتیں مت کرو۔'' کمال نے اسے ٹوک دیا۔

''آپ لوگ بالکل پریشان نہ ہوں، ہم آپ کے دوست ہیں، دشمن نہیں۔ اب آپ لوگ اطمینان سے سوجائیں۔''

یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر آ گیا۔

اسی وقت مجھے نادیہ نظر آئی اور بولی، تم ناشتا مانگ کر یہاں بیٹھے ان لوگوں سے گپیں لگارہے ہو؟''

''گپیں تو نہیں لگارہا تھا، ان کے خدشات دور کررہا تھا، میں نے ہنس کر کہا۔ ''ان کا خیال ہے کہ ہم بھاری رقم کے عوض سائرہ اور کمال کو سائرہ کے بھائیوں کے حوالے کردیں گے، پھر وہ لوگ ان کے ٹکڑے کرکے کہیں دبادیں گے یا کہیں پھینک دیں گے، آخر غیرت بھی تو کوئی چیز ہے۔'' میرے لہجے میں طنز تھا۔

میں اس کے ساتھ نیچے ڈرائنگ روم میں آیا، تیمور، ہاشم اور بلوچ میرے ہی انتظار میں بیٹھے تھے، میرا دل تو چاہ رہا تھا کہ پہلے ایک شاور لے لوں لیکن ان لوگوں کے خیال سے میں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گیا۔

خوب بھرپور ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد ہم لوگ پھر ڈرائنگ روم میں آگئے نادیہ نے کافی وہیں منگوالی تھی۔

کافی پیتے ہوئے میں نے بلوچ سے کہا۔ ''اب ذرا وہ گٹھڑی کو کھولو جس کے لیے ہم نے اتنے پاپڑ بیلے ہیں۔''

بلوچ نے تکیے کا وہ غلاف ڈرائنگ روم کے فرش پر الٹ دیا جو وہ ارجن اور اس کے ساتھیوں سے چھین کر لایا تھا۔

اس میں مختلف قسم کی فائلیں تھیں، کچھ سی ڈیز تھیں، کچھ کاغذات تھے اور باقی ہائی پاور کا ایک ٹرانسمیٹر بھی تھا۔ ٹرانسمیٹر دیکھ کر میں چونک اُٹھا، وہ اس وقت بھی آن تھا اور Blink کررہا تھا، میں نے اس پر لگا ہوا ایک بٹن دبایا تو کمرے میں

ایک کرخت آواز گونجنے لگی۔ ''ہیلو، جی تھری۔ جی تھری...... جی سیون از کالنگ۔ پھر کچھ دیر بعد ایک اور کرخت آواز آئی۔ ''ہیلو جی تھری...... جی تھری...... ہیلو...... جی سیون از کالنگ!''

''جی سیون از کنیکٹنگ۔ اوور!''

کرخت آواز والا امریکن لہجے میں بول رہا تھا۔ ''جی تھری! کیا پچویشن ہے؟ اوور!''

''سچویشن ٹھیک نہیں ہے باس!'' جی تھری نے کہا۔

''وہ دونوں حرامزادے بچ کر نکل گئے اوور!''

''ان پہ لعنت بھیجو، وہ تو پھر کسی وقت ہاتھ آ جائیں گے۔ ارجن کے پاس جو فائلیں تھیں، وہ تو محفوظ ہیں نا؟ اوور!''

''نو سر!'' جی تھری نے کہا۔ ''ارجن کے پاس اب صرف ایک فائل رہ گئی ہے جسے وہ اپنے ساتھ بھارت لے جانا چاہتا ہے، اوور!''

''تو اس سے کہو کہ دیر نہ کرے اور کل Available فلائٹ سے دبئی روانہ ہو جائے، اوور اینڈ آل!''

میں نے بھی ٹرانسمیٹر آف کر دیا پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ اس ٹرانسمیٹر میں لوکیشن مانیٹر بھی ہو سکتا ہے، اگر ایسا ہوا تو وہ اب ہم تک پہنچنے کی تیاری کر رہے ہوں گے، میں نے اپنے اس خدشے کا اظہار تیمور سے کیا۔

وہ بھی چونک اُٹھا اور بولا۔ ''بھیا! نعیم الیکٹرانک کا ماہر ہے، میں اسے ابھی بلواتا ہوں، اگر اس میں لوکیشن مانیٹر ہوا تو وہ اسے ابھی ناکارہ کر دے گا۔'' اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور نمبر پنچ کر کے بولا۔

''نعیم! فوراً تم ڈرائنگ روم میں پہنچو۔''

ایک منٹ سے بھی کم عرصے میں نعیم وہاں موجود تھا۔ اس نے ٹرانسمیٹر کا جائزہ لیا، پھر اپنی جیب سے اسکرو ڈرائیور نکال کر اس کا نچلا منہ کھول لیا اور بولا۔

''سر، اس میں لوکیشن فائنڈر موجود ہے، میں اسے ابھی نکال لیتا ہوں۔''

''اس کے نکالنے سے تو مسئلہ حل نہیں ہوگا، نعیم!'' میں نے کہا۔ ''وہ لوگ تو ہماری تلاش میں نکل چکے ہوں گے۔''

''میں اسے لے کر ابھی ہائی وے کی طرف جاؤں گا اور کراچی سے باہر جانے والے کسی بھی ٹرک کے نیچے چپکا دوں گا، وہ لوگ بھی گڑبڑا جائیں گے کہ ہم لوگ کراچی سے کہیں باہر جا رہے ہیں۔''

''تو پھر جلدی کرو۔'' میں نے کہا، اس نے کھینچ کر میگنیٹ کا وہ ٹکڑا اور لوکیشن فائنڈر نکال لیا، وہ چھوٹی سی ایک چپ تھی، جیسے سیل فون کا میموری کارڈ ہوتا ہے۔ لوکیشن فائنڈر لے کر نعیم اسی وقت نکل گیا۔

''تیمور! تم بھی اس کے ساتھ جاؤ، ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ اس سمت میں آ رہے ہوں اور نعیم سے ٹکراؤ ہو جائے۔''

''ہاں، میں بھی یہ ہی کہنے والا تھا۔'' ہاشم نے کہا۔ ''ہاں، جاتے ہوئے لینڈ کروزر لے جانا، پھر تمہیں اپنے ساتھ اضافی اسلحہ رکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔''

بہ قول ہاشم کے لینڈ کروزر چلتا پھرتا اسلحہ خانہ تھا، اس میں ہر قسم کا اسلحہ موجود تھا لیکن سب کچھ خفیہ خانوں میں تھا۔ تیمور بھی تیزی سے باہر نکل گیا، پھر مجھے لینڈ کروزر اسٹارٹ ہونے اور آہنی گیٹ کھلنے کی آواز آئی، میرے دل سے بے ساختہ دعا نکلی کہ یا اللہ! تو تیمور اور نعیم کو محفوظ رکھنا، مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں اور ہاشم خود بھی ان لوگوں کے ساتھ کیوں نہ چلے گئے؟

''کس سوچ میں گم ہو؟'' ہاشم نے پوچھا۔ ''کوئی پریشانی ہے؟''

''سب سے بڑی پریشانی تو یہ ہے کہ ان لوگوں نے ہمارا ٹھکانا تلاش نہ کر لیا ہو، دوسری پریشانی مجھے تیمور اور نعیم کی طرف سے ہے، لوکیشن فائنڈر کی موجودگی میں ان لوگوں کا ٹکراؤ ارجن کے ساتھیوں سے ہو سکتا ہے۔''

''میں تو سوچ رہا تھا کہ میں بھی ساتھ ہی چلا جاؤں۔'' ہاشم نے کہا۔ ''یا بلوچ کو بھیج دوں، لیکن زیادہ لوگوں کی موجودگی کی وجہ سے کام بننے کی بجائے بگڑ بھی سکتا ہے، اللہ نے چاہا تو وہ دونوں بہ خیریت واپس آ ئیں گے۔''

''ابھی بھی دیر نہیں ہوا ہے ولجہ!'' بلوچ نے کہا۔ ''وہ لوگ ہائی وے کی طرف گیا ہے نا؟ ہم بھی ان کے پیچھے نکلتا ہوں۔''

''اب رہنے دو بلوچ!'' میں نے کہا۔ ''تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ تیمور کس طوفانی رفتار سے گاڑی دوڑاتا ہے؟ وہ تو اب تک یہاں سے نہ جانے کہاں پہنچا ہوگا۔''

''اللہ خیر کرے گا۔'' بلوچ نے کہا۔ ''ہم لوگ کوئی غلط کام نہیں کر رہے ہیں۔''

''اب ذرا ان فائلوں کو بھی دیکھ لیں۔'' میں نے کہا اور ایک فائل اٹھالی، اس پہ ٹاپ سیکریٹ لکھا ہوا تھا اور فائل پہ حکومتِ پاکستان کا مخصوص مونوگرام تھا، میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ اسے سیل کر دیا گیا ہے، اب سیل توڑے بغیر اس کا پڑھنا ناممکن تھا۔

میں نے سیل کا جائزہ لیا، اسے ابھی تک چھیڑا نہیں گیا تھا، سیل پر متعلقہ افسر کے دستخط تھے، مجھے خوشی ہوئی کہ دشمنوں کو اس فائل کو دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ ہاں، اگر ہمیں کچھ دیر ہو جاتی تو یہ فائلیں بھی یہاں سے نکل چکی ہوتیں، تین فائلیں مزید بھی تھیں جن پر سیل موجود تھی، دو فائلوں پر سرے سے سیل تھی ہی نہیں یا ممکن ہے اسے چرانے والوں نے سیل توڑ دی ہو اور اسے سرے سے فائل سے نکال دیا ہو۔ اس فائل کے مندرجات پڑھتے ہوئے میرا دورانِ خون تیز ہو گیا۔ اس فائل میں ان لوگوں کی فہرست تھی جو پاکستان میں دہشت گردی کے ارادے سے آ گئے تھے یا آنے والے تھے، دوسری فائل میں ایک بدنام زمانہ بین الاقوامی مافیا کے لوگوں کے نام تھے، وہ اس وقت پاکستان میں موجود تھے اور قتل و غارت گری کا کوئی منصوبہ بنا رہے تھے۔ وہ مافیا پیسے کے عوض دنیا کا ہر قانون اور غیر قانونی کام کرنے کو تیار ہو جاتی تھی، بہ ظاہر وہ لوگ اپنے طور پر کام کرتے تھے لیکن اسے دو تین غیر ملکی طاقتوں کی پشت پناہی بھی حاصل تھی۔ بقیہ کاغذات وزارت خارجہ کے افسران کے تبادلوں اور تقرریوں کے بارے میں تھے۔ ہم لوگ ان فائلوں کو دیکھنے میں اتنے محو تھے کہ ہمیں تیمور اور نعیم کی واپسی کا احساس نہ ہوا۔

نعیم نے ہنستے ہوئے بتایا کہ میں نے وہ چپ (Chip) ایک ایسے ٹرک کے ساتھ چپکا دی ہے جو پشاور جا رہا تھا، اب وہ لوگ یا تو اس ٹرک کو رستے میں ہی جالیں گے، یا پھر اس کے پیچھے پیچھے پشاور پہنچ جائیں گے۔'' (ختم شد)



تین مرد
تین کہانیاں

سچی کہانیاں کا نیا سلسلہ
جس میں مرد ہی نہیں خواتین بھی مردوں کے اس معاشرے میں
اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات ہمارے پاس بھیج سکتی ہیں

تمہاری یاد میں

نور محمد

ایک نوجوان کی داستان جس کے لیے محبت ایک امتحان تھی......

اس کا اصل نام تو رفعت تھا، مگر گھر اور اس کے خاندان کے بھی لوگ اسے رانی کے نام سے پکارتے تھے۔ حقیقت میں وہ تھی بھی رانی۔ اس کا بولنا، اٹھنا، بیٹھنا بلکہ اس کا ہر کام بالکل رانیوں جیسا ہی تھا۔ رانی کیا تھی۔ وہ میری زندگی، میری جان، میر دنیا، بلکہ سب ہی کچھ تھی۔ وہ اتنی جلدی مجھ سے جدا ہو جائے گی، میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ آج اسے مجھ سے جدا ہوئے پورے چار سال ہو چکے ہیں، مگر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ابھی کل ہی کی بات ہو۔

میری رانی سے پہلی ملاقات کالج کے گیٹ پر ہوئی تھی، جبکہ وہ میرے کالج میں داخلے کے لیے آئی تھی۔ پہلی ہی نظر میں، میں نے اسے اپنے لیے منتخب کر لیا۔ کسی بھی انجام سے بے خبر ہو کر۔ شروع شروع میں، میں نے اس سے بات کرنے کی بہت کوشش کی، لیکن میری تمام کوششوں کے باوجود اس نے مجھ پر کوئی توجہ نہ دی، مگر میں نے بھی ہمت نہ ہاری اور برابر اس کے قریب آنے کی کوشش میں لگا رہا۔ کئی بار تو اس نے بڑی سختی سے مجھے تنبیہ بھی کی اور دھمکی بھی دی کہ اگر میں اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا تو وہ میری شکایت پرنسپل صاحب سے کر دے گی۔ بہر حال میں نے اپنے دل میں یہ عہد کر لیا تھا کہ اب کچھ بھی ہو جائے، میری زندگی کا مقصد صرف رانی کا حصول ہے۔ ایک طویل جدوجہد کے بعد بہر حال اسے میری حالت پر رحم آ گیا اور اس کی سرد مہری ختم ہوئی اور پھر میری باقاعدہ محبت کا آغاز ہوا۔ میں نے اسے ٹوٹ کر چاہا اور اس کی طرف سے بھی مجھے ایسے ہی جذبات جواب میں ملے۔ ہماری محبت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مضبوط اور گہری ہوتی چلی گئی۔ وعدے وعید ہوئے، قسمیں کھائی گئیں، ساتھ مرنے اور جینے کے عہد و پیمان ہوئے، مگر زمانہ کب یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہونے دیتا ہے۔ بہت جلد پورے کالج اور اطراف میں رانی اور میری محبت کے چرچے عام ہو گئے۔ آخر کار یہ کہ ہر بات کی انتہا ہوتی ہے۔ جب یہ تمام باتیں رانی کے گھر والوں کو معلوم ہوئیں تو انہوں نے اس کا کالج جانا بند کر دیا اور اس کے لیے رشتے کی تلاش شروع کر دی، تاکہ ان کی مزید بدنامی نہ ہو۔

یہ صورتحال میرے لیے انتہائی تکلیف دہ تھی، مگر محبت اور مجبوری ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

میرا تعلق ایک کاروباری خاندان سے ہے۔ میرے والد مجھے ایک کاروباری فرد کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی یہی چاہتا تھا، مگر رانی نے میری زندگی میں ہلچل مچادی تھی۔ اس لیے میں یہ سب کچھ بھول چکا تھا۔ اب تو میں صرف یہ چاہتا تھا کہ کچھ بھی ہو، بس کسی صورت مجھے رانی مل جائے۔ رانی سے ملاقات نہ ہونے کے سبب میری حالت ابتر ہورہی تھی۔ نہ کھانے کا ہوش، نہ پینے کا، میری کیفیت نیم پاگلوں کی سی ہوگئی تھی۔ کیوں کہ میری زندگی، میری جان جو مجھ سے دور تھی اور نہ جانے کس حالت میں تھی، مجھے معلوم نہ تھا۔

ہم دونوں ہی حالات اور وقت کے بے رحم



ہاتھوں بُری طرح ستائے جارہے تھے۔ ہمارا کوئی پُرسان حال نہ تھا۔ جب مجھے بعض قریبی ذرائع سے اس بات کی تصدیق ہوئی کہ واقعی رانی کے والدین اس کے رشتے کے بارے میں بہت سنجیدہ ہیں اوران کی کوشش ہے کہ جلدازجلد اس کی شادی ہوجائے تو یہ سن کراور جان کر میری تو حالت ہی غیر ہوگئی، مگر مجبوراور بے بس انسان کر ہی کیا سکتا ہے، پھر بھی میں نے ہمت نہ ہاری اور اپنے آپ کو سنبھالتا ہی رہا۔

میرے والد نے جب میری یہ حالت دیکھی تو انہوں نے مجھے بلایا اور مجھے زمانے کی اونچ نیچ سمجھانے لگے اور کہا۔ ''میاں صاحب زادے اپنی حالت ٹھیک کرو۔'' شاید انہیں میرے بارے میں پوری معلومات حاصل ہوچکی تھی۔ وہ بولے۔ ''ختم کرو یہ مجنوں پن اور یہ ڈراما، زندگی اس طرح نہیں گزرتی۔ زندگی ایک تلخ حقیقت ہے۔ خوابوں کے سہارے اور محض جذبات سے اسے گزارنا آسان نہیں ہے۔ صرف ایک لڑکی کی خاطر زندگی اور اپنا مستقبل داؤ پر لگادینا کہاں کی عقلمندی اور دانائی ہے۔ اگر تم اس چکر سے نہ نکلے تو سمجھ لو میں تمہیں اپنی تمام جائیداد سے عاق کردوں گا، پھر تم جانو اور تمہارا کام۔ مجھے مزید تمہارا بوجھ برداشت نہیں، تم اس بات کو خوب اچھی طرح سوچ لو۔'' میں خاموشی سے ان کی تمام باتیں سنتا رہا اور پھر ساری روداد اپنی والدہ سے جاکر بیان کردی۔ میری والدہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔ ان سے میری حالت پوشیدہ نہ تھی۔ میں نے ان سے کہا۔ ''میں سب کچھ کرلوں گا، مگر میری ایک شرط ہے کہ میری شادی میری پسند یعنی رانی سے کروادو۔''

انہوں نے پہلے تو مجھے خوب ڈانٹا اور سمجھانے کی کوشش کی، مگر میری ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور بولی۔ ''میں اس معاملے میں مزید تمہارے والد سے بات کروں گی۔'' یہ بات سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔

اب مجھے یہ فکر کھائے جارہی تھی کہ اگر اس مسئلے میں مزید دیر ہوگئی اور رانی کا رشتہ کہیں دوسری جگہ ہوگیا تو پھر کیا ہوگا۔ یہ سوچ کر میں نے رانی کے حالات معلوم کرنے کی کوششیں اور تیز کردیں۔ جلد ہی مجھے یہ اطلاع ملی کہ اس کا رشتہ کہیں نہیں ہوا ہے اور ابھی اس کے لیے رشتے کی تلاش جاری ہے۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے بعد میں نے فوراً ہی اپنی والدہ سے بات کی کہ آپ جلدی کریں، کہیں اس معاملے میں دیر نہ ہوجائے۔ قسمت نے مجھے یہ آخری موقع دیا ہے۔ کچھ دنوں بعد میری بار بار خوشامد اور کوششوں سے والدہ میرے والد کو منانے اور قائل کرنے میں کامیاب ہوگئیں اور وہ اس رشتے کے لیے تیار ہوگئے۔

خدا خدا کرکے وہ دن بھی آ گیا، جب میری والدہ، والد اور میری خالہ میرا رشتہ لے کر رانی کے گھر پہنچے، تھوڑی سے حیل وحجت کے بعد رانی کے والد اور والدہ اس رشتے کے لیے تیار ہوگئے۔ حقیقت میں جب مجھے میری والدہ نے بتایا کہ انہوں نے تمہارا رشتہ قبول کرلیا ہے تو کچھ لمحوں کے لیے میں تو بے خود سا ہوگیا اور مجھے یقین ہی نہ آیا کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے؟ میں خود بھی حیران تھا کہ کیا واقعی رانی مجھے اتنی جلدی مل جائے گی، بہرحال یہ میری زندگی کا ایک بہترین لمحہ تھا اور میں اپنے آپ کو اس وقت دنیا کا خوش قسمت انسان سمجھ رہا تھا۔

دراصل بات بھی کچھ ایسی ہی تھی کہ اگر کوئی شخص کسی ایسی شے کی طلب کرے کہ جس کا حاصل کرنا بہت مشکل، بلکہ ناممکن ہو اور پھر وہ شے اس کو تھوڑی سی جدوجہد، تگ ودو اور ذرا سی کوششوں سے حاصل ہوجائے تو اس کی حالت کیا ہوگی؟ بہرحال میرا رشتہ طے ہوگیا اور کچھ عرصے بعد میری شادی رفعت یعنی رانی سے ہوگئی اور وہ دلہن بن کر میرے گھر آ گئی۔

رانی کا ملنا تھا کہ میری زندگی میں جیسے بہار آ گئی اور مجھے ساری دنیا کی دولت مل گئی ہے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جب قسمت مہربان ہو تو کیا گل کھلاتی ہے۔ رانی کیا ملی کہ مجھے ہفت اقلیم کا خزانہ مل گیا۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا، کوئی انتہا نہ رہی۔

میرے احباب، دوست، عزیز و اقارب سب کے سب حیران تھے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگیا؟۔

میں نے اور رانی نے اپنی زندگی کا آغاز بڑے خوب صورت انداز میں کیا۔ وہ ایک بہترین ساتھی اور میرے والدین کے لیے ایک بہترین بہو ثابت ہوئی۔ مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ وقت گزرتا رہا۔ میں اور رانی وقت کا مذاق اڑاتے دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے کی محبت میں گم اپنا آپ کھو چکے تھے۔ مجھے دنیا کی ہر شے رانی کی شکل میں مل چکی تھی۔ یہ میری خوش قسمتی تھی۔ وقت دبے پاؤں گزرتا رہا...... گزرتا رہا اور پھر میری بدبختی کا آغاز اس وقت سے ہوا کہ جب میرے ہاں بچے کی پیدائش کا مرحلہ آیا تو ڈاکٹر نے کہا کہ پیدائش میں کچھ پیچیدگی آسکتی ہے، مگر فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔

ڈاکٹروں نے مجھے بہت یقین دہانی کرائی تھی اور پھر میں اور رانی خود بھی اس حوالے سے مطمئن تھے، پھر جب رانی تم نے ایک بیٹے کو جنم دیا، چوں کہ کیس کچھ پیچیدہ تھا، لہٰذا تمہارا آپریشن ہوا، پھر دوران آپریشن اچانک تمہیں دل کا شدید دورہ پڑا، جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوا اور میں تم سے اس نازک موڑ پر مل بھی نہ سکا، تم سے بات بھی نہ کرسکا، اتنی مہلت ہی نہ ملی، بلکہ تم نے اتنا موقع ہی نہ دیا۔ میں جو رات دن تمہارے قریب، تمہارے پاس، سائے کی طرح موجود رہتا تھا، آخری وقت تمہارے پاس نہ تھا۔ تم مجھے دنیا میں تنہا و اکیلا چھوڑ کر بہت دور چلی گئیں۔ میری محبت و چاہت کی شام وقت سے بہت پہلے مجھ سے دور ہوگئی۔

میری تو دنیا ہی تاریک ہوگئی۔ میں جو اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین شخص سمجھتا تھا، اچانک بدبختی اور بدنصیبی کے تاریک گڑھوں میں جا گرا تھا جہاں ہر طرف تاریکی تھی، گھپ اندھیرا تھا اور میرا گزرا ہوا ماضی تھا۔ اب میری زندگی بے مقصد اور بے معنی تھی۔ رانی تمہارے بعد مجھے تیرے چاہنے والوں نے بہت محبت اور بہت پیار دیا اور میری ہر طرح سے دل جوئی کی، مگر تمہاری یاد، تمہارے ساتھ گزرے ہوئے لمحات اور وہ وقت میں کیسے بھول سکتا ہوں، جو تمہاری آغوش، تمہارے پیار اور تمہاری محبت میں گزار چکا ہوں۔ وہ وقت، وہ شاندار ماضی ہر وقت میری نظروں کے سامنے کسی فلم کے یادگار سین کی طرح رہتا ہے۔

میں ہر دم تمہیں اپنے خیالوں میں محسوس کرتا ہوں کہ شاید تم گھر کے کسی حصے سے اچانک نمودار ہو جاؤ گی اور مجھے حیران کردو گی، مگر یہ سب محض ایک وہم اور صرف ایک خیال ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ تم جو میری زندگی تھیں، ہر وقت، ہر گھڑی میرے آس پاس موجود رہتی ہو۔ رانی میں تمہیں کبھی اپنے آپ سے جدا نہ کرسکوں گا۔ یہی یادیں، میری زندگی کا سرمایہ اور مستقبل ہیں۔ میرے جینے کا سہارا ہیں۔ اب مجھے کسی سے کچھ نہیں لینا، مجھے جو کچھ ملنا تھا مل چکا۔ آج میں دنیا سے ہٹ کر اپنی ایک الگ دنیا بسائے بیٹھا ہوں۔ رانی تمہاری یاد، تمہارا تصور کسی وقت مجھے تنہا چھوڑتے ہی نہیں، میرے اردگرد تمہاری یادوں کا ہجوم ہر وقت موجود رہتا ہے۔ میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے والدین، میرے دوست سب مجھ سے کہتے ہیں کہ نکلو اس یادوں کے چکر سے اور اپنی زندگی کو نارمل کرو۔ کیسے گزرے گی یہ لمبی زندگی؟ مگر میرا ان سب کو ایک ہی جواب ہوتا ہے اور وہ یہ کہ میں نے کسی کے ساتھ عہد کیا ہے اور میں اپنا عہد کسی طرح اور کسی حال توڑ نہیں سکتا۔

مجھے اندازہ نہ تھا کہ قسمت میرا اتنا بڑا امتحان لے گی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میرا سب کچھ اتنی جلدی ختم ہوجائے گا، مگر وقت نے میرے ساتھ بہت بڑا مذاق کیا ہے۔ اس بات کو شاید کوئی نہ سمجھ سکے۔ میں اس شمع کی مانند ہوں جو سحر ہونے سے بہت پہلے ہی بجھ گئی ہے۔ رانی میں تمہیں ساری زندگی بھول نہ سکوں گا، یہ میرا ایک بار پھر تم سے عہد وفا ہے کہ میری زندگی صرف تمہاری یاد میں گزرے گی، صرف تمہاری یاد میں۔

☆......☆

انسانیت کی ہار

عذرا فردوس

پیسے کے لیے لوگوں کا خون بہانے والے ایک مرد کی داستانِ عجب

کمرے سے اماں کی آتی ہوئی کھانسی کی آواز سے مجاہد حسین کے اٹھتے ہوئے قدم رک گئے۔ اس نے سر اٹھا کر اماں کے کمرے کی طرف دیکھا۔

''سنیں ذرا ادھر آیئے گا۔ اماں کی دوا کل سے ختم ہوگئی تھی، میں نے آپ کو بتایا تھا۔ دیکھیں اماں کی کھانسی رکنے کا نام نہیں لے رہی ہے۔''

''صائمہ! میرے پاس پیسے کہاں ہیں؟ جو میں اماں کی دوا لے کر آتا۔ میں تمہاری طرح صابر وشاکر نہیں، غربت اور مفلسی کی لاش میرے کاندھوں پر، اب تکلیف دینے لگی ہے، جوان بیٹے کے ہوتے ہوئے ماں دوا کے لیے ترسے یہ میں برداشت نہیں کرسکتا۔'' وہ صرف دل میں سوچ کر رہ گیا۔ کہنے کا حوصلہ اس میں کہاں تھا۔

''صائمہ میں اماں کے پاس ہوں تم نیم گرم پانی بوتل میں ڈال کر لے آؤ اور اماں کے سینے کی اس سے سینکائی کرو۔ ہوسکتا ہے اس سے کچھ فائدہ ہوجائے۔''

صائمہ نے چارپائی پر سے اپنے وجود کو سمیٹا اور باورچی خانے کی طرف چل دی۔ مجاہد یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو وہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

یہ روز کی کہانی تھی بیماری، دکھ، مجبوری اماں کی حالت تو سنبھلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بیمار تو وہ پہلے ہی تھیں، اوپر سے گھر میں کھانے کے لالے پڑے تھے۔ مجاہد کی بیروزگاری کو انہوں نے اپنے ذہن پر کچھ زیادہ ہی طاری کرلیا تھا۔

''پیسوں کا کچھ انتظام ہوا، بچوں کی فیس جمع کرانی ہے، گھر میں راشن کی چیزیں الگ ختم ہورہی ہیں۔''

''صائمہ نے سوالیہ نظروں سے مجاہد حسین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

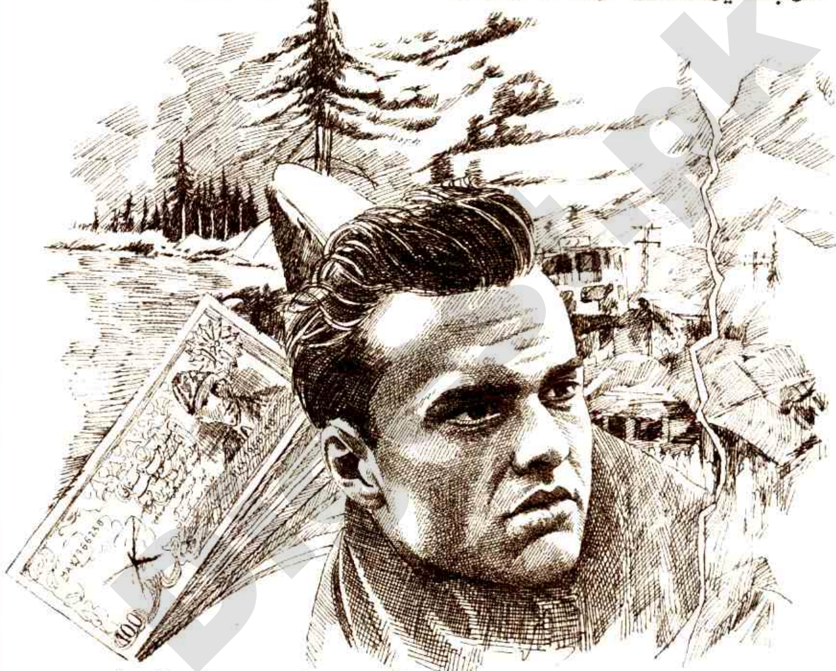
''صائمہ تم جاکر آرام کرو، پیسوں کا بھی انتظام ہوجائے گا۔'' صائمہ کے کمرے سے باہر نکلتے ہی وہ کرسی سے ٹیک لگا کر سوچنے لگا۔

بڑے اچھے دن تھے جو گزر گئے، اب شاید وہ دن لوٹ کر نہ آئیں۔ درمیانے درجے کی مناسب زندگی گزر رہی تھی، ابا نے پرانے وقتوں میں برتنوں کی دکان کھولی تھی جسے جوان ہونے کے بعد مجاہد چلا رہا تھا۔ وہ جو کچھ کماتا، خرچ کم کرتا، دکان میں زیادہ لگاتا۔ مجاہد نے گویا درد سے آنکھیں بند کرلیں، دکان کا خیال آتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، کتنی مشکل سے اس نے اپنی دکان جمائی تھی مگر یہ سیاست دان کیا جانیں۔ اپنی سیاست

چمکانے کے لیے ان کا کام آئے دن نئے نئے تماشے کرنا ہے۔ ان کے احتجاج اور آئے دن کی ہڑتالوں نے عوام کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ جس کا دل چاہتا کاروبار زندگی بند کرا دیتا۔

بڑے بڑے اور خوب صورت مکانوں میں ہڑتال والے دن بہترین کھانے پکوائے جاتے۔ دنیا کے سامنے ایک دوسرے کے مخالف ایک دوسرے سے دوستانہ ماحول میں ملاقاتیں کرتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ملک کی اکثریت کے گھروں میں شاید کھانے کے لیے کچھ نہ ہوگا۔ کئی بیمار وقت پر مناسب علاج نہ ہونے کے باعث زندگی کی بازی ہار گئے ہوں گے۔

مجاہد حسین کا قصور یہ تھا کہ اس سے ہڑتال والے دن دکان کھولنے کا جرم سرزد ہو گیا تھا۔ وہ شٹر ابھی پوری طرح کھول بھی نہ پایا تھا کہ شرپسندوں نے ماچس کی ایک تیلی اور پیٹرول کی ایک بوتل سے اس کی دکان میں آگ کے شعلے بھڑکا دیے تھے۔



مجاہد کو محسوس ہو رہا تھا یہ آگ اس کے جسم میں لگائی گئی ہو۔ اس نے اس وقت یہ نہ دیکھا کہ وہ تن تنہا ان لڑکوں سے کیسے نبٹے گا جو طرح طرح کے نعرے لگا رہے تھے اور دکانیں جلا کر، شیشے توڑ کر خوش ہو رہے تھے۔ مجاہد ان لڑکوں سے بھڑ گیا۔ طاقت کے نشے میں چور ان لڑکوں نے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ ہوش آیا تو وہ اسپتال میں پولیس کے سوال و جواب کی زد میں تھا۔

گزرتے وقت نے اس کے جسم کے زخم تو بھر دیے مگر روح کا زخم نہ بھر سکا۔ نوکری کی تلاش میں وہ ان سڑکوں پر مارا، مارا پھرنے لگا۔ جہاں بھاری ڈگریوں کا بوجھ اٹھائے لوگ سڑکوں کی خاک چھانتے ہیں اور چپڑاسی کی نوکری کرنے پر مجبور ہیں پھر بھلا مجاہد جیسے انٹر پاس کو ملازمت کہاں ملتی۔ لوگوں کی نظریں مجاہد حسین کی جلی ہوئی دکان پر بھی تھیں کہ وہ کسی طرح اسے اونے پونے فروخت کر دے اور بالآخر اسے یہ قدم بھی اٹھانا پڑا۔ کیوں کہ دکان کی نئے سرے سے تزئین و آرائش

کے لیے بھی بھاری سرمایہ درکار تھا، جو مجاہد حسین کے بس سے باہر تھا۔ گھر کا خرچ چلانے کے لیے بھی پیسوں کی ضرورت تھی اور پہلے ہی علاج پر کافی رقم خرچ ہوگئی تھی۔ سوچتے، سوچتے اس نے دل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ اب وہ زندہ نہیں رہے گا، موت ہی اس کے مسائل کا آخری حل تھی۔ اسے اس بات کا احساس تھا وہ جو کچھ کرنے جارہا ہے وہ ٹھیک نہیں، مگر اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔

اگلے دن وہ سمندر کے کنارے پہنچ گیا۔ وہ کئی دفعہ آگے سمندر میں بڑھا اتنا آگے کہ اسے محسوس ہوا کہ جیسے وہ اب ڈوب ہی جائے گا، مگر ڈوبنے کا خوف اسے دوبارہ پیچھے جانے پر مجبور کردیتا۔

''کیا بات ہے بھائی؟ کیا مرنے کا پروگرام بنا کر آئے ہو۔'' اسے اپنے پیچھے آواز سنائی دی، ساتھ ہی کسی نے مضبوط ہاتھوں سے اس کے کندھوں کو پکڑلیا۔ مجاہد حسین نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو اس کے پیچھے درمیانی عمر کا لمبے قد اور بھرے جسم کا حامل شخص کھڑا دکھائی دیا۔

''کیا پریشانی ہے تمہیں بتاؤ؟ ہوسکتا ہے میں تمہاری کچھ مدد کرسکوں، اسے خاموش دیکھ کر وہ بولا۔

''آپ میری کس کس پریشانی کو حل کریں گے۔ میں تو اپنی زندگی سے تنگ آگیا ہوں۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی الفاظ اس کی زبان سے نکل گئے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ شخص اجنبی ہے۔

''تم کیا سمجھتے ہو موت کو گلے لگانے سے تمہارے تمام مسائل حل ہوجائیں گے۔ تم جن لوگوں کو اپنے پیچھے چھوڑ کر جاؤ گے انہیں تمہاری زندگی سے زیادہ دولت کی ضرورت ہے۔ اگر زندگی کا سودا کرنا ہے تو انسان اپنے پیچھے اتنا چھوڑ جائے کہ وہ لوگ جن کا وہ سہارا ہے محتاج نہ ہوں، اس دنیا میں انسانی جان سب سے سستی چیز ہے کیا سمجھے؟''

اجنبی شخص کی اس بات پر مجاہد کی نظروں کے سامنے اپنے تین معصوم بچوں کا چہرہ گھوم گیا۔ وہ انہیں اور اپنی بیوی کو کس کے سہارے چھوڑ کر جارہا تھا، اس دنیا میں جو انسانوں کا نہیں درندوں کا جنگل ہے، بیمار ماں جو سسکتی ہوئی زندگی گزار رہی ہے۔ پیسے نہ ہونے کی وجہ سے جس کا علاج بھی ٹھیک طرح سے نہیں ہو پارہا تھا۔ میں کیا کروں؟ مجاہد نے سر پکڑلیا۔

''چلو کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔'' وہ دونوں ساحلِ سمندر کے نزدیک بنی ہوئی بینچ پر بیٹھ گئے۔

''اب بتاؤ تم کیوں خودکشی کرنا چاہتے ہو؟ اگر مرنا ہی تمہارا مقدر ٹھہرا تو ایسی موت گلے لگاؤ جس سے تمہارے بعد تمہارے گھر والوں کو فائدہ پہنچے۔''

اجنبی شخص کے چہرے پر سفاک مسکراہٹ ابھری۔

''بھلا میری موت سے گھر والوں کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ الٹا وہ مزید مصیبتوں میں گرفتار ہوجائیں گے۔''

''پہلے تم اپنی سناؤ، وہ کیا وجوہات ہیں جن کی وجہ سے تم حرام موت مرنے کے لیے تیار ہو۔''

اس شخص کے الفاظ میں جانے کیسی ہمدردی چھپی ہوئی تھی۔ مجاہد حسین نے اس کے سامنے اپنی زندگی کی پوری کہانی کہہ ڈالی، دل کا غبار کسی کے سامنے تو نکالنا ہی تھا۔

''اوہ! تمہارے ساتھ بہت برا ہوا مگر کیا کیا جائے ہمارے ملک میں تم جیسے کئی لوگ بھرے پڑے ہیں، کوئی ان کا پرسان حال نہیں ہے۔ ایسے لوگ اپنا گھر چلانے کے لیے کسی بھی قسم کی نوکری کے لیے تیار ہیں، مگر کیا کیا جائے بیروزگاری بڑھ گئی ہے۔ اگر تم روزگار کے حصول کے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہو تو مجھ سے رابطہ کرنا۔ یہ لو میرا پتا اور فون نمبر۔''

''آپ مجھے کام بتائیں میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' مجاہد کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''ابھی تم اچھی طرح سے سوچو اس کام میں تمہاری جان جانے کا پورا چانس ہے، مگر بدلے میں تمہارے گھر والوں کو معقول رقم گارنٹی کے ساتھ ملے گی، ٹھیک ہے۔'' اس سے پہلے مجاہد کچھ مزید پوچھتا، وہ شخص اُٹھ کر چلا گیا۔ مجاہد ہاتھ میں اس کے دیے ہوئے کارڈ کو الٹ پلٹ کرنے لگا۔

رات گئے تک وہ سمندر کی شور مچاتی لہروں کو دیکھتا رہا۔ لیکن اس کے دل کی آواز اس کا راستہ روک لیتی۔ اسے احساس ہورہا تھا کہ گھر والے کتنا پریشان

ہوں گے۔ صائمہ بار بار دروازے کے چکر لگا رہی ہوگی اور دروازے پر پڑا ہوا پردہ اٹھا کر باہر کی جانب دیکھ رہی ہوگی۔ اماں کی بوڑھی نگاہیں اس کی راہ تک رہی ہوں گی اور بچے اس کے منتظر ہوں گے۔ بچوں کا خیال آتے ہی اس کی آنکھوں میں اُداسی اتر گئی۔ جب وہ گھر میں داخل ہوتا تھا، بچوں کو کتنی آس ہوتی تھی کہ وہ پھل یا مٹھائی لے کر آیا ہوگا، مگر ایک دو مہینے سے اس کے پاس اکاؤنٹ میں موجود رقم بھی ختم ہوگئی تھی۔ بچے جب اسے خالی ہاتھ دیکھتے تو ان کی آنکھوں میں مایوسی کی جھلک کو وہ اچھی طرح محسوس کرسکتا تھا، پھر وہ مرے، مرے قدموں سے وہ گھر کی طرف چل دیا۔

''آج آپ صبح سے کہاں غائب تھے؟''

صائمہ نے دال روٹی ٹرے میں سجا کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا، چپ چاپ کھانا کھانے لگا۔

''نوکری کی کہیں بات ہوئی، اب تو اس گھر میں مفلسی نے ڈیرے ڈال لیے ہیں، آخر میں کب تک صبر کا دامن تھامے بیٹھی رہوں۔ میں بھی تنگ آگئی ہوں۔

''تمہارا کیا خیال ہے میں کوشش نہیں کررہا۔ مجھ سے زیادہ کس کو اس گھر کی پریشانی کا احساس ہوگا، جاؤ یہاں سے میں پہلے ہی بہت تھکا ہوا ہوں، گھر میں گھستے ہی وہی گھسے پٹے سوالوں کی بھرمار ہوجاتی ہے۔

وہ چلایا تو صائمہ چپ چاپ ٹرے اُٹھا کر چلی گئی اور مجاہد حسین اس کے سراپے میں اس کا کھویا وجود تلاش کرنے لگا۔ جس کے سرخی مائل رخساروں کی رنگت پھیکی پڑچکی تھی اور ہڈیاں اُبھر کر غذا کی کمی کا شکوہ کررہی تھیں۔ وہ ساری دنیا کی نعمتیں جس کے قدموں میں ڈالنے کے وعدے پر صائمہ کو لایا تھا، وہ صائمہ تو کہیں کھوگئی تھی، مجاہد حسین دل میں خدا سے شکوہ کرنے لگا۔ میرے رب تیری رحمت کہاں ہے۔ میں کمزور ناتواں انسان آزمائش سے گھبرا گیا ہوں۔ زندگی جیسی نعمت مجھے اب بوجھ محسوس ہوتی ہے، مجھے معاف کردے۔ دل ہی دل میں اس نے ارادہ کرلیا تھا کہ وہ کل ہر حال میں اس اجنبی شخص سے جس کا نام فدا احمد کارڈ پر درج تھا، اس سے ضرور ملاقات کرے گا۔

''مجھے سو فیصد یقین تھا تم ضرور آؤ گے۔'' فدا احمد نے اگلے دن اسے اپنے سامنے موجود پا کر کہا۔

''کیا کروں سر، اس وقت تو آپ ہی مجھے امید کی کرن دکھائی دے رہے ہیں۔ مجھ پر تو ہر دروازہ بند ہوگیا، اچھے دنوں میں ساتھ دینے والے دوست، احباب نے آنکھیں پھیر لی ہیں۔ برے وقتوں میں کون ساتھ دیتا ہے؟''

''دیکھو مجاہد یہاں کوئی کسی کا دوست نہیں۔ یہ جو میں تم سے سیدھے منہ بات کررہا ہوں، اس میں میری غرض چھپی ہوئی ہے۔ مجھے تم سے کام ہے یہ دنیا کچھ لو کچھ دو کے اصول پر چل رہی ہے۔'' فدا احمد نے صاف لفظوں میں کہا۔

''آپ مجھے کام بتائیں۔''

''وہ تو میں بتاؤں گا مگر یاد رکھو یہ بات بتانے کے بعد شاید تم اپنے قدموں واپس نہ جاسکو۔ تمہاری زندگی کی گارنٹی میں نہیں دوں گا۔ اگر تمہیں میری دی ہوئی آفر منظور ہوگی تب میں تمہیں اپنے سے وابستہ دوسرے لوگوں سے ملواؤں گا۔ یہ کام بزدل لوگوں کا نہیں ہے۔''

یہ کہہ کر فدا احمد اسے کام کے متعلق بتانے لگا۔

''نہیں میں یہ کام نہیں کرسکتا، یہ کہاں کی انسانیت ہے، میں ایسا ہرگز نہیں کرسکتا۔

''تو جاؤ کام ڈھونڈ لو، ورنہ اپنے گھر والوں کو مفلوک الحال دیکھتے رہو اور اگر نہیں دیکھ سکتے تو زہر دے کر اپنے ساتھ انہیں بھی ختم کردو، کم از کم میری دی ہوئی آفر سے تمہارے بچے عیش تو کریں گے۔ تم یہاں پر بیٹھ کر اچھی طرح پھر سوچ لو۔ مجاہد حسین نے کرسی سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ قسمت نے کیسی آزمائش سے اسے دوچار کیا تھا۔ فدا احمد کی بات اپنی جگہ درست تھی۔ جب شر پسندوں کی وجہ سے وہ اس حال میں پہنچا ہے تو اسے کسی سے ہمدردی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن انسانیت بھی تو کوئی چیز ہے۔ دل اور دماغ کی کشمکش جاری تھی۔ خیر و شر کی اس جنگ میں بالآخر شیطان غالب آ گیا۔

''صائمہ میرے ملک سے باہر جانے کا انتظام ہوگیا ہے اب ساری پریشانیاں دور ہوجائیں گی، اس ملک میں

ہم غریب عزت سے گزارا نہیں کر سکتے۔'' مجاہد حسین صائمہ کو سامنے بٹھا کر سمجھا رہا تھا۔ جو اس کے اتنی دور چلے جانے کی خبر سے کافی پریشان نظر آ رہی تھی۔

''میں اپنے بچوں کو چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے یوں ترستا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ میری بوڑھی ماں دواؤں کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہے اور تم؟ میں جانتا ہوں کہ اچھے کپڑے زیور عورت کی کمزوری ہوتے ہیں جو میں تمہیں مہیا نہیں کر پا رہا، میں نہیں چاہتا یہ محرومیاں مجھے تمہاری محبت سے محروم کر دیں، میں تو تمہاری محبت اپنے ساتھ قبر میں بھی لے جانا چاہتا ہوں۔'' آخری جملہ مجاہد نے قدرے اٹکتے ہوئے کہا۔

صائمہ ایک دم تڑپ کر مجاہد حسین سے لپٹ گئی۔ ''اللہ نہ کرے مجاہد ایسی باتیں نہ کریں۔''

''موت اور زندگی کا کس کو پتا ہے۔ بس تم اور بچے میری مغفرت کی دعا ضرور کرنا۔'' اس نے مسکراتے ہوئے صائمہ کے گال تھپتھپائے۔

مجاہد حسین کو گئے ہوئے 15 دن ہو گئے تھے۔ گھر والے اس کی کمی کو بہت محسوس کر رہے تھے مگر اچھے دنوں کی آس میں جدائی کا یہ زہر بہرحال پینا تھا۔

اس روز وہ سب ٹی وی کے آگے بیٹھے اپنا پسندیدہ پروگرام دیکھ رہے تھے۔ مجاہد حسین نے پہنچتے ہی ایڈوانس کی رقم بھیج دی تھی۔ رقم دیکھ کر صائمہ بہت حیران تھی جو کہ اگر دیکھا جائے تو کئی مہینوں کی تنخواہ کے برابر تھی۔ یہ رقم اس کو ایک شخص دے کر گیا تھا، جو صورت شکل سے علاقہ غیر کا لگ رہا تھا۔ رقم صائمہ کے حوالے کرتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ دوسری قسط بھی جلد مل جائے گی۔ اچانک ٹی وی پر بریکنگ نیوز چلنا شروع ہو گئی، خودکش حملہ آور نے جلوس میں دھماکہ کر دیا۔ کئی انسانی جانیں ضائع ہونے کا خدشہ اور پھر آہستہ آہستہ تفصیلات آنا شروع ہو گئیں، دھماکے میں کئی لوگ ہلاک ہو گئے تھے، جبکہ زخمیوں کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

''ہائے، ہائے کیا زمانہ آ گیا ہے، مسلمان ہی مسلمان کی جان لے رہا ہے۔ بے گناہ لوگوں کا قتل ہو رہا ہے، یہ تو قیامت کی نشانی ہے۔'' اماں لیٹے لیٹے خبر کو سنتے ہوئے بولیں۔

دن کے گیارہ بج رہے تھے اس وقت صائمہ کاموں سے فارغ ہو کر انہیں اخبار پڑھ کر سناتی تھی۔ گزشتہ روز ہونے والے دھماکے کی تفصیلات اخبار میں موجود تھیں۔ دھماکے میں ملوث ہونے کے شبہ میں کئی لوگوں کو حراست میں لیا گیا تھا جن سے تحقیقات جاری تھیں۔

''پتا نہیں اس ملک کا کیا ہوگا۔ آئے دن خودکش دھماکوں سے کتنی قیمتی جانیں ضائع ہوتی رہتی ہیں۔ ڈور بیل بجی تو صائمہ گفتگو ادھوری چھوڑ کر دروازہ کھولنے چلی گئی۔ دروازہ کھولتے ہی پولیس کی وردی میں ملبوس افراد اس کو تقریباً دھکیلتے ہوتے اندر داخل ہو گئے۔

''کون ہیں آپ لوگ، کیا کر رہے ہیں یہ'' وہ چیختے ہوئے بولی۔

''یہ مجاہد کا ہی گھر ہے نا؟'' آنے والوں نے استفسار کیا۔

''جی ہاں، مگر مجاہد گھر پر نہیں۔''

''ہاں ہمیں پتا ہے مجاہد جہاد پر گیا ہوا۔'' ان میں سے ایک نے صائمہ کو جواب دیا۔

''تلاشی لو پورے گھر کی۔'' ایک پولیس اہلکار نے جو غالباً ان کا افسر تھا، نے باقی ساتھ آنے والوں کو حکم دیا۔

''سر یہ رقم برآمد ہوئی ہے۔ ایک اہلکار نے لفافہ اپنے افسر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ان کاغذ کے پرزوں کے بدلے تم لوگ معصوم لوگوں کی جانوں سے کھیلتے ہو اور اسے جہاد کا نام دیتے ہو، تمہیں بھی تو اپنے شوہر کے کالے کرتوتوں کا علم ہوگا نا اور یہ بات تم اچھی طرح جانتی ہوگی کہ کل کیے جانے والے دھماکے میں مجاہد بھی ملوث تھا۔ گرفتار کر لو سب کو......''

صائمہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب سن رہی تھی، اس کو اپنے سارے وجود سارے گھر سے بارود اور انسانی خون کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ ''نہیں نہیں، میرا مجاہد ایسا نہیں تھا۔ وہ تو پرائے دکھ پر بھی تڑپ اٹھتا تھا۔ اس نے تو کبھی کسی چیونٹی کو بھی ایذا پہنچانے کا نہیں سوچا تھا۔ یہ سارے حالات ہم سب کے تم سب کے پیدا کردہ ہیں ہم سب مجرم ہیں، جن کی وجہ سے مجاہد اپنے آپ سے ہار گیا۔ حالات سے ہار گیا، انسانیت سے ہار گیا۔''

☆......☆

قلمی دوستی



ادیب سمیع چمن

قلمی دوستی کے نام پر پناہ ڈھونڈنے والے ایک مجرم کی کہانی

دوستو، بھائیو! بہنو! دراصل گزرے واقعات اور حالات ہی زندگی کی حسین یادیں ہوا کرتے ہیں۔ ہم ان کو یاد کر کے ایک انجانی خوشی، اُداسی محسوس کرتے ہیں۔ میں کیا، آپ بھی، بھلا کون ہے جسے اپنے بچپن کی نوعمری اسکول و کالج کی حسین یادوں سے پیار نہ ہوگا، یہ بھی دراصل میری اسی نوعمری کے دور کی کہانی ہے۔

یہ بات ہے میرے اسکول کے زمانے کی قلمی دوستی کے شوق کی، ان دنوں اخبار کے صفحات کمرشل اور کاروباری اشتہارات سے لبریز نہیں ہوا کرتے تھے۔ ہر اخبار کا مالک اور ایڈیٹر تحریک پاکستان، حالات اور کرب سے گزرا تھا۔ حقیقت میں بڑے بڑے نام تھے اور بڑے مخلص قوم وطن کے لوگ ہوا کرتے

تھے۔ اتوار کے روز اخبارات میں بچوں کا صفحہ آتا تھا۔ اخبارات میں اپنے جیب خرچ سے جب تک لیتا رہا جب تک ابو جان نے، اپنا بک اسٹال نہیں کیا تھا اور پھر جب ہمارا اپنا بک اسٹال ہوگیا پھر تو لشکارے تھے۔ پاکستان کے تمام اخبارات کے بچوں کے صفحات اور رسالے ہم خوب جی بھر کر پڑھتے تھے، میں نے ادبی ذہن پایا تھا، چنانچہ قدرت نے مجھے کہانیاں لکھنے اور نظمیں لکھنے کا بھی فن دیا تھا۔ ایک مرتبہ میں نے اپنا تعارف قلمی دوستی میں دے دیا۔ دو ہفتہ یا ایک ماہ کے انتظار کے بعد اخبار میں ہمارا تعارف اور تصویر کیا آ گئی جناب سارے رشتے داروں میں اور محلے میں دھوم ہوگئی، یہ ہی نہیں اندرون ملک جہاں جہاں ہمارے رشتے دار تھے، وہاں سے بھی ابو اور امی کے نام خطوط آرہے تھے۔ ان دنوں خط اور ٹیلی گرام ہی چلتے تھے۔ یہ موبائل شوبائل تو آج کی چیز ہیں۔

لو جناب! ہمارا تعارف کیا آیا، محلے کے ڈاکیے کی روزانہ ہمیں چار پانچ خطوط لا کر دینے کی ڈیوٹی لگ گئی، پھر جب اور اخباروں، رسالوں میں ہمارا تعارف مع تصویر آئے تو اور زیادہ ڈاک آنے لگی۔ چھوٹی موٹی کہانیاں، نظمیں ہماری چھپنا شروع ہوگئی تھیں، اصلاح ہم نے کسی سے نہیں لی بس اچھے لکھنے والوں کی تحریروں کو پڑھ کر ہی اُن سے فن حاصل کرتے رہے۔ درجنوں دوست بن گئے تھے۔ بنگلا دیش، جسے بنگلا دیش لکھتے ہوئے آج بھی میرا قلم لرز جاتا ہے۔ وہ ہمارا پیارا (ایسٹ پاکستان) یعنی مشرقی پاکستان کہلاتا تھا۔ ابھی سانحہ پاکستان نہیں ہوا تھا، یحییٰ خان کی حکومت چل رہی تھی اور ہر چیز آسان اور سستی تھی، نہ ہی آج کی طرح دہشت گردی کا راج تھا اور نہ بھتہ خوری اور قتل و غارت گری کا۔

تو جناب ان قلمی دوستوں میں ایک دوست پنجاب کے ایک علاقہ سے بھی بن گیا تھا۔ جس کا نام اختر عباس تھا۔

اختر عباس سے میری جب قلمی دوستی شروع ہوئی تو اس نے آہستہ آہستہ ہر خط میں مجھے اپنے گھریلو حالات پتا نہیں حقیقت تھے یا وہ فرضی لکھتا تھا، عمر میں مجھ سے تین چار سال بڑا تھا، لکھنا شروع کر دیے۔ مجھے اُس نے بتایا کہ اُس کی ماں کا بچپن ہی میں انتقال ہوگیا ہے۔ اس کے باپ نے دوسری شادی کر لی تھی اور اب میرے ساتھ میرے چھوٹے بھائیوں اور میرے باپ اور سوتیلی ماں کا سلوک ظالمانہ ہے جو میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ میں کیا کروں بھائی میری مدد کرو اور مجھے اپنے پاس حیدرآباد بلوالو۔ میں تمہارے ساتھ بڑا بھائی بن کر رہوں گا، میری ادھوری تعلیم بھی پوری ہوجائے گی اور...... تمہاری دکان پر بیٹھا کروں گا، تمہارا ہاتھ بٹایا کروں گا۔

شروع شروع میں میں نے توجہ زیادہ نہیں دی کہ والد صاحب پتا نہیں اجازت دیں گے یا نہیں، والد صاحب ہمیں کھلاتے سونے کا نوالہ تھے مگر دیکھتے تھے شیر کی نظر سے۔ میں نے والدہ صاحبہ سے سب قصہ گوش گزار کیا، والدہ بے چاری سیدھی سادی خاتون تھیں۔ بڑی رحم دل ہر کسی کے دُکھ درد میں مصروف رہنا ان کا فرض بنتا تھا۔

انہوں نے کہا۔ ''بیٹا تو اختر عباس کو خط لکھ دے کہ وہ آجائے، میں اُسے اپنا بڑا بیٹا بنالوں گی۔'' چناں چہ میں نے اختر عباس کو خط لکھ دیا کہ بھائی تم فکر نہ کرو میری امی نے اجازت دے دی ہے اور اب تم جب چاہو ہمارے پاس آجاؤ۔ جیسے ہی اختر عباس کو میرا خط پہنچا، اُس نے فوراً جواب لکھ مارا کہ وہ بڑا خوش ہوا ہے، اللہ آپ کی امی کی عمر دراز کرے میں آپ کی امی کو انشاء اللہ ہمیشہ اپنی سگی امی کی طرح عزت و مقام دوں گا۔ تم کو چھوٹا بھائی تصور کر کے سگے بھائی سے بڑھ کر پیار دوں گا۔ آخر ایک دن صبح کی گاڑی کی آمد سے وہ ہمارے گھر آ گیا۔

ان دنوں باجی کے شوہر جن کو...... میں اور سب بچے بھائی صاحب کہتے ہیں، ان کا جوتے بنانے کا چھوٹا سا کارخانہ تھا، مجھے انہوں نے کارخانہ کی دیکھ بھال کا کام سپرد کیا ہوا تھا۔ مجھے ابو کا اسٹال بھی اسکول سے آنے کے بعد شام تک سنبھالنا ہوتا تھا۔ اور بھائی صاحب کا کارخانہ بھی تھا۔ اختر عباس کے آنے پر مجھے خوشی ہوئی، میرا خیال تھا کہ میں اُسے یا تو ابو جان کے بک اسٹال پر بٹھا دوں گا یا پھر بھائی صاحب سے ملوا کر اسے کارخانہ کی دیکھ بھال پر تقرر کرا دوں گا، لہٰذا اُسے بھائی صاحب نے اپنے پاس لگوالیا، وہ 18 برس کا نوعمر لڑکا تھا اور میری عمر پندرہ برس کے قریب تھی۔ والدہ نے اور میں نے اسے آگے تعلیم کا مشورہ دیا، مگر وہ شاید پڑھنے پر آمادہ نہیں تھا، بس حیلے بہانے بنا کر بات کو پلٹ دیا کرتا تھا۔ اب وہ کارخانے میں دن بھر کتابیں، ناول وغیرہ پڑھتا رہتا تھا اور اس دوران کارخانہ کا کوئی کام ہوتا۔ بازار سے سامان وغیرہ لا کر دے دیا کرتا۔ اب وہ ہمارے گھر کا ایک فرد بن گیا تھا۔ ہمارے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا اور ہمارے ساتھ ہی کھاتا پیتا۔ اس وقت وہ واقعی بھولا بھالا اور کم گو لڑکا

تھا۔ میں بھی نوعمر تھا۔ میں نے اس پر توجہ ہی نہیں دی کہ اس کا ماضی کیا ہے؟ دراصل سقوط ڈھاکا سے قبل پاکستان کے لوگوں میں آپس میں بڑی یکجہتی اور اعتماد تھا۔ آج کی طرح سے نفسا نفسی، عصبیت گردی اور دہشت زدہ ماحول نہیں تھا۔

چندہ ماہ کے بعد میٹرک کے امتحان کے بعد مجھے میرے تایا زاد بھائی اپنے ساتھ کراچی لے گئے۔ ان کی شادی حال ہی میں ہوئی تھی، کراچی کورنگی نمبر 6 میں اُن کا کوارٹر تھا۔ گھر میں صرف ان کی بوڑھی والدہ، یعنی میری تائی اماں تھیں۔ وہ عمر رسیدہ اور کافی بوڑھی تھیں۔ بھائی ملازمت پر جاتے تو گھر میں بھابھی اکیلی ہوتی تھیں۔ وہ مجھے ابو امی سے کہہ کر لے گئے کہ کچھ دنوں کے بعد آ جائے گا، مگر وہاں جا کر مجھے کراچی میں رہنا اچھا لگا اور میں نے وہیں کے ایریا کورنگی کے کالج میں داخلہ لے لیا، ادھر اختر عباس جو شاید میری وجہ سے ہی آیا تھا، میرے کراچی آنے سے اُداس ہو گیا اور بعد میں پتا چلا کہ وہ واپس اپنے گھر چلا گیا ہے۔

''چلو اچھا ہوا، اپنے گھر اپنوں میں چلا گیا۔'' امی نے بھی میری ڈھارس بندھائی۔

کراچی میں، میں دو تین سال رہا، بھائی کے ہاں بیٹا پیدا ہو چکا تھا، بڑی دھوم دھام ہوئی ادھر امی میری جدائی سے رونے لگتی تھیں، ابو تو کراچی آتے تھے۔

میں خط و کتابت کرتا تھا، مگر امی کی بے قراری اور یادوں سے میں خود بھی زیادہ عرصہ بے پروا نہ رہ سکا اور کالج سے سرٹیفکیٹ لے کر واپس حیدرآباد گھر آ گیا۔

ابو کو میری ضرورت پہلے سے زیادہ تھی، وہ شدید بیمار رہنے لگے تھے۔ بک اسٹال یا تو بند رہتا تھا یا پھر کسی کو بٹھا دیا جاتا تھا، مگر نقصان بھی ہو رہا تھا۔ اس وقت بھٹو صاحب کی حکومت چل رہی تھی۔ میری عمر بھی اٹھارہ سال ہو گئی تھی، اختر عباس کے جانے کے بعد شاید امی کے پاس ایک ہی خط آیا تھا، جس میں اُس نے لکھا تھا کہ وہ گھر نہیں رشتے داروں کے ہاں مقیم ہے۔ پتا جلد بھیجوں گا مگر پھر اس کا کوئی خط وغیرہ نہیں آیا۔

کراچی میں بھی میرے کافی دوست بن گئے تھے، یہ عمر ہی لاپروائی کی تھی، امی نے کئی بار تذکرہ کیا تو میں نے توجہ نہیں کی، ایک دن دروازہ پر دستک ہوئی، امی سمجھیں شاید ڈاکیا آ گیا ہے جب دیکھا تو وہاں ایک لمبا تڑنگا نوجوان کھڑا تھا۔ امی نے مجھے بتایا کہ کوئی نوجوان لڑکا ہے، آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا ہے، مجھے سلام کر کے تمہارے نام سے تمہیں معلوم کر رہا ہے، میں نے جا کر دیکھا، سچ پوچھو تو میں بھی نہیں پہچانا، مگر پھر بھی جانی پہچانی شکل معلوم ہو رہی تھی، مگر وہ مجھے پہچان گیا تھا، اُس نے بڑھ کر مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''میں ہوں آپ کا بڑا بھائی اختر عباس۔''

''اوہ۔'' میں خوشی سے اُچھل گیا۔

''ارے اندر آؤ، کافی لمبے چوڑے جوان بن گئے ہو یار۔ میں واقعی نہیں پہچان پایا ہوں۔'' گھر میں امی سے اور دیگر بھائیوں سے اور ابو سے بھی ملوایا۔ ابو نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ امی نے بھی دعائیں دیں، اُس نے بتایا کہ اس کے ابو آج بھی اس اس کو غیر سمجھتے ہیں، سوتیلی ماں نے اُسے رہنے نہیں دیا، لہٰذا وہ ادھر اُدھر رشتے داروں میں رہتا رہا، مگر رشتے داروں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ ابو نے کہا۔

''بیٹا تم فکر نہ کرو، اب تم گبرو نوجوان ہو، دکان بند ہے۔ اسے تم جا کر کھلواؤ اور تم بھی ہمارے بیٹے کی طرح سے ہو۔''

میری بھی ذمے داریاں بڑھ گئی تھیں، ظاہر ہے اخبار رسالے صبح لینے جاتا تھا، دکان سجاتا تھا۔ گھر کا سودا سلف لانا، لکھنا پڑھنا، وقت ہی نہیں ملتا تھا اِدھر اُدھر جانے کو۔

اختر عباس اب اکیس بائیس سال کا خوب صورت جوان بن گیا تھا اور پہلے کی نسبت تیز طرار بھی ہو گیا تھا، آنکھوں میں جذباتی پن جھلکنے لگا تھا وہ اکثر گھر میں یا دکان پر ڈائری لکھتا رہتا تھا یہ ویسے بھی وہ ہمارے گھر کا ایک فرد بن گیا تھا اور میری ہی وجہ سے وہ سب کو پسند تھا، مگر...... میں نے محسوس کیا کہ اختر مجھ سے بہت سی باتیں چھپاتا ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح مجھ سے بے تکلف ہو کر باتیں نہیں کرتا ہے۔

میں نے سوچا، شاید اسے یہ احساس ہو گیا ہے کہ وہ مجھ سے عمر میں بڑا ہے۔ مگر میں تو اپنے سے بڑے دوستوں کے ساتھ بھی ہنسی مذاق بلّہ گلہ کرتا تھا۔ یہ تبدیلی مجھے کنفیوز کر رہی تھی، دوسرے ایک اور بات میں نے محسوس کی کہ وہ پہلے ہر خط مجھے پڑھواتا تھا، مجھے دکھاتا تھا، مجھ سے انجوائے کرتا تھا مگر اب وہ خط مجھ سے چھپ کر پڑھ رہا تھا، بلکہ ڈائری لکھ رہا ہوتا تھا اور میں اچانک آ جاتا تو وہ گھبرا کر فوراً بند کر دیتا تھا۔ مجھے ظاہر ہے تجسس تو ہوگا کہ میں تو اس سے کوئی بات نہیں چھپاتا ہوں، تو پھر کیوں مجھ سے یہ خطوط اور

ڈائری چھپا رہا ہے؟ ضرور کوئی خاص بات ہو رہی ہے۔

میری تحریریں کراچی اور پاکستان کے دوسرے شہروں کے اخبارات اور رسائل میں بچوں کے صفحات پر جگمگا رہی تھیں اور ادیبوں، شاعروں کے علاوہ ملک کے طول عرض میں قلمی دوستی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ اختر بھی تو میرا قلمی دوست ہے، پہلے تو خوب ڈسکس کرتا تھا۔ اب یہ میری طرف سے کچھ لاپروا معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے گھر میں...... وہ گھر کے فرد کی طرح سے رہ رہا تھا، لیکن روزانہ پوسٹ مین کے انتظار میں اس کے راستے میں ہی جا کر کھڑا رہتا، میں کہتا۔ ''ارے میاں کیوں وقت ضائع کرتے ہو؟''

''میری ڈاک آئے گی تو تمہاری بھی آ جائے گی۔'' لیکن وہ باز نہ آیا، میں نے بھی زیادہ توجہ نہیں دی۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ پوسٹ مین چاچا نے مجھے راستے میں ہی پکڑ لیا اور مجھے ڈھیر سارے خطوط پکڑا دیے، میں جب گھر آیا تو حسب عادت پہلے خطوط پڑھنے کے لیے بیٹھ گیا۔ اچانک ایک اجنبی سا خط میرے ہاتھ میں آ گیا۔

وہ خط اختر عباس کا تھا۔

میں نے یہ سوچ کر کہ کسی کا خط پڑھنا اچھی بات نہیں، اس کا خط اسے دے دیا۔ دوسرے دن مجھے ڈاکیے کے دوسرے ساتھی نے پوچھا کہ...... ''تمہارے گھر میں جو لڑکا رہتا ہے، وہ کون ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ہمارا عزیز ہے، کیا بات ہے؟''

کہنے لگا۔ ''آج وہ صبح ہیڈ آفس آ گیا تھا اور منع کر رہا تھا کہ اس کے خط ہرگز آپ کے ہاتھوں میں نہ دوں۔ ذاتی خط ہوتا ہے اور تمہارا نام لے کر کہا کہ تم اس کی ڈاک پڑھ لیتے ہو۔''

مجھے بہت حیرت ہوئی اور ذہن میں عجب سا جھٹکا محسوس ہونے لگا۔

''یہ کیا بات کی ہے۔'' ایک دن اختر عباس اپنی ڈائری دکان پر بھول گیا میں نے سوچا دیکھوں تو سہی کہ یہ ڈائری مجھ سے کیوں چھپاتا ہے۔ وجہ کیا ہے؟''

چند ورق الٹنے کے بعد پہلے صفحہ پر لکھا تھا۔

''قسمت مجھے کہاں لے آئی ہے؟ دوسروں کے ٹکڑوں پر زندگی گزارنے پر مجبور ہوں اور دوسروں کے ٹکڑے کیا، میں محنت جو کرتا ہوں اس کے بھی یہ گنے چنے پیسے بھی دیتے ہیں، مگر میری مجبوری ہے...... ورنہ...... میں ان کے در پر کیوں رہنے پر مجبور ہوتا۔''

میرے ذہن پر ہتھوڑے برسنے لگے۔ ''ہیں، غیروں کے در پر، یہ کیا لکھ رہا ہے، غیروں کا در ہمارا گھر؟ ہم غیر اس کو سمجھتے تو۔ گھر کے فرد کی طرح یہ کس طرح ہمارے درمیان رہتا اور اس طرح اس کے کپڑوں اس کے کھانے پینے کا خیال رکھا جاتا ہے۔''

دوسرا صفحہ پلٹا تو۔ درج تھا۔

''آج میں پھر اُداس ہوں، میرے سامنے سے خوب صورت حسینائیں نازک ادا سے گزر رہی ہیں، جی چاہتا ہے بڑھ کر ان کو چوم لوں یا بانہوں میں لے لوں، مگر کیا کروں؟ تم...... تم مجھ سے بچھڑ گئی ہو۔ رات و دن سلگ رہا ہوں تمہارے بغیر رات بھر نیند نہیں آتی۔ کاش یہ کچھ نہ ہوتا جو ہو گیا۔''

''کاش...... یہ غلطی نہ ہوئی ہوتی۔''

''مگر...... تم...... تم سے تو جدائی کی طویل دیوار حائل ہو گئی ہے۔''

اس سے آگے پڑھنے کی میری ہمت نہ ہوئی۔

یہ سوچ ہے...... اس بے وفا شخص کی، اور پھر، پھر...... یہ لڑکی وغیرہ کا کیا چکر ہے؟ اور کیسی دیوار کھڑی ہے، ہو سکتا ہے۔ موصوف نے کسی لڑکی کو اپنے چکر میں پھانس لیا ہوگا...... اب یہ کماتے دماتے تو کچھ ہیں نہیں، شاید لڑکی والوں نے منع کر دیا ہوگا یا ملنے جلنے پر پابندی لگا دی ہوگی؟ میرے ذہن میں اس طرح کے سوال و جواب آ رہے تھے۔

''مگر...... مگر...... پھر...... یہ ہمارے پاس ہی کیوں آ کر رہنے لگا ہے؟''

خدا جانے کیا راز ہے؟ یہ پہلے بھی ہمارے ہاں رہ کر گیا تھا۔ اس وقت تو یہ ایسا نہ تھا، بہت کم گو اور بڑی اچھی عادت و اطوار...... رکھتا تھا۔ ہمارے ذہن میں تو اس کا وہی کردار پیش نظر تھا، اگر میں نے یہ سب باتیں امی کو بتا دیں تو اُن کو بہت دُکھ ہوگا اور بلاوجہ ٹینشن پیدا ہو جائے گی، فی الحال خاموشی سے آنے والے مزید انکشافات کا انتظار کرنا چاہیے یہ سوچ کر میں نے نہ گھر میں کسی سے تذکرہ وغیرہ کیا اور نہ ہی اختر عباس کو محسوس ہونے دیا کہ

تمہارے خودغرض خیالات کا مجھ پر انکشاف ہوگیا ہے۔

دوسرے دن جب ڈاکیا مجھے ڈاک دینے آیا، تو میں نے اُسے کہا۔ "چاچا جی یہ جو ہمارے گھر لڑکا رہتا ہے اس کی ڈاک میری معرفت آتی ہے، آئندہ آپ اسے کوئی ڈاک وغیرہ نہیں دیں گے۔ ساری ڈاک آپ میرے ہاتھوں میں دیں گے اور اگر میں موجود نہیں ہوں تو آپ گھر میں امی یا ابو کو ڈاک دیں گے کسی اور کو نہیں۔"

چاچا پوسٹ مین عرصہ تیس سالوں سے ہماری ڈاک لا رہے تھے۔

دو تین دن گزرے ہوں گے کہ ایک خط اختر عباس کا میری ڈاک سے برآمد ہوا۔ یہ خط بہاولنگر سے اس کے ایک دوست نے لکھا تھا۔ میں نے تحقیق کے انداز سے اسے کھول کر پڑھنا شروع کیا تھا، سلام کے بعد اختر عباس کے دوست نے لکھا تھا۔

"جب سے تم اپنے گھر سے فرار ہوئے ہو، تمہارے گھر والوں کی شامت آ گئی ہے، پولیس رات دن انہیں تنگ کر رہی ہے۔"

"تم نے بہت بے وقوفی کی ہے، بغیر شادی کے تم بچے کے باپ بن گئے ہو، لڑکی گاؤں بھر میں بدنام ہوگئی ہے۔ تمہاری وجہ سے پولیس مجھے بھی تنگ کرتی ہے، کیوں کہ انہیں پتا چل گیا ہے کہ تم میرے دوست تھے۔ لڑکی کے بھائی بندوق لے کر تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اور تمہارے والد کو تمہاری وجہ سے جیل ہوسکتی ہے، کیوں کہ تم پر اقدام قتل کا بھی مقدمہ درج ہوگیا ہے۔"

خط پڑھ کر میں لرز کر رہ گیا...... اُف خدایا، قلمی دوستی کا یہ صلہ مل رہا ہے اور پھر یہ شخص جرائم کر کے ہمارے پاس پناہ لیے ہوئے ہے؟ کل کلاں پولیس کو خبر ہوگئی، یا کسی نے ہمارا ایڈریس دے دیا تو...... ہمارا کیا بنے گا گھر میں میری کیا عزت رہ جائے گی، میں نے ایک خط اختر کے دوست کو لکھا کہ تمہارا خط پڑھنے کے بعد میں تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔

دیگر باتوں کے ساتھ میں نے اُسے لکھا کہ آپ اختر کے والد صاحب کو ہمارا پتا دے دو اور انہیں کہو وہ فوراً آئیں، ورنہ اُن کا بیٹا کہیں اور فرار ہو جائے گا۔

یہ ہی کم عمری کی وجہ سے مجھ سے غلطی ہوگئی۔ اختر کا باپ پولیس کے ہمراہ ہمارے گھر آ گیا اور بجائے احسان ماننے اور ہمارا شکریہ ادا کرنے کے ہم پر اُلٹے سیدھے الزامات لگانے لگا۔

"اس کو تم نے کیوں گھر میں رکھا، اس کے پاس اتنے ہزار روپے تھے، اتنا زیور تھا وہ تم نے ہتھیا لیا ہے اور سیدھی طرح تم روپیہ زیور واپس کردو۔"

نیکی کر دریا میں ڈال والا معاملہ ہوگیا تھا۔

سارے گھر والے دم بخود رہ گئے تھے۔ اختر کا باپ نہایت ہی عیار آدمی معلوم ہو رہا تھا، میں گھر والوں کے آگے مجرم سا بن گیا تھا، میری اس نادان دوستی کی وجہ سے یہ آفت آئی تھی۔ کاش میں اس کو اپنے ساتھ گھر میں نہ رکھتا۔ جب تک اس کے گھر والوں سے نہ مل لیتا۔

سارے رشتے دار، محلے والے، دوست وغیرہ میری اس مصیبت کے آگے آ گئے، محلے کے بڑے بوڑھے لوگوں نے میرا اور میرے گھر کا دفاع کیا۔ وہ خطوط دکھائے گئے جن میں اختر عباس اپنے گھر والوں کی برائیاں لکھتا تھا، پھر وہ خط کام آ گیا۔ جو اختر عباس کے دوست نے لکھا تھا اور میرے ہاتھ لگ گیا تھا، جس میں اس کا دوست کھلم کھلا اس کے جرائم کی گواہی لکھ گیا تھا سب تفصیل درج تھی۔ اختر عباس کے باپ کی جب ایک نہ چلی تو اپنے بیٹے سے کھسر پھسر کرنے لگا۔

محلے والوں اور بڑوں نے ہمیں مشورہ دیا کہ ابھی اس وقت اس کو گھر سے نکالو نہیں تو ان کے خلاف فراڈ کا کیس کرتے ہیں، اختر عباس نے حالات کا اندازہ کرلیا تھا۔ پولیس نے اسے گرفتار کرلیا اور اپنے ساتھ لے گئی۔

اختر عباس کتنا خودغرض اور احسان فراموش نکلا کہ اس نے ہماری سادگی، اعتماد اور دوستی کو اتنا بڑا دھوکہ دیا تھا۔ اس نے تو جاتے وقت نہ سلام کیا اور نہ ہاتھ ملایا۔ خدا کا شکر ہے کہ ایک جرائم زدہ شخص سے نجات مل گئی اور بڑوں کی مدد اور عقل کام کرگئی۔ ورنہ نہ جانے کس کس مصیبت اور حالات سے پورا گھر متاثر اور دوچار ہوجاتا۔

اختر عباس نے دوستی کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا۔

ایک عرصہ تک مجھے دوستی سے چڑ ہوگئی تھی۔ خدا ایسی دوستی سے بچائے۔

☆......☆

شعلہ ساماں تحریریں

پہلا شعلہ

روشنی کے مینار



جیجل میتلو

کشمیر کی حسین وادیوں میں جنم لینے والی ایک مجاہد کی محبت بھری داستان

کرشن سنگھ اور اکبر علی بہت اچھے دوست تھے۔ انٹر کرنے کے بعد اکبر علی مزید تعلیم کے لیے دلّی چلا گیا اور کرشن سنگھ فوج میں بھرتی ہوگیا، کیوں کہ اس کا تعلق کسان گھرانے سے تھا اور سب سے بڑا ہونے کے ناتے باپو کے بعد گھر کی ساری ذمے داری اس کی تھی۔ باپو کے پاس تھوڑی سی زمین اور کچھ بکریاں تھیں، اسی پہ ان کا گزارا تھا۔ اکثر باپو کہتا۔

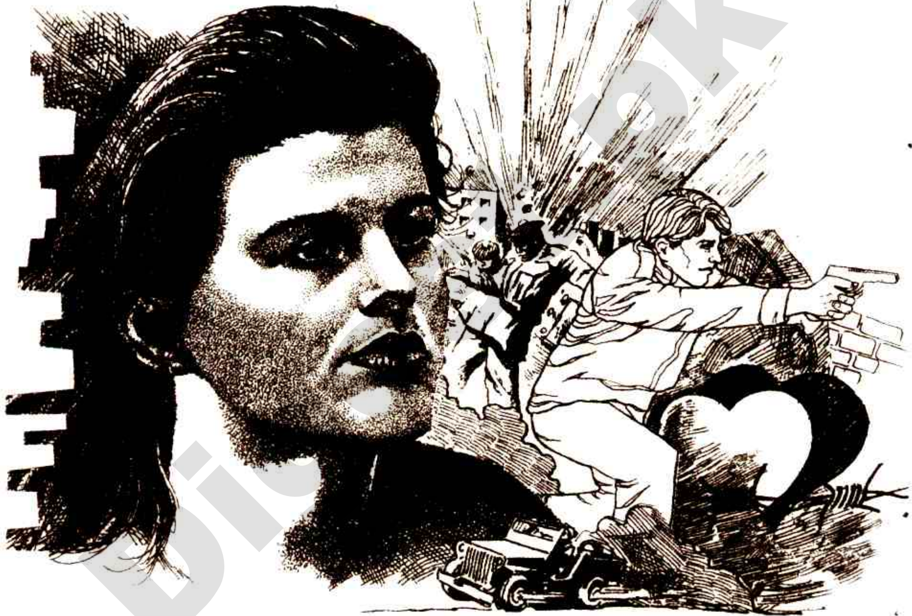
''کرشنا جلدی سے پڑھ لکھ کر تو سرکاری نوکری پہ لگ جا تو پچھا اپنے بھی چنگے دن آون۔'' اسی لیے انٹر کے بعد جیسے ہی فوج میں بھرتی شروع ہوئی تو وہ اس میں بھرتی ہوگیا۔ یہ اس کی مجبوری تھی، ورنہ وہ تو اور زیادہ پڑھ کر سول سروس کرنا چاہتا تھا اور ایک بڑا سرکاری افسر بننا اس کا خواب تھا۔

فوج کی نوکری میں اُسے تیسرا سال تھا اور اب اُسے کشمیر کے مشن پر بھیجا گیا تھا۔ یہاں آ کر وہ بہت تنہائی کا شکار ہوگیا تھا۔ دنیا کا کون سا ایسا ظلم تھا جو یہاں نہیں دیکھا تھا، بلکہ ظلم کے معنی تو اُسے یہیں آ کر سمجھ میں آئے تھے۔ یہاں ظلم و بربریت کی انتہا تھی۔ کشمیریوں کے گاؤں کے گاؤں نذرِ آتش کر دینا، معصوم لڑکیوں کی عزتیں لوٹنا، کشمیری نوجوانوں کو نعرۂ آزادی سے باز رکھنے کے لیے ان پر طرح طرح کے تشدد کے طریقے آزمانا، انہیں بھوکا پیاسا رکھ کر اذیتیں دینا اور نہ ماننے پر انہیں مار کر پانی میں ان کی لاشیں بہا دینا، شیر خوار بچوں کو نیزوں پر اُچھالنا، ترشولوں سے نہتی خواتین کو چھلنی کرنا اور سخت سردی میں ضعیفوں کو برہنہ بدن ٹھٹھرنے کے لیے چھوڑ دینا۔ یہ سب کرتے ہوئے انہیں بہت مزا آتا اور بھارتی سپاہی خود کو دنیا کا طاقتور شخص تصور کرتے ہوئے نہتے کشمیریوں کی بے بسی و بے کسی کا مذاق اڑاتے تھے۔ یہ سب کچھ وہ شراب کے نشے میں کرتے۔ سب سے کم شراب کرشنا پیتا تھا، کیوں کہ پتا نہیں کیوں اسے شراب بالکل اچھی نہیں لگتی تھی اور اسی وجہ سے وہ کم ہی پیتا تھا۔ یہ شیطانی کھیل کھیلتے ہوئے انہیں تین سال ہو چکے تھے۔ گھر سے بھی خط اور چٹھیاں آتی تھیں کہ ماں بیمار ہے، تجھے بہت یاد کرتی ہے۔ گھر کی یاد کے ساتھ ہی کرشنا بہن، بھائی، باپو، (بے بے) یعنی ماں بہت یاد آنے لگے اور اس کے ذہن میں کشمیری مائیں آنے لگیں جو رو رو کر ان سے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی جان و عزت کی بھیک مانگتیں اور وہ انہیں سنگینوں کی انیوں سے چھید چھید کر اور تڑپاتے

اور خوب قہقہے لگاتے اور انہیں زیادہ سے زیادہ اذیتیں دیتے۔ ان کی چیخیں سن کر کئی ماؤں کو انہوں نے مرتے دیکھا۔ ان کا دل پھٹ جاتا ہوگا اور وہ اپنی رائفلوں کے منہ ان نہتے اور بھوک و پیاس سے زخموں سے نڈھال جوانوں اور ان کی ماؤں کی لاشوں پر کھول دیتے تھے اور ان کے گھروں اور گاؤں کے گاؤں کو آگ لگا دیتے تھے اور پھر ہنستے ہوئے نعرے لگاتے ہوئے واپس چھاؤنی کی طرف لوٹ آتے تھے یا پھر کسی اور گاؤں کی طرف نکل جاتے تھے۔

جاؤں اور ماں کی گود میں سر رکھ دوں، لیکن کیسی بے بسی ولاچاری تھی۔ کرشنا آنسو بہہ رہے تھے اور یہ احساس اسے مارے ڈال رہا تھا کہ انہوں نے کیسے کیسے ظلم کمزور نہتے کشمیریوں پر ڈھائے ہیں، تب ہم اپنے گھر والوں کو بھول گئے تھے۔ اب کرشنا صرف ماں کی بیماری کا سن کر تڑپ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر دوسرے دوست اس کا مذاق اُڑاتے اور اسے بزدل کہتے، مگر وہ اپنے ضمیر کے آگے بے بس ہوتا جا رہا تھا۔

ماں ہمیشہ اُسے نصیحت کرتی تھی کہ پتر کسے دا دل



بھارتی فوج کی ظلم و بربریت اور فوجی ٹرکوں کی آوازوں سے اک گونج ہر طرف پھیل جاتی اور وہ فتح کے نشے میں چُور ہوتے۔ یہ سب دیکھ کر تو شیطان بھی کہیں منہ چھپا کر روتا ہوگا۔ یہ احساس اسے اب ہو رہا تھا، جب چھٹیوں میں ماں کی بیماری کی خبر آ رہی تھی اور کرشنا مجھے چھٹی نہیں مل رہی تھی۔ گھر والوں کی یاد نے اس کی میری راتوں کی نیندیں اُڑا دی تھیں اور دن کو بھی قرار نہ تھا۔ اس کا تو جی چاہتا تھا کہ اُڑ کر گھر پہنچ

نہ دکھائیں، وہ چونک چونک جاتا۔ دل دکھانا اس نے تو بھارتی فوجیوں کے ساتھ مل کر خوب اچھی طرح سے سیکھ لیا تھا۔ اس نے ان نہتے لوگوں پر وہ ستم ڈھائے تھے کہ جس کی مثال ملنا مشکل تھی اگر ماں کو ذرا بھی پتا چلے تو وہ تو صدمے سے ہی مر جائے شاید، یا پھر اسے یقین ہو جائے کہ کرشن سنگھ اس کا بیٹا نہیں ہوسکتا۔ ہر ہر طرح سے انہوں نے آزادی کی آواز کو دبانے کی کوشش کی، مگر یہ اتنی ہی زور پکڑتی گئی۔ اب کرشن نے

بھارتیوں کے ساتھ جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ زیادہ تر چوکی پر ہی رہتا۔ اس کے سر میں درد رہنے لگا تھا۔ اچانک ہی اس کی دعائیں رنگ لائیں اور اسے دس دن کی چھٹی مل گئی، ساتھ ترقی بھی، اُسے سپاہی سے لانس نائک بنا دیا گیا تھا، لیکن وہ ترقی سے زیادہ چھٹی ملنے پر خوش تھا۔ جب گھر آیا تو اُسے احساس ہوا کہ وہ درندوں کے چنگل سے نکل کر جنت میں آ گیا ہے۔ ماں تو اُسے دیکھتے ہی کھل اٹھی اور چند دنوں میں ہی بھلی چنگی ہو گئی۔

''ارے نیک بخت اب تو دوا بھی نہیں لے رہی۔'' باپو بھی خوشی سے کہتے۔

''میری دوا تو میرا کرشنا ہے، اُسے دیکھ کر تو میں خوشی سے ٹھیک ہو گئی ہوں۔''

واہے گرو کی مہربانی اور ایشور کی کرپا سے ماں اُسے دعائیں دیتی۔ دس دن تو ایسے گزر گئے جیسے دو دن ہوں۔ جب وہ واپس آنے لگا تو بہت اُداس و بے قرار تھا، مگر سب اُسے دعاؤں میں رخصت کر رہے تھے۔ ماں، بہنیں چھپ کے آنسو پونچھ لیتی تھیں اور ہنس ہنس کر اسے رخصت کر رہی تھیں اور اسے جلدی آنے اور چھٹی ملنے کی دعائیں دے رہی تھیں، خیر وہ پھر انسان نما درندوں میں آ گیا، لیکن اب اُس نے بس چھاؤنی میں چار سپاہیوں کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی تھی۔

''یہ مسلے بھی نا...... بہت سخت جان...... اور پکے ہیں۔ ہار ہی نہیں مانتے۔ بس آزادی۔ آزادی کے ہی لفظ بولے جاتے ہیں، مرتے مرتے بھی۔''

بھارتی سپاہی اکثر آپس میں اس طرح کے تبصرے کرتے۔

''ہاں یار بڑے جگرے والے ہیں۔'' وہ بھی ٹکڑا لگاتا۔ ''ارے کیا کریں گے۔''

''ہماری بڑی طاقت ہے...... سکھوں کی تحریک ٹھہری ہمارے آگے؟'' گوپال بہت تعصب پسند ہندو تھا، کوئی موقع نہیں جانے دیتا کرشن کو ہرٹ کرنے کا۔ دونوں میں جیسے ایک سرد جنگ جاری تھی اور وہ سوچتا یا پھر گوپال کے رویے اور جملوں نے اس کی سوچوں کا رُخ موڑنا شروع کر دیا تھا۔ وہ سوچتا واقعی جو بھی انسان پیدا ہوتا ہے وہ آزاد پیدا ہوتا ہے۔ وہ اپنے گھر میں، شہر میں، ملک میں آزاد، اپنی مرضی سے رہنا چاہتا ہے، یہ اس کا پیدائشی حق ہے۔ یہ اس سے چھیننا اور وہ بھی طاقت کے زور پر...... اس کا دل آہستہ آہستہ کشمیریوں کے حق میں ہوتا جا رہا تھا۔ جو بھی یہ حق چاہتا ہے، اُسے بھارتی اپنی طاقت سے دبا دیتے ہیں۔ جیسے کہ سکھوں کے گولڈن ٹمپل پر حملہ کر کے دبایا، مگر یہ مسلمان تو ہر قسم کا ظلم سہنے کے بعد بھی سینہ سپر ہیں۔ گاؤں کے گاؤں اجڑ گئے، خود بھی بھارتیوں کی وجہ سے ہجرت کر کے کہاں سے کہاں جا چکے ہیں، مگر جذبۂ تحریک میں کمی نہیں آئی۔ آفرین ہے اُن پر...... وہ انہی سوچوں میں گھرا تھا کہ حکم ملا کہ آج تم بھی چلو گے، کیوں کہ نفری کم ہے...... یہ نئے صوبے دار کا حکم تھا اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بھی ساتھ ہو لیا، کیوں کہ یہی تو اس کی روزی روٹی تھی۔ بہانہ گشت کا تھا مگر ارادہ کشمیریوں کے گھروں پر حملہ تھا۔ دو تین فوجی جیپوں پر فوجی ہتھیار لے کر ہنستے مسکراتے نعرے لگاتے سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ وہ سب سے آخری گاڑی میں تھا جو دیر کرنے کی وجہ سے کافی پیچھے تھی۔ نامعلوم کیوں اس کے دل کی طرح جیپ کی رفتار بھی سست بہت تھی۔ یہ ایک تباہ حال جلا ہوا گاؤں تھا۔ سب عمارتیں ٹوٹی پھوٹی، نہ کوئی دیوار سلامت، نہ چھت، کرشن نے سپاہیوں سے کہا کہ تم لوگ یہیں گاڑی روکو اور گشت لگاؤ۔ سب سپاہی اُتر پڑے، کیوں کہ کبھی کبھی ایسی ہی عمارتوں میں چھپا ہوا کوئی کشمیری مجاہد یا پھر کوئی بدقسمت عورت ہاتھ لگ جاتی تھی اور پھر سپاہیوں کی عید ہو جاتی تھی، لیکن آج کرشنا دل سے دعا مانگ رہا تھا کہ کوئی ہاتھ نہ لگے اور وہ خالی لوٹ جائیں۔

وہ ایک چٹان سے ٹیک لگائے دل میں یہ دعا مانگ رہا تھا اور سپاہی اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے کافی آگے تک نکل گئے تھے۔ وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ جیسے کوئی کھڑکا سا ہوا۔ اس نے سوچا شاید کوئی مجاہد اس پر پستول تانے کھڑا ہو گا۔ اس کا دل جیسے مٹھی میں آ گیا۔ پیشانی کی رگیں تن گئیں۔

کیوں کہ کشمیری مجاہد بھی تو ان کے خون کے

پیاسے تھے اور حملہ کرنے سے وہ بھی باز نہیں آتے تھے۔ اس نے جلدی سے پیچھے مڑ کر دیکھا، لیکن وہاں تو کوئی نہ تھا۔ اُس نے ٹھنڈی سانس شکر کی خارج کی اور جس طرف کھڑکا ہوا تھا، اُس طرف احتیاط سے بڑھنے لگا۔ اس نے سوچا کہ وہ چپکے سے نکل جائے گا۔ جس طرف سے آواز آئی تھی، وہ اِک ٹوٹی ہوئی کوٹھری تھی، بس اِک دیوار پر چھت جڑی ہوئی تھی، باقی تین دیواریں دروازے، کھڑکیاں جل کر گر چکی تھیں۔ چھت نے زمین پر گر کر نصف خیمے کی شکل اختیار کر لی تھی اور ایسی جگہ بن گئی تھی کہ ایک دو آدمی آسانی سے چھپ کر بیٹھ سکیں۔ مارے تجسس کے اس نے وہاں جھانکا تو ایک دم جیسے بجلی سی چمک گئی ہو۔ گلابی دوپٹا اور دو سہمی ہوئی آنکھیں اور تھوڑا سا ایک چہرے کی جھلک اسے نظر آئی اور بس، اب سوائے جلی ہوئی گھاس اور اَدھ جلے سرکنڈوں کے وہاں کچھ نہ تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے تو یہ سب ایک وہم سا لگا، لیکن بغور دیکھنے اور جائزہ لینے کے بعد وہ سمجھ گیا کہ یہ ایک گھر کا کمرا رہا ہوگا اور نیچے ایک تہ خانہ یا اسٹور نما کمرا ہو سکتا ہے۔ وہ ٹھٹھک سا گیا۔ اس نے اِدھر دیکھا، فوجی شاید آس پاس نہیں تھے۔ وہ آگے بڑھ کر نیچے کی طرف بیٹھ گیا اور اتنے لہجے میں کہ کوئی دوسرا نہ سن سکے، منہ کا رُخ اس طرف کر کے بولا۔

''تم جو کوئی بھی ہو...... یہاں سے مت نکلنا، کیوں کہ بھارتی فوجی کتوں کی طرح کشمیریوں کی بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔'' اور پھر وہ تیزی سے اٹھ کر نیچے آیا اور سکون کا سانس لیا کہ ابھی تک فوجی واپس نہ ہوئے تھے۔ وہ بھی اُس جگہ سے ہٹ کر جیپ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور جب تھوڑی دیر میں سب سپاہی آ گئے تو پھر وہ چھاؤنی کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں وہ سوچ رہا تھا کہ شاید وہاں گھر کے لوگ چھپے ہوں گے یا پھر مجاہد...... یا صرف...... وہ لڑکی...... اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری...... کیسی بے بسی کا عالم تھا اِن محصور کشمیریوں کے لیے...... چھاؤنی آنے کے بعد بھی وہ یہی سوچنے لگا کہ اُسے اس لڑکی کی مدد ضرور کرنی چاہیے۔ وہ اکیلا جائے یا نہیں۔ نہیں اس معاملے میں کسی پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا، دماغ نے اُسے سختی سے سرزنش کی اور مجاہد (یعنی حکومتی باغی ہوئے تو) پھر تو وہ مارا بھی جا سکتا ہے۔

اس وقت دوپہر ڈھل رہی تھی۔ وہ شام کا انتظار کرنے لگا۔ کسی کی ڈیوٹی دن کی تھی تو کسی کی رات کی مگر ان کے لیے ٹائم کی کوئی قید نہیں تھی، جو فوجی جس فوجی کے ساتھ چاہتا، چلا جاتا۔ کچھ سپاہی گشت پہ گئے ہوئے تھے اور کچھ تاش کی بازی لگائے بیٹھے تھے۔ وہ سب کا جائزہ لینے لگا۔ شکر تھا کہ گوپال اِن دنوں پیلیا کی وجہ سے اسپتال میں داخل تھا، ورنہ اُسے کرشن کی بڑی ٹوہ لگی رہتی تھی پھر وہ بہانہ بنا کر چھاؤنی سے نکل کر اس طرح کو روانہ ہوا جہاں اس نے اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ راستے سے اُس نے کچھ بسکٹ بھی لے لیے تھے، نامعلوم بیچاری وہ لڑکی وہاں کیوں تھی؟ اس کے گھر والے کہاں تھے؟ یا پھر وہ سب مارے گئے تھے؟ یا وہ مجاہدوں کی ساتھی تھی؟ انہی سوچوں میں گھرے ہوئے اس نے گاڑی ایک طرف درختوں کے جھنڈ میں اس طرح کھڑی کی کہ دور سے وہ کسی کو نظر نہ آئے اور واہے گرو کا نام لے کر وہ وادی میں اُتر گیا اور پھر بغور علاقے کا جائزہ لینے لگا۔ وہ گاؤں مکمل طور پر تباہ حالی کا شکار تھا اور اس اونچی نیچی وادی میں لگتا تھا کہ کوئی گھر یا بندہ سلامت نہ تھا۔ فوجیوں کے خوف سے بہت سے لوگ نقل مکانی کر چکے تھے۔ وہ اُس سرکنڈوں والے ٹکڑے کے پاس آ کر رکا اور پھر آس پاس کا خوب اچھی طرح سے جائزہ لینے کے بعد اس نے اُس گھاس پھوس کے ٹکڑے کو ہٹایا، مگر وہ کافی بھاری تھا۔ اُس نے خوب زور لگایا اور آخر وہ اتنا سرک گیا کہ وہ اس میں کود گیا۔

وہ واقعی ایک تہ خانہ نما کمرہ تھا، جو کہ پتھریلی زمین کو تراش کر بنایا گیا تھا اور اُس گھاس نما دروازے کے وزنی ہونے کا راز اس کا ایک لکڑی کے کھونٹے سے بندھا ہوا ہونا بھی تھا اور اس کے زور لگانے سے وہ رسی، جو کہ اَدھ جلی تھی، ٹوٹ چکی تھی اور ایک کونے میں ایک مہ جبیں کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ آنکھوں میں خوف ہی خوف تھا، ڈر کے مارے چہرہ زرد اور آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ ہونٹوں پر خشکی کی تہ جمی ہوئی تھی۔

کشمیر کا حسن تو بہت سنا تھا، لیکن ایسا سہا حسن اُس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا، کشمیر میں زیادہ عرصہ رہنے کی وجہ سے اُسے کچھ کچھ کشمیری زبان آ چکی تھی۔ اس لیے اُس نے اُس سے کہا۔

''گھبراؤ مت میں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ تم مجھ پر بھروسا کرسکتی ہے۔'' وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں تھا، بلکہ وہیں کھڑے رہ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ لڑکی نے جب محسوس کیا کہ وہ اُس کے قریب بھی نہیں آ رہا تو اُس کے چہرے کا خوف کچھ کم ہونے لگا۔ تناؤ اور دل کی دھڑکن تھوڑی معمول پر آنے لگی، لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولی اور نہ اپنی جگہ سے ہلی۔ کرشن اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ اس نے وہ خریدے ہوئے بسکٹ اور پانی کی بوتل زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہارے لیے ہیں اور یہ بہت محفوظ جگہ ہے، لہٰذا تم یہاں سے بالکل مت نکلنا، میں بھی تمہارا ہمدرد ہوں۔ کوشش کروں گا کہ تمہارے کچھ کام آسکوں، اب چلتا ہوں۔''

وہ ویسے ہی مبہوت کھڑی متوحش نگاہوں سے اسے جاتا دیکھتی رہی، بولی کچھ نہیں۔ وہ اسے حیران و پریشان چھوڑ کر باہر آ گیا اور چھاؤنی میں پہنچ گیا۔ کسی نے بھی نوٹ نہیں کیا تھا کہ وہ آج یونٹ سے غائب ہے۔ کرشن نے اطمینان کی سانس لی اب وہ روزانہ چھپ چھپ کر وہاں جانے لگا موٹر سائیکل پر، کیوں کہ جیپ چار پانچ سپاہیوں کے لیے تھی اور بائیک پر سپاہی خریداری کے لیے شہر یا سرینگر جاتے تھے۔ اس لیے کسی کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا، لیکن پھر بھی اُسے ایک ڈر سا لگا رہتا تھا کہ کہیں کسی کو شک نہ ہوجائے، اس لیے وہ کم سے کم وقت نور بانو، ہاں اس کا نام نور بانو ہی تھا۔ کو دیا کرتا تھا۔ اب وہ کچھ کچھ اس سے مانوس سی ہو چکی تھی۔ اُس نے اُسے بتایا کہ وہ دو بھائی بہن تھے۔ بھائی (باغی) یعنی مجاہد بن گیا تھا اور ماں باپ بچپن میں مر چکے تھے، چاچی چاچا نے ان کو پالا تھا۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ یہ کوئی بڑا گاؤں نہ تھا، بس پندرہ بیس گھر تھے، جن میں سے دو تین کے سوا سب نقلِ مکانی کر چکے تھے۔ وہ لوگ بھائی کا انتظار کر رہے تھے کہ اسے بتا کر کہیں جائیں کہ اچانک بھارتیوں نے ان پر حملہ کر دیا، تب چاچی نے اُسے یہاں چھپا دیا اور خود چاچا کو بلانے لگی کہ اتنے میں سپاہیوں نے چاچی کو پکڑ لیا اور گھر کو آگ لگا دی۔ ان وحشی درندوں نے چاچا کو شہید کر دیا۔ یہ دیکھ کر چاچی نے بھی خود کو چھڑا کر آگ میں چھلانگ لگا دی۔ فوجی درندے قہقہے لگا رہے تھے۔ یہ سب وہ اِک روزن سے دیکھتے ہوئے بے ہوش ہو چکی تھی۔ جب وہ ہوش میں آئی تو اُسے ٹھنڈ اور بارش کی آواز محسوس ہوئی۔ اس نے روزن سے باہر جھانکا تو واقعی بارش برس رہی تھی اور آگ بجھ چکی تھی، شاید خدا کو نور بانو کو زندہ رکھنا تھا۔ تین چار دن تو اس نے گھڑے سے پانی پیا اور سوکھی روٹی کے ٹکڑوں پر گزارا کیا تھا، جو کہ وہ اپنے بھائی کے لیے پکا کر رکھتی تھی کہ وہ جب بھی آتا جلدی میں ہوتا تھا۔ اگر وہ نہ آتا تو دوسرے وقت وہ کھا لیتے تھے اور اُس کے لیے پھر تازہ پکا کر رکھتے تھے۔ یہ بھی محبت کا ایک خوب صورت طریقہ تھا۔ واقعی بھائی بہن، ماں باپ ایک نعمت ہوتے ہیں۔ اس کی باتیں سن کر کرشن کو اپنا گھر یاد آنے لگا تھا اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

آج ابھی وہ نور بانو کے پاس جانے کا سوچ رہا تھا کہ ورما سپاہی نے اس سے پوچھا۔

''یار یہ تو روزانہ کہاں جاتا ہے۔'' یہ سن کر کرشن اندر ہی اندر جیسے لرز سا گیا، لیکن پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''یار چھٹی کی درخواست دی ہے، اس لیے کچھ یاد آ جاتا تو وہ خریدنے کے لیے چلا جاتا ہوں۔ تم بھی چلو گے کیا۔''

''نہیں نہیں یار۔ مجھے کون سی چھٹی مل رہی ہے۔''

وہ ہنس کر جاتے ہوئے بولا۔ ''اب جو بھی کرنا ہے، خوب سوچ سمجھ کر کرنا ہے، کرشن خود سے مخاطب ہوا۔

''لگتا ہے دشمن ہوشیار ہو رہا ہے اور اب مجھے بھی چوکنا رہنا ہوگا۔''

اب کرشن دن رات نور بانو کو ہی سوچتا رہتا تھا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کی ہمدردی اب محبت میں تبدیل ہو چکی تھی۔

وہ تھی ہی اتنی پیاری، معصوم، کم سن۔ اُسے چاہنا

تو چاہنا، نور بانو کا کرشن کو ملنا ہی اس کی خوش قسمتی تھی۔ یہ سوچ کر وہ زیرِ لب مسکرا دیا اور آنکھوں میں اس کا معصوم چہرہ گھوم گیا۔ اب اصل کام جلد از جلد اُسے یہاں سے نکالنا تھا اور ایسی جگہ پہنچانا تھا جہاں وہ محفوظ بالکل ہو۔ اُس نے کافی سوچ بچار کے بعد آخر ایک منصوبہ بنالیا اور نور بانو سے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ تیار رہے۔ وہ کسی وقت بھی وہاں سے نکل سکتے ہیں اور پھر یہاں سے نکل کر آرام سے اس کے بھائی کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ کب تک یہاں رہ سکے گی؟ اگر کسی روز کسی بھارتی فوجی کے ہاتھ لگ گئی تو؟ اس سے آگے نور بانو سوچ کر کانپ جاتی۔ اللہ کے بھروسے پر اُس نے کرشن کی بات ماننے میں ہی بہتری سمجھی۔ اس نے کرشن کی بات مان لی اور کرشن نے اپنے بچپن کے دوست علی اکبر کا پتا اپنے پرانے کاغذوں، خطوں میں سے ڈھونڈ کر اُسے ایک خط لکھا اور کچھ احوال نور بانو کا بھی لکھ دیا اور خط پوسٹ کرنے کے بعد اب وہ بہت بے چینی سے جواب کا انتظار کر رہا تھا۔ بارہ دن گزر جانے کے بعد آخر خط کا جواب آ گیا۔ اکبر علی نے اُسے خوش آمدید کہا تھا۔ اُس نے وہ خط پڑھنے کے بعد جلا دیا اور خود جانے کی تیاری کرنے لگا۔

ٹھیک دو دن کے بعد وہ فوجی جیپ میں نور بانو کے ہمراہ تیزی کے ساتھ شہر کی طرف گامزن تھا۔ نور بانو بھی فوجی وردی میں رائفل ہاتھ میں لیے بیٹھی ہوئی تھی۔

نور بانو سوچ رہی تھی کہ اب قسمت اس کے ساتھ نہ معلوم کیا کرنے والی ہے۔ اب تک تو قسمت نے اس کے ساتھ جو کیا تھا وہ بُرا ہی ہوا تھا۔ اس کا پورا خاندان ختم ہو چکا تھا۔ بھائی نہ معلوم کہاں تھا، بس کرشن پر ہی اعتبار کر سکتی تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، شاید کہ سچ ہی ہو۔ ''اے خدا تو ہی میرا مددگار رہنا۔ آمین۔'' اس نے دل ہی دل میں دعا مانگی۔ گاڑی کو ایک جھٹکا لگا اور وہ رُک گئی۔ نور بانو کا دل ایک دم جیسے مٹھی میں آ گیا تھا۔

یا اللہ خیر، کوئی فوجی تھا۔ جس نے گاڑی کو رکوائی تھی، دور کچھ لائٹیں بھی جل رہی تھیں۔ کرشن نے اُس سے بات کرتے ہوئے اپنا سروس کارڈ دکھایا تو فوجی سپاہی اسے دیکھ کر پیچھے ہٹ گیا۔ جیپ پھر آگے کی طرف چل پڑی، ہر طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور کہیں کہیں نیچے اور کہیں اوپر پہاڑوں پر درختوں کی اوٹ میں روشنیاں نظر آ جاتی تھیں، ورنہ سناٹا ہی سناٹا تھا۔ اونچے اونچے پہاڑ تاریکی کا مہیب لبادہ اوڑھے کھڑے تھے۔ کرشن چھوٹی چھوٹی سڑکوں سے ہو کر آ رہا تھا تاکہ چیکنگ سے بچا جا سکے۔ یہ راستے اس نے دن کی روشنی میں خوب اچھی طرح سے دیکھ لیے تھے۔ ایک پہاڑی کے نیچے کچی سڑک پر کچھ دیر چلنے کے بعد اس نے گاڑی روک دی اور نور بانو کو ایک پوٹلی سیٹ کی پچھلی طرف سے نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

''یہ کپڑے ہیں پہن لو اور ان کپڑوں کو پوٹلی میں باندھ لو، جلدی کرو اب ہم بس میں سوار ہونے والے ہیں۔'' نور بانو سے یہ کہتے ہوئے وہ خود دوسری طرف چل دیا۔ نور بانو نے جیپ اور پہاڑی کی اوٹ میں جلدی سے کپڑے بدلے اور ساتھ ہی کچھ نقلی زیور بھی تھے، وہ بھی پہن لیے۔ وہ دل میں خوف بٹھائے اِدھر اُدھر بھی دیکھے جا رہی تھی۔ وہ اتنی خوف زدہ تھی کہ اس کا خوف سے دل لرز رہا تھا، جلدی جلدی کپڑے بدلنے کے بعد جیپ کو ہاتھ مارا تاکہ کرشن آ جائے۔ کرشن کو دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ اب وہ مکمل طور پر ایک سکھ عورت کے روپ میں تھی۔

''اندھیرے کے باوجود تم نے کپڑے، گہنے ٹھیک سے پہن لیے ہیں اور اب تم بہت پیاری لگ رہی ہو۔'' اس نے نور بانو کو گاڑی کی ہیڈ لائٹ کی روشنی میں دیکھتے ہوئے اس کے حسن کی تعریف کی۔ نور بانو مارے شرم کے سرخ ہو گئی تھی اور سرخی اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہی تھی، لیکن اب ایک بڑی مشکل گھڑی آن پڑی تھی، جیپ کو ٹھکانے لگانے کی۔ اس لیے وہ جلدی جلدی وہاں سے پیدل ہی ایک طرف چلنے لگا۔

''دیکھو نور بانو۔ گھبراؤ مت، میں جو بھی کہوں تم چپ رہنا اور اپنا چہرہ ڈھانکے رکھنا ہلکے گھونگھٹ کی طرح۔'' وہ اُسے سمجھا رہا تھا اور وہ تو ویسے ہی چپ تھی،

اس نے تو خود کو اپنے خدا کے حوالے کر دیا تھا۔ اب تک اس کی جان کے ساتھ عزت بھی سلامت تھی، جس کے لیے وہ خدا کا دل ہی دل میں شکر ادا کر رہی تھی۔ چلتے چلتے اب وہ بڑی پکی سڑک پر آ گئے تھے۔
''دعا کرو کہ جلدی ہمیں بس مل جائے۔'' کرشن نے اُس سے کہا اور چلتے چلتے ہی اُس نے کپڑے بدلنے شروع کر دیے۔ اندھیرے کی وجہ سے کچھ بھی صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ کرشن نے اُسے ایک دم رُکنے کو کہا اور خود ایک پیڑ کی اوٹ میں ہو گیا، چند منٹ بعد وہ فوجی کے بجائے ایک سکھ مرد کی صورت میں تھا۔ ہاتھ میں ایک لٹھ اور دوسرے ہاتھ سے اُس نے اس کی پوٹلی اور اپنے کپڑوں کو آگ لگا کر سڑک سے نیچے کھیت میں لٹھ سمیت دھکیل دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے سڑک کی دوسری جانب ہو کر بھاگنے لگا۔

نور بانو اس صورت حال میں بالکل بدحواس ہو رہی تھی۔ اس کا ہاتھ سختی سے اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ایک غیر مرد نے اس کا ہاتھ اس طرح پکڑا تھا، لیکن یہ اس کی مجبوری تھی۔ کرشن جلد از جلد اس جگہ سے دور نکل جانا چاہتا تھا اور پھر دس منٹ بھاگنے کے بعد وہ رُک گیا۔ کرشن کو تو زیادہ فرق نہیں پڑا تھا، لیکن نور بانو بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ کرشن نے اُسے پانی دیا جو کہ بوتل میں وہ ساتھ لائے تھے۔ دو گھونٹ پانی پی کر آہستہ آہستہ چند منٹ میں وہ نارمل ہو گئی اور اب وہ پھر چلنے لگے تھے اور چلتے چلتے ایک بڑے روڈ پر پہنچ ہی گئے اور جیسے ہی وہ روڈ پر چڑھے ایک بس تیار کھڑی تھی۔ وہ اس میں سوار ہو گئے۔

رات بھر کے سفر کے بعد وہ لوگ ممبئی پہنچ گئے۔ یہاں بہت گہما گہمی تھی۔ وہ حیران حیران سی تھی۔ نور بانو تو کبھی اپنے گاؤں سے باہر نکلی ہی نہ تھی۔ کرشن نے اُسے بتایا کہ یہ ممبئی شہر ہے اور پھر وہ ایک ٹیکسی میں سوار ہو کر اکبر علی کے گھر پہنچے۔ علی اکبر اور اس کے گھر والوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ نور بانو کو بھی کچھ تسلی ہوئی تھی۔ عورتوں اور بچوں کے درمیان آ کر۔ اکبر علی اور کرشن تو مردانے میں رکے ہوئے تھے، جب کہ وہ اندر عورتوں کے ساتھ تھی۔ اُس نے ہاتھ منہ دھویا، ناشتا کیا اور پھر اسے ایک کمرے میں آرام کرنے کے لیے کہا گیا۔ وہ جیسے ہی نرم بستر پر سوئی تو نیند نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا اور اسے کسی نے جگایا بھی نہیں۔
جب وہ اٹھی تو رات کا کھانا لگایا جا رہا تھا۔ سب عورتوں نے گھر اور مردوں نے بیٹھک میں کھانا کھایا، پھر کرشن نے کہلوایا کہ وہ نور بانو سے بات کرنا چاہتا ہے۔ کھانے کے بعد وہ بیٹھک میں گئی، وہاں صرف کرشن تھا۔ کرشن نے اُسے نئے کپڑے اور کچھ چیزیں دیتے ہوئے کہا کہ یہ تمہارے لیے ہیں۔ وہ بڑی حیران ہوئی، اس نے کہا۔ ''اب آپ بالکل فکرمند نہ ہوں میں کہیں نہیں جا رہا اور میں نے ایک ماہ کی چھٹی لے لی ہے۔ اب جو کچھ ہوگا، اس کے بعد دیکھا جائے گا۔'' نور بانو نے اطمینان کا سانس لیا۔ کرشن اُسے ہی دیکھ رہا تھا، نور بانو کے چہرے پر مسکراہٹ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ وہ نظروں ہی نظروں میں اس کے صدقے واری جا رہا تھا۔ اس کا پلکوں کو اٹھانا پھر جھکانا۔ کیا خوب ادا تھی۔
''اب میں جاؤں'' نور بانو بولی۔
''ہاں۔'' اُس نے گردن اِک سرشاری کی کیفیت میں ہلائی۔ دوسری صبح جب نور بانو نے نہا کر نئے کپڑے پہنے تو علی اکبر کی بہن ثریا نے اُسے ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
''بہت پیاری لگ رہی ہو تم، چشم بددور تمہارے لمبے، گھنے بال بہت خوب صورت ہیں۔''
اپنی تعریف سن کر نور بانو کے کان لال ہو گئے۔ علی اکبر کے گھر میں اس کی چھوٹی بہن، جو کہ اُس کی ہم عمر تھی اور ایک ماں، ایک بھابی، ان کے دو چھوٹے بچے تھے۔ بھائی کی دکان تھی، جس پر علی اکبر کا بھائی قاسم علی اور والد دونوں دن بھر ہوتے تھے اور رات گئے آتے تھے۔ بڑے سے صحن والا چار کمروں اور ایک بیٹھک سمیت پکا گھر تھا۔ یہ درمیانے درجے کی ایک خوشحال فیملی تھی۔ علی اکبر کی سول سروس تھی۔ نور بانو علی اکبر کی ماں کو اماں کہتی تھی اور وہ بھی اسے اپنی بیٹی کی طرح ہی چاہتی تھیں۔ سب گھر والوں نے اُسے گھر جیسا پیار دیا ہوا تھا، پھر تین چار دن بعد اماں مٹھائی کا ڈبا لیے ہوئے

اس کے پاس آ ئیں اور کہا۔
''مبارک ہو نور بانو کرشن سنگھ اب کرشن سنگھ نہیں رہا، بلکہ عبداللہ ہو گیا ہے۔ لو مٹھائی کھاؤ۔''
''کیا مطلب۔'' وہ سمجھتے ہوئے بولی۔
''بیٹی اس نے اسلام قبول کر لیا ہے اور یہ سب تمہاری بدولت ہوا ہے یہ نیک کام۔''
''اچھا۔ اُس نے مٹھائی لیتے ہوئے کہا اس کے دل میں خوشی اور چہرے پر حیرانگی تھی اور معصوم سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ مٹھائی کھانے لگی۔
''عبداللہ سے مل کر اُسے مبارک باد نہیں دو گی۔'' ثریا نے اُسے ٹوکا۔
''ہاں ہاں بیٹی تم اُسے ضرور مبارک باد دو۔ وہ بہت خوش ہو گا۔'' اور اس نے شرمگیں مسکراہٹ کے ساتھ...... ''ہاں'' میں گردن ہلائی اور پھر مغرب کی نماز کے بعد وہ بیٹھک میں عبداللہ کے روبرو تھی اور مہکتا پھولوں کا ہار اس کے گلے میں ڈالتے ہوئے وہ جھجک پڑی، لیکن اماں سامنے تھیں، اس لیے انہوں نے اس کی ہمت بندھائی۔ عبداللہ تو اس ہمت افزائی پر کھلا جا رہا تھا۔

نور بانو کے عشق میں تو اسے خدا سے لگاؤ ہوا تھا اور اُس نے نور بانو کے لیے اپنا آپ اپنی ہر چیز قربان کر دی تھی۔ اماں اُنہیں تنہا چھوڑ کر بیٹھک سے چلی گئیں۔ تب عبداللہ نے اُٹھ کر اس کے ہاتھ تھام لیے اور نور بانو نے جب حیا بار آنکھیں اٹھائیں تو اس کی آنکھوں میں بھی محبت کے سب رنگ تھے اور پھر چند دنوں کے بعد عبداللہ اور نور بانو کا نکاح تھا۔ اُسے مایوں بٹھایا گیا، مہندی لگائی گئی، محلے والوں کے ساتھ مل کر گیت گائے گئے، بالکل اپنی بیٹی کی طرح اور نور بانو کو اماں نے جہیز کے ساتھ وداع کیا۔

نور بانو اس روز اپنے گھر والوں کو یاد کر کے خوب روئی اور اسی محلے کے ایک گھر میں جو کہ کرائے پر لیا گیا تھا، وہ رخصت ہو کر وہاں آ گئی۔ عبداللہ نے اُسے بہت پیار اور بڑی محبت دی۔ نور بانو سوچ رہی تھی کہ اس سے تو تقدیر نے سب کچھ چھین لیا، لیکن عبداللہ نے تو اس کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑ دیا۔ اس کی قسمت میں عزت بھری زندگی آ ئی، ورنہ جب وہ دیگر لڑکیوں کے بارے میں سوچتی تو اس کی ہمت جواب دے جاتی۔ وہ سجدۂ شکر ادا کرتی کہ قدرت نے اس پر اپنی خاص مہربانی کی ہے اور اسے ساری مشکلات سے نکال اتنا محبت کرنے والا شوہر دیا ہے۔ عبداللہ میں اس کی جان تھی، کیوں کہ وہ بھارت کا ایک بھگوڑا فوجی تھا، اس لیے اُسے ممبئی میں بھی بڑا خطرہ تھا۔ اس لیے بابا صاحب (علی اکبر کے والد) کے صلاح مشورے سے وہ اپنی نئی شناخت کے ساتھ بحیثیت مسلمان آزاد کشمیر کے ایک گاؤں میں، جہاں بابا صاحب کے کچھ جاننے والے تھے، ان کے ساتھ محلے میں رہنے لگا۔ یہاں نور بانو کو اپنے جیسے لٹے پٹے بہت سے خاندان ملے، یوں وہ جیسے اپنوں کے درمیان تھی، عبداللہ نے اپنے کام کے ساتھ اس کے بھائی کی بھی تلاش شروع کر دی تھی۔ اندر ہی اندر وہ مجاہدوں سے مل گیا تھا۔ ٹریننگ کے دوران اس نے کشمیری نوجوانوں کا جذبۂ آزادی دیکھا کہ وہ سب شمع آزادی کے پروانے جان ہتھیلی پر لیے ہوئے تھے۔ جب سب مل کر نعرۂ تکبیر پڑھتے تو دل چھوٹے بچے کی طرح ہمک ہمک جاتا اور ان کے دلوں میں شوقِ شہادت اور بھی بڑھ جاتا۔ جب دل میں سچی لگن اور تڑپ ہو تو منزل بھی قریب محسوس ہوتی ہے۔ مجاہدین کا جذبۂ شہادت دیکھ کر عبداللہ کا دل بھی شوقِ شہادت سے بھر بھر جاتا۔ جذبۂ آزادی اور پھر بھارتی فوجوں کے ظلم وستم نے ان کے جوش ولولے کو اور بھی تیز کر دیا تھا اور وہ سب وطن کی آزادی کے جان نثار پروانے بن چکے تھے۔ بہت سے مشن ان کے ساتھ مل کر عبداللہ نے بھی انجام دیے تھے اور ہر مشن کی تکمیل کے بعد اُسے ایک عجیب قسم کی خوشی محسوس ہوتی تھی۔ چار سال ہو چکے تھے اُسے کشمیر میں۔ اس کے اور نور بانو کے اب دو بیٹے بھی ان کے گلشن کی رونق تھے، جب وہ گھر جاتا تو وہ دوڑ کر اُس سے لپٹ جاتے، نور بانو نے نواب بھائی کا آسرا تک چھوڑ دیا تھا۔ پہلے وہ عبداللہ سے اکثر پوچھتی تھی، لیکن اب اس نے یہ آس بھی چھوڑ دی تھی، کیوں کہ عبداللہ کی خاموشی اُسے سب کچھ بتا دیتی تھی۔

وہ دن عید سے کم نہیں ہوتا تھا جس روز عبداللہ گھر پر ہوتا اور نور بانو اور بچوں کو وہ گھمانے پھرانے کے لیے لے جاتا اور جب وہ کسی محاذ پر جاتا تو نور بانو خدا سے اس کی اور اپنے گم شدہ بھائی کی سلامتی کی دعائیں مانگتی تھی اور ساتھ ہی اپنے سہاگ کی جدائی کی لمبی راتیں بے چینی سے گزارتی تھی۔ انہی بے چین راتوں اور دنوں میں ایک خوش قسمت دن بھی آ گیا، جب عبداللہ نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے اُسے آواز دی، تو وہ تو خوشی سے لپک کر کمرے سے باہر نکلی تو عبداللہ نے ایک طرف ہوتے ہوئے خوشی سے کہا۔

''دیکھو...... نور کون آیا ہے۔'' سالوں کی گرد بھی اُس کے چہرے کو نہ چھپا سکی تھی، جس پر گھنی داڑھی مونچھوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔

''بھائی جان......'' نور کے کپکپاتے ہونٹوں سے ایک دم نکلا اور وہ دوڑ کر اپنے بھائی سے لپٹ گئی۔ دونوں خوشی سے روتے ہوئے ایک دوسرے کو چوم رہے تھے۔ عجیب رقت آمیز منظر تھا، پھر چار دن اس کا بھائی اور عبداللہ گھر میں رہے۔ اس نے اپنے اور عبداللہ کے حالات اُسے بتائے اور جی جان سے بھائی کی خدمت کی۔ بھائی بہت دبلا ہو گیا تھا...... چھ ماہ سے وہ اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ دشمنوں کی قید میں تھا۔ یہ تو اچانک مجاہدین کے حملے میں انہیں بھارتیوں کے چنگل سے نجات مل گئی۔ دو روز وہ طبی کیمپ میں رہے، وہیں عبداللہ زخمیوں کی خدمت کرتے ہوئے اس سے ملا۔ نور بانو سے مشابہت کے سبب اسے پہچان گیا اور جب اس کے گاؤں اور پھر نور بانو کا نام لیا تب عبدالرحمٰن نے اُسے کچھ حالات بتائے اور کچھ عبداللہ نے اُسے اپنے متعلق بتایا، پھر وہ نور بانو سے ملنے آیا کہ بہن کی محبت نے اس کے دل میں ایک تڑپ پیدا کر دی تھی۔ من میں اس بات کی خوشی تھی کہ بہن زندہ سلامت ہے اور گھر باروالی بھی۔

نور بانو کا دل ابھی بھائی کی محبت سے بھرا بھی نہ تھا کہ دونوں نے رخصت چاہی، تو اس کی آنکھوں سے آنسو بے اختیار بہنے لگے۔

''بہنا...... رومت ہمیں خوشی خوشی وداع کر اور وطن کی آزادی کی دعا کیا کر۔ کشمیر کی خواتین و بچے کس عذاب سے گزر رہے ہیں تجھے تو معلوم ہے نا...... دعا کر، اگر میں شہید ہو جاؤں تب خدا تجھے اور تیرے بچوں کو آزادی کے دن دکھائے۔ آمین۔'' سب نے مل کر کہا اور نور بانو نے تڑپ کر بھائی کو گلے سے لگا لیا۔

''خدا کرے بھائی جان آپ بھی آزادی کی صبح دیکھیں، آمین۔'' پھر سب نے کہا اور بھیگی آنکھوں سے ان کو رخصت کیا۔ عبدالرحمٰن نے بچوں کو پیار کیا اور عبداللہ کے ہاتھ چومتے کہا۔

''میں تمہارا بہت احسان مند ہوں کہ تم نے میری نور کو عزت دی، گھر دیا، پیار دیا۔'' عبداللہ نے اُسے گلے سے لگایا اور پھر دونوں محاذ پر روانہ ہوئے۔ نور انہیں اس وقت تک دیکھتی رہی، جب تک وہ آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گئے۔

گاؤں میں سب مل جل کر رہتے تھے۔ ان کا چھوٹا موٹا کاروبار تھا، کچھ مویشی وغیرہ پال رکھے تھے، جن سے دل راوٹی چل رہی تھی، ایک دن نور بانو برتن دھو کر ٹوکری میں ڈال کر اندر باورچی خانے میں رکھنے جا رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''خدا خیر کرے'' آج صبح سے دل کی دعاؤں میں شدت آ گئی تھی۔ عجیب اُداسی دل پر چھا رہی تھی، نور بانو نے رک کر دروازے کی طرف دیکھا اور کمر پر ٹوکری دھرے دھرے ہی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ ایک مجاہد نے آگے بڑھ کر سلام کرتے ہوئے کہا۔

''محترمہ۔ آپ کے شوہر اور بھائی دونوں نے جام شہادت نوش کر لیا ہے...... وہ وطن کے عظیم سپوت تھے، انہوں نے وطن کی آزادی کے لیے اپنی جان نثار کر دی ہے۔'' یہ سنتے ہی نور بانو کے برتن چھوٹ کر بکھر چکے تھے اور وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ روشن راہوں کے مسافر اپنی منزل پر پہنچ کر زندہ و جاوید ہو چکے تھے۔

☆......☆

دوسرا شعلہ

نئی قبر

ایس امتیاز احمد

ایک گورکن کی عبرت خیز کہانی جس نے اپنی محبوبہ کو......

''اسے قبر بنانے کا شوق تھا۔ایسی قبریں جنہیں دیکھ کر لوگوں کو مرنے کی آرزو ہو۔''

مردہ خوب صورت ہونے کی شکل میں اس کا جی



کھل اٹھتا تھا۔نہلاتے وقت وہ مولوی صاحب سے بھی بڑھ چڑھ کر سرگرمی دکھاتا، پھر اسے اپنے ہاتھوں پہ اٹھا کر قبر میں اتارتا اور بڑی احتیاط سے اینٹیں چنتا، مٹی ڈالتے وقت لوگوں کو اس سے زیادہ اجازت نہ ہوتی تھی کہ وہ مٹی کی تین مٹھی بھر کی قبر کی طرف اُچھال لیں۔اس کی بڑی بڑی انگلیاں فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ مٹی سے کھیلتیں اور دیکھتے ہی دیکھتے قبر سانچے میں ڈھالی ہوئی معلوم ہونے لگتی۔

وہ گورکن تھا اور ہوش سنبھالتے ہی اس نے قبر بنانا سیکھ لیا تھا۔اسے قبر بنانے کا شوق تھا۔خوب صورت اور دلکش قبریں، ایسی قبریں جنہیں دیکھ کر لوگوں کو مرنے کی آرزو ہو۔

کبھی کبھار وہ نمونے میں تبدیلی بھی کر دیا کرتا تھا، تاہم ایسا بہت کم ہوا تھا۔بچپن سے لے کر اب تک صرف دو بار ایسا ہوسکا تھا کہ ایک قبر اس کے باپ کی تھی اور دوسری اس بڑھیا کی جو صائمہ کی ماں تھی۔پوری دنیا میں اسے دو چیزوں سے عشق تھا، قبر اور صائمہ سے۔

وہ اپنی جھونپڑی میں اکثر چھوٹی چھوٹی قبریں بنایا کرتا تھا، جنہیں بار بار بنانے اور مٹانے سے ہر طرف مٹی بکھری رہتی تھی۔لوگ اسے پاگل کہتے تھے اور اس کا

مذاق اُڑاتے تھے، تاہم اس نے کبھی بھی کسی کی پروا نہیں کی تھی۔ وہ ہر شے سے بے نیاز اپنے کام میں مشغول رہتا تھا۔ اس پوری کائنات میں اگر اسے کسی کی پروا تھی تو وہ صائمہ کی تھی جو کبھی بھی اس پہ نہیں ہنسی تھی۔ اگرچہ آغاز میں اسے یہ قبروں کا سلسلہ بڑا ہولناک لگا تھا اور وہ اس فراخ پیشانی اور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں والے آدمی کی طرف حیران نظروں سے تکتی رہتی تھی جو قبروں کے بارے میں کمال مسرت اور دلچسپی سے باتیں کرتا تھا، آخر کار اس کا خوف بھی آہستہ آہستہ دور ہو گیا تھا اور وہ اس کی باتوں میں دلچسپی لینے لگی تھی۔

انہیں آپس میں ملتے پانچ سال ہو گئے تھے اور اس پانچ سال کے عرصے میں ایک رات بھی ایسی نہیں آئی تھی، جب صائمہ اس کی جھونپڑی میں نہ آئی ہو۔

وہ آج بھی ہمیشہ کی طرح اسے جھونپڑی سے باہر ہی آملا تھا اور اس سے لپٹ گیا تھا۔ پل بھر کے توقف کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔

"جب میں تھکن سے چور ہو جاتا ہوں تو میرے اندر تمہیں دیکھنے کی خواہش کتنی شدید ہو جاتی ہے۔" اس نے صائمہ کی آنکھوں میں جھانکا۔

"کیا تم جانتی ہو؟" وہ اس کے رخساروں پر جھک گیا۔ صائمہ چادر کی بکل میں ذرا کسمسائی۔ اس نے شاہد کی تیز تیز سانسوں کو چہرے پر محسوس کیا، پھر اس نے سرگوشی کی۔

"میں آ تو گئی ہوں، پھر تم ایسا کیوں سوچتے ہو۔" اس کے لہجے میں دُکھ کی چاشنی تھی۔ شاہد نے اسے اپنے سینے کے ساتھ چمٹائے رکھا اور اس کے بالوں کی خوشبو اپنے پھیپھڑوں میں بھرتا رہا۔ ذرا دیر کے بعد وہ جھونپڑی میں چلے گئے، زنگ آلود لالٹین کی دھیمی دھیمی روشنی میں ہر شے دھندلائی ہوئی تھی، جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی چمنی کو کاغذ کے ساتھ جوڑا ہوا تھا اور جھونپڑی کے دائیں کونے میں بوسیدہ سا ٹرنک پڑا تھا، جس کے رنگ کی جگہ زنگ نے لے لی تھی۔ اس کے ساتھ ہی چارپائی بچھی ہوئی تھی، دیوار پر دو کیلیں ٹھکی ہوئی تھیں۔ ایک پر قمیص اور دوسری پر لالٹین لٹکا دی گئی تھی۔ دیوار کا وہ حصہ جہاں لالٹین ٹنگی ہوئی تھی، کالا ہو چکا تھا، جھونپڑی کے کچے فرش پر متعدد جگہ چھوٹے چھوٹے گڑھے تھے اور مٹی بکھری ہوئی تھی۔

صائمہ چارپائی پر بیٹھ چکی تھی، اس نے ٹانگیں نیچے لٹکائی ہوئی تھیں، جنہیں اب وہ ہولے ہولے ہلا رہی تھی، اس نے ہاتھ کی ہتھیلی پر ٹھوڑی جمائی تھی اور اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی طویل اور خمیدہ پلکوں کو بار بار جھپک رہی تھی۔ اس کی بکل ڈھیلی ہو گئی تھی اور دوپٹا سر سے ڈھلک گیا تھا۔

"صائمہ!" شاہد نے اسے ٹہوکا دیا۔

صائمہ نے جواباً اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اوپر اٹھادیں۔ اس کی مسکراہٹ کا عکس اس کی آنکھوں سے بھی جھلک رہا تھا۔ "ہم نے جو قبروں کے گرد پھول لگائے تھے نا، وہ کھل گئے ہیں۔ کیا تم دیکھو گی؟"

"ہاں۔" صائمہ نے بکل کو درست کرتے ہوئے کہا۔ "اگر تم کہو گے تو میں ضرور دیکھوں گی۔"

وہ دونوں جھونپڑی سے باہر نکل آئے۔ شاہد اسے قبروں کے اس حصے کی طرف لے آیا تھا جہاں انہوں نے پھول لگائے تھے اور جنہیں ہر روز وہ پانی دیا کرتے تھے۔ بھینی بھینی خوشبو اب ان کے نتھنوں میں محسوس ہونے لگی تھی۔ ذرا دیر کے لیے وہ بے خود سے ہو گئے تھے۔ کسی نے کسی سے بات نہیں کی، آخرکار صائمہ نے سکوت کو توڑا۔

"میرا جی خوشی سے پھولوں ایسا ہو رہا ہے۔" اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔

"تم دیکھ لینا۔" شاہد نے کہا۔ اس کی آواز بھاری ہو گئی تھی اور وہ اس وقت بڑا ہی جذباتی ہو رہا تھا۔ میں اسے باغ سے زیادہ خوب صورت بنادوں گا۔ لوگ یہاں دفن ہونا قابل فخر تصور کریں گے۔ اس کے ہونٹ کپکپانے لگے تھے۔

"کیا میں ایک پھول توڑوں۔" صائمہ نے پوچھا۔ وہ چہکنے لگی تھی۔

"نہیں نہیں۔" ایکا ایکی وہ گھبرا گیا۔ اس نے عجیب طریقے سے ہاتھ کو جھٹکا۔ اس کی آنکھوں سے نہ معلوم خوف جھانکنے لگا تھا اور اس کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔

"تم ایسا نہ کروگی۔" وہ ایک لمحے کے لیے رک گیا، تاہم اس نے جملہ مکمل کرنے میں دیر نہیں کی۔

''تم نہیں جانتیں یہ سب۔'' اس نے قبرستان کا احاطہ کیا۔

''یہ سب کچھ مجھے کس قدر عزیز ہے۔'' پھر وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے پھولوں پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

''پھول تو دیکھنے کے لیے ہوتے ہیں نا۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ اس کا لہجہ بالکل کسی خوف زدہ بچے کی طرح تھا، تاہم اس کا رنگ جو ذرا دیر پہلے زرد ہو گیا تھا۔ اب معمول پر آ چکا تھا۔ وہ ذرا دیر تک بیٹھا رہا۔ اس کی طبیعت آہستہ آہستہ اعتدال پر آ رہی تھی۔ آخر کار وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے صائمہ کو بازو سے پکڑ لیا۔ وہ جھونپڑی کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ چپ چاپ چل رہے تھے اور ان کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ ایکا ایکی وہ رک گیا۔ اس کی نظریں داہنی جانب والی قبر پر رک گئی تھیں۔

صائمہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کیا ہوا؟''

اس نے فوراً جواب نہیں دیا۔ ذرا دیر کے لیے وہ ہونٹ کاٹتا رہا۔

''یہ قبر بیٹھ گئی ہے۔'' اس نے ایک پرانی قبر کی طرف اشارہ کیا۔

''تو اس قدر گھبرانے کی کیا بات ہے؟''

اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا اور آنکھیں ابلنے لگیں...... ''گھبرانے کی بات نہیں'' اس نے دہرایا۔ تمہارے لیے اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ وہ بیٹھ گیا۔ ایک بنائی ہوئی قبر کا بیٹھ جانا کیا معنی رکھتا ہے، اسے صرف میں ہی سمجھ سکتا ہوں۔ اس نے ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔ اس کے چہرے پر کرب کی بہت ہی تیز لہر دوڑ گئی۔

''اس کا مطلب ہے۔'' وہ رک گیا۔ اس نے وحشت کے ساتھ ادھر اُدھر دیکھا۔ ''میں اناڑی ہوں۔''

اس نے بڑی ہی تکلیف کے ساتھ یہ جملہ ادا کیا۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی اور اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے قبر کو ٹٹولا...... پھر وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر سختی سی آ گئی تھی۔ میں اسے ابھی درست کروں گا۔ کل سے پہلے ملاقات کی کوئی صورت نہیں ہو سکے گی، اس نے جواب کا انتظار نہیں کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا جھونپڑی کی طرف چلا گیا۔

صائمہ جواب تک بت کی طرح ساکت و جامد تھی، اسے دیکھتی رہی۔ وہ یکا یک اپنے آپ کو اُداس محسوس کرنے لگی تھی۔ اس نے جھونپڑی کی طرف دیکھا۔ اپنی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں سے، ان آنکھوں سے جن کی چمک ایک ہی لمحے میں گم ہو گئی تھی اور جن میں اُداسی اور ویرانی رات کی سیاہی کی طرح آپ ہی آپ امڈتی چلی آ رہی تھی، پھر وہ تھکے تھکے قدموں سے گاؤں جانے والی پگڈنڈی پر چلنے لگی۔

شاہد جلد ہی واپس آ گیا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ قبر کے سرہانے اس نے کدال اور کھرپا رکھ دیا۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ اس نے سوچا۔ یہ جو خواہش تھی اپنے کام میں کمال حاصل کرنے کی جس کے لیے میں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی، آخر اس سب کا کیا بنا؟ کچھ بھی نہیں۔ اس نے تاسف کے ساتھ سر ہلایا اور بڑے ہی دکھ کے ساتھ سوچا۔ میں نے محض اپنا وقت برباد کیا ہے۔ اس نے کھرپا اٹھالیا اور ہولے ہولے مٹی اکھاڑنے لگا، تو کیا میں اسے خیرآباد کہہ دوں؟ اس نے سوچا۔

''نہیں نہیں۔'' اس کا دل تڑپنے لگا، یہ نہ ہو سکے گا اور کبھی ایسا ہو گیا تو اس کے لیے بہت بڑے طوفان کی ضرورت ہوگی۔ تاہم ناکامی کا کربناک احساس اسے ڈس رہا تھا۔ آخری تاریخوں کا چاند مشرقی افق سے ہولے ہولے جنم لے رہا تھا۔ وہ سرخ تھا اور اس میں روشنی نام کو بھی نہ تھی۔

شاہد بڑا اُداس اور پژمردہ لگ رہا تھا، اس نے شام تک قبر کو صاف کر دیا تھا۔ قبر کو بند کرنے والی اینٹیں ٹوٹ چکی تھیں۔ وہ ایک دم مسرت سے کھل اٹھا تو اس میں میرا گناہ نہیں ہے۔ ذرا دیر کے لیے اس خوشی سے جو اسے خلاف توقع ملی تھی، ہاتھ پیر پھول گئے۔ کافی دیر وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔ آخر جب اس کی طبیعت اعتدال پر آئی تو اس نے فوراً ہی قبر کو مٹی سے برابر کر دیا، پھر اس نے کھرپے کی پشت سے تھپکیاں دے کر قبر کے کونے نکالے۔ اب اس کا روپ نکھر آیا ہے۔ وہ بڑبڑایا، پھر اس نے انگوٹھے کے ساتھ پسینہ پونچھا اور اوزار اٹھا کر جھونپڑی میں آ گیا۔ مسکراہٹ سے اس کے ہونٹ پھیلے

ہوئے تھے۔ اس نے اوزاروں کو دھوکر سرسوں کا تیل لگایا، اس کا مزاج بڑا خوش گوار ہوگیا تھا اور غم کی گھٹاؤں سے جو تاریکی اس نے اپنی روح پر چھائی ہوئی محسوس کی تھی، مسرت کے نور میں دم توڑ گئی تھی۔ وہ چارپائی پر دراز ہوگیا۔ اس کا جسم دکھ رہا تھا، تاہم وہ خود کو بڑا ہی ہلکا محسوس کرنے لگا تھا۔

اگلے دن وہ کافی دیر تک سوتا رہا، جب وہ اٹھا تو سورج کافی بلندی پر پہنچ چکا تھا۔ اس روز وہ سارا دن قبروں کے درمیان سے گھاس کھودتا رہا۔ شام کے وقت وہ نہا کر جھونپڑی میں آ گیا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ اپنے نئے ڈیزائن کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔

ان دنوں وہ ایک نئی قبر بنانے کی فکر میں تھا۔ کافی دنوں سے اس کے ذہن میں ایک ڈھانچہ سا ابھر رہا تھا، بلکہ اب تو کافی حد تک مکمل ہوگیا تھا، اس نے ایک بار صائمہ سے دعویٰ بھی کیا تھا اور وہ اس وقت بڑا جذباتی ہو رہا تھا۔

''تم دیکھ لینا ایسی قبر ساری دنیا میں نہیں ملے گی۔ میں اسے اپنے خون سے سینچوں گا۔'' اس نے دونوں ہاتھ کمر پر باندھ لیے تھے اور جھونپڑی میں ٹہلنے لگا تھا، اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آ گئی تھی۔

''تو وقت آ گیا ہے کہ اسے شروع کر دیا جائے۔'' اس نے چارپائی پر لیٹے لیٹے سوچا اور اب اس محبوبہ کو، جسے ہر روز میں تصور کی آنکھ سے دیکھتا ہوں، میرے ہاتھوں زمین کے اس ٹکڑے پر جنم لینا ہوگا، جو مدت سے اس کا منتظر ہے میں اسے کل ہی شروع کر دوں گا، مجھے اپنا آپ پھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا ہے۔ وہ اُٹھ کر جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ اس کے رخسار تمتمانے لگے تھے اور ہاں میں اسے کل ہی شروع کر دوں گا۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔

پھر وہ چلتا ہوا اس جگہ تک گیا جہاں اس شاہکار کے لیے عرصے سے پڑی ہوئی تھی، یہ جگہ بقول اس کے پورے قبرستان میں جنت کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہاں چھوٹے سے قطعے کو لمبے اور گھنے درختوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا اور زمین پر گھاس اُگ آئی تھی جو بڑی دلکش لگتی تھی۔ اس نے نرم نرم گھاس پر ہاتھ پھیرا جس پر اوس کے موتی پڑے ہوئے تھے، اس پر قبر کے نشانات لگائے اور واپس آ گیا۔ جھونپڑی کے وسط میں کھانا رکھا ہوا تھا جو کوئی اس کی غیر موجودگی میں رکھ گیا تھا۔ اس نے کھانا کھا کر برتن کونے میں رکھ دیے اور دوبارہ لیٹ گیا۔ وہ اپنے اس شاہکار کے بارے میں سوچنا چاہتا تھا۔ کافی دیر کے بعد وہ جب اس سوچ کے سمندر سے نکلا تو رات بھیگ چکی تھی اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ اس نے قبرستان کے درختوں کو سانس لیتے ہوئے محسوس کیا۔ اس نے اُٹھ کر پانی پیا، پھر وہ جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ اس نے ستاروں کی مدد سے جان لیا تھا کہ صائمہ کو دیر ہوگئی ہے۔

''وہ کہیں ناراض نہ ہوگئی ہو۔'' ایک لمحے کے لیے اس نے سوچا۔ ''آخر مجھے اس طرح الوداع کہنے کا کیا حق تھا۔''

وہ قبروں کے درمیان سے ہوکر گزرنے والی پگڈنڈی پر گاؤں کی طرف چلنے لگا، تاہم اس نے قبرستان کی حد عبور نہیں کی، اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے سر اٹھانے لگے تھے اور وہ دل جو ابھی ابھی مسرت کے نغمے گا رہا تھا اب ہلکے ہلکے اضطراب سے دوچار ہونے لگا تھا بے چینی اور انتظار کی شدید کوفت کو اس نے پہلی بار محسوس کیا، وہ اس پگڈنڈی پر دیر تک چکر لگاتا رہا۔ جب کافی دیر گزر گئی تو ستاروں کی دھیمی دھیمی روشنی میں ایک سایہ ابھرا جو بغل میں لپٹا لپٹایا جھونپڑی کی طرف بڑھنے لگا۔

آج اس نے صائمہ کو کافی فاصلے پر ہی جا لیا تھا، وہ ذرا دیر تک چپ چاپ کھڑے رہے، آخر شاہد نے ہاتھ تھام لیا اور وہ دھیرے دھیرے چلنے لگے۔ ابھی تک شاہد نے لالٹین نہیں جلائی تھی۔

''کس قدر اندھیرا ہے۔'' صائمہ نے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

''جب تم نہیں آتی ہو تو یہاں کی ہر شے اجالے کی کرن تک کو ترس جاتی ہے، میرا دل ڈوبنے لگتا ہے اور کوئی بھی شے مجھے اچھی نہیں لگتی۔''

شاہد نے لالٹین جلا دی اور کمرے میں دھیمی دھیمی روشنی پھیل گئی، صائمہ ابھی تک کھڑی تھی۔ اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں......!

''یہاں میرے پاس آؤ نا۔'' شاہد نے چارپائی پر

ہاتھ سے جگہ بنائی۔ صائمہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔
''کیا تم ناراض ہو گئی ہو؟''
اس نے پلکیں اٹھائیں اور شاہد کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''میں تم سے ناراض نہیں ہو سکتی۔'' اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔ وہ مسکرائی اور اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔ شاہد نے اپنی طرف کھینچا، وہ اس کی چھاتی پر ڈھے سی گئی، وہ سہمی ہوئی چڑیا کی طرح چمٹ گئی تھی۔
''جب تم دیر سے آتی ہو تو میری روح پھڑ پھڑانے لگتی ہے۔ میرا جی کسی کام میں نہیں لگتا۔ ہر شے مجھے تنہائی کا احساس دلاتی ہے۔'' اس نے صائمہ کے بالوں کو چوما۔
''میرا بھی تو جی نہیں لگتا۔'' وہ اُداس ہو گئی تھی اور اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا، اس کی آواز دھیمی مگر غمگین تھی۔
''سارا دن دل بجھا بجھا سا رہتا ہے اور ہر چیز کو اس طرح کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہوں، جیسے کچھ کھو گیا ہے۔'' اس کی طویل اور خمیدہ پلکیں بھیگ گئیں۔ اس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا۔ اس کی ٹھوڑی پر ننھے ننھے گڑھے پڑ گئے تھے اور اپنی آنکھوں کو اس نے بڑے ہی کرب کے ساتھ بند کر لیا تھا۔
''میں نہیں جانتی میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔'' وہ اس کی گود میں گر گئی اور سسکنے لگی۔
''تم رویا نہ کرو۔'' اس نے صائمہ کا چہرہ جو آگ کی طرح دہک رہا تھا ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ ''تمہارے آنسو مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتے۔'' شاہد نے اس کی آنکھوں رخساروں اور لرزتے ہوئے ہونٹوں کو چوما، پھر اس نے صائمہ کی آنکھوں میں جھانکا جو سرخ ہو گئی تھیں اور پپوٹے معمول سے بھاری تھے، شاید وہ رات بھر نہیں سوئی تھی۔ باہر ہوا تیز ہو گئی اور درختوں کے پتے بری طرح کھڑ کھڑانے لگے تھے۔ وہ کافی دیر تک اسی طرح بیٹھے رہے، جب کافی وقت گزر گیا تو وہ پھول دیکھنے قبروں کی طرف چلے گئے۔
آٹھ دن کی مسلسل جدوجہد کے بعد اس نے قبر مکمل کر لی تھی۔ اس کا جسم شل ہو گیا تھا اور مضبوط ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے تھے، تاہم وہ بے پناہ مسرت سے دوچار ہوا تھا۔

اس نے قبر پر اس طریقے سے پھول لگائے تھے کہ قبر پھولوں سے گندھی ہوئی معلوم ہوتی تھی، اس نے پھولوں کے پودے اوپر سے نیچے کی طرف لگائے تھے اور ان کا درمیانہ فاصلہ نصف انچ سے زیادہ نہیں تھا۔ اس طرح پھولوں کے ڈنٹھل نظر نہیں آتے تھے اور پھول پہ پھول چڑھ گئے تھے، یوں لگتا تھا جیسے پھولوں کی چادر بچھا دی گئی ہو۔ یہ سلسلہ ابھی ایک طرف ہی ہوا تھا، کیوں کہ نیچے کی طرف سے قبر کھلی تھی، تاہم اس نے زمین پر پھول لگا دیے تھے تاکہ ضرورت کے وقت پھول تیار ہو چکے ہوں۔ اس کے علاوہ ذرا ذرا سے فاصلے پر انار اور بادام کے درخت لگا دیے گئے تھے، جنہوں نے قبر کا چاروں طرف سے احاطہ کر لیا تھا۔ درخت کافی بڑے تھے اور وہ انہیں شہر سے خرید کر لایا تھا۔ ان چیزوں کو خریدنے کے لیے اس نے کپڑوں کا اکلوتا اور نیا جوڑا مع ٹرنک کے فروخت کر دیا تھا۔ وہ بے حد خوش تھا، ایسی خوشی اور ایسا اطمینان اس نے زندگی میں پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا، اس کے ہونٹوں سے ایک پنجابی شعر غیر اختیاری طور پر پھوٹ پڑا، پھر اپنے جسم کو بے معنی انداز میں حرکت دی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ناچے، لیکن اپنی اس خواہش کو وہ عملی جامہ پہنا نہیں سکا۔ اس نے جھونپڑی اور قبر تک کئی چکر لگا ڈالے۔ وہ صائمہ کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اسے اپنا شاہکار دکھانا چاہتا تھا جس کے لیے وہ عرصے سے تڑپ رہا تھا، آخر جب اسے صائمہ دکھائی دی تو اس نے دور ہی سے پکار کر کہا۔
''میں نے وہ قبر مکمل کر لی ہے۔''
اس نے مزید گفتگو کے بغیر ہی اس کا رُخ قبر کی جانب پھیر دیا۔ صائمہ اس کے پیچھے چلنے لگی تھی۔ اس نے خلاف معمول صرف دوپٹا ہی اوڑھ رکھا تھا، اس کی کمر پتلی اور خمیدہ تھی۔ جس سے چلتے وقت اس کے دونوں حصے الگ الگ چلتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔
صائمہ اسے دیکھ کر واقعی مسحور ہو گئی تھی۔ بادام اور انار کے درختوں پر کلیاں کھل رہی تھیں۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو فضا میں پھیل رہی تھی۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی اور آس پاس کی ہر شے کو ٹکر ٹکر دیکھے جا رہی تھی۔
شاہد بڑا جذباتی ہو رہا تھا، اس کا سانس تیزی سے

چل رہا تھا۔ وہ کافی دیر تک قبر کی تعریف میں تقریر کرتا رہا، آخر کار وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''میں رات یہیں گزارنا چاہوں گا تم یہیں ٹھہرو۔''

اس نے جواب کا انتظار نہیں کیا اور جھونپڑی کی طرف بھاگ گیا۔

صائمہ کھڑی تھی اور سدا بہار پھولوں کی خوشبو سے لطف اندوز ہو رہی تھی، ذرا ہی دیر کے بعد شاہد بھی آ گیا۔ اس نے چارپائی اٹھا رکھی تھی۔ اس نے قبر سے ہٹ کر پھولوں کی کیاریوں کے بالکل ساتھ چارپائی بچھادی۔ وہ دونوں چارپائی پر بیٹھ گئے۔

''یہ ابھی مکمل نہیں ہے، بہرحال جلد ہو ہی جائے گی۔'' اس کا تنفس ابھی تک غیر متوازن تھا۔ وہ صائمہ کے قریب ہی لیٹ گیا۔ میں تھک گیا ہوں۔ اس نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

صائمہ قبر کی تعریف میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے اور کیسے کہے۔ اس کی آنکھیں اضطرابی انداز میں گردش کر رہی تھیں۔ وہ اپنا ہونٹ کاٹنے لگی تھی اور اس کی انگلیاں بھی ایک دوسری میں الجھ گئیں تھیں۔ ایکا ایکی گاؤں سے چیخنے اور چلانے کی آوازیں بلند ہوئیں۔ رات کے سناٹے کو عورتوں کے بین جھنجھوڑ رہے تھے اور فضا ہولناک شور سے لرز اٹھی تھی۔

''مجھے جانے دو ہمارا پڑوسی فوت ہو گیا ہے۔'' وہ تڑپ کر اٹھی اور پگڈنڈی پر بگٹٹ بھاگنے لگی۔

''تو کیا یہ مکمل ہو گئی؟'' اس نے اپنے شاہکار کے بارے میں سوچا۔ آج ہی رات اس پر آخری پھول لگا دیے جائیں گے۔ وہ اٹھا اور مٹی کے ڈھیلے باریک کرنے لگے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ بالٹی میں پانی لایا۔ آخر میں اس نے قبر تک نالی کھینچی جو نلکے سے پانی لاتی تھی۔ کام ختم کر کے سامان اس نے جھونپڑی میں رکھ دیا۔

''تو کیا اس قبر میں جسے میں نے اپنے خون سے سینچا ہے ایک بڈھا آرام فرمائے گا۔ اسے کچھ کراہیت سی ہوئی۔ نہیں نہیں، اس نے فوراً ہی تردید کر دی۔ میں اس کی تکمیل میں تاخیر برداشت کر لوں گا، لیکن اس میں کوئی اتنا ہی خوب صورت بدن بھی ہو گا۔

اس نے فیصلہ کر لیا اور نئی قبر کھودنے میں مصروف ہو گیا۔ اس آدمی کو نئی قبر میں دفنا دیا گیا۔ تاہم شاہد کے دل میں کھد بد رہنے لگی۔ قبر کے مکمل ہونے کا تجسس اضطراب میں بدل گیا تھا۔

مجھے اس معیار کا مردہ کبھی نہ مل سکے گا۔ وہ اب اکثر سوچنے لگا تھا اور بے چینی جس میں دُکھ کی آمیزش ہوتی ہے، اس تنکے کی طرح کریدنے لگی تھی۔ روز بروز ہنسی اس کے چہرے سے رخصت ہوتی جا رہی تھی، اس کی آنکھوں کی چمک بجھ گئی تھی اور چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا، کبھی کبھی اچانک ہی ایک ہی مسکراتا ہوا چہرہ فضا میں ابھرتا، خوب صورت اور دلکش چہرہ جو واقعی اس کے معیار پر پورا اترتا تھا اور جس کے ایک بال میں بھی کبھی اس نے کسی خامی کو محسوس نہیں کیا تھا، ''نہیں نہیں۔'' وہ اپنا بوجھل سر جھٹکتا، اس کے جبڑے بھینچ جاتے اور آنکھیں حلقوں سے باہر ابلنے لگتیں۔ میں کس قدر کمینہ ہوتا جا رہا ہوں۔ وہ سوچتا اور اس خیال سے پیچھا چھڑانے کے لیے دیوانوں کی طرح قبروں میں بھاگنے لگتا، جو اس کے ذہن میں اپنے دانت گاڑنے لگا تھا۔

کبھی کبھی اسے یہ وہم بھی ستانے لگا تھا کہ وہ اسی طرح سوچتے سوچتے مر جائے گا اور لوگ اس جگہ پر کسی بھی ایسے آدمی کو دبا دیں گے جس کی اہمیت اس کے نزدیک ذرا بھی نہ ہو گی۔

کافی دن وہ اسی غم میں گھلتا رہا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی صحت بھی گرتی جا رہی تھی۔

''زندگی کی ہر خوشی تو پوری نہیں ہو سکتی اور اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ زندگی کا ساتھ ہی چھوڑ دیا جائے۔''

اب وہ زندگی سے مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ میں اپنے غم کو، اس نے فیصلہ کر لیا صائمہ کی محبت کے سائے میں بھلا دوں گا اور اس قبر کو کل ہی ہمیشہ کے لیے بند کر دوں گا جو مجھ سے ہر شے چھینے جا رہی ہے۔ وہ پگڈنڈی پر ٹہلنے لگا۔ اس نے چاند کی طرف دیکھا جو کمان کی طرح تنا ہوا تھا۔ اس نے ہوا میں دو تین لمبے لمبے سانس لیے اور سوچا رات کتنی حسین ہے۔ وہ گنگنانے لگا، دھیمی دھیمی مگر غمگین آواز میں، جو صاف مرجھائی ہوئی لگ رہی تھی، پھر اس نے پل بھر کے لیے سیٹی بجائی اور

تال کے لیے سر کو ہلایا۔ ایکا ایکی اس نے محسوس کیا کہ وہ ایکٹنگ کر رہا ہے، حالاں کہ ان چیزوں کے لیے اس کے دل میں رتی بھر جگہ نہیں تھی۔

اچانک وہ صائمہ سے ٹکرا گیا جو چادر کے بکل میں سمٹی سمٹائی کھڑی تھی، وہ چوروں کی طرح ٹھٹھک گیا۔ اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ صائمہ نے اپنی بڑی سیاہ آنکھوں سے شاہد کو دیکھا، پھر نظریں جھکالیں۔ وہ پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کرید نے لگی تھی۔

''تم آ گئی ہو۔'' شاہد نے بجھی بجھی آواز میں پوچھا۔ اس کا رنگ اُڑا ہوا تھا اور آج پہلی بار وہ نظریں ملانے سے گریز کر رہا تھا۔ ''ہاں۔''

وہ جھونپڑی میں چلے گئے۔ شاہد نے لالٹین جلانے کے لیے اتاری تو اس کی چمنی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بدل گئی۔ اس نے بغیر چمنی کے ہی لالٹین جلالی اور کانچ کے ٹکڑے باہر پھینک دیے، پھر وہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ وہ اپنا جسم چرا رہا تھا، صائمہ کا چہرہ قدرے دبلا اور زرد ہو گیا تھا۔ شاہد ابھی تک خاموش تھا اور یہ بالکل ہی خلاف معمول تھا۔

''کیا میں اب تم کو اچھی نہیں لگتی؟'' صائمہ نے پوچھا۔ وہ مرجھائی ہوئی اور پژمردہ سی لگ رہی تھی۔

''میں اب صرف تمہارے سہارے سے جی رہا ہوں!'' اس کی آواز بھاری تھی اور اس کے چہرے پر تھکن کے گہرے تاثرات تھے، پل بھر کے توقف کے بعد اس نے کہا۔

''مجھے عجیب عجیب خیال آتے ہیں، کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے آنے والے لمحے میں میرے جسم کی دھجیاں اُڑ جائیں گی، میں تم سے کہنا چاہتا تھا کہ اب...... اعتماد مجھے خود اپنی ذات پر بھی نہیں رہا۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ دو چیزوں کے درمیان آ کر میں پس جاؤں گا۔'' اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپالیا۔

''یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے، تم لیٹ جاؤ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔''

وہ لیٹ گیا، کوئی سایہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ وہ تڑپ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے جبڑے بھینچ گئے، تاہم جلد ہی اس نے خود پر قابو پالیا اور صائمہ کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے صائمہ کی پتلی کمر پر ہاتھ پھیر، اس کی گوری گوری لمبی انگلیوں کو ہاتھوں میں لے کر دبایا، اس کے گلاب جیسے ہونٹوں کو چوما، پھر اس نے صائمہ کو اپنے ساتھ چمٹالیا۔

ایسا لگتا تھا جیسے وہ صائمہ کو اپنے سینے میں پیوست کر لینا چاہتا ہو، پھر وہ چارپائی پر لیٹ گیا اور اسے کندھے سے پکڑ کر کھینچا۔ صائمہ نے اپنے رخسار اس کے سینے میں پیوست کر دیے۔ اس نے صائمہ کی سانس کو اپنے سینے پر پھیلتے محسوس کیا۔ اس نے صائمہ کے بھرے بھرے گالوں کو گدگدایا، پھر اس کی گردن پر ہونٹ رکھ دیے۔ اس کی سانس تیز ہو گئی تھی، اس نے اپنے اندر ایک عجیب سی آگ کو پھیلتے ہوئے محسوس کیا۔

پھر ایک دم وہ تڑپ کر کھڑا ہو گیا، اس کے حلق سے بڑی ہی عجیب و غریب آواز نکلی جو کراہ سے ملتی جلتی تھی، صائمہ اسے پاگلوں کی طرح تکنے لگی تھی۔

''کیا ہوا؟''

اس نے جواب نہیں دیا، وہ دروازے تک گیا اور اپنے بالوں کو مٹھی سے نوچا، پھر ایکا ایکی وہ پلٹ آیا اور صائمہ کے ساتھ دوبارہ لیٹ گیا۔ وہ پاگلوں کی طرح اسے چومنے لگا تھا، اس کے ہاتھ صائمہ کو جگہ جگہ سے اُٹھا کر ہونٹوں کے قریب لا رہے تھے۔

صائمہ پر مدہوشی سی چھا گئی تھی، اس نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا تھا، وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس پر مکمل خود سپردگی کی حالت طاری ہو چکی تھی، شاہد نڈھال سا ہو رہا تھا اور اس کا پورا جسم کانپنے لگا تھا، تاہم اس نے اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے صائمہ کے گال ملے اور تھپتھپائے پھر اس کی کانپتی کپکپاتی انگلیاں گردن کی طرف سرک گئیں۔

اگلے دن لوگوں نے دیکھا، قبرستان میں نئی قبر مکمل ہو چکی تھی۔ گورکن کا کہیں نشان تک نہیں تھا، تاہم اس کے اوزار قبر کے سرہانے ٹوٹے ہوئے پڑے تھے۔

☆......☆

تیسرا شعلہ

قسمت کی دستک

ریحانہ نسیم

ایک ایسے بزدل جوڑے کی کہانی جس نے خود اپنی قسمت پر تالا لگالیا

''ارے فرحانہ بٹی صفائی ذرا اچھی طرح کرلینا۔ کل آپا صغراں کسی کو لائیں گی تمہارے رشتے کے لیے۔'' صفیہ بیگم نے کہا۔

''امی یہ آپا صغراں کو پورے محلّے میں صرف ایک میں ہی جوان لڑکی نظر آتی ہوں کیا؟ اور بھی تو میری کتنی سہیلیاں ہیں۔ فوزیہ، رعنا، اسریٰ۔ یہ اُن کے گھر کیوں نہیں جاتیں۔'' فرحانہ نے غصے میں کہا۔

''اری بے شرم، ناشکری کہیں کی۔ ایک تو وہ ہمارا خیال کرتی ہیں اور تیرے دماغ ہی نہیں ملتے۔ چل دیواریں بھی جھاڑ لے، کہیں کوئی مکڑی کا جالا نہ لگا ہو، ورنہ وہ سوچیں گے کہ لڑکی پھوہڑ ہے۔'' صفیہ آرڈر دے کر باورچی خانے میں چلی گئیں۔

فرحانہ کے ذہن میں کل آنے والے لوگ ابھی سے آ گئے اور اس نے دیوار پر جھاڑو ایسے زور زور سے ماری کہ جیسے وہ لوگ دیوار پر چپکے ہوئے ہوں اور جھاڑو سے نیچے گر جائیں گے۔

یہ دیکھ کر صفیہ بی وہیں سے چیخیں۔

''کم بخت توڑ دے جھاڑو۔ چار دن بھی نہیں چلتی ہے، مہینے کی دو آ جاتی ہیں۔'' انہوں نے مہینے کا خرچا بتانا شروع کر دیا۔

فرحانہ صفائی کرتی رہی اور بڑبڑاتی رہی کہ ہر مہینے دو مہینے کے بعد آپا صغراں رشتہ کروانے کے بہانے لوگوں کو لاتی ہیں اور کھا پی کر چلی جاتی ہیں۔ آج تک نہ منگنی کروائی نہ ہی شادی۔ وہ زور سے بولی۔

''امی یہ آپا صغراں کہاں پیدا ہوئی تھیں؟ ہمارے محلّے میں کیسے آ گئیں؟ آپ کی ان سے دوستی کیسے ہوئی؟''

صفیہ بولیں۔ ''اے لو، مجھے کیا پتا کہاں پیدا ہوئیں؟ کون سا وہ میری ہم عمر ہیں، کم از کم دس سال بڑی ہوں گی مجھ سے۔'' انہوں نے فوراً اپنی عمر واضح کر دی۔

''امی مجھ سے اس گھر کی صفائی نہیں ہوتی۔ لال اینٹوں کا صحن ہے۔ تنکے والی جھاڑو استعمال کرنی پڑتی ہے۔ چکنا فرش ہو تو دو منٹ میں جھاڑو پونچا ہو جاتا ہے۔ یہ صحن تو یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ ختم ہی نہیں ہوتا، دھوپ گرمی الگ۔ آپ ماسی لگا لیں صفائی کے لیے۔''

فرحانہ نے تنگ آ کر کہا۔

''اے ہاں یہ گھر تو مجھے بھی شروع ہی سے ناپسند ہے۔ اتنا بڑا ہے اور رہنے والے صرف ڈھائی لوگ۔ آگے برآمدہ، پیچھے کوٹھریاں۔ تمہارے دادا کو بھی انڈیا



سے آ کر یہ ہی گھر ملا تھا رہنے کو؟ کوئی دوسرا دیکھ لیتے۔ لوگوں نے تو انڈیا سے آ کر خوب ہاتھ پاؤں چلائے تھے۔ خوب بٹورا، تمہارے دادا ہی ایک شریف آدمی تھے جو یہ محل لے کر بیٹھ گئے۔'' انہوں نے اپنی ساس کو آتا دیکھ کر باقی کا جملہ منہ میں ہی روک لیا۔

رقیہ بیگم نے اپنی بہو کے منہ سے اپنے شوہر کی تعریف سنی تو بڑا خوش ہوئیں۔ وہ ذرا اونچا سنتی تھیں۔ عزیز اُن کو بیٹا اور صفیہ کا شوہر تھا عزیز صاحب ایک شریف انسان تھے۔ گورنمنٹ ادارے کے ملازم تھے۔

سادہ طبیعت کے مالک۔ نا زیادہ کی تمنا نہ ہوس۔ انڈیا سے آ کر اُن کے والد نے کلیم کے ذریعے یہ مکان حاصل کیا تھا۔ یہ ہندوؤں کا مکان تھا اور ان ہی کے طرزِ رہائش کے مطابق بنا ہوا تھا۔ اس کے چاروں طرف برآمدہ تھا۔ پیچھے کی طرف کمرے، کھلا صحن اور ایک طرف زینہ۔ یہ لال اینٹوں کا بنا ہوا ایک مضبوط مکان تھا۔ ان کے گھر میں کل افراد ہی کتنے تھے، دو بیٹیاں، فرحانہ بڑی 23 سال کی اور چھوٹی رابعہ 20 سال کی۔ آخر میں عثمان تھا 15 سال کا۔ یہ گھر ان کی ضرورت سے کہیں بڑا تھا، مگر صفیہ بیگم کو اس گھر سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ ایک تو ان کو اپنے میاں کی سیدھی سادی طبیعت ناپسند تھی، بس جو کمایا اُس میں ہی خوش ہیں، آگے کی فکر نہیں ہے کہ لڑکیوں کی شادی کرنی ہے، بیٹے کو پڑھانا ہے۔ کسی اچھے علاقے میں ذرا چھوٹا مگر خوب صورت سا مکان دیکھ لیں اور جو پیسے بچیں اس سے کوئی چھوٹی موٹی دکان کر لیں تو چار پیسے کی آمدنی ہونے لگے گی۔

چار بجے آفس سے آ کر میں فارغ رہیں گے، انسان ذرا آگے تو بڑھے، بس لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔

عزیز صاحب کو ان کی شرافت کی وجہ سے پورے محلے میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس وجہ سے آپا صغراں جو جگت آپا تھیں، آئے دن ان کے گھر لڑکیوں کے لیے رشتے لاتی رہتی تھیں۔ صفیہ ان کے لائے ہوئے مہمانوں کی خوب آؤ بھگت کرتیں۔ فرحانہ نے پورے گھر کی صفائی کی اور اسٹور کو ویسے ہی بند رکھا۔ اسٹور وہ کمرہ تھا، جو گھر کے مشرقی کونے میں بنا ہوا تھا۔ یہ دوسرے کمروں کے مقابلے میں ذرا چھوٹا تھا۔ اس کمرے میں سے اکثر و بیشتر عجیب سی آواز آیا کرتی تھی، جیسے زمین کے اندر کوئی سخت چیز ٹکرا رہی ہو۔ شروع میں یہ سب لوگ بہت خوف زدہ ہوئے کہ ہندوؤں کا مکان تھا۔ اس کمرے میں مورتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ فرحانہ کے دادا حامد صاحب نے جب یہ مکان خریدا تھا تو اسے پاک صاف کر کے قرآن خوانی کروائی تھی اور پورے گھر میں نیا رنگ و روغن کروایا تھا۔ اگر بتیاں جلائی گئی تھیں۔ وہ ہر جمعرات جمعہ کو خاص طور پر اگر بتیاں پورے گھر میں لگاتے تھے وہ خود بھی حافظ قرآن تھے اور پورے گھر میں ٹہل ٹہل کر قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ ان کی بیگم بھی نماز کی پابندی کرتی تھیں، مگر جب وہ آواز آتی تو ڈرتی ضرور تھیں۔

''کمبخت ہندوؤں نے مُردے جلائے ہوں گے، ان ہی کی بدروحیں چیختی ہوں گی۔'' وہ جھلّا کر کہتیں۔

عزیز اور طوبیٰ ان کے دو ہی بچے تھے۔ طوبیٰ کی شادی کے بعد گھر اور خالی خالی ہو گیا تھا اس لیے فوراً ہی عزیز کے لیے دلہن ڈھونڈنی شروع کر دی تھی۔ صفیہ ان کو پسند آئی اور وہ دلہن بن کر اس محل میں آ گئی۔ شروع شروع میں تو صفیہ کو اس آواز کا پتا نہیں چلا، پھر بچوں کی آمد شروع ہو گئی۔ طوبیٰ کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ اکثر مایوس ہو جاتی کہ میری شادی کو دو سال ہو گئے ہیں اور بھائی کی تو ابھی ہوئی ہے اور بھابی کے خوش خبری ہے، مگر اللہ کے آگے کس کی چلتی ہے۔ رقیہ بیگم ہر نماز میں اپنی بیٹی کے لیے دعا کرتیں کہ اللہ اس کی گود بھی بھر دے۔ صفیہ بیگم کے تلے اوپر بچے ہوئے۔ فرحانہ، پھر رابعہ اور پھر عثمان۔

طوبیٰ کا علاج شروع کرایا گیا۔ اس کے شوہر دانش کا بھی چیک اپ ہوا، مگر اللہ نے ان کی دعاؤں کو رائیگاں نہیں جانے دیا اور جب عثمان تین سال کا تھا تو طوبیٰ کے گھر رمشا پیدا ہوئی۔ بڑی خوشیاں منائی گئیں، پھر تھوڑے تھوڑے وقفے سے ثمرہ اور ازحان بھی ہو گئے۔ یوں طوبیٰ کا گھر بھی بچوں کے شور و غل میں ڈوب گیا۔ حامد صاحب

کا انتقال اچانک ہی ہوا تھا۔ پورے گھر میں کہرام مچ گیا تھا، لیکن پھر آہستہ آہستہ سب معمول پر آتے گئے۔

عزیز صاحب حسب معمول آفس جانے لگے۔ بچے اسکول چلے جاتے تو گھر میں سناٹا ہوجاتا، اتنا بڑا گھر جب اس سناٹے میں جب اس کمرے سے آواز آتی تو صفیہ بیگم کے پسینے چھوٹ جاتے، ساس کو تو آواز اب کم سنائی دیتی تھی۔ ان کی قوت سماعت عمر کے ساتھ ساتھ کمزور ہوگئی تھی، مگر صفیہ بیگم بہت ڈرتی تھیں۔ شروع شروع میں انہوں نے عزیز صاحب پر بہت زور ڈالا کہ وہ یہ مکان تبدیل کرلیں، مگر وہ بولے۔

''ارے صرف آواز ہی تو آتی ہے، کوئی جن بھوت تو آج تک نظر آیا نہیں ہے اور ویسے بھی اس آواز نے آج تک کسی کو کسی قسم کا کوئی نقصان بھی نہیں پہنچایا ہے، پھر بلاوجہ کان کیوں بیچ دیں، ویسے بھی ابا جان حافظ قرآن تھے۔ اگر کوئی خطرے کی بات ہوتی تو وہ خود اس کو چھوڑ دیتے۔ جہاں نماز اور قرآن پڑھا جائے وہاں کوئی بد روح نہیں آسکتی۔ تمہاری تسلی کے لیے میں اس میں فالتو کا سامان بھر کر تالا ڈال دیتا ہوں۔ تا اس طرف کوئی آئے اور نہ جائے۔ بیکار کے وہم میں مت پڑو۔

یہ کہہ کر انہوں نے اس کمرے میں فالتو سامان بھر کر تالا ڈال دیا گویا انہوں نے صفیہ کا منہ بند کردیا، مگر جب وہ آواز آتی تو صفیہ بیگم کا منہ کھل جاتا اور عزیز صاحب کا بند ہوجاتا۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔ بچے بڑے ہوتے گئے آواز گاہے بگاہے آتی رہی، کسی نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ یہ کیا چکر ہے۔ آواز کیسی ہے۔ اُس تاریخ سے جو تالا ڈالا گیا تو پھر کھولا ہی نہیں گیا۔ اب تو بچے بھی اس آواز کے عادی ہوگئے تھے، پھر بھی ایک لمحے کو وہ ڈرتے ضرور تھے۔ ویسے بھی کبھی مہینے دو مہینے میں یہ آواز آتی تھی۔ آج بھی فرحانہ نے پورے گھر کی صفائی کی مگر اس کمرے کی طرف نہیں گئی۔ رابعہ باورچی خانے میں ماں کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ عثمان میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوا تھا۔ اب وہ زیادہ وقت اپنے دوستوں میں رہتا۔ وہ اپنے آپ کو فریش کررہا تھا۔ والد صاحب آفس میں تھے، رقیہ بیگم برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھی تھیں۔ انہوں نے جو زور و شور سے صفائی ہوتے دیکھی تو سمجھ گئیں کہ کوئی مہمان آرہا ہے۔ فوراً بولیں۔

''ارے کیا میری طوبیٰ آرہی ہے۔'' وہ لطیف آباد میں رہتی تھی، یہ لوگ خود حیدرآباد میں تھے۔ ایک ہی تو بیٹی تھی اس لیے حامد صاحب نے اسے قریب میں ہی بیاہا تھا۔ کہ ایک ہی بھائی ہے۔ دونوں کو ملنے ملانے میں آسانی رہے۔ عزیز بھی اپنی چھوٹی بہن کا بہت خیال رکھتے تھے۔ فرحانہ بولی۔

''نہیں دادی۔ پھپھو نہیں آرہی ہیں کوئی اور آرہا ہے۔''

''ارے کیا نور بیٹا آرہا ہے۔'' نور ان کا بھانجا تھا۔ وہ لوگ جامشورو میں رہتے تھے۔ فرحانہ نے ان کے کان کے قریب آکر زور سے بتایا کہ نور بھائی نہیں بلکہ کوئی اور مہمان آرہے ہیں، تب ان کو سمجھ میں آیا۔

شام کو عزیز آفس سے آئے تو صفیہ نے ان کو آپا صغراں کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے چائے پیتے ہوئے پوچھا۔

''کون لوگ ہیں، لڑکا کیا کرتا ہے۔ تعلیم کتنی ہے، کچھ بتایا آپا نے اُن کے بارے میں؟''

وہ بولیں۔ ''لوکل آتو رہے ہیں سب معلوم ہوجائے گا۔''

عزیز کو غصہ آنے لگا کہ وہ ہر دفعہ کوئی نہ کوئی الٹی سیدھی فیملی اُٹھا کر لے آتی ہیں۔ کبھی خاندان برابری کا نہیں، کبھی لڑکا جاہل ہے اور ان کی بیگم کو اتنی عقل نہیں ہے کہ ضروری باتیں تو پہلے معلوم کرلیں، پھر سمجھ میں آئے تو بلاؤ۔ وہ اپنی بیگم کی اس بات سے چڑتے تھے۔ رشتے کے نام پر کوئی بھی کھا پی کر چلا جاتا ہے، اب بھی پہلے کی طرح کچھ معلوم نہیں کہ کون لوگ ہیں۔ کاروبار ہے یا نوکری ہے۔ تعلیم کیا ہے؟ وہ پیالی رکھ کر غصے میں بڑبڑاتے ہوئے باہر چلے گئے۔ اُن کی ساس چپ چاپ بیٹھی دیکھ رہی تھیں۔ سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں بس بیٹے کو غصے میں باہر جاتا دیکھ کر یہ سمجھ گئیں کہ بہو سے لڑائی ہوئی ہے۔ وہ بہو کو بولنے لگیں۔

''ارے صفیہ کیوں لڑتی ہے میرے بچے سے۔ صبح کا گیا شام کو تو آتا ہے تھکا ہوا۔ ذرا گھر میں آرام کرنے دیا کر، اب پھر باہر چلا گیا۔''

صفیہ کو بھی غصہ آ گیا، وہ زور سے بولیں۔ ''خود گئے ہیں میں نے نہیں بھگایا۔''

''ہائیں، کیا جلایا؟ کیا سالن جلا دیا۔'' وہ حسب عادت غلط بولنے لگیں۔

''ارے ذرا دل لگا کر سالن پکایا کر، جب تو ہی جلا بھنا پکائے گی تو میری بچیاں کیا سیکھیں گی!'' صفیہ نے کوئی جواب نہیں دیا اور چپ چاپ وہاں سے اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں اور ان کی ساس ایک گھنٹے تک بولتی رہیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ مغرب کی اذان ہوگئی اور عثمان نے ان کو اشارے سے بتایا کہ اذان ہو رہی ہے۔ تب وہ چپ ہوئیں۔

دوسرے کمرے میں رابعہ فرحانہ کو چھیڑ رہی تھی کہ ''باجی کل لڑکے والے آرہے ہیں۔ آپ کون سا سوٹ پہنیں گی؟'' فرحانہ جل کر بولی۔

''کم خواب کا جو نیا سوٹ بنوایا ہے وہی پہنوں گی۔''

رابعہ اس کی اس بات پر خوب ہنسی۔

صبح جب عزیز صاحب آفس جانے لگے تو صفیہ نے یاد دلایا کہ ذرا جلدی آیے گا۔ لڑکے والے 6 بجے آئیں گے۔ وہ بولے۔ ''ارے بھئی آج تو صرف عورتیں ہی تو آئیں گی۔ میرا بھلا کیا کام؟ تم دیکھ بھال کر لینا، لوگ صحیح ہوئے تو میں لڑکا دیکھ لوں گا۔''

صفیہ کی سمجھ میں بات آ گئی۔ ویسے بھی وہ عام عورتوں کی طرح تیز طرار نہیں تھیں۔ اس لیے عزیز صاحب اکثر ان کو سمجھاتے رہتے تھے۔ اب صبح ہی سے وہ بوکھلائی پھر رہی تھیں۔ جلدی جلدی سب کر لیں۔ لڑکیاں آرام سے اپنا اپنا کام کر رہی تھیں۔ ان کو معلوم تھا کہ جب تک مہمان نہیں آجاتے تب تک امی کا یہ ہی حال رہے گا۔ آج کوئی نئی بات تو ہے نہیں، لہٰذا ماں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ دادی کو صاف ستھرے کپڑے استری کر کے پہنائے گئے۔ ان کو بھی تو بیٹھنا تھا نا۔ صفیہ بیگم ہمیشہ مہمانوں کے لیے گھر میں سب کچھ تیار کرتی تھیں۔ بازار سے صرف پھل اور مٹھائی آتی تھی۔ کباب، کسٹرد، دہی بڑے، چھولے جو کچھ بھی ہو گھر کا بنا ہوا ہو۔ آپا صغراں کو ان کی یہ عادت بہت پسند تھی۔ اس لیے ہر رشتہ پہلے یہاں لاتیں پھر کہیں اور کیوں کہ دوسرے گھروں میں تو بیکری کا سامان کھانے کو ملتا تھا۔ سب تیاری کے بعد فرحانہ نے نہا دھو کر لان کا گلابی سوٹ پہنا۔ لمبے بالوں کی چوٹی بنائی اور کانوں میں سونے کی چھوٹی چھوٹی بالیاں پہن لیں۔ بغیر میک اپ کے اس کا گورا رنگ خوب کھل رہا تھا۔ رابعہ کو ماں نے منع کر دیا تھا کہ تم مہمانوں کے سامنے مت آنا، ورنہ لوگ بڑی کو چھوڑ کے چھوٹی کی بات کرنے لگتے ہیں۔ اس لیے وہ اندرونی کمرے میں ہی کتاب پڑھنے بیٹھ گئی۔ عثمان کو بھی گھر میں ہی رہنے کا آرڈر تھا کہ کوئی کام پڑ سکتا ہے، یا اُن کے ساتھ کوئی مرد ہوا تو اس کے ساتھ کون بیٹھے گا۔

پورے چھ بجے ان لوگوں نے دستک دی۔ آپا صغراں سب سے آگے اپنا شٹل کاک، برقع سنبھالے چلی آ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک اچھے کھاتے پیتے گھر کی اُدھیڑ عمر خاتون اور دو لڑکیاں ساتھ میں تھیں۔ ایک بڑی جو شادی شدہ لگ رہی تھی اور ایک رابعہ کی عمر کی تھی۔ مرد کوئی نہیں تھا۔ عثمان کی ایک ٹینشن تو ختم ہوگئی تھی۔ وہ بڑا خوش ہوا کہ اس کی جان بچ گئی تھی۔ سب ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ سلام دعا کے بعد تعارف ہوا کہ اُدھیڑ عمر خاتون قدسیہ ہیں، لڑکے کی ماں اور یہ دونوں چھوٹی بہنیں ہیں۔ بڑی والی شادی شدہ ہے، اس کا نام رضوانہ تھا۔ اس کی صرف ایک بیٹی تھی۔ ادیانام تھا بچی کا، وہ تین سال کی تھی۔ چھوٹی کا نام ندا تھا، اس کی منگنی ہو چکی تھی۔ اب بیٹے کو بیاہنے سے پہلے وہ بہو لانا چاہ رہی تھیں، تاکہ گھر ایک دم سے خالی نہ ہو جائے۔ اس لیے بہو کے آنے سے رونق ہو جاتی۔ وہ تینوں اسی لیے ساتھ آئی تھیں کہ ایک ہی وقت میں سب دیکھ لیں لڑکی کو، ورنہ باری باری آ کر دیکھنا بہت بُرا لگتا ہے۔ جو فیصلہ بھی ہو سب کا مشترکہ ہو۔ سلام دعا کے بعد قدسیہ نے صفیہ سے ان کے گھر کی تعریف کی کہ آپ کا گھر تو بہت خوب صورت ہے۔ صاف ستھرا کھلا کھلا۔ صفیہ بیگم حیران رہ گئیں، کیوں کہ یہ پہلی خاتون تھیں، جنہوں نے ان کے اس گھر کی تعریف کی تھی، انہوں نے بھی ایک نظر اپنے گھر پر ڈالی۔ صاف ستھرا گھر، قرینے سلیقے سے سجا ہوا، سادگی اور صفائی کا حسین امتزاج لگ رہا تھا۔

پورے کمرے میں سادہ سا قالین، صوفے ان پر وائٹ کور، بیک کور پر فرحانہ نے آئل پینٹنگ سے پھول بنائے ہوئے تھے۔ پورا گھر سفید رنگ میں خوب کھل رہا تھا۔ بڑا صحن، چاروں طرف گملے، پھول کھلے مہک رہے تھے۔ تخت کونے میں رکھا تھا۔ تخت کور بھی وائٹ، صفیہ بیگم کو ایک دم سے سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دیں، کیوں کہ ان کو تو یہ گھر بس برا لگتا تھا۔ کبھی پیار سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ آج ان کے کہنے پر دیکھا تو واقعی گھر تو بہت خوب صورت تھا۔ وہ جھینپ سی گئیں اور فوراً ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور بولیں۔ ''ہاں آپ نے محبت سے دیکھا ہے۔ اس لیے آپ کو خوبیاں نظر آ رہی ہیں۔'' پھر ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ آپا صغراں نے اشارے سے کہا کہ فرحانہ کو تو بلاؤ۔ مطلب یہ تھا کہ کھانا پینا شروع کرواؤ۔ صفیہ اُٹھ کر اندر گئیں اور فرحانہ کو آواز دی۔ فرحانہ ناشتے کا سامان لا کر میز پر رکھنے لگی اور سب کو سلام کیا۔ جب پورا ناشتا لگا دیا تو وہ جانے لگی، مگر ان خواتین نے اسے روک لیا اور اپنے درمیان بٹھالیا۔ اب فرحانہ کا انٹرویو شروع ہوا۔ اُس نے بتایا کہ بی اے کر کے فارغ ہوں۔ امی کا ہاتھ بٹاتی ہوں۔ ان سب کو فرحانہ ایک ہی نظر میں بھا گئی۔ انہوں نے اس کو اپنے ہاتھ سے مٹھائی کھلا دی اور جاتے وقت سو روپے ہاتھ پر رکھ گئیں، ان کے بیٹے کا نام ندیم تھا۔ ایم اے کر کے اب بینک میں جاب کر رہا تھا۔ فیملی بھی چھوٹی تھی اور تنخواہ اچھی تھی۔ اب وہ باقاعدہ رشتا لانے کا کہہ رہی تھیں کہ آپا صغراں کے ہاتھ پرچا بھجوادوں گی۔ اس میں لڑکے کے مکمل کوائف تفصیل سے لکھ دیں گے۔ آپ لوگ دیکھ لیجیے گا اگر سمجھ میں آئے تو پھر آپ لوگ لڑکا دیکھنے آ جائیں۔ یہ کہہ کر وہ خوشی خوشی چلی گئیں۔ آپا صغراں کی تو باچھیں کھلی جارہی تھیں۔ ان کو دونوں طرف سے ہرا ہرا دکھ رہا تھا۔

عزیز صاحب کو تفصیل بتائی گئی، گھر میں ایک عجیب سی خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ حالاں کہ جب تک وہ لوگ رہے صفیہ بیگم اور فرحانہ ڈرتی رہیں کہ وہ آواز نہ آ جائے ورنہ سب بھاگ جائیں گے، مگر خدا کا شکر ہے کہ امن ہی رہا۔

متوسط طبقے کی ایک خاصیت یہ ضرور ہے کہ ان کی بیٹی کو اگر لڑکے والے پسند کر لیں تو وہ اس کو بھی آدھی شادی سمجھ لیتے ہیں۔ چاہے ان کی بیٹی کتنی ہی خوب صورت سلیقہ مند یا پڑھی لکھی ہو، مگر ماں باپ پر بوجھ ہی ہوتی ہے کہ کوئی بس پسند کر لے۔ خواہ لڑکا اس سے کم شکل یا مزاج کا مختلف یا بد دماغ ہی کیوں نا ہو۔ مگر ان کی بیٹی کو صرف پسند کر لیا جائے، یہ لوگ خوش ہو جاتے ہیں، لیکن بعد میں بیٹی جو کچھ بھگتتی ہے تو اسے اس کا نصیب کہہ کر چھوڑ دیا جاتا ہے اُس کے حال پر، یہاں بھی یہ ہی کچھ ہوا۔ ابھی نا لڑکا دیکھا نہ اُن کا گھر بار دیکھا۔ بس انہوں نے ہاں کہا اور یہاں اچھل کود شروع ہو گئی کہ جیسے شادی کی تاریخ رکھ دی گئی ہو۔ ویسے یہ پہلا رشتہ تھا جو عزیز صاحب کو سمجھ میں آ رہا تھا۔ رابعہ بہت خوش تھی، وہ بار بار فرحانہ سے چھیڑے جارہی تھی کہ اب تو آپ مسز ندیم بن جائیں گی۔ فرحانہ خوش تو تھی مگر سو روپے کے نوٹ پر ناراض تھی کہ کم از کم 500 تو دیتیں۔ ایک لان کا سوٹ ہی بن جاتا۔ اس میں تو بس آئس کریم کھا سکتے ہیں۔ دادی اس پورے پروگرام میں خاموش بیٹھی رہیں۔ جب سب چلے گئے تو فرحانہ سے پوچھنے لگیں کہ انہوں نے تیرے ہاتھ میں کیا دیا تھا؟ وہ بولی کہ سو روپے دے کر گئی ہیں۔ دادی بولیں۔

''ہیں کیا؟ نو روپے۔ اے لو کم از کم دس کا نوٹ تو رکھا ہوتا ہاتھ پر۔ نا بھئی نا۔ ایسے غریب لوگوں میں تو میں اپنی پوتی کا رشتہ نہیں کروں گی۔''

دادی کی بات سن کر سب لوگ ہنسنے لگے کہ اماں نو نہیں سو، پھر ان کو سو کا نوٹ دکھایا گیا تو وہ بڑا خوش ہوئیں اور فرحانہ کو دعائیں دینے لگیں۔

اب طے پایا کہ اتوار کو ہم لوگ لڑکا دیکھنے چلتے ہیں، مگر عزیز صاحب نے کہا کہ میرے گھر کی پہلی شادی ہے۔ صرف ہم میاں بیوی لڑکا دیکھ آئیں، یہ کچھ درست نہیں ہے۔ میری صرف ایک بہن ہے طوبیٰ اور تمہارا صرف ایک بھائی ہے طارق، اب ان دونوں کو چھوڑ دیں تو یہ لوگ بولیں گے تو کچھ نہیں، مگر دل میں ضرور بُرا مانیں گے۔ ایسا کرتے ہیں۔ ان دونوں کو بلا لیں اور لڑکے کو بھی یہاں بلوالیں۔ سب لوگ ایک

دفعہ میں ہی دیکھ بھی لیں گے اور ہم آنے جانے کی زحمت سے بھی بچ جائیں گے، ورنہ گاڑی کا بھی انتظام کرنا پڑے گا۔ صفیہ بیگم ذرا آگے پیچھے ہورہی تھیں، کیوں کہ وہ دن تو خیریت سے گزر گیا تھا۔ کوئی آواز وغیرہ نہیں آئی تھی، مگر اب اتنے لوگ جمع ہوئے اور کچھ ہوگیا تو کیا عزت رہ جائے گی۔ بات تو وہ ٹھیک کررہی تھیں، مگر عزیز صاحب نے سارا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا کہ ''اگر جوڑا آسمان پر بنا ہوا ہے تو کچھ نہیں بگڑے گا۔ اب اگر ہم سب کو لڑکا پسند آ گیا تو تم اور طوبیٰ جا کر گھر وغیرہ دیکھ آنا۔''

صفیہ بیگم راضی ہوگئیں۔ کھانے کا انتظام کیا گیا، کیوں کہ اتنے لوگوں میں ناشتا اچھا نہیں لگتا۔ ندیم کے گھر فون کردیا گیا کہ آپ لوگ ندیم کو یہاں لے آئیں۔ وہ لوگ بھی فوراً ہی تیار ہوگئے۔ جمعے کے مبارک دن ان کو بلایا گیا۔ وہاں سے قدسیہ بیگم، ندا، ندیم، اس کا چھوٹا بھائی فہیم رضوانہ کے شوہر عرفان صاحب اور والد وقار صاحب، کل چھ لوگ آئے تھے۔ مرد ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔ طوبیٰ رات کو ہی آ گئی تھی۔ اس کے تینوں بچے خوب دھما چوکڑی مچارہے تھے۔ طارق ماموں اور افشین مامی صبح آ گئے تھے۔ سب لوگ خوش تھے، عورتیں دوسرے کمرے میں تھیں۔ فرحانہ کو بالکل آخری کونے والے کمرے میں بٹھایا گیا تھا۔ اس کے سامنے وہی اسٹور تھا جس میں سے آواز آتی تھی۔ فرحانہ کا ڈر کے مارے بُرا حال ہورہا تھا کہ وہ آواز نہ آ جائے۔ ہلکے آسمانی سوٹ میں گورا رنگ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ آج رابعہ نے زبردستی ہلکی سی پنک شیڈ کی لپ اسٹک لگادی تھی اور کانوں میں سونے کے جھمکے ڈال دیے تھے، حالاں کہ آج تو لڑکا دیکھنا تھا لڑکی نہیں، مگر پھر بھی تیار تو سب ہی تھے۔

کھانے کا سارا انتظام عثمان اور اس کے دوستوں کے ہاتھ میں تھا۔ صحن بہت بڑا تھا، اس لیے تین میزیں لگائی گئی تھیں۔ ذرا سے تو لوگ تھے، پہلے ان کو کھلانا تھا، پھر گھر والے کھاتے، اندر مرد حضرات تھے۔ اب ندیم کا انٹرویو ہو رہا تھا۔ کیا مضامین تھے۔ بینک کے ٹائمنگ کیا ہیں، فارغ وقت میں کیا کرتے ہو وغیرہ وغیرہ۔ وہ بڑی بردباری اور سمجھ داری سے ہر بات کا جواب دے رہا تھا۔ لڑکا سب کو پسند آیا۔ سنجیدہ، باوقار لمبا قد اور رکھ رکھاؤ والا، غرض کہ کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ سب بہت خوش تھے۔ دونوں خاندان کو ایک دوسرے میں کوئی بُرائی نہیں ملی۔ بہت اچھے ماحول میں ڈنر ہوا۔ کھانا کھا کر سب باتوں میں لگ گئے۔ کوئی چھت پر ٹہلنے چلا گیا۔ کوئی گھر دیکھنے لگا۔ سب اپنے آپ میں مگن تھے۔ عثمان برتن سمیٹ رہا تھا دوستوں کے ساتھ، تاکہ اگلی دفعہ کے لیے تیار ہوجائے کھانا۔ ندیم بھی ٹہلتے ہوئے برآمدے میں آگے کی طرف چل پڑا۔ جہاں وہی اسٹور تھا اور اس کے سامنے والے کمرے میں فرحانہ تھی، سب اپنے آپ میں مگن تھے۔ قہقہے بلند ہورہے تھے۔ اتنے میں اچانک فرحانہ کو وہی منحوس گڑگڑاہٹ کی آواز آئی۔ فرحانہ کا دل تو جب سے ادھر ہی لگا ہوا تھا۔ وہ کافی دیر سے اکیلی بیٹھی تھی، اب ذرا سی آواز سے ہی ڈر گئی۔ آواز صرف اتنی تھی کہ فرحانہ نے سنی، باہر ویسے تو شور ہی ہورہا تھا۔ سب مصروف بھی تھے، کسی کے کان اس آواز کی طرف نہیں تھے۔ فرحانہ اس آواز سے ڈر کر کمرے سے بھاگی اور باہر آتے ہی آنے والے سے ٹکرا گئی۔ آنے والا کوئی اور نہیں بلکہ ندیم تھا۔ ندیم اپنے خیالوں میں گم تھا۔ وہ اس ناگہانی افتاد کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ بھی گھبرا گیا اور آنے والے کو سنبھالنے لگا۔ پھولی ہوئی سانس، ڈری ہوئی شکل، پریشان زلفیں، پسینے میں بھیگا گداز بدن۔ وہ ندیم کی بانہوں میں گہری گہری سانسیں لے رہی تھی، اچانک دونوں کو ہوش آ گیا۔ ندیم نے اس کو دیکھا تو وہ فرحانہ تھی۔ ندیم کو تو ہوش اُڑ گئے۔ فرحانہ ایک جھٹکے سے اُس سے الگ ہوئی، ندیم کی شکل دیکھی اور بھاگ کر پھر اُسی کمرے میں گھس گئی جہاں سے آئی تھی اور اندر جا کر اس نے کنڈی لگالی۔ ندیم وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ ایک سیکنڈ میں سب کچھ ہوگیا اور کسی کو کچھ پتا ہی نہیں چلا کہ کس طرح ان دونوں نے ایک دوسرے سے اتنی تفصیلی ملاقات کرلی۔ آسمانی سوٹ میں گلابی چہرہ، پسینے میں پیشانی پر چپکی بالوں کی لٹیں، وہ تو کوئی آسمانی حور لگ رہی تھی۔ فرحانہ کی تصویر ندا نے

بڑی مشکلوں سے ندیم کو دکھائی تھی۔ اب اصل میں تو وہ تصویر سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ وہ ابھی تک اسی سحر میں جکڑا کھڑا تھا۔ عثمان کسی کام سے ادھر سے گزرا تو اس نے ندیم کو اسٹور کے قریب کھڑے دیکھا۔ وہ حیرانی سے بولا کہ ''ارے ندیم بھائی آپ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں۔'' ندیم نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا۔

''ارے کچھ نہیں، دیکھ رہا تھا کہ اس طرف کیا ہے۔''

عثمان بولا۔ ''ادھر بھی کمرے ہی ہیں، آئیں باہر بیٹھ کر کولڈ ڈرنک پیئیں۔'' وہ ندیم کے صحن میں لے گیا۔ اندر کمرے میں فرحانہ کا خوف کے مارے بُرا حال تھا، وہ سوچ رہی تھی کہ ندیم اُسے ایسی ویسی لڑکی نہ سمجھے کہ مجھے آتا دیکھ کر جان بوجھ کر ٹکرا گئی۔ وہ بہت خوف زدہ تھی کہ کہیں کسی نے دیکھ نہ لیا ہو۔ وہ بہت پریشان ہو رہی تھی۔ ان دونوں نے تو کبھی خواب میں بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ایسا ہوگا۔ اب سب جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ندا نے کہا میں تو بھابی سے ملے بغیر نہیں جاؤں گی۔ مجھے تو ان کی تصویریں بھی لینی ہیں۔ قدسیہ بیگم نے بھی کہا کہ ہاں بھئی اپنی بہو سے تو مل لوں۔ وہ لوگ رابعہ کے ساتھ فرحانہ سے ملنے چل پڑیں۔ فرحانہ نے دروازہ کھولا۔ سب بیڈ پر بیٹھ گئے۔ ساس نے اپنی بہو کی بلائیں لیں، ندا نے بہت سی تصویریں کھینچیں۔ فرحانہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ قدسیہ بیگم نے پرس میں سے 500 کا نوٹ نکال کر فرحانہ کو دیا اور بولیں۔

''بیٹا اُس دن میرے پاس صرف سو کا ہی نوٹ تھا، مجھے بھی بُرا لگ رہا تھا مگر مجبوری تھی'' فرحانہ نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا۔

وہ بولیں۔ ''اب انشاء اللہ منگنی میں ڈھیر سارا سامان لائیں گے۔'' فرحانہ جھینپ گئی کہ اُس دن کے خیالات انہوں نے پڑھ تو نہیں لیے، تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ لوگ ہنسی خوشی چلے گئے۔ عثمان نے کھانا لگایا پھر سب گھر والوں نے مل کر کھانا کھایا اور باتیں کرتے رہے۔ طارق ماموں اور افشین مامی تو اپنی گاڑی میں آئے تھے، لہٰذا آرام سے چلے گئے۔ طوبیٰ پھپھو کو سب نے روک لیا تھا۔ سب بچے مل کر اودھم بازی کرنے لگے۔ پندرہ دن کے بعد منگنی کا دن رکھا گیا تھا۔ چار دن کے بعد طوبیٰ، صفیہ بیگم، رابعہ، عثمان اور دانش ان کے گھر گئے۔ گھر بہت اچھا تھا۔ سب کو پسند آیا۔ ندیم کے لیے اوپر کا کمرہ رکھا گیا تھا۔ رابعہ نے خوب گھوم پھر کر پورا گھر دیکھا۔ وہ اپنی باجی کی قسمت پر رشک کر رہی تھی، منگنی کا دن بھی پلک جھپکتے میں ہی آ گیا۔ ندیم کے گھر والوں نے ہال بک کروایا تھا۔ کھانا بھی ان ہی کی طرف سے تھا۔

وقار صاحب عزیز صاحب کی سادگی اور شرافت کے بارے میں جانتے تھے۔ لہٰذا یہ فیصلہ انہوں نے خوب سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ انہوں نے کہا۔ ''پچاس لوگ آپ کی طرف سے ہوں گے اور پچاس ہی ہماری طرف سے ہوں گے۔'' عزیز صاحب نے بہت زور دیا کہ مل کر آدھا آدھا بانٹ لیں، مگر وقار صاحب نے منع کر دیا، کیوں کہ ایک کھانا تو وہ لوگ کر چکے تھے۔ اب ان کی باری تھی، مجبوراً عزیز صاحب کو ماننا پڑا۔ دو دن پہلے سے ہی انہوں نے فرحانہ کا جوڑا، جوتے، چوڑیاں، مہندی سب سامان بھجوا دیا تھا، تا کہ ناپ وغیرہ دیکھ لیں۔ اِدھر سے بھی جوڑا وغیرہ گیا۔

فرحانہ منگنی والے دن گولڈن سوٹ بھرے ہوئے دوپٹے میں میک اپ کے ساتھ بہت حسین و جمیل لگ رہی تھی، سب ہی تعریف کر رہے تھے۔ ندیم کو بھی آف وائٹ اور گولڈن کرتا شلوار دیا گیا تھا۔ گلے میں گولڈن لمبا مفلر وہ بے حد اسمارٹ اور جاذب نظر لگ رہا تھا۔ کیمروں کی لائٹ میں دونوں نے ایک دوسرے کو انگوٹھی پہنائی، حالاں کہ عزیز صاحب چاہتے تھے کہ عورتیں یہ رسم کریں، مگر آج کل یہ ہی فیشن چل رہا ہے، لہٰذا اُن کی کسی نے نہیں سنی، خوب ہلّا گلّا ہو رہا تھا۔ جملے بازی ہو رہی تھی۔ مٹھائیوں اور پھلوں کے ٹوکروں کا تبادلہ ہوا۔ لفافے میں ہزار روپے دلہن کو سلامی کے ملے، لڑکی والوں نے بھی بارہ سو روپے دیے، کھانا بہت زبردست تھا۔ اچھا خاصا بڑا پروگرام ہوگیا۔ وقار صاحب نے خاموشی سے بچا ہوا آدھا کھانا دلہن کی گاڑی میں رکھوا دیا تھا۔ عزیز صاحب بولے۔

"بھئی اب آپ زیادتی کر رہے ہیں۔" مگر انہوں نے کہا کہ میری بہو نے کھانا ٹھیک سے کھایا نہیں ہے۔ اب گھر جا کر آرام سے کھائے گی، آپ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ عزیز صاحب خاموش ہوگئے۔ یوں ہنسی خوشی یہ کام بھی انجام کو پہنچا۔

شادی چھ مہینے کے بعد رکھی گئی تھی۔ تیاری کے لیے کم از کم اتنا وقت تو چاہیے ہی تھا۔ صفیہ بیگم نے عقلمندی کا کام یہ کیا کہ اپنی طرف کے آئے ہوئے سب مہمانوں کو مٹھائی کے ڈبے وہیں ہال میں ہی دے دیے، اس طرح سب لگے ہاتھوں نمٹ گئے، ورنہ اگلے دن عثمان کو بھاگنا پڑتا مٹھائی بانٹنے کے لیے، جو دو چار لوگ رہ گئے تھے ان کو البتہ جا کر دینا پڑا۔

اصل مسئلہ تو اب شروع ہوا تھا، رشتہ آنے سے منگنی ہونے تک تو ہلکا پھلکا خرچہ تھا، لیکن اب شادی کوئی گڈے گڑیا کا کھیل تو ہے نہیں، اس کے لیے اچھی خاصی رقم چاہیے تھی۔ اب وہ اس کے لیے فکر مند رہنے لگے کہ پیسوں کا انتظام کہاں سے کریں۔ ان کے پاس جمع پونجی کوئی خاص تھی نہیں۔ اگر آفس سے لون بھی لیتے تو کتنا ملتا۔ اب ان کو صفیہ کی بات سمجھ میں آنے لگی تھی کہ یہ مکان فروخت کر کے قدرے چھوٹا مکان لے لیتے ہیں اور باقی کے پیسوں سے کوئی دکان وغیرہ کر لیں، کیوں کہ ان کے مکان کا رقبہ کافی بڑا تھا، جب کہ اس رقبے کا آدھا مکان بھی ان کی فیملی کے لیے کافی تھا۔ فرحانہ کے بعد رابعہ بھی رخصت ہو جائے گی، رہ گیا عثمان تو اس کے لیے پورا گھر ہوگا۔ اب وہ دن رات اسی چکر میں رہنے لگے۔

ادھر منگنی کے بعد فرحانہ کی تو دنیا ہی بدل گئی۔ وہ اپنے خیالوں کی نئی دنیا میں مگن رہتی اور اکثر بے دھیانی میں اپنی امی سے پوچھتی۔

"امی اب تو کافی دنوں سے اس کمرے سے کوئی آواز نہیں آئی۔" وہ بولیں۔

"ارے کیا پاگل ہوگئی ہے کہ آواز سننے کی بات کر رہی ہے۔" اب ان کو کیا معلوم کہ وہ اس آواز سے کس دنیا میں کھو جاتی ہے۔ کس کی بانہوں میں گم ہو جاتی ہے۔ خیالوں میں ندیم کے سینے سے لگی کتنی باتیں کرتی ہے۔ وہ انجانے میں اس آواز کی منتظر رہتی ہے۔ رابعہ حیران تھی کہ منگنی کے بعد باجی کو کیا ہوگیا ہے۔ بہانے بہانے سے اس کونے والے کمرے میں جا کر لیٹ جاتی ہیں۔ اُدھر ندیم بھی گم صم رہنے لگا تھا۔ جہاں جاتا فرحانہ آ کر اس کے سینے سے لگ جاتی۔ وہ اس کی زلفوں میں چہرہ چھپائے باتیں کرتا رہتا۔ کوئی آتا تو چونک جاتا۔ ڈر جاتا کہ کسی نے دیکھ نہ لیا ہو۔ ندا نے بھی یہ بات نوٹ کی، ندیم بھائی پہلے جیسے ہنس مکھ نہیں رہے، بلکہ کافی سنجیدہ ہوگئے ہیں۔ ماں نے کہا کہ بھئی اب وہ شادی کر رہا ہے، اگر سنجیدہ ہو رہا ہے تو کیا ہوا۔ دن اسی طرح گزرنے لگے، دونوں طرف شادی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔

عزیز صاحب نے دو تین ایجنسیوں میں مکان کے لیے بول دیا تھا۔ ٹائم شام کا دیا گیا تھا، تاکہ ان کی موجودگی میں ہی پارٹیاں آئیں، لوگ آ کر دیکھتے اور قیمت لگانے لگے۔ رقیہ بیگم کو معلوم ہوا کہ مکان بیچا جا رہا ہے تو وہ بہت رنجیدہ ہوئیں۔ ان کی پوری زندگی اسی مکان میں گزری تھی۔ ان کے دونوں بچے عزیز اور طوبیٰ کا بچپن اس صحن میں کھیلتے کودتے جوانی میں تبدیل ہوا تھا۔ طوبیٰ اس گھر سے رخصت ہو کر پیا گھر سدھاری تھی۔ صفیہ بیگم بہو بن کر اس گھر میں داخل ہوئی تھیں۔ عزیز کے بچوں نے اس گھر میں آنکھ کھولی تھی، ان کے شوہر کا جنازہ اس گھر سے نکلا تھا وہ اتنی جلدی اس حادثے کو قبول کرنے کو تیار نہ تھیں۔ ان کی آنکھوں سے جھڑی لگ گئی تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا جنازہ بھی اسی گھر سے نکلے۔ افسردہ تو عزیز بھی بہت تھے کہ یہ مکان ان کے والد کی واحد نشانی تھا۔ ان کا بس چلتا تو وہ کسی قیمت پر بھی یہ مکان نہیں بیچنا چاہتے تھے، مگر انسان جو کچھ کماتا ہے اپنی اولاد کے لیے کماتا ہے۔ اس لیے ان کے باپ نے اپنی اولاد کے لیے یہ مکان بنایا تھا۔ اب عزیز اپنی اولاد کے لیے اس مکان کو فروخت کر رہے تھے۔ اگر کوئی خوش تھا تو وہ تھیں صفیہ بیگم۔ ان کی اس مکان اور اس منحوس آواز سے جان چھوٹنے والی تھی۔ اس رات بھی عزیز صحن میں پڑے پلنگ پر لیٹے اور برآسمان پر چمکتے تاروں کو دیکھ رہے تھے، مگر ان کا ذہن کہیں اور تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ

اگر میرے پاس اتنی رقم ہوتی کہ میں اپنی بیٹی کو سادگی اور عزت سے رخصت کردیتا تو میں کبھی یہ مکان نا بیچتا۔ یہ سوچ کر اور اپنی بے بسی پر ان کی آنکھوں میں کبھی تارے جھلملانے لگے اور آنکھوں کے کنارے گیلے ہوگئے تھے کہ اچانک وہی گڑگڑاہٹ کی آواز اس رات کے سناٹے میں کافی زور سے آئی۔ اس اچانک اور تیز آواز سے وہ خود بھی ایک لمحے کو خوف زدہ ہوگئے اور ایک لمحہ پہلے کی مکان کی محبت اس آواز کے ساتھ رخصت ہوگئی اور انہوں نے جلد از جلد اس مکان کو فروخت کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ گھر کے باقی افراد نے بھی رات کے سناٹے کو چیرتی اس آواز کو سنا۔ عثمان اور رابعہ تو خوف زدہ ہوگئے، مگر فرحانہ تو اس آواز کے ساتھ ہی ندیم کی بانہوں میں پہنچ جاتی تھی، سو وہ مطمئن تھی۔ آج یہ آواز صفیہ بیگم کو بھی ناگوار نہیں گزری، کیوں کہ اب تو یہ سب کچھ چند دنوں کا کھیل رہ گیا تھا۔

عزیز صاحب چوں کہ فطرتاً شریف اور نیک تھے، لہٰذا ان کو یہ فکر تھی کہ جو لوگ مکان دیکھنے آرہے ہیں ان کو اس آواز کے بارے میں کیا بتایا جائے، بتاؤں کہ نا بتاؤں۔ وہ کسی کو دھوکہ نہیں دینا چاہتے تھے۔ نا جانے یہ آواز ہے کیا۔ انہوں نے خود تو کبھی جاننے کی کوشش کی نہیں۔ اب نئے آنے والوں کیا بتاؤں؟ اس سے سودے پر کیا اثر پڑے گا؟ انہوں نے اپنی بیگم سے اس سلسلے میں مشورہ کیا۔ وہ بولیں۔

”ارے بھولے سے بھی اس آواز کا ذکر مت کیجیے گا۔ لوگ خریدنا تو دور قریب سے گزرنا چھوڑ دیں گے۔“

عزیز صاحب سر ہلا کر رہ گئے۔

عثمان کو اپنے بچپن کے دوستوں کو چھوڑنا مشکل ہورہا تھا۔ اس نے اپنے والد سے کہا کہ جب ہم نیا مکان خرید ہی رہے ہیں تو کیا نامعلوم مقام پر جانا ضروری ہے۔ ہم اسی علاقے میں خرید لیتے ہیں۔ پرانے لوگوں سے تعلق بھی رہے گا۔ اپنا گھر بھی نظروں کے سامنے رہے گا۔ آتے جاتے اسے دیکھتے بھی رہیں گے۔ سب کو یہ بات پسند آگئی، کیوں کہ خود ان کے آفس کا بھی مسئلہ بنتا، ابھی تو دس منٹ کی ڈرائیو پر تھا۔ اب نہ جانے کہاں جانا پڑتا۔ اس لیے عثمان کی بات پر عمل کیا گیا۔ اب اپنا مکان فروخت کرنے کے ساتھ ساتھ نیا مکان خریدنے کی بھی بات کی گئی، تاکہ یہ بکے اور اسی رقم سے نیا خریدا جائے۔ چناں چہ یہ ڈیوٹی عثمان کی لگی کہ وہ دن میں مکان دیکھے۔ شام کو اپنا مکان لوگوں کو دکھائے، مصروفیت کافی بڑھ گئی تھی، گاہے بگاہے ندیم کے گھر والے بھی چکر لگا لیتے، ان کو بھی معلوم تھا کہ مکان کیوں بیچا جارہا ہے، وقار صاحب نے تو کہا بھی کہ ”بھائی صاحب رہنے دیں، ہمارے گھر اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ آپ پریشان مت ہوں، بس سادگی سے رخصتی کردیں۔“ مگر عزیز صاحب کو معلوم تھا کہ اس سادگی میں بھی کتنی بناوٹ ہے۔ ماں باپ کا بس چلے تو اپنی لخت جگر کو اپنی جان بھی دے دیں، لہٰذا انہوں نے مسکرا کر بات ٹال دی۔

عثمان کی محنت رنگ لائی اور دو گلیاں چھوڑ کر ایک خوب صورت سا ایک سو بیس گز کا ڈبل اسٹوری مکان عثمان کو پسند آگیا، بس رنگ روغن کروانا تھا۔ وہ سب کو دکھانے کے لیے گیا۔ رقیہ بیگم نہیں گئیں، صفیہ کو وہ مکان بے حد پسند آیا، جیسا وہ چاہتی تھیں بالکل ویسا ہی تھا۔ فرحانہ اور رابعہ کو بھی اچھا لگا۔ عزیز صاحب بھی راضی ہوگئی۔ ٹوکن کی رقم دے کر بات کرلی گئی۔ اب اپنے مکان کی قیمت لگتی تو اُس سے ادائیگی کی جاتی۔ ایجنسی والے بھی خوب بھاگ دوڑ کررہے تھے۔ ان کو تو ڈبل کے بجائے چار گنا ملنا تھا۔ قسمت کی بات کہ اگلے ہفتے ہی ایک پارٹی کو عزیز صاحب کا مکان پسند آگیا۔ قیمت بھی عزیز صاحب کی مرضی کی تھی۔ وہ فوراً راضی ہوگئے۔ ایک مہینے کا ٹائم اُن سے لیا گیا تاکہ اپنے گھر کی مرمت اور رنگ و روغن کرواسکیں۔ عثمان نے جلد از جلد مکان تیار کروایا۔ مسجد کے بچوں کو بلا کر قرآن خوانی کروائی گئی اور اگلے ہی دن سامان باندھنا شروع کردیا گیا۔ رقیہ بیگم اٹھتے بیٹھتے آنسو بہارہی تھیں۔

”دیکھنا تم لوگ پچھتاؤ گے۔ ایسا مکان کہیں ملے گا نہیں، میری مانو تو اب بھی رُک جاؤ۔“ مگر سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ ان کی بڑبڑ کون سنتا ان کو دیکھ کر ان کا بیٹا بھی رنجیدہ ہوجاتا۔ وہ بھی اس مکان کو بیچنے کے حق میں نہیں تھے، کوئی چیز تھی جو ان کو ایسا

کرنے سے روک رہی تھی اور ان کے قدم جکڑ رہی تھی، مگر وہ کچھ سمجھ نہیں پارہے تھے، لیکن اولاد کے مسئلوں کے آگے یہ جذباتی باتیں کہاں ٹھہرتی ہیں۔ مکان کا سودا ہوگیا۔ آج ان کا اپنا خریدا ہوا مکان پورا تیار تھا۔ سامان عورتوں نے باندھ لیا تھا۔ عثمان نے کہا میں میٹرک لے آتا ہوں۔ عورتوں کو چابی دی کہ آپ لوگ جائیں دو ہی تو گلیاں ہیں۔ جھاڑو لگاؤ سامان آرہا ہے۔ معیز صاحب کو فون کردیا کہ رات کو آکر چابی لے لیں، بے منت بھی ہوجائے گی، آج رات ان کو نئے گھر میں گزارنی تھی۔ عورتیں پیدل ہی گھر کی طرف روانہ ہوگئیں۔ کیوں کہ قریب ہی تو تھا۔ رقیہ بیگم باقاعدہ روتے ہوئے جارہی تھیں، جیسے کسی نے ان کو زبردستی گھر سے نکال دیا ہو۔ دونوں لڑکیاں بھی اس صورت حال سے کافی افسردہ تھیں۔ آخر کو وہ ان کا اپنا گھر تھا۔ ایک زمانہ گزارا تھا سب نے وہاں۔ اب اتنی جلدی تھوڑی سب کچھ سیٹ ہوجاتا۔ سب کے دل اُداس تھے۔ رقیہ بیگم مستقل بڑبڑا رہی تھیں۔

''دیکھنا تم لوگ میری بات نہیں مان رہے ہو۔ اس گھر میں لکشمی ہے، وہ تمہیں بلا رہی ہے۔ مت جاؤ یہاں سے بہت پچھتاؤ گے۔'' وہ اپنے آپ سے بولتی ہوئی جارہی تھیں۔

''چار پیسوں کے لیے تم نے بھری دولت کو لات ماری ہے۔ اپنی باپ کی بنائی ہوئی جائیداد بیچ کر تم لوگ کبھی خوش نہیں رہو گے۔''

اُن کے قدم نہیں اُٹھ رہے تھے۔ وہ مرے مرے قدموں سے چل رہی تھیں، ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ واپس اپنے گھر میں چلی جائیں، جہاں ان کے مرحوم شوہر کی روح اُن سے ملنے آتی تھی۔ آنسو بہاتی ہوئی وہ اس گھر سے دور ہوتی جارہی تھیں۔

صفیہ بیگم بھی ذہنی طور پر اُلجھی ہوئی تھیں۔ دل تو بہت خوش تھا، مگر دماغ مسلسل منع کررہا تھا۔ روک رہا تھا کہ مت جاؤ، لیکن وہ اپنی ذہنی کیفیت کو سمجھ نہیں پارہی تھیں۔ اگر وہ خوش تھیں تو ان کو وہ خوشی محسوس کیوں نہیں ہورہی تھی۔ ان کے قدم من من بھر کے ہورہے تھے۔ وہ چل نہیں پارہی تھیں۔ زمین جیسے ان کے قدم روک رہی تھی۔ اس مکان کو منحوس مت سمجھو۔ یہ آواز نحوست کی نہیں ہے۔ اسے سمجھو۔ یہ تمہیں بہت کچھ دے گی، ذرا رُک جاؤ، وہ رُک گئیں اور مڑ کر پیچھے اپنے مکان کو دیکھنے لگیں۔ نہ جانے یہ کیا ہورہا تھا۔ انہوں نے بھی تو اپنی سہاگ رات اسی گھر میں منائی تھی۔ ان کی بھی کتنی حسین یادیں اس مکان سے وابستہ تھیں، دو آنسو ان کی آنکھوں سے نکل کر گالوں پر پھسل پڑے۔ انہوں نے اپنے آپ پر قابو پایا اور تیز تیز چلنے لگیں۔

عزیز صاحب اس بند کمرے کے سامنے کھڑے تھے۔ جہاں سے وہ آواز آتی تھی، ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ سارا سامان بندھا ہوا رکھا تھا۔ پورا گھر خالی سائیں سائیں کررہا تھا۔ عثمان ٹرک لینے گیا ہوا تھا۔ انہوں نے اس بند کمرے کا تالا کھولا اور وہاں رکھا ہوا سامان باہر نکالنے لگے۔ سارا سامان کام کا تھا، مگر بیگم کو خاموش کرنے کے لیے انہوں نے فالتو کہہ کر اندر رکھ دیا تھا۔ باہر ٹرک آگیا تھا عثمان ایک مزدور بھی لے آیا تھا، تاکہ آسانی رہے۔ اب سارا سامان ٹرک پر رکھا جارہا تھا، وہ حسرت بھری نگاہوں سے اپنے پیارے مکان کو دیکھ رہے تھے۔ وہ اس وقت بہت جذباتی ہورہے تھے۔ ہر بار نئے سرے سے کمروں میں جاکر دیکھ رہے تھے۔ عثمان کن انکھیوں سے اپنے باپ کی حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ رنجیدہ تو وہ بھی بہت تھا، مگر خود پر قابو رکھا ہوا تھا۔ گھوم پھر کر عثمان سامان دیکھ رہا تھا کہ کچھ رہ نا جائے۔ اب عزیز صاحب پھر اس کمرے میں آگئے جہاں سے وہ آواز آتی تھی۔ ان کو اچانک اس کمرے میں اپنے والد صاحب کھڑے ہوئے نظر آئے۔ جو بہت افسردہ ہیں اور ان کی بھی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے ہیں۔ جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ عزیز بیٹا، اس مکان کو فروخت مت کرو۔ یہ تمہارے لیے بہت اچھا ہے۔ آگے چل کر تم کو اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوگا۔ عزیز صاحب کے بھی آنسو بہہ رہے تھے، مگر جو ہونا تھا وہ ہوچکا تھا، عثمان کی آواز پر وہ چونکے اور خود پر بمشکل قابو پایا۔ وہ تالا لگانے کو کہہ رہا تھا، سارا سامان ٹرک

پر رکھ دیا گیا تھا۔ معیز صاحب بھی آ چکے تھے۔

عزیز صاحب نے اپنے گھر پر ایک آخری اور الوداعی نظر ڈالی اور تالا لگا دیا۔ چابی دیتے وقت ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ معیز صاحب بھی ان کی جذباتی کیفیت کو سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے عزیز صاحب کو گلے لگا کر تھپکی دی، پھر انہوں نے ہاتھ ملائے اور کل ایجنسی میں ملنے کے لیے وقت مقرر کیا، تا کہ باقی لین دین بھی ہو جائے۔ عزیز صاحب ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے اور عثمان مزدور کے ساتھ سامان پر چڑھ گیا۔ ایک منٹ کا تو راستہ تھا، فرحانہ اور رابعہ نے پورا گھر صاف ستھرا کر دیا تھا اور سوچ بھی لیا تھا کہ کیا چیز کہاں رکھوانی ہے۔ عثمان کے دوست بھی آ گئے تھے۔ لڑکیوں کی ہدایات پر پورا سامان سیٹ کر دیا گیا۔

ساری کاغذی کارروائی کے بعد یہ مکان عزیز صاحب اور وہ مکان معیز صاحب کے نام ٹرانسفر ہو گیا۔ معیز صاحب کی بیگم نے جب یہ مکان دیکھا تو اس میں کچھ تبدیلی کروانے کے لیے کہا۔ خاص طور پر وہ حصہ جس میں وہ کمرہ تھا جہاں سے آواز آتی تھی۔ معیز صاحب کو بھلا کیا اعتراض ہوتا، چنانچہ انہوں نے ٹھیکے دار سے بات کی اور وہ حصہ ٹوٹنا شروع ہو گیا۔ عثمان کو پتا چلا کہ مکان ٹوٹ رہا ہے تو وہ دیکھنے آ گیا۔ جہاں وہ پیدا ہوا تھا اُسے ٹوٹتا دیکھتا رہا۔ مزدور روزانہ تھوڑا تھوڑا کر کے توڑ رہے تھے۔ دو مزدور تھے جو رات دن لگے رہتے۔ کسی وقت عزیز صاحب بھی ادھر کا چکر لگا لیتے اور مکان کو ٹوٹتا دیکھتے اور افسردگی سے چلے جاتے۔ آج جمعہ تھا اور آج اس کمرے کو ٹوٹنا تھا جہاں سے آواز آتی تھی۔ عثمان جمعہ پڑھ کے نکلا تو نہ جانے کیوں اس طرف آ نکلا۔ دیکھا تو مزدور اس کمرے کو توڑ رہے تھے۔ چھت اور دیواریں ٹوٹ چکی تھیں، اب فرش کی باری تھی۔ عثمان دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ نہ جانے اب کیا ہو۔ مزدور نے فرش توڑنا شروع کیا جب وہ کمرے کے درمیان میں پہنچے تو ایک تیز گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ مزدور کدال پھینک کر بھاگے۔ آواز اتنی زوردار تھی کہ آس پاس گزرنے والے راہگیروں نے بھی سنی۔ سب آواز سن کر ڈر گئے۔ عثمان کے تو پسینے چھوٹ گئے۔ لوگ جمع ہونے لگے۔ کسی نے کہا مولوی کو بلاؤ، جن بھوت کا معاملہ ہے۔ کسی نے کہا پولیس کو بلاؤ، آواز ایک ہی دفعہ آئی، مگر مزدور قریب جانے پر تیار نہیں تھے۔ رش بڑھتا جا رہا تھا کسی نے بتایا کہ یہاں پہلے ہندوؤں کا شمشان گھاٹ تھا۔ مردے جلائے جاتے تھے ان کی روحیں شور کر رہی ہیں۔ کوئی بولا۔ ''ارے یہاں جن رہتے ہیں اور وہ ناراض ہو رہے ہیں۔'' غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ اچانک کسی کی نظر عثمان پر پڑ گئی۔ وہ بولا۔

''ارے بھئی پہلے تو یہ لوگ یہاں رہتے تھے۔'' اب عثمان کو اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ آواز سنتے ہی وہ وہاں سے بھاگا کیوں نہیں۔ وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ اب سب کی توجہ عثمان کی طرف ہو گئی۔

''کیوں بھئی یہ آواز کا کیا چکر ہے۔''

''تم لوگوں نے کیا دھوکے سے یہ مکان بیچا ہے، اس کمرے میں جنوں کا اثر تھا کیا، جو وہ آوازیں نکال رہے ہیں۔'' ہر طرف سے سوالوں کی بارش ہو رہی تھی۔ عثمان کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ ایک بڑے میاں کو اس پر ترس آ گیا۔ وہ بولے۔

''ارے بھئی صبر کرو، کیوں بچے کو پریشان کر رہے ہو۔ میں ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں، بہت شریف لوگ ہیں، یہ کسی کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ کیوں بیٹا، جب تم لوگ یہاں رہتے تھے تو کیا کبھی یہ آواز آئی تھی؟'' انہوں نے پیار سے عثمان سے پوچھا۔ اتنے عرصے میں عثمان سنبھل چکا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر سچ بولے گا تو پورے ہجوم سے پٹائی ہو گی، وہ صاف مکر گیا اور بولا۔

''جی نہیں۔ اگر یہ آواز آتی تو اس محلے کے لوگوں کو کیا سنائی نہ دیتی، ہم لوگ تو سالوں سے یہاں رہ رہے ہیں۔'' سب نے ہاں میں ہاں ملائی۔ بات تو سچ ہے، مگر اب کیا کریں۔ مزدور تو کام چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، ٹھیکے دار پریشان کھڑا تھا۔ اُس نے فون کر کے معیز صاحب کو بلوالیا۔ کس نے مشورہ دیا کہ کسی اور علاقے کے مزدور لے آؤ، جن کو اس آواز کا علم نہ ہو۔ چناں چہ پھر دو مزدور لائے گئے۔ وہ بھی رش دیکھ کر

حیران ہوئے کہ کھدائی دیکھنے کے لیے اتنا رش کیوں ہے۔انہوں نے کھودنا شروع کیا،اچانک ان کی کدال کسی سخت برتن سے ٹکرائی۔ وہ حیران ہوگئے۔ رش بڑھتا جارہا تھا۔کھودتے کھودتے ایک دیگ زمین میں دبی ہوئی نظر آئی۔ اس عرصے میں پولیس بھی آچکی تھی۔سب دیکھ رہے تھے۔معیز صاحب الگ پریشان تھے کہ یہ کس چکر میں پھنس گئے۔ دیگ کو باہر نکالا گیا، اس کے اوپر کی مٹی کی صفائی ہوئی،عثمان سانس روکے آنکھیں پھاڑے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ کمزور دل حضرات دوقدم پیچھے ہٹ گئے،مولوی صاحب کوآگے بلایا گیا۔انہوں نے پڑھ کردم کیا،کوئی کہہ رہا تھاڈھکن کھولو، کوئی منع کررہا تھا کہ اس میں جن قید ہیں۔ مزدوروں نے اللہ کا نام لے کر دیگ کا ڈھکن کھولا۔ معیز صاحب اوران کا بیٹا حماد بھی پریشان کھڑے تھے۔ ان کوعزیز صاحب کی شرافت پر کوئی شک نہیں تھا،مگر ایک بڑی حقیقت سامنے منہ کھولے کھڑی تھی۔ جیسے ہی ڈھکن کھولا گیا۔سب ایک چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئے۔ سب کے دل دھک دھک کررہے تھے۔سب سے بُرا حال عثمان کا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بے حوش ہوکر گرنے والا ہے۔ پوری دیگ سونے کی اشرفیوں سے بھری ہوئی تھی۔سورج کی روشنی میں اس کی طرف دیکھا نہیں جارہا تھا۔ پرانے زمانے میں ہندوسا ہوکار اپنی دولت اورجمع پونجی زمین میں دبا کر چھپا کر رکھا کرتے تھے۔ ہندومسلم فسادات کے وقت اس مکان کے ہندو مالک کوبھی اتنا ٹائم نہیں ملا ہوگا کہ وہ جاتے ہوئے اپنی دولت نکال کرلے جاتا۔ وہ اسے اسی حالت میں چھوڑ کر جان بچا کر بھاگا ہوگا کہ جان ہےتو جہان ہے۔ بعد میں آکرلے جاؤں گا،مگرشاید اُسے اتنی مہلت نہیں ملی ہوگی کہ وہ دوبارہ پاکستان آتا۔ پاکستان آکر یہ مکان حامد صاحب کوکلیم کے ذریعے مل گیا۔انہوں نے جیسا ہےاور جہاں ہے کی بنیاد پر رہنا شروع کردیا۔ نہ توڑا نہ پھوڑا۔ بس اپنی نماز اورقرآن میں مگن رہتے۔ یہ دولت ان کے اوران کے خاندان کے لیے نہیں تھی۔ اسی لیے سالوں رہنے کے باوجود وہ ان کو نہ ملی۔لوگوں میں ایک چیخ وپکار مچ گئی تھی۔ پولیس نے حالات پر قابو پایا۔ ورنہ تو لوگ لوٹا ماری شروع کردیتے۔ پوری دیگ باہر نکالی گئی۔ تھانے سے بڑے افسران کو بلایا گیا۔ پورے علاقے میں ہلچل مچ گئی۔عثمان کو نہ تو کوئی آواز سمجھ میں آرہی تھی نہ کچھ دکھائی دے رہا تھا۔لوگ کبھی اسے دھکّے سے آگے کردیتے کبھی پیچھے۔کون کیا پوچھ رہا تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ ہوتے ہوتے یہ خبر عثمان کے گھر بھی پہنچ گئی۔

جمعہ کے دن عزیز صاحب جلدی جایا کرتے تھے۔ وہ بھی دیگ کا سُن کر بھاگے بھاگے وہاں پہنچے، رش کو چیرتے ہوئے وہ اندر گھسے۔ پولیس نے رسی سے دیگ کی ناکہ بندی کی ہوئی تھی اور دیگ اپنے قبضے میں لے لی تھی،معیز صاحب کواپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ یہ مکان ان کے لیے اتنا لکی ثابت ہوگا۔ وہ تو اربوں پتی بن گئے تھے۔ان کی تونسلیں بیٹھ کر کھاتیں تب بھی کم نہ ہوتا، وہ سوچنے لگے کہ عزیز صاحب تو واقعی ضرورت سے زیادہ ہی شریف آدمی ہیں کہ سالوں اس خزانے کے ساتھ رہے، حفاظت کرتے رہے مگر ہاتھ نہیں لگایا۔عثمان نے اپنے والد کو دیکھا تو ان کے قریب آگیا۔ دونوں باپ بیٹا ایک دوسرے کو ایسی حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ برسوں بعد جیسے آج ہی ملے ہوں،معیز صاحب اور ان کا بیٹا حماد اچھلتے پھر رہے تھے کہ اچانک ان کی نظر عزیز صاحب پر پڑی۔ وہ دوڑتے ہوئے آئے اوران کے گلے لگ گئے اور بولے۔

’’واقعی آپ بہت شریف آدمی ہیں، آپ نے یہ مکان نہیں دیا بلکہ ہمیں ایک نئی زندگی دی ہے۔‘‘

عزیز صاحب بالکل گم صم کھڑے رہے۔ پولیس افسران نے کاغذی کارروائی کی اور گورنمنٹ کے سارے ٹیکسز نکالے اپنا اور اپنی پوری ٹیم کا حصہ لیا اور تمام ضروری کارروائی کے بعد دیگ معیز صاحب کے حوالے کردی۔ ان کو اپنی آنکھوں اورقسمت پر یقین نہیں آرہا تھا۔ انہوں نے عزیز صاحب کوبھی آفر کی کہ یہ مکان تو بہرحال آپ ہی کا تھا۔ سالوں سے یہ خزانہ آپ کے پاس رہا۔آپ بھی اس کے حصّے دار ہیں،مگرعزیز صاحب افسردگی سے بولتے ’’نہیں میری سزا یہی ہے کہ میں اس دولت سے دُور رہوں، کیوں کہ میں نے آپ کو دھوکے

میں رکھا تھا۔ یہ آواز جو آج سب نے سُنی ہے، یہ برسوں پرانی ہے۔ میرے والد کے زمانے سے آ رہی ہے جب میں چھوٹا سا تھا، مگر میرے والد اللہ والے تھے، انہوں نے کبھی اس پر توجہ ہی نہیں دی۔ میں نے بھی اپنے والد کی طرح اس پر توجہ نہیں دی۔ میری بیوی کو اس آواز سے بہت خوف آتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس مکان کو فروخت کرنے کی بات کرتی تھی، اب جب کہ مجھے بیٹی کی شادی کے لیے رقم کی ضرورت تھی تو میں نے یہ مکان فروخت کر دیا اور آپ کو اس آواز سے لاعلم رکھا۔ ضروری نہیں تھا کہ یہ سونے کی دیگ ہی ہوتی۔ ہوسکتا تھا کہ واقعی کوئی آسیب ہوتا، جن ہوتا، جو آپ کو اور آپ کی فیملی کو کوئی نقصان پہنچاتا۔ میں نے آپ کو دھوکے میں رکھ کر یہ مکان آپ کو فروخت کیا ہے۔ اب یہ آپ کی قیمت ہے کہ یہ آسیب کے بجائے دولت ہے اس میں میرا کوئی حصّہ نہیں ہے۔ یہ میری سزا ہے۔ دولت ہمیشہ قسمت سے ملتی ہے۔ ہم برسوں اس دولت کے ساتھ رہے۔ اگر ہمارے لیے ہوتی تو اتنے عرصے میں کسی نہ کسی بہانے سے ہم کو مل جاتی، مگر ہم اس سے محروم رہے۔ اب میں اس کا حصّے دار نہیں بن سکتا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہے گا۔ ہم نے تو اس آواز کو منحوس سمجھ کر اس سے اپنی جان چھڑائی تھی، اب یہ آپ کا نصیب ہے، آپ کو مبارک ہو، میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔" یہ کہہ کر وہ افسردگی کے ساتھ واپس چل پڑے۔

معیز صاحب اور دیگر محلے والے حیرانی سے اس عجیب وغریب شخص کو دیکھ رہے تھے جس نے اپنے کیے کی سزا اپنے لیے خود ہی تجویز کر لی تھی۔ عثمان بھی اپنے والد کے ساتھ چلا گیا۔ عزیز صاحب گھر جا کر پلنگ پر ڈھے سے گئے۔ ان کو اس مکان میں آخری لمحات میں اپنے والد صاحب کا اس کمرے میں نظر آنا اور مکان فروخت نہ کرنے کی التجا یاد آ گئی۔ ان کی آنکھیں اپنی بے بسی پر ایک بار پھر نمناک ہو گئیں۔ صفیہ تک بھی یہ خبر پہنچ گئی تھی کہ اس آواز والے کمرے سے خزانہ ملا ہے۔ وہ شوہر کو دیکھ کر خوشی خوشی ان کے قریب آئیں اور بولیں۔

"سنیں۔ وہ مکان تو ہمارا تھا، وہ خزانہ برسوں سے اس میں دفن تھا، تو وہ دولت تو ہماری ہوئی نا۔"

عزیز صاحب نے غضبناک نگاہوں سے ان کو دیکھا اور سالوں کا بھرا ہوا غبار نکال دیا۔ وہ چیخ کر بولے۔

"بند کرو اپنی بکواس۔" تینوں بچے بھاگ کر آ گئے۔ آج پہلی بار انہوں نے اپنے والد کی یہ آواز سنی تھی، صفیہ کے تو پسینے چھوٹ گئے، وہ بولے جا رہے تھے۔

"برسوں کیا تم تو جب سے بیاہ کر اس گھر میں آئی تھیں تمہیں اس گھر سے نفرت تھی۔ تم نے ہمیشہ اس کو بیچنے کی بات کی۔ اتنے سال یہ مکان رہا تو صرف میری وجہ سے۔ اب بھی اگر فرحانہ کی شادی کے لیے رقم کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں کبھی یہ مکان نا بیچتا، پھر فروخت کرتے وقت بھی تم نے مجھے بہکایا کہ اس آواز کے بارے میں معیز صاحب کو نہ بتاؤں۔ میں تمہارے ساتھ جرم میں برابر کا شریک رہا۔ وہ دولت اور قسمت کی دیوی برسوں سے ہمارے دروازے پر دستک دے رہی تھی، مگر کسی کو وہ آواز سنائی نہ دی۔ صرف ایک خوفناک گڑگڑاہٹ سنائی دیتی رہی، ہم اس سے آنکھ چراتے رہے۔ اس سے نفرت کرتے رہے، خوف زدہ ہوتے رہے، کبھی آگے بڑھ کر جاننے کی کوشش نہیں کی کہ یہ آواز ہے کیا۔ کبھی فرش کو ٹھونک بجا کر نہیں دیکھا۔ چیک کرتے کہ کیسی آواز ہے۔ تم نے صفیہ بیگم اس آگ کو اور بھی بھڑکایا۔ دروازہ بند کروا کے تالا ڈلوا دیا۔ میں بھی وہی کرتا رہا جو تم کہتی رہیں۔ تم نے اپنی قسمت پر تالا ڈال لیا تھا۔ اب کس دولت کی بات کر رہی ہو۔ میرا یا تمہارا اس پر کوئی حق نہیں ہے، ہم نے دھوکے بازی کی ہے۔ اب اس کی یہ ہی سزا ہے کہ ہم اس سے دُور رہیں اور تم بھول جاؤ کہ وہاں سے کوئی خزانہ ملا ہے جو ہماری قسمت میں تھا، وہ ہمیں مل گیا ہے، چار سو گز کے مکان سے نکل کر 120 گز کے مکان میں آ گئے ہیں۔ یہ تمہاری ہی پیش کردہ تجویز تھی، جس پر میں نے آنکھ بند کر کے عمل کیا ہے وہ سونے کی دیگ ہماری قسمت میں نہیں تھی، قسمت کی دیوی ہمیں پکار پکار کے چلی گئی۔ ہم نے اس کی آواز پر کان نہیں دھرا۔ اب پچھتائے کیا ہووت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔"

صفیہ بیگم اپنی قسمت پر آنسو بہاتی رہیں اور قسمت کی دیوی معیز صاحب پر مہربان ہو گئی۔

☆......☆

ماں کی قبر



دستگیر شہزاد

بیٹی کے ہاتھوں ممتا کے قتل کی لرزہ خیز داستان، ٹوبہ ٹیک سنگھ سے

ثانیہ آبائی طور سے جدھالہ کی رہنے والی تھی، اس کے والد کا نام مدثر علی تھا۔ تقریباً بیس سال قبل ثانیہ کی شادی گھروکی میں رہنے والے شہزمان سے ہوئی تھی، بعد میں شہزمان بھلور میں کنبے سمیت آباد ہوگیا تھا۔

وقت کا پہیہ گھوما اور ثانیہ تین بچوں کی ماں بن گئی۔ دو بیٹے ہونے کے بعد بیٹی رانیہ نے آنکھ کھولی۔ رانیہ جب بہت چھوٹی تھی تبھی ایک دن شہزمان اچانک بیمار پڑ گیا۔ ثانیہ سے جتنا ممکن ہوسکا اُس نے شوہر کا علاج کرایا۔ یہ الگ بات ہے کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، آخرکار ایک دن شہزمان اپنے کنبے کو روتا بلکتا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگیا۔ سوگ کے دن بیت گئے تو گھر والوں نے ثانیہ کو دوسری شادی کے لیے راضی کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر اس کی زبان پر ہمیشہ انکار رہا۔ اس کا ایک ہی جواب تھا۔ دوسری شادی کرنے پر بیوی تو میں سگی رہوں گی، مگر بچے سوتیلے ہوجائیں گے، ثانیہ ہی راضی نہیں تھی تو کوئی کیا کرتا، ثانیہ محنت مشقت کرکے اپنی زندگی گزر بسر کرنے لگی۔ بس! اس کا بھی ایک عنصر ہی تھا جو بہن اور اُس کے بچوں کا حال لینے پھلور آتا رہتا تھا اور جتنا ممکن ہو پاتا ثانیہ کی مالی مدد بھی کردیتا تھا۔

دن جیسے تیسے بیت رہے تھے کہ ایک دن ثانیہ کا بڑا بیٹا اچانک لاپتا ہوگیا۔ لاپتا بھی ایسا کہ تمام کوششیں کرلینے کے باوجود اس کا کہیں سراغ نہیں ملا۔ پتا نہیں اُسے زمین کھاگئی یا آسمان نگل گیا۔ ثانیہ نے دل پر پتھر رکھ کر اپنا پورا دھیان باقی بچوں پر لگادیا۔ دونوں بچے پڑھنے کے لیے اسکول جاتے تھے، وقت نے پھر پاؤں پسارے، رانیہ دسویں میں پہنچ گئی اور اس کا چھوٹا بھائی آٹھویں کلاس میں۔ ثانیہ پرانے غم بھول کر نئی امیدوں کے سہارے جی رہی تھی کہ تبھی اُس پر بدنصیبی کی برق گری۔ ثانیہ کا دوسرا بیٹا سڑک کے ایک حادثے کا شکار ہوگیا اور موقعے پر ہی اس کی موت ہوگئی۔ شوہر کے بعد دونوں بیٹے بھی چلے گئے تھے۔ اب بچی تھی اس کی واحد اولاد رانیہ۔ اب ثانیہ اپنا سارا دھیان رانیہ پر لٹاتی، لیکن دل میں ڈری سی رہتی کہ کہیں یہ بھی میرا ساتھ نہ چھوڑ جائے۔ روح پر پھیلی آنسوؤں کی نمی سے رستی ہوئی انجان اور بے نام آرزوؤں کی موجودگی رات کو گرتی ہوئی اوس کی مانند ہے جو نظر نہیں آتی، لیکن آسمان کے نیچے ہر شے بھیگ جاتی ہے۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ رانیہ نے انٹر پاس کرلیا اور عمر کے بھی اٹھارہ سال مکمل کرلیے۔ جوان بیٹی ماں کے سینے پر بھاری بوجھ کی مانند ہوتی ہے۔ اسی لیے

دوسری ماؤں کی طرح ثانیہ بھی اس بوجھ کو جلد ہی اُتار دینا چاہتی تھی۔ اس کے بارے میں وہ کئی بار اپنے بھائی عنصر علی سے بھی ذکر کر چکی تھی۔ عنصر علی کی بھی دلی خواہش تھی کہ رانیہ کے ہاتھوں میں جلد مہندی لگے اور وہ کسی اچھے خاندان کی بہو بن جائے۔ ہر دوسرے تیسرے دن موبائل فون کے ذریعے بہن کی خیریت پوچھتا رہتا تھا، عنصر علی کی ثانیہ سے آخری بار 24 اکتوبر کو بات ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ کام میں ایسا مصروف ہوا کہ بہن کو فون کر کے خیر خبر لینے کا اُسے وقت ہی نہیں ملا۔ عنصر علی کو اُمید تھی کہ بہن فون کرے گی، لیکن ثانیہ نے بھی اُسے یاد نہیں کیا۔ تقریباً 8 دن بعد عنصر علی نے بھانجی کی خیریت جاننے کے لیے فون کیا تو جواب میں فون بند ہونے کا ریکارڈ پیغام سننے کو ملا۔ عنصر علی کو حیرت ہوئی کہ ثانیہ کا فون سالوں سے کبھی بند نہیں ہوا تھا، تو اب کیوں بند ہے؟ اُسے تو فون بند کرنا بھی نہیں آتا۔ ثانیہ کہیں گئی ہوتی تھی تو رانیہ کال اٹینڈ کرتی تھی۔ عنصر علی نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کر دیا کہ ہوسکتا ہے ماں بیٹی کہیں گئی ہوئی ہوں۔ اُس کے بعد عنصر علی پھر سے اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

تین چار دن بعد اُسے فرصت ملی تو پھر سے بہن کا نمبر ڈائل کیا۔ اس بار بھی اُسے وہی پیغام سننے کو ملا۔ اس کے بعد عنصر علی روزانہ ثانیہ کا نمبر ڈائل کرتا رہا، مگر اُس سے بات نہ ہوسکی، ہر بار فون بند ملا۔ اسی طرح جب تقریباً 20 دن بیت گئے اور ثانیہ سے رابطہ نہیں ہو پایا، تب عنصر علی کا ماتھا ٹھنکا، ضرور کوئی گڑبڑ ہے، بھلور جا کر پتا



کرنا چاہیے کہ کیا بات ہے؟

یہ سوچ کر اسی دن عنصر علی بھلور میں واقع بہن کے گھر جا پہنچا، لیکن گھر میں ثانیہ نہیں تھی، اسے صرف رانیہ نظر آئی اور اُس کے ہاتھوں میں اسے مہندی دمکتی ہوئی دکھائی دی۔ رانیہ کو سہاگن دیکھ کر عنصر علی حیران تھا تو رانیہ کے چہرے پر بھی بدحواسی کے سائے لہرا رہے تھے۔

عنصر علی نے سوال کیا۔ ''تیرے ہاتھوں میں یہ مہندی کیسی؟'' رانیہ نے نظر جھکا کر آہستہ سے جواب دیا۔ ''ماما! میری شادی ہوگئی ہے۔''

''کب؟''

''اسی مہینہ کی پانچ تاریخ کو۔''

''تمہاری شادی ہوگئی اور مجھے خبر تک نہیں کی گئی۔''

''ماما! سب کچھ اتنی جلدی ہوا کہ کسی کو بتانے یا بلانے کا بھی وقت نہیں ملا۔''

''اور بہن جی کہاں ہے۔'' عنصر علی نے چاروں طرف دیکھ کر پوچھا۔

''وہ تبلیغ پر چلی گئیں۔''

''کیا.....؟'' کافی کوشش کرنے کے باوجود عنصر علی رانیہ کے بیان پر یقین نہیں کر پا رہا تھا۔ دل میں ایک ہی بات اُمڈ گمڑ رہی تھی کہ بہن نے اُسے بتائے بغیر رانیہ کی شادی کر دی اور خود تبلیغ پر چلی گئی، یہ ممکن نہیں لگتا، ضرور کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔

''رانیہ تیری شادی کس سے اور کہاں ہوئی؟''

رانیہ نے سر جھکا کر دھیرے سے جواب دیا۔ ''خاور کھارو سے۔''

''وہی جو وزیر پور میں رہتا ہے اور صہیب کا چھورا ہے۔'' رانیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پلک جھپکتے ہی عنصر علی کا دل ماضی میں دور تک چلا گیا۔ ثانیہ نے اُسے بتایا تھا کہ رانیہ نے خاور کھارو کو دل میں بسا لیا ہے۔ بدنامی کی فکر کیے بغیر وہ اُس کے ساتھ گھومتی پھرتی ہے۔ دیکھنے والوں نے بتایا ہے کہ وہ تنہائی میں بھی اُس سے ملتی ہے۔ پوچھنے پر کہتی ہے خاور کھارو میرا پیار ہے اور میں اُسی سے شادی کروں گی۔ عنصر علی کو یاد آیا کہ ثانیہ نے اُس سے ایک نہیں متعدد بار کہا تھا، ایک تو خاور کھارو آوارہ اور نکھٹو ہے۔ دوم وہ ہماری برادری کا بھی نہیں ہے، اُسے داماد بنانے کا سیدھا مطلب رانیہ کی زندگی برباد کرنا ہوگا۔ جب تک میں زندہ ہوں رانیہ کو یہ من مانی نہیں کرنے دوں گی۔ میری موت کے بعد چاہے وہ کچھ بھی کرے۔ عنصر علی جانتا تھا کہ ثانیہ ضدی عورت تھی۔ اگر اُس نے ٹھان لیا تھا کہ وہ رانیہ کی شادی خاور کھارو سے نہیں کرے گی، تو نہیں کرے گی۔ وہ ٹوٹ جانے والی عورت تھی، جھکنے والی نہیں، رانیہ کی شادی کرنے کے لیے وہ کسی اچھے گھر اور دَر کی تلاش بھی کر رہی تھی، ایسی حالت میں وہ رانیہ کی شادی آناً فاناً خاور کھارو سے کیسے کر سکتی تھی، ثانیہ نے بیٹی کی شادی بھی کر دی اور تبلیغ پر بھی چلی گئی۔ یہ بات عنصر علی ہضم نہیں کر پا رہا تھا، خیالات کے بھنور سے نکل کر عنصر علی نے رانیہ سے سوال کیا۔

''شادی کے بعد تمہیں سسرال میں ہونا چاہیے، میکے میں کیا کر رہی ہو؟''

رانیہ نے سوچا سمجھا جواب دیا۔ ''اماں گھر کی رکھوالی کے لیے مجھے یہاں چھوڑ گئی ہیں، جب تک وہ تبلیغ سے نہیں لوٹتیں، میں یہیں رہوں گی، ان کے آنے کے بعد وزیر پور چلی جاؤں گی۔''

''اور تیرا گھر والا کہاں ہے؟''

''وہ کام پر گئے ہیں، شام کو لوٹیں گے۔''

''ماما! تم بیٹھو میں ناشتا بنا کر لاتی ہوں۔''

''رانیہ! آج میرے پاس وقت نہیں ہے۔'' عنصر علی نے اُسے ٹالا۔ ''میں تو تم لوگوں کی خیریت لینے کے لیے پانچ منٹ کے لیے آیا تھا۔ بہن آجائیں تو فون کر لینا، ملنے آؤں گا۔ تمہارے لیے تحفہ بھی لانا ہے۔'' اتنی بات کہہ کر عنصر علی گھر سے نکل گیا۔

☆......☆

اُس کے دل میں شک کے بادل گھوم رہے تھے، وہ سیدھا بھلور پہنچا، یہاں اُس کے کچھ واقف کار تھے۔ اُن سے ملا اور رانیہ کے بارے میں بات چیت کی تو اُن سب نے بھی رانیہ کے بیان پر اپنے شک کا اظہار کیا۔ وہ سب بھی ثانیہ کے تبلیغ پر جانے کی بات پر یقین نہیں کر پا رہے تھے۔ اُس لیے عنصر علی کے قدم تھانہ بھلور سٹی کی جانب گامزن ہوگئے۔

☆......☆

انسپکٹر حسن نثار اپنے کمرے میں موجود تھے۔ عنصر علی

نے انہیں رانیہ اور خاور کھارو کی پریم کہانی سے آگاہ کر کے شک ظاہر کیا، بہن ان دونوں کی شادی کے حق میں نہیں تھی۔ اب بہن لاپتا ہے اور رانیہ خاور کھارو کی بیوی بنی ہوئی ہے، مجھے شک ہے کہ رانیہ اور خاور کھارو نے ثانیہ کو کہیں قید کر رکھا ہے اور دونوں اپنی من مانی کر رہے ہیں۔ پولیس کی ٹولی کے ساتھ عنصر علی ثانیہ کے گھر گئے تو رانیہ گھر میں ہی تھی اور اتفاق سے خاور کھارو بھی وہاں موجود تھا۔ عنصر علی کے کہنے پر پولیس نے رانیہ کو بھی حراست میں لے لیا۔ رانیہ اور خاور کھارو کو ساتھ لے کر پولیس ٹیم تھانہ بھلور لوٹ آئی۔

''تیری ماں کہاں ہے؟'' حسن نثار نے رانیہ کو سامنے کھڑا کر کے پوچھا۔ رانیہ بُری طرح گھبرائی ہوئی تھی، پھر بھی خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

''وہ تبلیغی جماعت کے ساتھ تبلیغ کرنے کے لیے راولپنڈی گئی ہوئی ہیں۔''

''ہوں!'' حسن نثار نے ہنکارا بھرا۔ ''24 اکتوبر کو تبلیغ کے لیے راولپنڈی گئی اور اب تک واپس نہیں آئی، تو آناً فاناً میں 5 نومبر کو اُس نے تیری شادی خاور کھارو سے کیسے کر دی؟''

اس بات کا رانیہ اور خاور کھارو کے پاس کوئی اطمینان بخش جواب نہیں تھا، کچھ دیر بغلیں جھانکنے کے بعد خاور کھارو نے بگڑتی ہوئی بات کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

''سر! ہم دونوں پیار کرتے تھے، لیکن ثانیہ چاچی ہماری شادی کے خلاف تھیں۔ اسی لیے ہم نے اُن کی غیر موجودگی کا فائدہ اُٹھا کر 5 نومبر کو شادی کر لی۔ ہمارا خیال تھا ثانیہ چاچی تبلیغ سے لوٹیں گی تو انہیں ہماری شادی قبول کرنا ہی ہوگی۔ افسوس! وہ اب تک نہیں لوٹیں۔''

''پولیس کو تو بے وقوف سمجھتا ہے کہ جو تو کہے گا ہم اس کا یقین کر لیں گے۔'' حسن نثار نے دھاڑتے ہوئے ہوا میں تیر چلایا۔

''صاف صاف کیوں نہیں کہتا کہ تم دونوں نے ثانیہ کو مار کر اُس کی لاش کو ٹھکانے لگا دیا ہے۔'' اندھیرے میں چلایا گیا تیر بالکل صحیح نشانے پر لگا۔ رانیہ اور خاور کھارو کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں اور ان کی پیشانی پسینے سے بھیگ گئی۔ حسن نثار نے انہیں سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ایسے ایسے سوالوں کی بارش کی کہ وہ رونے لگے اور روتے روتے ہی اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔

23 سالہ خاور کھارو وزیر پور کے باشندے صہیب کا بیٹا تھا۔ اوسط پڑھائی کرنے کے بعد وہ آوارگی کرنے لگا۔ ماں باپ کی چھ اولادوں میں خاور سب سے چھوٹا تھا، اس لیے سب سے دُلارا تھا۔ خاور کے دو بڑے بھائیوں علیم، وسیم اور دو بہنوں کے بیاہ ہو چکے تھے۔ شادی شدہ بھائیوں کے علاوہ کنوارا بھائی نسیم بھی کام دھندے سے لگا ہوا تھا، جبکہ خاور کی زندگی عیش سے گزر رہی تھی، باپ نے اسے بائیک دلا رکھی تھی، اس پر سوار ہو کر وہ من مرضی سے گھومتا رہتا تھا۔ خاور کھارو کی رشتے داری بھلور میں تھی، جہاں وہ اکثر آتا جاتا رہتا تھا۔ اس کے رشتے دار کا گھر ثانیہ کے مکان کے عین بغل میں تھا، وہاں آنے جانے کے دوران ایک سال پہلے خاور کھارو نے رانیہ کو دیکھا اور اُس کے حسن پر فدا ہو گیا۔ اُس نے رانیہ پر ڈورے ڈالے تو وہ اُس پر ریجھ گئی، کچھ دنوں تک ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں بات کرتے رہے۔ اس کے بعد ایک دن رانیہ کو اکیلا پا کر خاور کھارو اُس کے گھر میں گھس آیا اور محبت کا اظہار صاف صاف کر دیا، بس اُس کے بعد ہی دونوں کی لو اسٹوری شروع ہو گئی۔

عشق کا جنون آگے بڑھا تو دونوں کے دل ہی نہیں جسم بھی ایک ہو گئے۔ ثانیہ کو اس بات کا علم ہوا تو وہ سکتے میں آ گئی۔ عزت کے علاوہ اُس دکھیاری کے پاس کچھ نہیں تھا اور نادان بیٹی عزت کو نیلام کرنے پر تلی ہوئی تھی، اُس نے بیٹی سے جواب طلب کیا تو رانیہ نے صاف صاف بتا دیا۔

''اماں! میں خاور کھارو کو چاہتی ہوں اور ہم دونوں جلد شادی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

ثانیہ نے رانیہ کو سمجھایا کہ خاور کھارو اُس کے لائق نہیں ہے، نہ وہ زیادہ پڑھا لکھا ہے اور نہ ہی کوئی کام دھندا کرتا ہے۔ بھلور سے وزیر پور تک ساری آوارگیاں اُس کے ہی نام درج ہیں، خاور کھارو کے ساتھ وہ خوش نہیں رہ سکتی، لیکن رانیہ نے ماں کی باتوں پر کان نہیں دھرے۔ وہ پہلے کی طرح خاور کھارو سے ملتی اور خوابوں میں رنگ بھرتی رہی۔

ثانیہ نے جب دیکھا کہ پریم دیوانی بیٹی پر نصیحتوں کا اثر نہیں ہو رہا ہے تو اُس نے بیٹی پر پابندی عائد کر دی۔ جب اُس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو ثانیہ رانیہ پر ہاتھ اُٹھانے لگی اور یہ بھی بول دیا کہ جان بوجھ کر میں تجھے جہنم میں نہیں دھکیل سکتی۔ مجھے زہر دے کر مار دے، اس کے بعد من مرضی کرتی رہنا، پھر میں تجھے دیکھنے یا روکنے ٹوکنے نہیں آؤں گی۔''

رانیہ نے یہ باتیں جب خاور کھارو کو بتائیں تو جیسے اُسے شادی کی آسان راہ سوجھ گئی، وہ مسکرا کر بولا۔

''ثانیہ چاچی! اپنی عمر جی چکیں، ویسے بھی انہیں دُکھ کے سوا ملا کیا ہے۔ اب مزید جی کر وہ کیا کریں گی، انہیں مر ہی جانا چاہیے۔ ویسے بھی جب تک وہ زندہ ہیں۔ ہماری شادی نہیں ہو سکتی، اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے کہ ماں کا انتخاب کرتی ہو یا میرا۔''

رانیہ پر عاشقی کا ایسا رنگ چڑھا ہوا تھا کہ اُس نے ماں کی بجائے خاور کھارو کا انتخاب کر لیا۔ اس کے بعد ان دونوں نے مل کر ثانیہ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ قتل جیسا سنگین جرم کر کے لاش ٹھکانے لگا پانا اکیلے خاور کھارو کے بس کی بات نہیں تھی، اس لیے اُس نے اپنے دوست واجد کو سازش میں شریک کر لیا۔ واجد پھلور میں ہی رہتا تھا اور اس کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ قتل کرنا تو بہت آسان تھا، لیکن لاش ٹھکانے لگانا ذرا مشکل تھا، اِس لیے خاور کھارو اور واجد نے لاش ٹھکانے لگانے کی تیاری پہلے کی۔ 24 اکتوبر کی صبح ہی ان دونوں نے پھلور روڈ پر واقع ایک خشک نالے میں لاش دفنانے کے لیے قبر نما گڑھا کھود دیا۔

جب قبر تیار ہوگئی تو خاور کھارو اور واجد ایک بوری نمک خرید لائے، اس کے بعد خاور نے رانیہ کو فون کیا کہ اپنی ماں کو میتراں والا لے آؤ، وہاں سے آگے کا کام ہم سنبھال لیں گے۔ منصوبے کے مطابق رانیہ نے چائے بنائی اور اس میں نیند کی گولیاں گھول دیں۔ رانیہ نے وہ نشیلی چائے ماں کو پلائی۔ اس کے بعد بولی۔

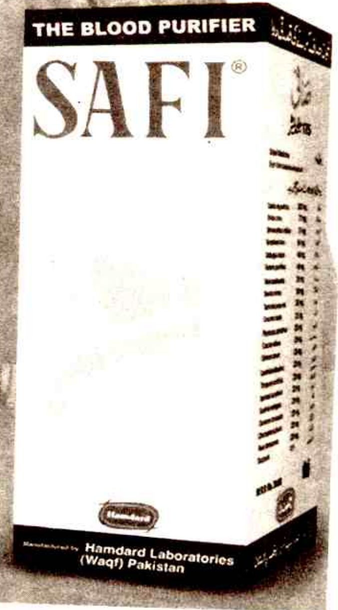
''اماں! تم ٹھیک کہتی تھیں خاور میرے لائق نہیں ہے، میں نے تعلقات توڑنے کے لیے اُسے میتراں والا بلایا ہے، تم بھی ساتھ چلو تو بہتر ہوگا۔''

یہ ثانیہ کے دل کی بات تھی، وہ خوشی خوشی رانیہ کے ساتھ اُس مقام پر چلی گئی۔ میتراں والا کے سنسان مقام پر خاور کھارو اور واجد پہلے سے موجود تھے۔ وہ ثانیہ کو باتوں میں اُلجھا کر کھودی گئی قبر کے پاس لے گئے، تب تک ثانیہ پر نیند کی گولیوں نے اثر کرنا شروع کر دیا تھا، اُس سے نہ تو ٹھیک سے کھڑا ہوا جا رہا تھا اور نہ ہی وہ بات کرنے کی حالت میں تھی۔ ثانیہ کی اس حالت کا فائدہ اُٹھا کر رانیہ نے اُسے دبوچ لیا، واجد نے اُس کے پاؤں پکڑ لیے اور خاور کھارو نے ثانیہ کے دوپٹے سے اُس کا گلا گھونٹنا شروع کر دیا، ثانیہ سانس رکنے سے بے ہوش ہوگئی، لیکن وہ مری نہیں۔ اِس لیے واجد اور خاور کھارو نے بائک کے کلچ وائر سے اُس کا گلا گھونٹ دیا۔ ثانیہ مر گئی تو قاتلوں نے اُس کی لاش گڑھے میں ڈال کر اُس پر نمک کی بوری اُلٹ دی اور پھر گڑھے کو مٹی سے پاٹنے کے بعد وہ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

اس کے بعد 5 نومبر کو فیملی کورٹ کی اجازت سے رانیہ اور خاور کھارو نے شادی کر لی تھی۔ ملزموں کے بیان کے بعد انہی کی نشاندہی پر پولیس کی پوری ٹیم نے گڑھا کھود کر ثانیہ کی لاش نکلوائی جس کے باقیات ہی رہ گئے تھے، باقی سب کچھ سڑ گل کر مٹی میں مل چکا تھا، اس کے علاوہ ملزموں کے پاس سے مقتولہ کا موبائل فون، ٹوٹا ہوا سم کارڈ اور سونے کی ایک انگوٹھی بھی برآمد کر لی گئی اور واجد کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ پولیس نے ثانیہ کے بھائی عنصر علی کی تحریری بنیاد پر مقدمہ قتل 302 کے تحت ایف آئی آر درج کر کے رانیہ و خاور کھارو کو عدالت میں پیش کر کے جیل بھیج دیا، تادم تحریر رانیہ اور خاور کھارو جیل میں تھے اور نابالغ واجد کو بچوں کی جیل لاہور بھیج دیا گیا تھا۔

جس بیٹی کو پالنے کے لیے ثانیہ نے زندگی بھر تکلیفیں اٹھائیں، بیوہ ہونے پر صرف اس لیے کہ بچوں کو سوتیلے پن کا احساس نہ ہو۔ شوہر کے بعد دونوں بیٹوں کے چلے جانے سے ثانیہ جو صرف اس لیے جی رہی تھی کہ اُس کی بیٹی کا مستقبل روشن ہو سکے، اُسی بیٹی نے اپنی ہوس کی تکمیل کے لیے ماں کی قبر کھود ڈالی۔ عام آدمی اِس لحاظ سے اچھا ہوتا ہے کہ اُس کی موت پر بڑے آدمی کی موت کی طرح کوئی بہت بڑا خلا پیدا نہیں ہوتا، بلکہ زیادہ سے زیادہ ایک چارپائی، ایک کمرے یا ایک جھونپڑی کی جگہ خالی ہوتی ہے جسے بڑی آسانی سے پُر کیا جا سکتا ہے۔

☆......☆



THE BLOOD PURIFIER
SAFI®
Hamdard Laboratories
(Waqf) Pakistan

ناگن

اعجاز احمد نواب

زندگی صرف وہی تو نہیں جو ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ زندگی تو وہ بھی ہے، جسے ہم صرف سوچتے ہیں۔ نیا سلسلہ "ناگن۔" آپ کو یقیناً ایک نئی دنیا، نئی زندگی میں قدم رکھنے پر مجبور کردے گا۔ ہزاروں سال کی تپسیا پر پھیلا، زندگی کا نیا رنگ۔ ناگن کے روپ میں، آپ کو ضرور تسخیر کرے گا

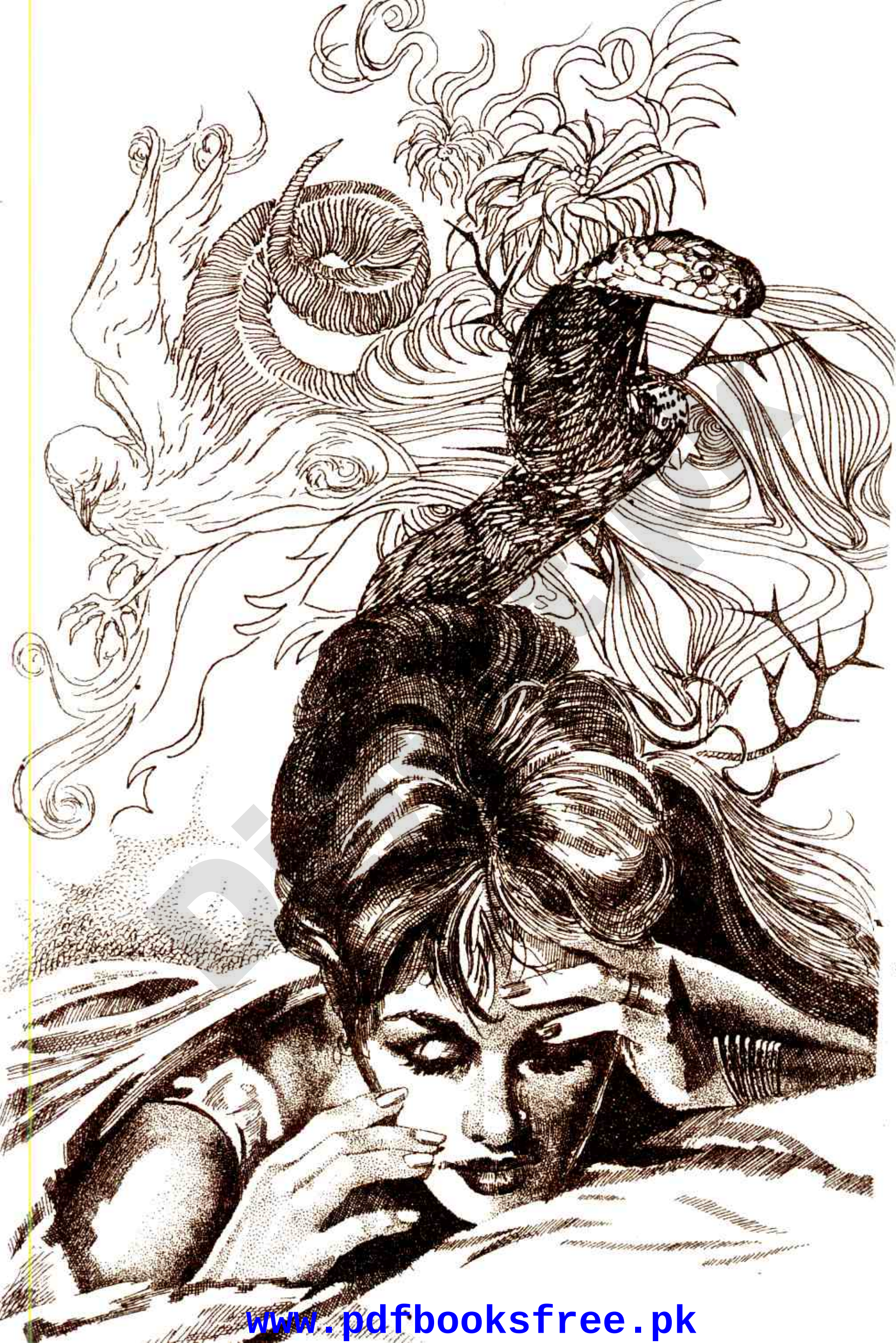
قسط نمبر: 9

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

جوگی مہاراج کے پردادا کو اس کے گرو نے مرتے سمے شیش ناگ کا جوڑا دان کیا تھا اور بتایا تھا کہ ان ناگوں کے سر پر تاج کے نشان ہیں اور آنکھوں میں سنہری روشنی۔ آنکھوں کی سنہری روشنی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بادشاہ سانپ ہیں۔ اگر یہ سو سال تک زندہ رہ گئے تو یہ نہ صرف انسان کے روپ میں آ جائیں گے، بلکہ ہر جاندار کا روپ دھار سکیں گے۔ زمین کی تہوں میں چھپے خزانے ان کی دسترس میں ہوں گے اور اس وقت یہ جس کے قبضے میں ہوں گے یہ اسی کے حکم کے غلام ہوں گے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے ہر ساون میں اماوس کی رات ناگ دیوتا کے حضور ایک مرد اور ایک عورت کی قربانی دی جائے۔ جان جوکھوں میں ڈال کر ان کے پرکھوں نے ان ناگوں کو ناز و نعم سے پالا تھا اور نگہبانی کا یہ عمل اب جوگی مہاراج کے حصے میں آ چکا تھا۔

وہ رات بھی اماوس کی رات تھی اور ان ناگوں کی عمر کے سو سال مکمل ہونے جا رہے تھے۔ جوگی مہاراج نے یہ کہانی بیس سال سے ساتھ رہنے والے چیلے صابو کو سنائی تو اس کی نیت میں کھوٹ آنے لگا۔ گرو مہاراج ہاتھ میں خنجر تھامے ناگ منتر کا جاپ کر رہے تھے اور صابو انہیں طنزیہ نظروں سے دیکھ کر زیر لب مسکرا رہا تھا۔ جاپ مکمل کر کے جوگی مہاراج نے بلی کا عمل مکمل کیا۔ دونوں ناگ اور ناگن انسانی خون میں اشنان کر رہے تھے اور سرخ زبانیں نکال کر خون چاٹ رہے تھے۔ جوگی مہاراج بیٹھے یہ منظر غور سے دیکھ رہے تھے، یہی وہ لمحہ تھا جس کا صابو کو انتظار تھا۔ اس نے پلک جھپکنے میں خنجر کا وار مہاراج کی گردن پر کیا اور گرو مہاراج پتھرائی آنکھوں سے اپنے چیلے کو دیکھتے رہ گئے۔ صابو لاش ٹھکانے لگا کر جب کمرے میں آتا ہے تو پٹاری والی جگہ ایک خوب صورت نوجوان مرد اور سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی موجود تھے۔ صابو انہیں کہتا ہے کہ تم میرے غلام ہو۔ وہ ان کے نام ارجن اور شکنتلا تجویز کرتا ہے۔ تب ارجن اور شکنتلا اسے بتاتے ہیں کہ انہیں معلوم ہے کہ صابو ان کا گرو مہاراج نہیں بلکہ ایک چیلا ہے۔ تب صابو کے خون سے شیش ناگ کا یہ جوڑا اپنی پیاس بجھا کر شہر کا رخ کرتا ہے۔

لوگ اسے دیکھ لیتے ہیں اور اس پر تیل ڈال کر آگ لگا کر مار ڈالتے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر شکنتلا غصے میں آ جاتی ہے اور کہتی ہے۔ "ارجن کے قاتلو! تم نے میرے ناگ کی ہتھیا کر کے بڑا انیائے کیا، تم ناگن کی طاقت اور انتقام سے واقف نہیں، شکنتلا تمہاری زندگیوں میں زہر گھول دے گی۔ میں اس گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی، تم موت مانگو گے لیکن موت بھی تم سے روٹھ جائے گی۔ ایک ایک کو تڑپا تڑپا کر ماروں گی میں پھر آؤں گی اور تمہارے لیے قیامت بن کر آؤں گی۔"



شکنتلا گاؤں کے لوگوں سے جان بچا کر بھاگتی ہے اور جنگل میں موجود ریاست تابانہ کے مہاراجہ رام ناتھ کے قافلے تک جا پہنچتی ہے۔ مہاراجہ رام ناتھ اس کی خوب صورتی دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور اسے اپنی کنیز بنانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔
مہارانی ماریہ مہاراجہ رام ناتھ کو بتاتی ہے کہ شکنتلا ناگن ہے اور انسانی روپ میں انہیں بےوقوف بنا رہی ہے اور اس کے لیے وہ چاہیں تو شاہی پنڈت گروزائن سے تصدیق کر سکتے ہیں۔ مہاراج اس سے کہتے ہیں کہ اگر شکنتلا ناگن ہوئی تو اس کو آگ میں جلا دیا جائے گا اور اگر یہ الزام جھوٹا ثابت ہو گیا تو ماریہ کو اسی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ ایک ہجوم شکنتلا کی رہائش گاہ پہنچتا ہے۔ مہارانی ماریہ اپنے لباس میں چھپا کر لایا جانے والا آئینہ اچانک شکنتلا کے سامنے کر دیتی ہے جس میں ایک بڑی سی ناگن لوگوں کو نظر آتی ہے۔ سپہ سالار بلگرام شکنتلا کے بجائے راجہ رام ناتھ کو گرفتار کر لیتا ہے۔
سامری شکنتلا، بلگرام اور پریہ تابانہ کی حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کر چکے تھے۔ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہ ہو سکتا تھا۔ ہر طرف ظلم کا راج تھا۔ شکنتلا جاپ کے ذریعے کالی ماتا کی مہان شکتی کے حصول میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ شکنتلا اب صرف ناگن نہ تھی بلکہ جادوگرنی بن چکی تھی۔
شکنتلا سبز آنکھوں اور گھنگریالے بالوں والے نوجوان کو دیکھ کر مبہوت رہ جاتی ہے۔ وہ شکنتلا کو بتاتا ہے کہ وہ جنات کے بادشاہ خسکران کا بیٹا شکران ہے اور تمہارا کوئی جادو مجھ پر کارگر نہیں ہوگا۔
شکنتلا خسکران کو دوست بنانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ وہ بھی اس کا ساتھ دینے پر راضی ہو جاتا ہے۔ سامری گروزائن کو منڈل جاپ سے باز رکھنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے گرو شداد کی روح سے مدد طلب کرتا ہے۔ سامری جادوگر کی ملاقات خسکران سے ہوتی ہے۔ شکنتلا، شکران اور سامری تینوں گروزائن کے منڈل کے پاس جا پہنچتے ہیں لیکن گروزائن اپنا جاپ مکمل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔
شکنتلا کی ساری شکتیاں معطل ہو گئی تھیں اب وہ بالکل ایک عام سی کمزور بےبس لڑکی تھی۔ گروزائن شکنتلا سے کہتا ہے کہ چنکار سے بولو کہ آئندہ تمہیں مالکن نہ کہے بلکہ براہ راست میرا حکم مانے۔
ادھر پریہ حیران تھی کہ کئی دن گزر گئے نہ شکنتلا واپس آئی اور نہ سامری یا خسکران۔ پریہ کو پتا تھا گروزائن شکنتلا کو غلام بنانا چاہ رہا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ شکنتلا کا غلام بن جانا اس کے حق میں بہتر ہے تاکہ وہ حکومت پر قبضہ کر کے ملکہ بن جائے تب اچانک خسکران آتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ گروزائن تیرتھ جاپ میں کامیاب ہو کر شکنتلا کے جسم و جان اور اس کی تمام شکتیوں پر قابض ہو گیا ہے اور سامری بھی اس کے پاس قید ہو گیا ہے، یہ سن کر وہ خوش ہو جاتی ہے۔ سامری کو ہوش آتا ہے تو سامنے گروزائن اور لکشم ناتھ موجود تھے۔ تب وہ اپنے دیوتا کارتیکا کو اپنی سہایتا کے لیے پکارتا ہے، گروزائن منتر پڑھتا ہے اور نیلی آگ کے شعلے سامری اور شکنتلا کو گھیر لیتے ہیں۔ شکنتلا گروزائن کو بھی اس آگ میں کھینچ لیتی ہے اور ان کے جسم جلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جب شکنتلا کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ ایک ویران اور بنجر جگہ پر موجود تھی۔ اس کا جسم بری طرح جلا ہوا تھا اور زخموں میں پیپ پڑ چکی تھی، اسی حالت میں شکنتلا تڑپتی سسکتی آبادی تک پہنچتی ہے جہاں اس پر کتے حملہ کر دیتے ہیں اور وہ بےہوش ہو جاتی ہے۔ جب اس کو ہوش آتا ہے تو وہ ایک گھر میں موجود ہوتی ہے ایک نوجوان لڑکا، لڑکی اور ادھیڑ عمر عورت اور مرد موجود تھے۔ علاج اچھی خوراک اور مکمل آرام سے اس کے زخم بھرنے شروع ہو چکے تھے۔ لڑکی سندری شکنتلا کی دوست بن گئی ہے۔ شکنتلا دیکھتی ہے کہ سندری کا بھائی گگن رات گئے چپکے سے روز باہر نکل جاتا ہے۔ شکنتلا کو خود میں خون کی کمی محسوس ہوتی ہے اور وہ چنکار کو یاد کرتی ہے۔ وہ اس وقت حیرت زدہ رہ جاتی ہے جب چنکار کو اپنے سامنے کھڑا دیکھتی ہے، وہ سوچتی ہے کہ اس کو کھوئی ہوئی شکتیاں واپس مل گئی ہیں۔
شکنتلا کھوئی ہوئی شکتیاں پا کر کھلکھلا اٹھتی ہے۔ گاؤں کے کھیتوں سے نوجوان کی لاش ملتی ہے جس کی شہ رگ کاٹ کر اس کا خون پی لیا گیا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس بات سے بہت خوف زدہ ہوتے ہیں۔ دلاور نامی شخص جس کو سادھو کوٹھاری نے اپنے بس میں کیا ہوا تھا۔ کوٹھاری دلاور سے کہتا ہے کہ تمہارے ذریعے ایک جن میرے قبضے میں آئے گا جو میرے تمام کام پل بھر میں کر دے گا۔ پھر تو بھی کوٹھاری کا چیلا بن کر عیش کرنا۔ پریہ خسکران اور دونوں کی مدد سے حکومت کر رہی تھی اور دونوں کو خوش رکھتی تھی۔ تب ایک روز خسکران شکنتلا کی تلاش میں نکلتا ہے اور پھر واپس نہیں آتا اور پھر ایک روز وہ بلگرام کو بھی قید خانے میں ڈال دیتی ہے جہاں بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ کر بلگرام بھی بےبسی کی موت مارا جاتا ہے۔
شکنتلا کو چنکار بتاتا ہے کہ سندری کے بھائی گگن کو ایک چڑیل خوب صورت لڑکی بن کر اپنے جال میں قید کر چکی ہے اور روزانہ تھوڑا تھوڑا کر کے اس کا خون پیتی ہے۔ چنکار شکنتلا کو اس جگہ لے جاتا ہے جہاں گگن مدہوشی کی حالت میں تھا اور وہ لڑکی اس کا خون

پینے کو اس پر جھکی ہوئی تھی۔ تب وہاں اچانک شکنتلا نمودار ہوتی ہے اور کالی دیوی کا جاپ پڑھ کر اس چڑیل کو آگ لگا کر ہلاک کر دیتی ہے۔ گگن کو ہوش آتا ہے تو وہ اسے سب بتا کر گھر واپس جانے کا کہتی ہے۔

سپیرا اکروندیا اور اس کے چیلا شیش ناگ کو اپنے بس میں کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ بڑی تپسیا میں مصروف تھے۔ کوٹھاری دلاور کو ساتھ لے کر قبرستان پہنچتا ہے اور کدال سے ایک قبر کی مٹی ہٹاتا ہے۔ قبر سے جواں سالہ عورت کی لاش نکلتی ہے۔ دلاور اس کے بال کاٹ کر اپنے پاس محفوظ کر لیتا ہے۔ وہاں سے کوٹھاری اسے ایک مکان کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے اور دلاور سے کہتا ہے کہ اس مکان میں میاں بیوی اور ان کی ایک جواں سال بیٹی ہے، بوڑھے کو باہر بلا کر میں ابھی قتل کرتا ہوں، جبکہ لڑکی کو تو ہی لائے گا میرا ہاتھ لگانا منع ہے۔ اس کے بعد دلاور دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اندر سے ایک ادھیڑ عمر شخص باہر نکلتا ہے، کوٹھاری اس پر حملہ کر دیتا ہے اور اسے گردن سے دبوچ لیتا ہے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر دلاور مکان میں گھس جاتا ہے۔ جہاں ایک کمرے میں نوجوان دوشیزہ موجود تھی اور دروازے کی آواز سے نیند سے بیدار ہوئی لگتی تھی۔ وہ دلاور کو دیکھ کر خوف زدہ ہو کر چلاّنے لگتی ہے۔

دلاور اس لڑکی کو بے ہوش کر کے باہر کوٹھاری کے پاس لے آتا ہے، کوٹھاری اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہے، اور دلاور کے ساتھ اپنی شکتی کے ذریعے ایک بنجر اور بیابان علاقے میں پہنچ جاتا ہے۔ اور اس دوشیزہ کو ایک چتا پر لٹا کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیتا ہے۔ لڑکی ہوش میں آ کر رونے گڑگڑانے لگتی ہے۔ دلاور کو اس پر ترس آ جاتا ہے اور وہ کوٹھاری پر حملہ کر دیتا ہے۔ کوٹھاری غصے میں آ کر اسے ہاتھ پاؤں ہلانے کی طاقت سے محروم کر دیتا ہے اور پھر اپنے جنتر منتر میں مشغول ہو جاتا ہے، تب ایک نیلا شعلہ آسماں سے زمین کی طرف آتا ہے جس کے ساتھ دھواں سا تھا، وہ دھواں جو کہ حکمران جن تھا، آہستہ آہستہ بوتل میں داخل ہو جاتا ہے۔ کوٹھاری ڈھکن لگا کر بوتل کا منہ بند کر دیتا ہے اور خوشی میں ناچنا شروع کر دیتا ہے اور دلاور سے کہتا ہے کہ کوٹھاری آج بہت بڑی شکتی بن گیا ہے، ایک جن اس کے قابو میں آ گیا ہے جو اس کے سارے کام کرے گا۔

کوٹھاری اس سارے عمل کے بعد سامان سمیٹ کر اٹھنے کی تیاری کر رہا ہوتا ہے کہ راجہ ہری داس کے سپاہی اسے گرفتار کر لیتے ہیں۔ راجہ ہری داس عیاش ہونے کے باوجود ایک رحم دل اور رعایا کا خیال رکھنے والا حکمران تھا۔ اس نے جادوگر اور جادوگرنیوں کے



خلاف سخت قانون بنایا ہوا تھا جس کی وجہ سے پوری راجدھانی میں جادو ٹونے کرنے والا نہیں تھا۔ کوٹھاری کئی بار اس جرم میں گرفتار ہوا تھا لیکن وہ ہر بار فرار ہو جاتا۔ اس بار اسے گرفتار کر کے ہری داس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور سزا کے طور پر اس کے ہونٹ سی دیے گئے تھے۔ ہری داس کو کوٹھاری کے تھیلے سے برآمد ہونے والا سامان دکھایا جا رہا تھا جس میں ایک شیشے کی بوتل بھی تھی جس میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ راجہ اس بوتل کو کھولنے کا حکم دیتا ہے اور چند ہی لمحوں میں میدان میں خسکران جن موجود تھا جو بوتل میں بند تھا۔ تمام لوگ اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ خسکران کوٹھاری کو آزاد کروا دیتا ہے اور وہ اسے پوری ریاست کو آگ لگا دینے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر گگن شکنتلا کے متعلق سوچتا ہے کہ شکنتلا کو کیسے اس چڑیل کا پتا چلا اور کیسے اسے ختم کر دیا۔ شکنتلا گگن سے رات کو گاؤں سے باہر بیری کے درختوں کے پاس ملنے کے لیے کہتی ہے۔ شکنتلا کو خون کی پیاس بے تاب کرتی ہے، لیکن گگن کے گھر والوں کے احسانات کی وجہ سے وہ گگن کا خون پینا مناسب نہیں سمجھتی۔ وہ رات کے وقت سانپ کے روپ میں ایک گھر میں داخل ہو جاتی ہے اور ایک عورت کے خون سے اپنی پیاس بجھاتی ہے۔ ان خونی وارداتوں سے گاؤں میں کہرام مچ جاتا ہے۔ پنچایت میں فیصلہ کیا جاتا ہے کہ گاؤں میں نئے آنے والوں کو علاقہ بدر کر دیا جائے اور وہ لوگ گاؤں کے مکھیا گگن کے پتا سے شکنتلا کو بھی علاقے سے باہر نکالنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے)

''**لیکن** شکنتلا میری ذاتی مہمان ہے۔'' موراد یا اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔

''جتنے آدمیوں کو نکالا جا رہا ہے وہ کسی نہ کسی کے مہمان ہی تھے۔'' ایک بوڑھا شخص بولا۔

''لیکن یہ عورت ذات ہے اور مظلوم بھی۔ اس کا کوئی آگا پیچھا نہیں یہ انیائے ہوگا۔'' موراد یا گاؤں والوں کا رویہ دیکھ کر نرم انداز میں بولا۔

''تم اس گاؤں کے مکھیا ہو موراد یا۔'' بوڑھا شخص جو معتبر آدمی معلوم پڑتا تھا سخت لہجے میں بولا۔ ''تین خون ہو چکے ہیں کیا یہ انیائے نہیں؟''

''لیکن شکنتلا میری ذمے داری ہے!''

''یہ کوئی بات نہ ہوئی۔'' ایک گنجے اور گول سر والا ہندو جس کے سر کے درمیان چوٹی تھی مخاطب ہوا۔ ''دوسروں کے فیصلے تو تم بڑے سر اٹھا کر کرتے ہو اپنے گھر کی بات آئی تو تمہارے انصاف کا جنازہ نکل گیا ہے! اگر تم اپنی بات منوانا ہی چاہتے ہو تو اس چھوری کے اپنے چھورے گگن کے ساتھ پھیرے کروا دو۔''

''ہاں...... یہ بات البتہ دل کو لگتی ہے۔'' بوڑھے شخص نے دوبارہ گفتگو میں حصہ لیا۔

☆......☆

شکنتلا گہری سوچ میں گم تھی۔ اس گاؤں میں رہنے کا حکم ناگ دیوتا کا تھا، جبکہ گاؤں والے اسے گاؤں سے نکالنے کے درپے تھے! یا پھر گگن سے اسے پھیرے لینے پڑتے ہیں جبکہ انسانی خون پینا اس کی فطرت اور ضرورت تھی۔ یہ وارداتیں تو وہ مسلسل کرتی رہے گی! پھر اب کیا کیا جائے اس وقت وہ صحن میں بچھی ایک چارپائی پر لیٹی تھی۔

''چمتکار......'' اس نے آواز دی۔

''جی مالکن......'' چمتکار فوراً اسے سامنے کھڑا نظر آیا۔

''تو ہی کچھ بتا...... کوئی مشورہ دے کہ اب میں کیا کروں، گاؤں چھوڑ دوں یا گگن سے پھیرے لے لوں......؟''

''بیاہ کرنے یا نہ کرنے سے تجھے کوئی فرق نہیں پڑتا مالکن...... پوتر پاپ کی تیرے لئے کوئی حیثیت نہیں، بہتر یہی ہے کہ گگن سے پھیرے لے لو اور حالات کا جائزہ لو۔'' یوں جھٹ پٹ ہی گاؤں کے بندے اکٹھے کر کے پنڈت جی کو بلا کر شادی کی رسومات ادا کر دی گئیں۔ اسی رات شکنتلا دلہن اور گگن دولہا کے روپ میں آمنے سامنے آ گئے! گگن کو تو اپنے نصیب ایسے کھلنے کی قطعاً امید نہ تھی۔ وہ شکنتلا کے آگے بچھا بچھا جاتا۔ اب وہ کام بھی کرنے لگا تھا اور والدین کا مطیع و فرماں بردار بھی ہو چکا تھا، لیکن شکنتلا جو رانی مہارانی کے مزے لے چکی تھی، وہ گگن کے ساتھ کچھ لمحات کو پر کیف تو بنا سکتی تھی لیکن اس ماحول میں خود کو سمو نہ سکی اس کا من بیاکل رہنے لگا۔ اسے بے چینی محسوس ہونے لگی اور پھر ایک دن اچانک

ایک ایسا واقعہ وقوع پذیر ہوا جس نے شکنتلا کی ٹھہری ہوئی زندگی میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ گگن جو اس کا پتی تھا ایک دن اس کو کسی انتہائی زہریلے سانپ نے ڈس لیا۔ لوگ اس کی چارپائی کاندھوں پر اٹھائے جب گھر پہنچے تو کہرام برپا ہو گیا! سندری اور اس کی ماں یہ سمجھ کر کہ وہ مر چکا ہے اپنا منہ سر پیٹنے لگیں۔ ان کے بین سن کر شکنتلا چنی ٹھیک کرتی کمرے سے باہر آئی تو صحن میں خاصا رش ہو رہا تھا، تھوڑی دیر کے بعد اسے اصل صورتحال کا علم ہوا تو وہ دل ہی دل میں گھبرا گئی، کیوں کہ اسے دیکھتے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ گگن کو سخت زہریلے سانپ نے ڈسا ہے اور اگر فوری طور پر کچھ نہ کیا گیا تو وہ مر جائے گا۔

لیکن شکنتلا عجیب حالات میں آ پھنسی کہ اگر فوری طور پر گگن کی جان بچانے کے لئے سانپ کو واپس بلاتی ہے تو اس کے ناگن ہونے کا راز فاش ہو جاتا ہے اور اگر خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتی ہے تو بھی گگن کی موت کی صورت میں اسے گگن کی چتا میں بٹھا کر ستی کر دیا جائے گا۔ دونوں صورتوں میں اس کی جان پر بن سکتی ہے اور اسے آگ میں جلا جا سکتا ہے۔ جوں جوں اس کی سوچ گہری ہوتی جا رہی تھی اس کے ماتھے پر ایک پسینہ آ رہا تھا ایک پسینہ جا رہا تھا۔

اسی کشمکش میں خاصی دیر ہو گئی۔ گگن کی چارپائی صحن میں رکھی تھی لمحہ بہ لمحہ اس کا جسم نیلا پڑتا جا رہا تھا، اس کی حالت بگڑ رہی تھی۔

اسی اثناء میں کسی کی زبانی گگن کے باپ مورادیا کو پتا چلا کہ گاؤں سے باہر سرائے رام چند میں ایک سپیرا ٹھہرا ہوا ہے فوراً بندے دوڑائے گئے کہ اسی سپیرے کو بلا لائیں۔

شکنتلا فوراً ٹھٹکی کہ ہو نہ ہو یہ وہی سپیرا ہو گا جو کھڑ ماؤنڈ کے کھنڈرات میں اس سے ٹکرایا تھا۔ دو خطرے جو اس نے سوچے تھے یہ تو ان سے بھی مختلف اور خطرناک بات ہو گئی اور پھر وہی ہوا جس کا اسے خدشہ تھا کروندیا اپنے چیلے کے ساتھ آ پہنچا۔ آتے ہی اس نے گگن کا بغور معائنہ کیا۔

''کتنا سمے بیت چکا ہے بی بی؟'' وہ چارپائی کے پاس کھڑی اس کی ماں سے مخاطب ہوا۔

''مہاراج کچھ کیجئے۔'' گگن کی ماں ہاتھ جوڑ کر کروندیا کے سامنے کھڑی ہو گئی!

''خاصی دیر ہو چکی ہے میرے اکلوتے بیٹے کو بچا لیجیے۔''

''مائی تم لوگوں نے بہت دیر کر دی کوشش کرتا ہوں ویسے بہت مشکل ہے۔ یہ کہتے ہوئے کروندیا نے اپنے جھولا زمین پر رکھا اور بین ہونٹوں سے لگا لی اس کا چیلا بھی اس کی تقلید کر رہا تھا۔

اچانک کروندیا بری طرح چونک پڑا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

''کیا بات ہے مہاراج'' مورادیا نے کروندیا سے پوچھا کیوں کہ دیر ہو رہی تھی اور گگن کا جسم آہستہ آہستہ نیلا پڑ رہا تھا۔

''شش...... شش......'' کروندیا سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ تم لوگوں میں سے وہ صحن میں کھڑے تمام لوگوں کو بھرپور نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ کوئی ایک آدمی شیش ناگ ہے اور یا پھر تم میں سے کسی کے کپڑوں میں شیش ناگ چھپا ہوا ہے مجھے بہت قریب سے اس کی بو آ رہی ہے۔

کروندیا کی بات سنتے ہی لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ سانپ کا خوف سانپ سے زیادہ ہوتا ہے لوگ بکھرنے لگے کہ مبادا ساتھ والا شخص ہی سانپ نہ ہو اور پھر اپنے اپنے کپڑے جھاڑتے ہوئے گھروں کو بھاگ نکلے تھوڑی ہی دیر میں مورادیا اور اس کی بیوی کے علاوہ صرف سندری اور شکنتلا رہ گئے۔ کروندیا آہستہ آہستہ سب کے چہروں کو بغور دیکھنے لگا، بالآخر شکنتلا کے دمکتے چہرے پر اس کی نگاہ آ کر ٹھہر گئی۔ یہ لڑکی تمہاری کیا لگتی ہے؟

یہ بہو ہے ہماری۔ پتنی ہے اس بدنصیب کی، مورادیا گگن کے نیم مردہ جسم کی طرف دیکھ کر حسرت سے بولا۔

''ہوں......'' مورادیا ہوں کو لمبا کرتے ہوئے شکنتلا کے قریب آیا۔ اب شکنتلا کو یقین آ گیا کہ بھانڈا پھوٹ گیا ہے۔ چلو جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

''یہی سانپ ہے......'' مورادیا کروندیے نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا تو سب لوگ اچھل پڑے...... ہیں۔ سندری ڈر کر اپنی ماں کے پیچھے ہو گئی مورادیا حیرت سے شکنتلا کو دیکھنے لگا۔

”تو...... تو ہی وہ موذی سانپ ہے جس نے اس نوجوان کو ڈسا۔“ کروندیا غیر محسوس انداز میں شکنتلا کی طرف بڑھا۔ اس کا چیلا اس کی آڑ میں ہو گیا۔

”ہاں......“ شکنتلا آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ میں سانپ تو ضرور ہوں، لیکن اسے ڈسا میں نے نہیں۔

”ارے کلموئی...... پتنی تو...... پتی پرستی ہو جاتی ہے اور تو اسے ہی کھا گئی! سات گھر تو ڈائن بھی چھوڑ دیتی ہے۔“ کروندیا درشت لہجے میں بولا۔

دو باتیں یاد رکھ سپیرے۔ شکنتلا کے اندر کی ملکہ پھن اٹھانے لگی! میں نے گگن کو نہیں ڈسا اور نہ ہی تو مجھے ڈس سکتا ہے۔ جا اپنا رستہ ناپ نہیں تو پچھتانے کے لیے بھی وقت نہ ملے گا۔

میرا نام کروندیا ہے۔ سانپ کے بل پر ناک رکھ کر سانس کھینچوں تو سانپ باہر آ جائے، میرے ہاتھوں میں آ کر زہریلے سے زہریلا سانپ بھی رسّی بن جاتا ہے اور زہر کروندیا کیلئے امرت ہے تجھی نا سمجھ۔

نہ شکنتلا بل کے اندر ہے نہ تیرے ہاتھ آئے گی اور نہ تجھے زہر سے ماروں گی۔ بہتر یہی ہے کہ پہلے گگن کو ٹھیک کر دیا جائے تو اتنا بڑا سپیرا جوگی ہے تو پہلے اس کی جیون ڈور بچا! یا پھر پیچھے ہٹ جا میں بچاتی ہوں۔

وشوں کی تپسیا کے بعد ہاتھ آیا یہ موقع اب نہ ضائع کروں گا گگن چھوڑ پورا گاؤں مر جائے۔ کروندیا نے بین ہونٹوں سے لگائی اور سرعت سے اس کی خوب صورت لے بکھیرنے لگا۔ اس کی بین کی آواز کچھ ایسی سحر انگیز تھی کہ ایک بار شکنتلا جھومنے لگی پھر اس نے سر کو زور سے جھٹکا اور بولی۔

”چمتکار......“

”جی مالکن......“ آواز اُبھری۔

”اس ٹنٹنے کو ختم کر دو۔“

”جیسا تیرا حکم مالکن۔“

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کروندیا زور سے تڑپا جیسے اس کے جسم پر کسی تیز دھار آلے سے وار کیا گیا ہو۔ ساتھ ہی اس کے پہلو سے خون کا فوارہ نکلا اور پھر کروندیا پر دھڑا دھڑ نادیدہ خنجروں کے وار شروع ہو گئے!!

اور وہ دیوانہ وار بھاگنے اور گرنے لگا۔ لمحوں میں جگہ جگہ سے کٹی پھٹی لاش گگن کی کھاٹ کے قریب پڑی تھی۔ اس دوران اس کے چیلے نے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن شکنتلا نے کچھ پڑھ کر انگلی کا اشارہ کیا تو وہ اپنی جگہ گر گیا اور باوجود کوشش کے اُٹھ کر بھاگ نہ سکا یوں لگا جیسے اَن دیکھی زنجیروں نے اسے جکڑ رکھا ہو۔ دونوں کا مسئلہ حل ہو جانے کے بعد شکنتلا پلٹی اور سندری اس کی ماں اور مورادیا جو خوف اور حیرت کا مجسمہ بنے تھے، کی طرف دیکھ کر بولی جو کچھ دیکھوا سے بھول جانا اور ڈرنا اور بھاگنا نہیں ہے! گگن میرا پتی ہے اس کی جان بھی میں بچاؤں گی۔“

یہ کہہ کر شکنتلا نے زور سے پھنکار ماری اور سیَش ناگن بن گئی! یہ روح فرسا منظر دیکھ کر سندری تاب نہ لا سکی اور بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ ناگن بنتے ہی شکنتلا نے زور زور سے پھنکارنا شروع کر دیا اور لہروں کے ذریعے پیغام چھوڑنے لگی کہ میں سانپوں کی ملکہ ہوں جس کسی سانپ نے میرے پتی کو ڈسا ہے وہ آئے اور زہر واپس چوس لے۔ اس کا پیغام سن کر قرب و جوار کے کثیر النسل سانپوں میں کھلبلی مچ گئی اور پھر تھوڑی ہی دیر میں ایک سیاہ کالا لمبا ناگ بجلی کی سی تیزی سے دیوار سے اُترتا ہوا صحن میں آ گیا اور آتے ہی شکنتلا جو انسانی روپ میں واپس آ چکی تھی، کے قدموں میں لوٹنے لگا اور پھر گگن جس کھاٹ پر لیٹا تھا اس پر چڑھ کر پنڈلی پر اپنے ڈسے ہوئے مقام پر منہ رکھ دیا۔ تھوڑی دیر میں سارا زہر چوسنے کے بعد وہ خود بھی ایک جانب لڑھک گیا اور پھر تھکے ہوئے انداز میں آہستہ آہستہ رینگتا ہوا چلا گیا!

شکنتلا کمر پر ہاتھ جمائے یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ ناگ کے جانے کے بعد وہ مورادیا اور اپنی ساس کی طرف متوجہ ہوئی اور بولی۔

”میرا نام شکنتلا ہے اور میں سیکڑوں سال کی عمر کی ہوں۔ نسلاً سانپ ہوں لیکن رہتی انسانی روپ میں ہوں۔ رحم کرنا میری

فطرت نہیں، نجانے کیوں آپ لوگوں پر مجھے ترس آ گیا تھا۔ شاید اس لیے کہ آپ نے میری جان بچائی تھی۔ گاؤں میں جتنے قتل ہوئے وہ بھی میں نے کیے کہ خون اور وہ بھی انسانی خون پینا میری سرشت میں شامل ہے۔ یہ میری خوراک ہے!''

مورادیا اور اس کی بیوی پھٹی پھٹی نگاہوں سے ششدر شکنتلا کو دیکھ رہے تھے! اسی اثناء میں گگن کو ہوش آنا شروع ہو گیا! لیکن شکنتلا نے اس کے مکمل ہوش میں آنے کا انتظار نہیں کیا۔

''چمتکار......''

''جی مالکن......''

''چلو اب اس گاؤں میں ہمارا رہنا ناممکن ہے!''

''لیکن مالکن آپ کو یہاں رکنے کا حکم ہے۔''

''لیکن اب یہاں ٹھہرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔''

''کرونڈیا کے اس چیلے کا کیا کرنا ہے مالکن۔''

''اس کو ساتھ لے چلو راستے میں اس کا خون میرے خون کی گرمی بڑھائے گا۔''

''جو حکم سرکار۔'' چمتکار منمنایا۔

☆......☆

دلاور کی جب آنکھ کھلی تو اسے کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا، البتہ تھوڑی دیر میں آنکھ کے پردے پر مناظر ابھرنے لگے۔ کوٹھاری سامنے ہی تھا۔

''کیوں پت تجھے عزت راس نہیں آتی! کوٹھاری کے آگے تو ایسے ہی ہے جیسے صحرا کے سامنے ریت کا ذرہ اور سمندر کے مقابل قطرہ......'' کوٹھاری سونے چاندی سے مرصع تخت پر بیٹھا غرا رہا تھا، جبکہ دلاور اس کے سامنے زمین پر پڑا تھا۔ اس کا سارا جسم پانی سے بھیگا تھا اور خوب صورت کپڑوں میں ملبوس ایک نازک سی دوشیزہ اس کے قریب کھڑی تھی۔ پاس ہی گھڑا رکھا تھا، غالباً لڑکی نے اسی گھڑے کا پانی دلاور پر الٹایا تھا جس کی وجہ سے وہ ہوش مند ہو سکا۔

''آخری بار تیری گستاخی پر تجھے معافی دے رہا ہوں! اس لیے کہ تو نے میرا وہ کام کیا جس کی وجہ سے میرا جیون بچ گیا، ورنہ اس خبیث شخص نے میری موت کا مکمل سامان کر لیا تھا۔'' کوٹھاری پاس کھڑے راجہ ہری داس کی طرف دیکھ کر غرایا جو نگ دھڑنگ بیچارگی کے عالم میں سر جھکائے کھڑا تھا۔

''آج میں اتنا شکتی مان ہو گیا ہوں کہ عام آدمی اور معمولی برہمچاری میرے آگے پانی بھرتے ہیں، اب میں اپنی حکومت قائم کروں گا۔ اسی لیے اس محل کو جلنے سے بچایا۔ آج سے یہ محل میری شکتیوں اور میرے کاموں کا مرکز ہو گا۔ یہ ہی میرا دارالسلطنت ہے اور دلاور تم میرے نائب ہو اور یہ جن میرا خاص کارندہ اور میرا سب سے مضبوط ہتھیار ہے۔''

''آؤ جن زادے۔'' کوٹھاری نے خسکران کو حکم دیا، جو بوتل کے اندر دھوئیں کی شکل میں موجود تھا۔ کوٹھاری کا حکم سنتے ہی ایک زناٹے دار آواز پیدا ہوئی اور خسکران بوتل سے باہر آ گیا۔ جس کو دیکھ کر کنیزیں، ہری داس اور دلاور بری طرح خوف زدہ ہو گئے! اب خسکران کا سر کمرے کی چھت سے لگ رہا تھا! اس کی کریہہ شکل دیکھی نہ جاتی تھی اس کے منہ سے نیلے رنگ کا تھوک باہر آ رہی تھا۔ اس کے تمام بدن سے انتہائی گرم بھاپ نکل رہی تھی۔

''کیا حکم ہے میرے آقا......'' خسکران ادب سے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا!

''تمہارا نام کیا ہے؟'' کوٹھاری اپنے مکروہ چہرے پر خباثت بھری مسکراہٹ سجا کر رعونت سے بولا۔

''خسکران میرے آقا۔''

کس نسل سے تعلق رکھتے ہو اور کہاں رہتے ہو!''

''میرا تعلق جنات کے قبیلہ آتشان سے ہے اور میرا باپ لشکران اپنے قبیلے کا بادشاہ ہے۔''

''ہوں۔'' کوٹھاری پرسوچ لہجے میں بولا۔

''تو کس کا غلام ہے؟''
''کوٹھاری کا!''
''میرا حکم مانے گا؟''
''مانوں گا!''
''جو میں کہوں کرے گا؟''
''کروں گا!''
''تیرا باپ ساتھیوں سمیت تجھے لینے آجائے تو؟''
''اس سے لڑوں گا۔''
''شاباش۔'' یاد رکھ خسکران آج سے تو میرے حکم کا غلام ہے! حکم عدولی کرے گا تو بھسم کردوں گا اور سنو ہری داس تیری عیاشی کا دور لد گیا، اب بقیہ جیون تو کتے کے روپ میں گزارے گا۔ یہ کہہ کر کوٹھاری نے کچھ پڑھنا شروع کیا۔ کافی دیر زیرلب بڑبڑانے کے بعد اس نے دونوں ہاتھوں کی تمام انگلیاں ہری داس کی طرف کر کے جھٹکیں تو اس کی انگلیوں کی پوروں سے سیاہ دھواں نکلنے لگا جس نے ہری داس کو گھیر لیا۔ تھوڑی دیر بعد دھواں چھٹا تو ہری داس غائب ہو چکا تھا اور اب اس کی جگہ ایک خارش زدہ کتا کھڑا تھا۔ کمزور اور مریل کتا جس کی دُم اس کی ٹانگوں میں گھسی تھی! اب کوٹھاری نے ہوا میں ہاتھ بلند کیا تو اس کے ہاتھ میں ایک پتلی سی چھڑی آگئی۔ کوٹھاری نے چھڑی ہاتھ میں آتے ہی کتے پر جو دراصل ہری داس تھا، شدت سے برسانی شروع کردی اور ہری داس کتے کے روپ میں چاؤں چاؤں کرنے لگا۔

ہری داس کا خوفناک حشر دیکھ کر دلاور کانپ کر رہ گیا اور کنیزیں اپنے راجہ کو بلکتے دیکھ کر تھر تھر کانپنے اور رونے لگیں تو کوٹھاری نے ہاتھ روک لیا اور چھڑی پھینک کر دونوں ہاتھ پھیلا کر کنیزوں کی طرف بڑھا اور بولا۔ ''تم کیوں روتی ہو جان من، تمہیں تو کوٹھاری سزا نہیں دے گا۔ تمہارا کوئی دوش نہیں۔ پہلے تم ہری داس کا سے سہانا کرتی تھیں اور اب تمہیں کوٹھاری کا پہلو گرمانا پڑے گا۔

''آؤ...... آؤ کنیزو...... بدتمیزو'' اور آگے بڑھ کر اس نے دو کنیزوں کو ایک ساتھ اُٹھا لیا۔

☆......☆

شکنتلا ایک بیل گاڑی میں سوار آرام سے لیٹی تھی۔ چمتکار گاڑی بان کے فرائض سنبھالے تھا، جبکہ کرونڈیا کا چیلا شکنتلا کے سامنے سہما ہوا بیٹھا یک ٹک حسن کی مورتی کو تکے جا رہا تھا۔ شام کا وقت اور پتھریلا علاقہ تھا، خنک ہوا چل رہی تھی، جبکہ شکنتلا ٹھوڑی ہتھیلیوں پر ٹکائے اسے مسکراتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ کافی دیر اسی عالم میں گزرنے کے بعد وہ حرکت میں آئی اور سرکتی ہوئی چیلے کے پاس پہنچ گئی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''
''جی...... شرما۔''
''دور کیوں ہو آؤ۔ تم جوان ہو میں حسین ہوں موسم سہانا ہے تو پھر یہ دوری کیسی......؟''
''جی......'' شرما ہکلا کر رہ گیا، اس کا ذہن سٹپٹا کر رہ گیا!
لیکن شکنتلا نے اسے مزید سوچنے کا موقع فراہم نہیں کیا اور اپنے نرم گداز وجود کے ساتھ اس کے اوپر گر گئی!
شرما پسینے پسینے ہو گیا!
شکنتلا کی بھرپور رعنائی اور شادابی پیچ و خم دیکھ کر شرما تڑپ اٹھا۔ اس کے سرد و خوفزدہ جذبات سلگنے لگے۔ سرمستی و سرشاری میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ جسموں کی آویزش ہر لحمہ آسودگی کے قریب ہوتی چلی گئی تھوڑی ہی دیر میں شرما میٹھی نیند کے مزے لوٹنے لگا، لیکن یہ مختصر ترین نیند اس کے جیون کی آخری نیند تھی کیوں کہ اب اسے ابدی نیند سونا تھا، لیکن سونے سے پہلے اسے اذیت ناک موت کے عمل سے بھی گزرنا تھا، سو شکنتلا نے کچھ پڑھ کر اس پر پھونکا۔ اب شرما زیادہ حرکت نہ

کر سکتا تھا، لہٰذا شکنتلا نے بڑے سکون سے اس کی شہ رگ ٹٹول کر ہاتھوں سے پکڑی اور پھر تیزی سے دانتوں سے اسے ادھیڑنے لگی۔ تکلیف کی شدت سے شرما کی آنکھ کھل گئی، اس نے تیزی سے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن ندارد وہ تو ہلنے جلنے سے بھی قاصر تھا۔ ادھر شکنتلا شہ رگ کاٹنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ شرما کا جوان ابلتا گرم خون کھل کھل گرنے لگا تو شکنتلا پر حیوانیت چھا گئی اور وہ لپ لپ شپ شپ کر کے خون زبان پر لینے لگی۔ شرما شکنتلا کا یہ روپ اور اپنی حالت دیکھ کر پوری قوت سے چیخنے لگا، لیکن اس کی چیخوں کو چمتکار اور شکنتلا کے سوا ان ویرانوں میں سننے والا کوئی نہ تھا۔ چمتکار کے انداز میں کوئی فرق نہ آیا اور وہ بدستور بیلوں کو ہانکنے میں مصروف رہا اور شکنتلا پوری طمانیت سے خون پی رہی تھی۔ شرما درد سے نڈھال چیختے چیختے بے ہوش ہو گیا اور شکنتلا خون پینے کے بعد مدہوش ہو گئی۔

بیل گاڑی چلتی رہی۔ رات گہری ہو گئی اور گہری اور گہری، جانے کون سا پہر تھا کہ شکنتلا کی آنکھ کھل گئی۔ بیل گاڑی رکی ہوئی تھی۔

چمتکار اس نے آواز دی۔ خاموشی...... مسلسل خاموشی......

''چمتکار......'' شکنتلا زور سے پکاری، لیکن کوئی جواب نہ ملا۔

شکنتلا بڑی حیران ہوئی اور حیرانگی کے عالم میں اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو چمتکار نظر نہ آیا۔ اب اسے تشویش ہوئی! وہ بیل گاڑی سے اُتر گئی! یہ ایک ویرانہ ہی تھا۔ وہی پتھریلی چٹانیں جن پر چلتے ہوئے بیل گاڑی کھڑ کھڑاتی تھی۔ چہار سو گھپ اندھیرا تھا۔ آسمان پر ستارے روشن تھے! ہر طرف موت کی خاموشی طاری تھی کوئی عام لڑکی ہوتی تو مارے خوف کے بے ہوش ہو جاتی، لیکن یہ شکنتلا تھی خوف جس سے ڈرتا تھا البتہ وہ چونکی ہوئی اس کی چھٹی حس اسے خبردار کرنے لگی کہ کوئی خطرہ ضرور ہے ورنہ چمتکار اس طرح غائب نہ ہوتا۔

شکنتلا تیزی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ان دیکھے خطرے کا احساس بڑھتا چلا گیا پھر اپنی پشت پر شکنتلا کو کچھ چمک محسوس ہوئی! وہ سرعت سے پلٹی اور ہکا بکا رہ گئی، دودھیا رنگ کی انتہائی تیز روشنی کا ہیولا تھا جس میں سے کہیں کہیں سرخ و سبز آگ کے شعلے بھی نکل رہے تھے۔ یہ ہیولا شکنتلا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک لمحے کو شکنتلا کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا اس کے ہونٹ ہلنے لگے! لیکن ہونٹوں کے ہلتے ہی تڑاخ کی آواز آئی اور زوردار چانٹا شکنتلا کے گلابی گال کو سرخ کر گیا۔

گستاخ لڑکی......'' یہ بھاری بھرکم اور کرخت آواز شاید اسی ہیولے کی تھی جس کا تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ شکنتلا کو جبڑا ہلتا محسوس ہوا۔ وہ ششدر اور خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''ہم جانتے ہیں کہ تو کون ہے پر تو نہیں جانتی کہ ہم کون ہیں۔ سن ہمارا نام لشکران ہے۔ ہم باپ ہیں خسکران کے۔ خسکران ہماری اکلوتی اولاد ہے۔ انسانی بستیاں دیکھنے نکلا تھا۔ تیرے حسن کے جال میں گرفتار ہو گیا، تیری جدائی کے بعد وہ تمہیں ہی تلاش کر رہا تھا کہ ایک دن اچانک وہ لاپتا ہو گیا ہے! ہمارے گھن چکر سے اس کا عکس غائب ہو گیا، ورنہ حفاظتی ہر وقت اپنے گھن چکر میں اس کا عکس دیکھتے رہتے تھے! لیکن اب وہ لاپتا ہو گیا ہے! ہمیں یقین ہے کہ وہ کسی مصیبت کا شکار ہو گیا ہے!

اور اب ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ اسے تلاش کرو۔ وہ روئے زمین پر جہاں کہیں بھی ہے اس کو ڈھونڈ کر بستی آتشان جانے کا کہو اور اگر تم نے یہ کام نہ کیا تو یاد رکھنا ہم جنات ہیں تمہیں جلا کر خاکستر کر دیں گے!! بات مکمل ہوتے ہی لشکران کا ہیولا غائب ہو گیا اور پھر اندھیرا چھا گیا!

شکنتلا گہرا سانس لے کر دوبارہ بیل گاڑی میں آ کر بیٹھ گئی۔

اچھا تو یہ وجہ تھی جس کی پیشگی اطلاع پا کر چمتکار بدک گیا تھا۔

جنات کے آگے تو میں بے بس ہوں شکنتلا سوچنے لگی۔ خسکران کو تلاش کرنا ہی ہو گا ورنہ جان بچانی مشکل ہو جائے گی۔ چمتکار پتا نہیں کہاں دفعہ ہو گیا ہے۔ شکنتلا اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے اُٹھی اور بیلوں کی راسیں سنبھال کر انہیں ہانکنے لگی۔ کافی دیر چلتے چلتے آخر کار صبح ہو گئی تو اسے آبادی کے آثار دکھائی دیے۔

یہ بڑی آبادی نہ تھی چند سو گھر تھے جس کے شروع میں ایک بہت بڑا مندر تھا۔ مندر کے باہر وسیع میدان لوگوں سے کھچا کھچ بھرا تھا، شاید کوئی جشن یا میلہ تھا۔

شکنتلا ایک ویران جگہ پر اُتر کر انسانی روپ میں آئی اور دیہاتی عورت کا روپ دھارے لمبا سا گھونگھٹ نکالے مندر کی طرف چل پڑی۔ کچھ لوگوں سے پوچھنے پر اسے پتا چلا کہ یہ ایک چھوٹی سی ریاست شادھنی ہے۔ اس کے راجہ کی رانی گزشتہ دنوں ایک موذی مرض کی شکار ہوکر دیہانت ہوگئی اب راجہ کے لیے نئی رانی کا انتخاب ہوگا۔ اس مقصد کے لیے ریاست بھر سے لوگ اپنی اپنی بیٹیوں کو لے کر آئے ہیں۔ ایک طرف لگے خیموں میں ان کو بٹھایا جارہا ہے۔ ان کے ساتھ آنے والے عزیز باہر میدان میں خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اس بات میں یوں بھی دلچسپی بڑھ گئی تھی کہ ایک رانی کے علاوہ ایک درجن پلنگ داسیوں کا انتخاب بھی ہونا تھا۔ رانی منتخب ہونے والی لڑکی کے ورثا کو بطور انعام تین گاؤں ملنے تھے اور لڑکی کا پتا یا سرپرست ان تینوں گاؤں کا مالک اور ٹھا کر کہلانے کا حق دار بن جائے گا، اسی طرح پلنگ داسیوں کے ورثاء کو ایک ایک گاؤں بطور خلعت ملے گا اور ان کے ورثاء بھی گاؤں کے مکھیا کے عہدے پر فائز ہوں گے اور ہر پلنگ داسی کو حویلی، چاکر اور داسیاں ملنی تھیں، جبکہ رانی اس محل اور ریاست پر راج کرے گی۔ یہ انعامات اور عزتوں کی دوڑ تھی۔ جشن میں شریک ہر شخص کی کوشش تھی کہ اس کی بیٹی راجہ کو پسند آجائے تاکہ وارے نیارے ہوجائیں۔

شکنتلا بھی چھپتے چھپاتے اس خیمے میں داخل ہوئی جہاں کنیائیں آنکھوں میں خواب سجائے قطار در قطار کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔ یہ ایک بہت بڑا مضبوط اور خوب صورت خیمہ تھا۔ رنگ و نور کا ایک سیلاب آیا ہوا تھا۔ خیمے کے اندر فرش پر قالین بچھے تھے اور ہر کرسی اعلیٰ مرصع تھی اور ہر لڑکی کے آگے چھوٹی سی میز تھی جس پر مشروبات اور پھل رکھے تھے، جبکہ کئی غلام اور کنیزیں کنیاؤں کی خدمت گاری کے لیے موجود تھیں۔ خیمے کے اردگرد فوجی پہرہ بڑا کڑا تھا۔ غیر متعلقہ اشخاص کو خیمے کے دروازے سے ہی واپس بھیج دیا جاتا۔ شکنتلا کو امیدوار سمجھ کر اندر جانے سے نہ روکا گیا۔ درجنوں کرسیاں بھر چکی تھیں اور بہت سی ابھی خالی تھیں اور لڑکیوں کا ایک سیلاب تھا جو خیمے میں گھسا جارہا تھا۔ شکنتلا نے جو اس وقت ایک عام دیہاتی لڑکی کے روپ میں تھی، خیمے کے ویران کونے کا انتخاب کر کے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی، آس پاس کوئی آدمی نہ تھا، دور بیٹھی لڑکیاں اپنے خیالوں میں گم تھیں، جبکہ کنیزیں اور غلام کام کی بھاگ دوڑ میں تھے۔ کوئی شکنتلا کی طرف متوجہ نہ تھا شکنتلا پھنکار کر ناگن بنی اور پھر دوسری پھنکار کے ساتھ وہ دوبارہ شکنتلا بن گئی لیکن اب وہ دیہاتی روپ میں نہ تھی بلکہ اس وقت خوب صورت دلہن بن چکی تھی اب اس نے دوبارہ گھونگھٹ نکالا اور خراماں خراماں چلتی ہوئی سب سے آخری قطار کے ایک کونے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

☆......☆

کافی دیر بعد راجہ کی سواری کی آمد کا اعلان ہوا۔ نقارے پر چوٹ پڑی، چوبدار القابات دہرانے لگے، ہر طرف ہلچل مچ گئی۔ کنواریاں پہلو بدلنے لگیں۔ راجہ کی سواری کہیں باہر ہی رک گئی، تھوڑی دیر کے بعد راجہ پورے طمطراق کے ساتھ خیمے میں داخل ہوا اور ایک طرف رکھے اپنے خوب صورت تخت پر براجمان ہوگیا اور اردگرد کی مرصع کرسیوں پر درباری درجہ بدرجہ بیٹھتے گئے لیکن راجہ کو دیکھ کر شکنتلا کے ارمانوں پر اوس پڑگئی کہ راجہ تو کم از کم پینسٹھ کے پیٹے میں تھا اور وہ اتنا موٹا تھا کہ توند باہر کو نکلی ہوئی، سر گنجا اور رنگ سیاہ توے کی مانند۔

ضابطے کی ضروری کارروائیوں کے بعد لڑکیوں کے ورثاء میں سے ایک ایک آدمی خیمے کے اندر بلا لیا گیا اب ورثاء اور لڑکیوں کی گنتی کی گئی تو ایک لڑکی زیادہ نکلی۔ اعلان ہوا کہ وہ کون سی لڑکی ہے جس کے ساتھ کوئی آدمی گھر کا نہیں آیا، تو شکنتلا کھڑی ہوگئی۔ وہ اس وقت سیاہ چادر میں سر سے پاؤں تلک ملبوس تھی اور لمبا گھونگھٹ نکال رکھا تھا، جبکہ دیگر تمام لڑکیوں کی چادریں زرق برق تھیں اور ان کے چہرے نمایاں تھے، جبکہ شکنتلا کی صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں باقی چہرے پر نقاب تھا۔

ادھر آؤ لڑکی، راجہ کرخت آواز میں بولا، تو شکنتلا چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی ہوئی راجہ کے عین سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''کیا نام ہے تمہارا؟'' راجہ جے کشن نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔
''جی شکنتلا!''
''تمہارے ساتھ کوئی نہیں آیا؟''
''جی نہیں''
''کیوں؟''
''میں زمانے کی ٹھوکریں سہنے کے لیے اکیلی دنیا میں ہوں۔''
''کہاں رہتی ہو!''
''جی کھڑ ماؤنڈ گاؤں سے آئی ہوں۔''
''کس کے ساتھ......؟''
اپنے بھائی کے ساتھ آ رہی تھی کہ راستے میں، میں سوگئی جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ بیل گاڑی ویران چٹانوں میں کھڑی تھی اور میرے بھائی کا کسی ڈائن نے خون پی لیا تھا۔''
کہاں ہے تمہاری سواری؟
جی شہر سے باہر ادھر چٹانوں والے راستے میں!
بھائی کی ہتھیا ہوگئی اور تم بیاہ رچانے کے لیے یہاں آ گئی ہو؟ راجہ طنزیہ لہجے میں بولا۔
''نہیں مہاراج، یہ بات نہیں...... '' شکنتلا یاسیت بھرے لہجے میں گویا ہوئی۔
بات دراصل یہ ہے کہ بھائی کے سوااب میرا دنیا میں کوئی نہیں رہا تھا اور اگر میں بروقت یہاں نہ پہنچتی تو مقابلے میں شرکت نہ کرسکتی اور یہ سنہری موقع اگر ہاتھ سے نکل جاتا تو میں پھر بھری دنیا میں اکیلی اور بے یارومددگار رہ جاتی۔
تو گویا تمہیں وشواس ہے کہ تم بطور رانی یا پلنگ داسی منتخب کرلی جاؤ گی۔
پلنگ داسی نہیں مہاراج آپ مجھے رانی بنائیں گے۔ شکنتلا لاڈ بھرے اعتماد سے بولی۔
''بہت خوب......'' راجہ جے کشن ہنستے ہوئے بولا۔ ''لیکن کنیا اس تنبو میں موجود ہر حسینہ یہی خواب دیکھ رہی ہے۔
تو پھر ٹھیک ہے۔ شکنتلا بولی پہلے آپ ان تمام میں سے اپنی پسند چن لیں پھر میں آپ کو اپنا مکھڑا دکھاؤں گی...... سب سے آخر میں۔''
ہمیں منظور ہے کنیا...... پرنتو اگر تو پلنگ داسی بننے کے قابل بھی نہ ہوئی تو پھر ہم تمہیں اپنی حرام سرائے میں کنیز بنا کر رکھیں گے اور پھر تو سارا جیون حرم حویلی سے باہر نہ نکل سکے گی۔
ٹھیک ہے مہاراج شکنتلا ادب سے جھکتے ہوئے الٹے قدموں چلتی ہوئی اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔
اب تمام دوشیزائیں باری باری راجہ جے کشن کے سامنے سے گزرنے لگیں۔ پہلی نظر میں راجہ کو جو پسند آ جاتی اس کی طرف انگلی سے اشارہ کر دیتا وہ لڑکی ایک طرف ہو جاتی، باقی لڑکیاں اپنی جگہ پر بیٹھتی گئیں۔ ایک طرف ہونے والی لڑکیاں کھل اٹھتیں اور اپنی جگہ واپس پہنچنے والی لڑکیوں پر اوس پڑ جاتی۔ اس طرح تمام لڑکیاں گزرتی چلی گئیں اور راجہ پسند آنے والیوں کو الگ کرتا گیا۔
اب تمام ناپسند لڑکیوں کو پچھلی قطاروں میں رکھی ہوئی کرسیوں پر بٹھا کر اگلی قطاریں خالی کروالی گئیں!!
اور پہلے مرحلے میں کامیاب لڑکیوں کو چادریں اتار کر ایک بار پھر راجہ کے سامنے آنے کا حکم ملا لیکن اب مرحلہ ذرا سخت تھا۔ راجہ کی خاص دو کنیزیں ایک ایک لڑکی کو باری باری راجہ کے عین سامنے کھڑا کر کے اس کی چادر اُتار کر اس کو ہر زاویے سے گھما پھرا کر راجہ کو دیدار کرواتیں۔ اس عمل سے کئی لڑکیاں بری طرح شرما اور لجا کر جسم کو چھوئی موئی بنا لیتیں۔
تمام لڑکیاں قدرت کی صناعی کا شاہکار تھیں۔
دوسرے مرحلے کے اختتام پر کامیاب لڑکیوں کی تعداد تقریباً بیس رہ گئی اور باقی تمام کو بھی پچھلی قطاروں میں بٹھا دیا گیا۔

لیکن ابھی مسئلہ یہ تھا کہ انتخاب صرف گیارہ کا ہونا تھا، جبکہ لڑکیاں بیس تھیں۔ اس ساری کارروائی کے دوران شکنتلا چپ چاپ بیٹھی رہی۔

ایک بار پھر تمام لڑکیوں کو باری باری راجہ کے سامنے لایا گیا اور راجہ صاحب انتہائی چھان پھٹک کرنے لگے۔ آخرکار گیارہ لڑکیں چن ہی لی گئیں، باقی واپس اپنی نشستوں پر بٹھا دی گئیں۔ گیارہ لڑکیاں ایک دم کھل اٹھیں کہ کم از کم پلنگ داسی تو بن ہی گئی تھیں اور اگر قسمت نے یاوری کی تو رانی بھی بن سکتی ہیں۔

اب شکنتلا کو سامنے آنے کا حکم ملا۔

شکنتلا ایک مرتبہ پھر اپنی نشست سے اٹھی اور راجہ سے کچھ فاصلے پر آ کر کھڑی ہو گئی۔

''اے نقاب پوش حسینہ'' راجہ توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

اب تو اپنا جلوہ دکھا...... تجھے اپنے آپ پر بڑا مان ہے۔ کنیز و اس کا پردہ اتار دو۔'' دونوں کنیزیں آگے بڑھیں اور شکنتلا کے تن سے لپٹا سیاہ لبادہ اتارنے لگیں۔

اور پھر...... ایک شعلہ جوالہ لپکا...... جیسے ہر طرف روشنی پھوٹ پڑی ہو...... تمام درباری...... شاہی اہلکار...... عوام اور راجہ جے کشن...... دانتوں تلے انگلیاں داب کر رہ گئے۔

شکنتلا کا نرم گداز سراپا گلابی رنگ لیے، کسا کسا تن بدن...... نفیس ترین سولہ سنگھار، سنہری گھنی سلجھی زلفیں، شاہی کھسے شاہی تاج، شاہی پوشاک جیسے مصر کی شہزادی...... جیسے اپسرا اتری ہو آکاش سے......

جے کشن کو تو سدھ بدھ ہی نہ رہی۔ واہ...... بھئی واہ...... تو ہی رانی بنے گی۔ جے کشن کی شادھنی پر تو ہی راج کر سکتی ہے۔ جے کشن بے تابانہ انداز لیے کھڑا ہو گیا، تو شکنتلا اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی، تو سرخ و سپید گال بھنور بنا گئے۔ کمر پر ہاتھ رکھ کر شکنتلا ہولے ہولے چاروں اور گھوم گئی!

راجہ نے آگے بڑھ کر شکنتلا کا ملائم ہاتھ تھام کر کوچ کا حکم دیا۔

☆......☆

شاہی کانوائے چل پڑا۔ یہاں سے چند ہی کوس دور شاہی محل تھا۔ وہاں پہنچ کر شادی کی رسومات شروع ہو گئیں۔ دوسرے دن شکنتلا ایک بار پھر رانی بن گئی دیگر تمام لڑکیوں کو راجہ کی پلنگ داسیاں بنا دیا گیا۔

یہ ایک چھوٹی سی ریاست شادھنی تھی جو سرسبز پہاڑوں کے بیچوں بیچ ایک وسیع و عریض وادی پر مشتمل تھی جس میں ایک خوب صورت دریا بھی بہتا تھا۔ پھلوں کی بہتات تھی۔ شمال کی طرف ایک لامتناہی پہاڑی سلسلہ تھا۔ جن کے پار سے تجارتی قافلے مال اسباب لے کر یہاں سے گزرتے اور قیام بھی کرتے تھے۔ کچھ مال یہاں فروخت کرتے اور اس کے بدلے میں پھل اور میوہ جات لے جاتے اور پھر آگے نکل جاتے جے کشن گزشتہ تقریباً نصف صدی سے یہاں کے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ یہ ایک قدامت پرست حکمران تھا۔ فوج برائے نام ہی تھی کہ ارد گرد کوئی دشمن حکومت نہ تھی۔ یہ ایک غریب ریاست تھی جس کی آبادی چند ہزار ہی تھی۔

لیکن شاہی محل کیا تھا پورا شیش محل تھا۔ عوام پر طرح طرح کے محصول عائد تھے۔ عوام غریب تر جبکہ شاہی خاندان عیش و عشرت کی آسودہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ راجہ جے کشن کا ایک ہی جوان بیٹا پرشاد تھا جس کی باپ کے ساتھ قطعاً نہ بنتی تھی، کیوں کہ اس کے خیال میں اب جے کشن چونکہ بہت بوڑھا ہو چکا ہے لہٰذا اب اس کو رام رام کرنا چاہیے اور راج گدی چھوڑ دینی چاہیے، لیکن بوڑھا جے کشن تاحیات راجہ رہنا چاہتا تھا۔ وہ گمان کرتا تھا کہ تخت تاج اگر اس نے چھوڑ دیا تو اس کی وقعت کم تر ہو جائے گی! راجکمار پرشاد ایک صحت مند گھنگھریالے بالوں والا سخت گیر جوان تھا۔ راجہ نے اس کی شادی پڑوسی ریاست رتن گڑھ کی راجکماری اروپ سے کی ہوئی تھی۔ اروپ ایک سازشی لڑکی تھی۔ وہ ہی ہر وقت راجکمار پرشاد یعنی اپنے پتی کو اکساتی رہتی کہ باپ سے راج گدی حاصل کر لو تا کہ میں رانی اور تو راجہ بن جائے۔ جے کشن کے پاس عوام کی بھلائی کے کام کرنے کو بے شک وقت نہ تھا لیکن تخت تاج کو محفوظ رکھنے کے لیے وہ درباری اور امراء کو اپنا حلیف بنا کر

رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پرشاد اس سلسلے میں ابھی تک بے بس تھا اور جے کشن کی حکومت پر گرفت بڑی مضبوط تھی۔ تاہم شاہی محل کے ایک بڑے حصے پر پرشاد اور اروپ کا حکم ہی چلتا تھا، کیوں کہ جے کشن کی پہلی رانی خاصا عرصہ بیمار رہنے کے بعد پرلوک سدھار چکی تھی اور راجہ جے کشن راج پاٹ کے کاموں میں مصروف رہتا تھا، لہٰذا اروپ کا شاہی محل میں زبردست اثر ورسوخ تھا۔ سرکاری انتظامیہ اور عدلیہ کے لوگ جانتے تھے کہ آنے والے دنوں میں اروپ اور پرشاد ہی حکمران ہوں گے، کیوں کہ پرشاد کافی عرصہ سے ولی عہد مقرر تھا۔

شکنتلا دلہن بن کر رانی بن گئی۔ اروپ اسے دیکھنے اور بدھائی دینے کے لیے پورے شاہی اعزازات کے ساتھ روانہ ہوئی، چوں کہ رشتے میں شکنتلا اروپ کی ساس بن گئی تھی، لہٰذا رسم کے مطابق اروپ کو اس کے چرن چھوکر تابعداری کا اظہار کرنا تھا۔ اروپ پہلی بار شکنتلا کے سامنے آ رہی تھی۔ دل ہی دل میں وہ سوچ رہی تھی کہ چونکہ شکنتلا نوجوان ہے، لہٰذا اسے پہلی ہی ملاقات میں زیر کر کے دبالوں گی تا کہ آئندہ اسے سر اٹھانے کی جرأت نہ ہو اور جے کشن کی موت کے بعد وہ رانی رہنے کا خیال من سے کھرچ دے۔

شکنتلا راجہ جے کشن کی صحبت سے ذہنی طور پر خوش نہ ہوئی تھی۔ جے کشن اپنی طبعی زندگی گزار چکا تھا۔ تمام وقت وہ اپنی جوانی اور اختیارات کی شیخی اور شکنتلا کے حسن کی تعریف کرتا رہا۔ اپنی تعریف سننا شکنتلا کے لیے نیا نہ تھا۔ وہ کوئی چھوٹی موئی کنیا نہ تھی، زمانہ شناس گھاگ عورت بن چکی تھی۔ البتہ ایک بات جو شکنتلا نے بری طرح محسوس کی تھی وہ یہ کہ جے کشن اپنے بیٹے اور بہو سے خوف زدہ تھا اور شکنتلا کو بھی ہدایت کر رہا تھا کہ ان سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی ضرورت نہیں۔ شکنتلا اس کی باتیں سن کر مسکرا رہی تھی۔ پہلے تو وہ شاید دھیان نہ دیتی لیکن اب اس نے کچھ وقت خوش گوار گزارنے کا ارادہ کر لیا۔ اس کا کیا تھا یہاں سے نکل کر کہیں بھی جا سکتی تھی۔ البتہ یہاں آ کر اسے ایک بار پھر تابانہ اور وہاں کے اختیارات یاد آ گئے! پر یہ پتا نہیں وہاں کیا کر رہی ہوگی البتہ حسکران کہاں ہوگا۔ اسے تلاش کرنا بھی ضروری ہے، ورنہ لشکران کی قوت اور اس کا کھیڑا اسے یاد تھا۔ سامری جی کہاں ہوں گے۔ ایک بار تابانہ ضرور جاؤں گی......

''اروپ آداب کہتی ہے رانی ماتا۔'' آواز سن کر شکنتلا کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹا تو اسے یاد آیا کہ وہ رانی بن چکی ہے اردگرد کنیزوں، غلاموں کا جمگھٹا لگا ہے اور وہ شاہی چھپر کھٹ پر بیٹھی ہے۔ اس نے آہستگی سے سر اٹھایا تو سامنے شاہی پوشاک میں ایک حسین وجمیل لڑکی جو کہ اروپ تھی، کو کھڑے پایا۔ اس کے ساتھ نوکروں کی ایک فوج ظفر موج بھی تھی۔ اروپ کی رنگت سانولی لیکن بلا کی کشش رکھتی تھی۔ گھنیرے سیاہ بال بھی خوب صورت تھے لیکن سب سے بڑھ کر اس کے چہرے پر اس کی سبزی مائل بڑی بڑی غلافی آنکھیں تھیں جنہیں وہ بار بار تیز تیز جھپکاتی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ قد وقامت اس کا زیادہ نہ تھا جبکہ تھی بھی وہ پتلی دبلی...... لیکن آواز اس کی سریلی اور خاصی بلند تھی۔ پھولوں اور زیورات کی بہت شوقین معلوم ہوتی تھی، کیوں کہ ہاتھوں، پیروں، گلے اور کانوں میں بھاری زیورات کے علاوہ سر پر ایک ہالے کی شکل میں سرخ گلاب سجا رکھے تھے۔ اسی طرح کلائیاں بھی سرخ گلابوں سے بھری تھیں...... وہ ایک مکمل راجکماری ہی دکھتی تھی۔

لیکن شکنتلا نے جب سر اٹھایا تو اس کا پریوں جیسا حسن دیکھ کر اروپ آنکھیں جھپکانا بھول گئی اور پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اس کی نئی ساس اس قدر حسین ہوگی کہ اس کے سامنے وہ خود ماند پڑ جائے گی، لیکن پھر فوراً ہی سنبھل گئی۔

''آؤ اروپ...... تم کیسی ہو؟'' شکنتلا نے جان بوجھ کر تم کا صیغہ استعمال کیا۔

''ٹھیک ہوں رانی ماتا۔'' روپ نے طوہاً وکرہاً اس کے پاؤں چھوتے ہوئے کہا اور پھر فوراً تمام غلاموں، کنیزوں اور اہلکاروں کی طرف دیکھ کر اونچی آواز میں تحکمانہ بولی۔ سب لوگ باہر چلے جاؤ اور کوئی اندر نہ آنے پائے۔

ایک ہلچل مچ گئی...... اور لمحوں میں کمرہ خالی ہو گیا۔ شاید یہ سب اروپ سے بہت خوف زدہ رہتے تھے۔ سب باہر جا چکے تھے! اب اروپ کے چہرے پر ایک رعونت اُبھری اور وہ اپنا بھاری لباس چکنے فرش پر گھسیٹتی ایک مسہری پر شکنتلا کے سامنے بیٹھ گئی۔ دونوں ہتھیلیاں اپنے پچھلی جانب مسہری پر ٹکا کر اس نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر ہلانا شروع کر دیں۔

اور شکنتلا کے چہرے پر نظریں جما کر طنزیہ اور پر غرور انداز میں بولی۔ سنو شکنتلا ہم رتن گڑھ کے راجہ کی بیٹی اور جے کشن کے بیٹے اور شادھنی کے ولی عہد پرشاد کی پتنی ہیں۔ شادھنی کی ہونے والی رانی اور موجودہ راج کماری بھی ہیں۔ ہمارا تعلق شاہی خاندان سے ہے۔ تمہارے بھاگ اچھے کہ کسی نیچ ذات کی ہوتے ہوئے بھی شادھنی کی رانی بن گئی ہو، لیکن یہ سب ٹھاٹھ باٹ تمہارے لیے صرف جے کشن کے جیون تک ہیں۔ جے کشن ایک موذی مرض میں مبتلا ہے اور کسی بھی وقت مر سکتا ہے۔ اس کے مرتے ہی پرشاد راجہ اور ہم رانی بن جائیں گے۔

شاہی محل کے تمام رہائشی تو ہماری انگلی کے اشارے پر ناچتے ہی ہیں لیکن پھر پوری ریاست پر صرف اروپ کا حکم چلے گا۔ نہ صرف شادھنی بلکہ رتن گڑھ میں بھی، کیوں کہ وہاں کا راجہ بھی ہمارا باپ اور ولی عہد ہمارا چھوٹا بھائی ہے!

اگر سکھی جیون گزارنا چاہتی ہو تو اس بند کمرے میں ہمارے پاؤں پر سر رکھ کر ہماری غلامی میں آ جاؤ۔ بظاہر ہم تمہیں رانی ماتا کہہ کر تمہارا ادب کیا کریں گے لیکن تنہائی میں تمہیں ہماری جوتی کے تلوؤں سے نیچے بیٹھنا ہوگا۔

اگر ایسا نہ کرو گی تو جے کشن کے مرتے ہی ہم رانی بن کر سب سے پہلے تیرا چہرہ جلا کر تمہیں بدصورت اور اندھا کروانے کے بعد تیرے ہاتھ پاؤں توڑ کر کسی بازار میں بھیک مانگنے کے لیے پھینکوا دیں گے۔

''بولو تمہیں کیا پسند ہے؟'' یہ کہتے ہوئے اروپ انتہائی تحقیرانہ انداز میں شکنتلا کو دیکھتی رہی اور بائیں گھٹنے پر دائیں ٹانگ رکھ کر ہلاتی رہی۔ شکنتلا چپ چاپ بیٹھی رہی! وہ تصور بھی نہ کر سکتی تھی کہ یہ دھان پان سی راجکماری اس قدر سخت رویہ اپنائے گی، لیکن شکنتلا کو تو جواب فوراً ہی دینا تھا۔ اروپ نے اس سے دوٹوک بات کی تھی۔

☆......☆

اگر میں اس کا حکم نہ مانوں تو بھی یہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ اس کی حیثیت میرے سامنے بہت معمولی ہے! پرنتو اس کے ساتھ مل کر دیکھتی ہوں کہ یہ ہے کیا چیز اور اس کے لمبے ہاتھوں کی پہنچ کہاں جا کر ختم ہوتی ہے اور یہ جے کشن کو تخت سے اتارنے کے لیے کیا سازش تیار کر رہے ہیں۔ چلو جب تک سامری، جسکران اور چمتکار کا کوئی سراغ نہیں ملتا تفریح ہی کرتی ہوں۔ سوچ مکمل ہوتے ہی شکنتلا اُٹھ کر اروپ کے قدموں میں بیٹھ گئی اور اپنا سر اس کے جوتوں کے ساتھ لگا دیا۔

راجکماری جی ہاتھ کی ریکھاؤں سے میں حضور کی ساس تو بن گئی ہوں مگر ماتھے کی لکیریں میری کم ذات ہونے کی چغلی کھاتی ہیں۔ آپ نسل در نسل شاہی خاندان کی چشم و چراغ ہیں۔ منہ میں سونے کا نوالہ لے کر پیدا ہوئی تھیں۔ جہاں سے آئی ہیں وہاں بھی راجکماری تھیں یہاں بھی راجکماری ہیں، آنے والا سمے بھی آپ کے رانی بننے کا اعلان کر رہا ہے اور میں کمی کمین خاندان سے اٹھنے والی بدبو ہوں...... '' قریب المرگ راجہ کی پتنی بننا صرف اس لیے قبول کر لیا ہے کہ غربت سے چھٹکارا پا سکوں۔ یہاں پیٹ بھرنے کے لیے کھانا، رہنے کے لیے عالیشان چھت تو میسر آئے گی۔ میرا اور حضور کا کیا مقابلہ آپ راجہ بھوج میں گنگوا تیلی...... میں چھپکلی آپ شہتیر ہیں۔ آپ کی شان و شوکت آکاش جتنی بلند میری پستی پاتال سے بھی گہری...... حضور جیسا کہیں گی میں ویسا ہی کروں گی۔ بس مجھے دھتکاریے گا نہیں...... میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ شکنتلا زار قطار رو رہی تھی اور اروپ غرور سے گردن بلند کیے اپنی کامیابی پر نازاں اور شاداں ہو رہی تھی۔

''اُٹھ کھڑی ہو جا۔'' اروپ نے شانِ بے نیازی سے کہا۔ تو شکنتلا آنسو ضبط کرنے کے انداز میں باادب کھڑی ہو گئی۔

سنو ہمارے تمہارے بیچ ہونے والی گفتگو کی بھنک بھی کسی کے کانوں میں پڑی تو ہم تم پر کوئی گھناؤنا الزام لگا کر اس سے پہلے کہ راجہ کو پتا چلے تمہیں ہاتھی کے پاؤں تلے کچلوا دیں گے۔ پورے محل میں اروپ کے منشاء کے بنا کوئی آنکھ جھپکانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ جے کشن صرف نام کے راجہ ہیں۔ تمام فیصلے پرشاد اور ہم کرتے ہیں۔ اروپ سینہ تان کر بولی اور یہ بات بھی یاد رکھنا کہ اس وچار میں نہ رہنا کہ تم کچھ عرصہ بعد یہاں قدم جما کر کچھ کرنے کے قابل ہو جاؤ گی۔ اروپ نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ تمہارے اردگرد رہنے والی باندیاں اور کنیزوں میں اکثر میری ہی نمک خوار ہیں اور تمہاری ایک ایک حرکت کی مکمل روداد مجھ تک ہر رات کو اور ہر صبح کو پہنچ جایا کرے گی۔ چاہے تم جتنی مرضی رازداری برت لو۔ اس کا ایک ثبوت یہ دے کر جا رہی ہوں کہ پوری کوشش کے باوجود جے کشن سے گزری رات کچھ نہ ہو سکا اور

تمہاری امنگوں پر بھی اوس پڑ گئی ہے، لیکن تم چنتا نہ کرو اگر ہمارے سامنے دم ہلانے کی عادت پال لو گی تو تمہارا یہ مسئلہ بھی حل کر دیں گے۔ اروپ معنی خیز انداز میں مسکراتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی...... اور پھر ایک جھٹکے سے لباس کی سلوٹیں درست کرتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئی اور شکنتلا مسکرا کر گہرے سانس لے کر رہ گئی۔ ''تمہارے ساتھ وہ کروں گی شہزادی۔'' شکنتلا زیرلب بولی۔

''جو ماریہ کے ساتھ بھی نہیں کیا۔'' شکنتلا کے لہجے میں یہ کہتے ہوئے سفا کی اُتر آئی۔

☆......☆

جے کشن شکنتلا جیسی رانی پا کر پھر سے جوان ہو گیا تھا۔ شکنتلا کا قیامت خیز سراپا جے کشن کو دنیا بھلا دینے کے لیے کافی تھا۔ شکنتلا نے حالات کو مکمل سمجھنے کے لیے ایک سہمی ہوئی شرمیلی بیوی کا کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ جے کشن اپنی بہو کے جارحانہ عزائم سے واقف ہونے کے باوجود اس کے مضبوط میکے کی وجہ سے ڈرتا تھا۔ جبکہ جے کشن کا بیٹا پرشاد بھی اپنی بیوی اروپ سے دبتا اور اس کے اشاروں پر چلتا تھا، یوں پورے محل میں اروپ دندناتی پھرتی۔ ہر شعبہ میں ٹانگ اُڑانا اور ڈرانا دھمکانا اس کا شوق اور مشاغل تھے۔ دن چڑھے تک وہ سوتی رہتی اور پھر سہ پہر سے لے کر شام ڈھلے تک سو جاتی اور شام کے بعد وہ ملازمین اور کنیزوں غلاموں کے کاموں کی پڑتال شروع کر دیتی اور رات گئے تک سخت گیری سے پوچھ گچھ کرتی اور تمام لوگ اس کی سزا کے ڈر سے جاگتے رہتے، جبکہ صبح اروپ کا تمام لوگوں کے لیے حکم تھا کہ طلوع آفتاب سے قبل کام پر آ جائیں، اس کی ان غیر منصفانہ حرکات سے تمام لوگ مجبور اور سخت تنگ تھے۔

شکنتلا کو چند ہی دنوں میں اس کی تمام حرکات کا پتا چل گیا! غیر محسوس طریقے سے شکنتلا نے اروپ کی جانب سے فراہم کردہ کنیزوں کو اپنے سے دور کر دیا اور اپنی خدمت کے لیے اپنے ساتھ منتخب ہونے والی پلنگ داسیوں کو رکھ لیا تھا۔ ان میں سے آدھی دن کو اور کچھ رات اس کی خدمت کرتیں اور پھر واپس اپنی حویلی چلی جاتیں کیوں کہ وہ عام باندیاں نہ تھیں بلکہ راجہ کی پلنگ داسیاں تھیں جن کو باقاعدہ حویلی اور ملازمین ملے تھے...... صرف رانی کی خدمت یا راجہ کے پہلو کو گرانا ان کا کام تھا۔

چھٹکارہ تو پھر تو شکنتلا کو کچھ مشکل نہ تھی لیکن اس کی عدم موجودگی میں اروپ کی سرگرمیوں کا پتا چلانا شکنتلا کے بس میں نہ تھا، جبکہ سانپ بن کر وہ اس کی حدود میں جانا نہ چاہتی تھی کہ مبادا کہیں ارجن والا انجام نہ ہو جائے، پھر یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ بھی نہ تھا جس کے لیے وہ جان جوکھوں میں ڈالتی پھرتی۔ وہ تو محض تفریح طبع کر رہی تھی، لہٰذا اب کے اس نے ذہانت سے کام لینے کا ارادہ کر لیا تا کہ ذہنی ورزش بھی جاری رہے۔

ادھر پرشاد جو راجہ جے کشن کا سگا بیٹا تھا اس نے جب شکنتلا کو دیکھا تو دھک سے رہ گیا۔ یہ تو اروپ سے بہت خوب صورت اور نوخیز تھی۔ کسی طرح سے اس کا اسے ماں کہنے کا دل نہ چاہا لیکن اروپ سے دبنے کی وجہ سے اس کے سامنے دل پر پتھر رکھ کر شکنتلا کو رانی ماں کہتا، لیکن اس کے خلوص کے درپن پر ہوس کی دراڑ آ چکی تھی۔ وہ بہانے بہانے سے شکنتلا کے کمرے میں آنے لگا۔ ادھر شکنتلا بھی اس کی نگاہوں کا سوال بوجھ چکی تھی بس پھر کیا تھا؟ یہ کھیل شکنتلا کے لیے نیا نہ تھا۔ مرد کی رگ رگ سے وہ واقف تھی۔ چند ہی دنوں میں سوچ بچار کے بعد اس نے عشق و مستی کی بساط بچھانے کا فیصلہ کر لیا اب میں دیکھتی ہوں اروپ کہ تیرا روپ زیادہ ہے یا شکنتلا کے جلوے مہان ہیں۔

لیکن ان تمام باتوں سے پہلے شکنتلا کے لیے ایک کام جو بہت ضروری تھا وہ تھا انسانی خون کا حصول، کیوں کہ خونی پیاس بجھائے اسے خاصے دن ہو چکے تھے اور اب وہ بے تاب ہو رہی تھی لیکن سارا دن مبارکباد دینے والوں اور کنیزوں اور غلاموں کا رش اور رات کو راجہ جے کشن کی موجودگی کی وجہ سے اسے موقع نہ مل رہا تھا، کیوں کہ جے کشن کو نیند بہت کم آتی تھی۔ اسے بے خوابی کا مرض بھی لاحق تھا۔ ساری رات دمہ کی وجہ سے کھانستا اور جاگتا رہتا، بعض اوقات تو اس کی کھانسی اتنی شدت اختیار کر جاتی کہ شکنتلا کو گمان گزرتا کہ بڈھا ابھی پار ہو جائے گا۔

شکنتلا اس وقت اپنی مسہری پر لیٹی آرام کر رہی تھی اور پلنگ داسیاں اسے مور چھل جھل رہی تھیں۔ ایک اس کی

ٹانگ دابنے میں مصروف تھی، اچانک شکنتلا کو کمرے کی چھت پر ایک طرف دائرے کی شکل کا سوراخ دکھائی دیا جس میں لوہے کی جالی لگی ہوئی تھی اب جو اس نے غور کیا تو کمرے کے چاروں کونوں میں ایسے ہی چھوٹے چھوٹے سوراخ ہیں۔ غالباً روشنی اور ہوا کی آمدورفت کے لیے بنائے گئے تھے۔ اب تو باہر جا کر خون کا حصول آسان ہو گیا ہے۔ اس نے تمام کنیزوں کو خرابی طبیعت کا بہانہ بنا کر کمرے سے رخصت کر دیا اور حکم دیا کہ کوئی اندر نہ آنے پائے۔ رانی تخلیہ چاہتی ہے۔ تنہائی ہوتے ہی اس نے اندر سے کواڑ بند کر لیے اور فوراً ہی ایک چھوٹے زہریلے سانپ کی شکل میں آئی اور چھت کی طرف بڑھی، لیکن اس اثناء میں چند ملی جلی چیخیں سنائی دیں جو چھت کی طرف سے آئی تھیں۔ شکنتلا تیزی سے دیوار پر چڑھ کر چھت کی اندرونی سطح پر رینگتی ہوئی سوراخ تک آئی تو اسے چھت پر کچھ لوگوں کی باتوں کی آواز آئی۔ وہ فوراً چھت کے اوپر آ گئی تو فوراً ہی اس کی چھٹی حس نے خطرے کا الارم بجایا اور وہ اچھل کر دور جا گری اور اگر وہ ایسا نہ کرتی تو ان لاٹھیوں کی زد میں آ جاتی جو بیک وقت اس پر برسائی گئی تھیں۔ شکنتلا سنبھل گئی اس نے دیکھا کہ چار آدمی ہاتھوں میں لاٹھیاں اٹھائے اس کی طرف لپک رہے ہیں۔ اب شکنتلا نے جان بچانے کے لیے انتہائی پھرتی سے اچھل کود شروع کر دی اور پھر داؤ لگتے ہی ایک آدمی کے ماتھے کا نشانہ لے کر پورے زور کے ساتھ اس کے منہ پر جا لگی۔ شکنتلا کا زہر اتنا شدید تھا کہ وہ شخص تیورا ہو کر گرا اور گرتے ہی نیلا پڑ گیا۔ اس کے ناک اور منہ سے نیلی جھاگ نکلنے لگی اور آنکھیں پتھرا گئیں اور لمحوں میں اس کا وجود ختم ہو گیا۔ اس کے مرنے تک شکنتلا دوسرے شخص کو شکار کر چکی تھی اور جلد ہی تیسرے آدمی کی روح بھی زہر کی مدد سے قفس عنصری سے پرواز کر گئی تو چوتھا آدمی محل کی وسیع چھت پر شکنتلا کو دوسری طرف سرپٹ دوڑتا نظر آیا۔ شکنتلا برق رفتاری سے اس کے پیچھے لپکی۔ اور تھوڑی ہی دور اسے جا لیا۔ اس کے عین سامنے جا کر شکنتلا زور سے پھنکاری اور رانی بن گئی۔ یہ منظر دیکھ کر اس شخص کی گھگھی بندھ گئی۔ اب شکنتلا پرسکون ہو چکی تھی اور کمر پر ہاتھ رکھے اس کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی اور بولی بھاگنے کی کوشش میں تمہارا انجام بھی ساتھیوں کی طرح ہوگا۔ جیون بھکشا چاہتے ہو تو سچ سچ بتاؤ تم کون تھے اور تم نے حملہ کیوں کیا؟ جواب میں اس شخص کے صرف ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔ وہ اتنا خوف زدہ ہو چکا تھا کہ اس کے ہونٹ اس کا ساتھ دینے سے قاصر تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر شکنتلا مسکرائی اور زلفیں جھٹکتی ہوئی اس کے قریب جا پہنچی۔ گھبراؤ نہیں، کچھ نہیں کہوں گی صرف میری باتوں کا تسلی بخش جواب دے دو۔ شکنتلا کا رویہ دیکھ کر اس کی حالت قدرے بہتر ہوئی تو شکنتلا اس کے بالکل قریب ہو گئی۔ اتنے قریب کہ اس کی سانسیں اس شخص کے منہ پر آنے لگیں! شکنتلا نے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے۔

دیکھو! شکنتلا اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ میرے سوالوں کا جواب درست دو گے تو جانے دوں گی ورنہ اپنے ساتھیوں کا حشر تو تم نے دیکھ ہی لیا ہے! میں ایک جادوگرنی ہوں جب چاہوں جو مرضی روپ اختیار کر لوں لیکن ہوں بہرحال میں ایک عورت اور وہ بھی جوان۔ شکنتلا نے اس کا خوف کم کرنے کی غرض سے سانپ کا ذکر نہ کیا تھا۔ اور یہ حربہ خاصا کارگر ثابت ہوا۔ کیا نام ہے تمہارا؟ شکنتلا نے اس کو میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''امیت......'' وہ بمشکل بولا۔

''کیا کر رہے تھے یہاں پر......؟''

''آپ کی نگرانی!''

''کس نے بھیجا ہے تمہیں؟''

''راجکماری اروپ کے حکم سے ہم آئے تھے۔''

''کب سے کھڑے ہو!''

''جب آپ نے تمام کنیزوں کو کمرے سے نکالا تو شیلا اور چمپا نے بھاگ کر اروپ جی کو اطلاع کر دی تھی کہ آپ نے سب کنیزوں کو کمرے سے باہر نکال دیا ہے تو اروپ جی نے ہمیں فوراً چھت سے آپ کی نگرانی کا حکم دیا۔ ہمارے دیکھتے

ہی دیکھتے آپ سانپ بن گئیں اور چھت کی طرف آئیں تو ہم نے لاٹھیاں اٹھالیں۔
''ہوں......'' شکنتلا سوچ میں پڑ گئی۔
''تم کس جگہ کام کرتے ہو۔''
''ہم کھوجی ہیں۔ راجکماری اروپ کے۔ وہ جہاں کہتی ہیں ہمیں وقت ضائع کئے بغیر وہاں پہنچنا پڑتا ہے۔''
''اب تمہیں چھوڑ دیا جائے تو اروپ کو جا کر کیا کہو گے؟''
جو آپ کہیں گی وہی جا کر کہہ دوں گا۔ رانی جی امیت ہاتھ جوڑ کر گھگھیایا تو شکنتلا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ہے تو تم بڑے خوب صورت ہو اور بھرپور نوجوان بھی۔ میں جادوگرنی ضرور ہوں لیکن ہوں تو نوجوان لڑکی ہی تمہیں دیکھ کر میرا جی مچل اُٹھا ہے۔ یہ کشن تو بوڑھا کھوسٹ ہے دیکھو تم جوان اور حسین ہو اور یہ یاد رکھو کہ میں جادو جانتی ہوں پل بھر میں تمہیں قتل کر سکتی ہوں اور اگر تم مجھ جیسی توبہ شکن جوانی سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو تو جاؤ اروپ کو جا کر کہہ دو کہ محل کی چھت پر چڑھتے ہی ایک سانپ نے جو وہاں چھپا بیٹھا تھا ہم پر حملہ کر دیا اور ساتھ ہی تینوں آدمیوں کو ہلاک کر دیا اور میں بڑی مشکل سے جان بچا کر آیا ہوں اور پھر رات کو تم اسی جگہ پر آ جاؤ میں تمہیں ایسا خوش کروں گی کہ یاد رکھو گے۔ آخری فقرہ کہتے ہوئے شکنتلا نے محبوبانہ انداز بناتے ہوئے اپنی گھنیری زلفیں امیت کے چہرے پر پھینکیں اور بالکل اس کے ساتھ لگ گئی جس سے امیت کے جذبے برانگیختہ ہونے لگے۔ اس کے دل کی دھڑکن انتہائی تیز ہو گئی۔
مم...... میں بالکل آؤں گا۔ رانی جی۔ آپ...... آپ کا حکم کیسے ٹال سکتا ہوں۔ امیت نے بے خیالی میں اپنے ہاتھ شکنتلا کے سڈول و ملائم بازوؤں پر رکھ دیے تو شکنتلا پیچھے ہٹ گئی اور بولی۔
''دیکھو امیت...... میرا نام شکنتلا ہے میں رانی بھی ہوں اور ساحرہ بھی۔ میری جوانی اتنی معمولی نہیں کہ تم جیسا معمولی آدمی اسے ٹھکرا دے اگر تم نے وعدہ خلافی کی تو میں تمہیں پاتال کی گہرائیوں سے بھی نکال لاؤں گی رات گہری ہوتے ہی تم یہاں آؤ گے۔ میں نہ بھی ہوں تو تم خاموشی سے میرا انتظار کرو گے آواز نہیں دینی اور اگر میں پہنچ گئی تو تم نہ پہنچے تو پھر میں تمہاری دشمن بن جاؤں گی! اور سنو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اور آج کے بعد تم مجھے اروپ کی خبریں بھی دیا کرو گے۔ سمجھے۔''
''سمجھ گیا...... رانی جی۔'' امیت بری طرح بدحواس تھا۔ اس کی تو سمجھدانی ہی کام کرنا چھوڑ چکی تھی۔
''چلو اب جاؤ۔'' اور امیت تیز تیز قدموں سے ایک طرف چل دیا اور شکنتلا طائرانہ نظروں سے محل کی چھت کا جائزہ لینے لگی۔ ہزاروں ایکڑ پر پھیلا ہوا یہ محل قریباً سو کمروں پر مشتمل تھا اور ہر کمرے پر شکنتلا کے کمرے کی طرح چار چار جالی دار روشندان تھے لیکن تمام محل ایک منزلہ ہی تھے اور اوپر سے تمام کمروں کی چھت ایک ہی تھی۔ ساری چھت پر مٹی ڈال کر گھاس اُگائی گئی تھی جس کی وجہ سے یہ ایک بہت بڑا میدان دکھائی دیتا تھا جبکہ چاروں طرف سبزا تھا جس کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے گملوں میں سرو کے پودے لگائے گئے تھے جو چھت کی خوب صورتی کو دو چند کر رہے تھے۔ محل کی بیرونی چار دیواری اصل عمارت سے خاصی دور تھی اور درمیان میں کئی چھوٹی عمارتیں اور وسیع عریض باغ تھا، مزید گھومنے سے اسے پتا چلا کہ چھت کے چاروں کونوں پر سیڑھیاں نکلتی ہیں جن کے آگے لوہے کے جنگلے لگے ہیں جن پر اندر سیڑھیوں کی طرف سے تالا لگا ہوا ہے، یقیناً سیڑھیوں کے نیچے پہرا لگا ہوگا اور امیت اور اس کے ساتھی اروپ سے خصوصی اجازت نامہ رکھتے ہوں گے اوپر آنے کا۔''
اب شکنتلا اپنے کمرے کی چھت پر آ گئی ایک ہی جیسی چھت ہونے کی وجہ سے شاید وہ اپنے کمرے کی چھت بھول جاتی لیکن نشانی یہ تھی کہ وہاں تین حملہ آوروں کی گلی سڑی لاشیں پڑی تھیں۔ لاشوں کے پاس آ کر شکنتلا نے ایک شخص کی لاش کو پاؤں سے پکڑا اور اپنی چھت سے خاصی دور لے جا کر چھوڑ دیا۔ اس کے بعد دوسرے شخص کی لاش مخالف سمت میں کافی دور لے جا کر چھوڑا اور تیسرے کی لاش چند گز دور لے جا کر چھوڑ دی تاکہ اگر تفتیش ہو تو شک اس کی طرف نہ جائے اور یہ سمجھا جائے کہ اتفاقاً ہی وہاں کوئی سانپ کہیں سے نکل آیا تھا۔
ساری باتوں سے مطمئن ہو کر ناگن بنی اور پھر شکنتلا اپنے کمرے میں آ کر دوبارہ رانی بن گئی، اندر سے چٹخنی کھول

دی۔ پلنگ داسیاں باہر برآمدے میں بیٹھی گپیں لگا رہی تھیں۔ شکنتلا نے انہیں اندر آنے کا اشارہ کیا اور وہ سب خاموشی سے اپنی اپنی جگہوں پر کھڑی ہوگئیں اور شکنتلا نے مسہری پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

اپنے جسم پر چبھن کا احساس ہوتے ہی شکنتلا کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو اروپ پوری سج دھج سے کھڑی تھی باقی کمرہ خالی تھا۔ وہ اور شکنتلا ہی تھیں اور چبھن خنجر کی نوک کی تھی جس سے ٹہوکا دے کر اروپ نے شکنتلا کو جگایا تھا اور اروپ ایک پاؤں مسہری کے کنارے پر ٹکائے ہوئے کھڑی تھی۔

☆......☆

یہ گستاخی دیکھ کر شکنتلا کا خون کھول اٹھا لیکن وہ کچھ سوچ کر ضبط کر گئی۔

''کیا بات ہے راجکماری بڑی غصے میں نظر آتی ہیں؟'' شکنتلا سیدھی ہو کر نگاہیں جھکا کر ادب سے بولی۔

''کتے کی بچی۔ ہم تمہاری ٹانگیں چیر دیں گے۔'' غصے کی شدت سے اروپ کی سریلی آواز پھٹ رہی تھی۔

''کیا......؟'' شکنتلا نے یک دم نظریں اٹھائیں۔ پورے جیون میں اس قدر گھٹیا طریقے سے اسے مخاطب نہ کیا گیا تھا۔ ایک دفعہ پھر اس کی کھوپڑی گھومنے لگی، مگر کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ غصہ پی گئی۔

''میں کچھ سمجھی نہیں راج کماری جی۔ آپ آرام سے بیٹھیں۔'' شکنتلا مسہری سے اُتر کر اروپ کو شانوں سے پکڑ کر صوفے پر بٹھاتے ہوئے بولی۔ آپ کو لگتا ہے میرے بارے میں کچھ غلط فہمی ہوئی ہے!

''تمہارے کمرے کی چھت پر ہمارے تین خاص غلام سانپ کے ڈسنے سے مر گئے ہیں۔ ان پر سانپ کس نے چھوڑا۔'' اروپ نے گہری نگاہوں سے شکنتلا کو گھورتے ہوئے ماتھے پر سلوٹیں ڈال کر سوال کیا۔

''سانپ؟ چھت پر......؟ غلام قتل ہوئے؟'' شکنتلا بھولپن سے حیران ہوتے ہوئے اروپ کے سامنے قالین پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''مجھے تو کچھ پتا نہیں راج کماری جی۔ میں تو کچھ نہیں جانتی۔''

''اچھا تم پھر تم نے سب باندیوں کو نکال کر کمرہ اندر سے کیوں بند کیا تھا......؟''

''میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے! اس لئے۔''

''تو پھر تھوڑی دیر بعد دوبارہ تم نے کمرہ کھول کر انہیں خود اندر بلا لیا، جبکہ تم کہہ رہی ہو کہ طبیعت اب بھی ٹھیک نہیں۔''

پے در پے سوالات سے شکنتلا سٹ پٹا گئی۔ اروپ تو خوب صورت ہونے کے ساتھ خاصی ذہین بھی ہے! لیکن فوراً ہی سنبھل گئی اور اس کے پاؤں چھوتے ہوئے بولی۔ ''باندیوں کو حضور باہر اس لیے نکالا تھا کہ طبیعت ٹھیک نہیں تھی لیکن بلایا اس لیے کہ مجھے کچھ گرمی محسوس ہوئی اور پھر پانی پینے یا دوسری ضروریات کے لیے مجھے کئی بار اُٹھنا پڑا تو تنگ آ کر میں نے انہیں اندر بلا لیا۔''

''اچھا جی!'' اروپ نے سبزی مائل بڑی بڑی آنکھوں کو تیزی سے جھپکاتے ہوئے کہا۔ ''کل تک کیڑے مکوڑوں جیسا جیون بسر کرنے والی شکنتلا آج خود پانی پینے کے لیے اٹھنا نہیں چاہتی۔''

''پرنتو کماری جی...... آپ کے غلام میرے کمرے کی چھت پر کیا کر رہے تھے؟''

''بکواس بند کر...... ہم تجھے جواب دینے کی پابند نہیں۔''

یہ کہتے ہوئے اروپ خوب صورت لباس سنبھالتے ہوئے کھڑی ہوگئی اور پھر بولی۔

''دیکھو شکنتلا ہم نے تجھے پہلے بھی کہا ہے کہ پر پرزے نکالنے یا زیادہ عقلمندی دکھانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا باپ راجہ اور بھائی راجکمار ہے اور ہم شادھنی کی رانی بننے والے ہیں۔ بس جے کشن کی ہتھیا کا انتظار ہے۔ اپنے راستے میں رکاوٹ بننے والی ہر چیز ہم روند کر گزر جانے کے عادی ہیں ہمیں مجبور نہ کرو کہ تمہارے بارے میں کوئی سخت فیصلہ کر ڈالیں۔''

''راج کماری۔'' شکنتلا اس کے قدموں سے لپٹ گئی اور سر اس کے جوتوں پر رکھ دیا۔ ''میں ایک غریب اور مجبور لڑکی ہوں۔ مجھے محل سے نہ نکالئے گا۔ میں آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر رکھوں گی۔''

''ٹھیک ہے تو پھر۔'' اروپ نرم پڑتے ہوئے بولی۔ ''جو باندیاں پہلے تمہارے لیے تعینات تھیں ان کو بھی رکھو۔ پلنگ داسیوں کو بھی ادھر ہی پڑا رہنے دو مگر وہ بھی یہیں رہیں گی۔'' اروپ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو شکنتلا عاجزی سے بولی۔ ''ٹھیک ہے راجکماری جیسے حضور کی مرضی، میں تو آپ کے حکم کے بنا سانس بھی نہیں لوں گی!''

''ایسا کرو گی...... نہیں تو ٹانگیں چیر کر رکھ دوں گی!'' یہ کہتے ہوئے اروپ نے خنجر شکنتلا کی مسہری پر پھینکا اور باہر چل دی۔

اس کے باہر جاتے ہی شکنتلا فرش سے اٹھی اور ایک آرام کرسی پر سر ٹکاتے ہی خنجر کی طرف دیکھ کر اپنے آپ سے مخاطب ہوئی...... ٹانگیں تو میں چیروں گی تمہاری شہزادی عالیہ ابھی تمہیں شکنتلا سے واسطہ ہی کب پڑا ہے۔ اتنی ہی دیر میں ایک باندی اُتر آئی۔

''پرشاد جی کو جا کر کہو کہ اگر مناسب فرمائیں تو مجھے آ کر ملیں!''

جی رانی جی۔ باندی فرشی سلام کرتی ہوئی الٹے قدموں باہر نکل گئی!

خاصی دیر کے بعد پرشاد آیا اور آتے ہی شکنتلا کے چرن چھوئے۔

''جی رانی ماتا۔'' وہ شکنتلا کے چہرے پر آنکھیں جما کر بولا۔

''بیٹھو پرشاد۔'' اور اس کے بیٹھتے ہی باقی سب کو آنکھ کے اشارے سے کمرہ چھوڑنے کا حکم دیا۔

''دیکھو کئی دنوں سے میرا دم گھٹ رہا ہے میں ذرا شہر کی سیر کرنا چاہتی ہوں!''

''ٹھیک ہے میں انتظام کرواتا ہوں۔'' پرشاد گہری نظریں شکنتلا کے چہرے پر جماتے ہوئے بولا۔

''نہیں پرشاد۔'' شکنتلا لگاوٹ سے بولی۔ ''میں اکیلی نہیں جانا چاہتی۔ تم بھی ساتھ چلو۔''

''باپو خفا نہ ہو جائیں۔'' پرشاد نے سوال اٹھایا۔

''ان کی چنتا نہ کرو۔ وہ کچھ نہیں کہیں گے! میں کہوں گی کہ میں خود ساتھ لے کر گئی ہوں۔''

''ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی...... آپ تیار ہو جائیں پالکی میں جائیں گی یا ہووے میں......؟''

گھوڑوں والی بگھی ٹھیک رہے گی۔ ذرا آرام سے بھی چلیں گے۔ تیز رفتار بھی ہوتی ہے۔ شہر گھوم لیں گے! پرنتو وہ جھجکی...... اروپ کو پتا نہ چلے۔''

''میں بندوبست کرتا ہوں۔ شام کی چائے میں آپ کے ساتھ پیوں گا اور پھر نکلیں گے!'' اروپ کی آپ فکر نہ کریں۔ پرشاد تو خود شکنتلا کے نزدیک آنا چاہ رہا تھا۔

حسب وعدہ پرشاد سہ پہر کو آ گیا لیکن شکنتلا پر نظر پڑتے ہی اس نے دل تھام لیا...... خوب صورت چست گلابی اور سبز رنگ کی پوشاک اور کھلی زلفیں اونچی ایڑی والے سنہرے جوتے...... موتیے کے گجرے...... ہر لحاظ سے اروپ کو مات دیتی جوانی کھلتی رنگت پرشاد اپنے باپو کی قسمت پر حسد کرنے لگا۔

''آؤ پرشاد۔'' شکنتلا اسے دیکھتے ہی مسکرا کر بولی تو گالوں کے گڑھے گہرے ہوتے چلے گئے۔

اور شکنتلا نے ہاتھ پکڑ کر پرشاد کو قریب ہی بٹھا لیا۔

''اروپ کو تو پتا نہیں چلا۔''

''نہیں...... نہیں...... رانی۔'' ماتا پرشاد اب ماتا کہتے ہوئے جھجکا۔

''اروپ اس وقت گہری نیند سوئی ہوئی ہے۔''

تھوڑی ہی دیر بعد پرشاد اور شکنتلا چار سفید گھوڑوں والی بگھی پر شہر کی سیر کو نکلے ہوئے تھے۔ ان پر چلنے سے کافی دیر پہلے ہی سپاہی ان راستوں پر کھڑے ہو کر بازار خالی کروا رہے تھے۔

بگھی کے آگے آگے بھی سیاہ گھوڑوں پر سوار دو اہلکار فضا میں کوڑے گھماتے ہوئے چل رہے تھے۔ کوڑوں کے گھومنے سے شائیں شائیں کی آواز سے لوگوں کو پتا چل رہا تھا کہ شاہی سواری آ رہی ہے۔

اسی طرح بگھی کے پیچھے پیچھے بھی محافظ موجود تھے۔

شکنتلا اپنی نشست پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے ایک ہاتھ سے بگھی کی بالکونی تھامے دوسرے ہاتھ سے خوب صورت بال سنوارنے میں مصروف تھی۔ بات بات پر اس کی ہنسی نکل رہی تھی موتیوں ایسے دانت اور گلابی گالوں کے گڑھے پرشاد کی محویت کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ اروپ تو دھاپ پان سی تھی جب کہ شکنتلا دراز قد اور بھرے بھرے سراپے کی مالک تھی۔ وہ جان بوجھ کر اداؤں کے جادو جگانے لگی اور غیر محسوس طریقے سے پرشاد کے ساتھ ٹکرانے لگی۔ بگھی اس وقت کسی گنجان بازار سے گزر رہی تھی دونوں اطراف لوگ کھڑے شاہی سواری اور سواروں کو دیکھ رہے تھے۔ پرشاد نے بتادیا تھا کہ یہ ہماری ریاست کا سب سے بڑا اور بہت پرانا بازار گڑھی پروہت ہے۔ جا بجا کھانے کپڑے اور زیورات کی دکانیں تھیں۔

یہاں بگھی رکوا کر شکنتلا بازار میں گھومنے لگی پرشاد اس کے ساتھ ہی تھا۔

نئی رانی کو اپنے درمیان پا کر عوام خوش ہو گئے۔ فقیروں نے ہاتھ پھیلا دیئے! مظلوم فریادیں لے کر آ گئے۔ شکنتلا نے پرشاد کو کہا کہ ان کی دادرسی کردو۔ پرشاد نے محافظوں کو کہا کہ تانبے کے سکے لاؤ...... ایک بڑا تھال آ گیا شکنتلا اپنے ہاتھوں سے غریبوں میں بانٹنے لگی۔ پرشاد مختلف درخواستوں پر فیصلے سنا کر شاہی اہلکاروں کو عمل درآمد کے لیے کہنے لگا۔ دکانوں اور ریڑھیوں سے شکنتلا چیزیں چکھنے لگی۔ عوام کا ایک جم غفیر اکٹھا ہو گیا! لوگ خوش ہو گئے۔

کافی دیر بعد شکنتلا نے چلنے کا عندیہ دیا۔ اہلکار کوڑے برسا کر بگھی تک راستہ خالی کروانے لگے۔

تھوڑی دیر بعد بگھی شہر سے باہر خوب صورت پہاڑوں کے درمیان ہموار راستوں پر چل رہی تھی۔ یہ ایک نیم پختہ سڑک تھی جو آگے سے گھوم پھر کر واپس شہر کو جاتی تھی۔

خنک ہوا چل رہی تھی۔ شکنتلا بلند پہاڑوں کو دیکھ رہی تھی۔ جبکہ پرشاد شکنتلا میں کھویا ہوا تھا۔ پرشاد کی محویت کو محسوس کر کے شکنتلا نے اسے کہنی ماری۔ ''کہاں ہو؟''

''آں...... ہاں'' پرشاد چونک کر شرمندہ سا ہو گیا۔ بلندیوں میں کھو گیا تھا!

''خواہش کو حقیقت بھی بنایا جا سکتا ہے۔'' شکنتلا ہولے سے بولی۔

''کیا مطلب؟'' پرشاد اس کے دمکتے چہرہ کی طرف دیکھ کر بولا۔

''مطلب یہ کہ'' شکنتلا نے آہستگی سے اس کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کر کہا۔

''تم مجھے رانی ماتا نہ کہا کرو...... تمہیں عجیب سا نہیں لگتا...... مجھے تو بڑی شرم آتی ہے۔ ہم عمر ہی تو ہو تم میرے۔''

''آہ......'' بے اختیار پرشاد کی سرد آہ نکل گئی۔ تو شکنتلا کھلکھلا کر ہنسنے لگی اور پرشاد کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مارا۔ میں سمجھ گئی...... تم باپو کی وجہ سے مجھے رانی ماتا کہتے ہو۔''

''یہی سمجھ لو۔'' پرشاد کا دل اُداس تھا شاید......

''رانی تو مقدروں والی ہوتی ہیں...... میں تو بس مہمان ہوں۔''

رات بھی راجہ جے کشن دمہ سے بُری طرح کھانس رہے تھے۔ ویدوں کے پاس شاید کوئی علاج نہیں۔ اب تو انہیں بخار بھی بہت تیز آنے لگا۔ شکنتلا یکدم چہرے کے تاثرات بدل کر گہری اُداسی سے بولی۔ رام نہ کرے اگر انہیں کچھ ہو گیا...... تو...... یا تو مجھے بھی ساتھ ہی ستی کر دیا جائے گا اور یا پھر اروپ مجھے محل سے دھکے دے کر نکال دے گی۔ وہ تو مجھے پسند ہی نہیں کرتی۔ میرا تو کوئی سہارا بھی نہیں کہاں جاؤں گی۔ شکنتلا نے پلکیں اُٹھا کر دیکھا تو پرشاد کو ان میں تیرتی نمی دکھائی دی۔

''نہیں شکنتلا......'' بے اختیار اس نے شکنتلا کا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا اور شکنتلا اس کی آغوش میں منہ چھپا کر بُری طرح سسکنے لگی...... تو پرشاد نے غیر ارادی طور پر اسے بھینچ لیا۔

شکنتلا نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اس کے وجود کی سوندھی خوشبو نے پرشاد کو سب احترام اور جھجک بالائے طاق رکھنے پر مجبور کر دیا۔ شکنتلا کسمسانے لگی اور پھر زور لگا کر اس کی گرفت سے نکل کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور دستی رومال سے اپنی آنکھیں صاف کرنے لگی۔ اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ پرشاد کے دل پر اس کے مسحور کن وجود کا جادو چھانا شروع ہو گیا تھا۔

بگھی واپس اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی اور شکنتلا اب پھر شوخی سے باتیں کر رہی تھی تاکہ آخری وقت میں

اس کا چہرہ پرشاد کو خوش کن لگے۔ شاہی سواری جب محل پہنچی تو رات ہو چکی تھی۔ جے کشن دربار سے آ چکے تھے اور اروپ کو بھی پتا چل چکا تھا۔ اس کا پارا چڑھا ہوا تھا اور غصّے میں وہ بھری ہوئی تھی۔

پرشاد شکنتلا کو چھوڑنے کمرہ خاص تک آیا جہاں راجہ جے کشن اور اروپ دونوں بیٹھے تھے۔ شکنتلا کو دیکھتے ہی اروپ کھڑی ہوگئی! جے کشن کی موجودگی کی وجہ سے وہ کھل کر اظہار خیال نہ کر سکتی تھی۔

''کہاں گئی تھیں رانی ماتا......؟'' اروپ اس کے چہرے پر نظریں گاڑ کر طنزیہ انداز سے بولی۔

''شہر کی سیر کو نکلے تھے......'' شکنتلا مختصر جواب دے کر ایک طرف لاپروائی سے بیٹھ گئی۔

''آپ کے پھیرے باپو کے ساتھ ہوئے ہیں۔''

''ان کی طبیعت تمہیں پتا ہے اروپ ٹھیک نہیں۔'' شکنتلا دیکھنا چاہتی تھی کہ جے کشن کا کتنا لحاظ ہے۔

''پرشاد آپ نے بھی مجھے نہ بتایا اور ساتھ چلے گئے؟'' اروپ بڑی مشکل سے ضبط کر رہی تھی۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں اروپ......کون سی قیامت آ گئی ہے۔ آخر کو ہماری رانی ماتا ہیں۔''

پرشاد کی سرد مہری دیکھ کر اروپ پاؤں پٹختی ہوئی چلی گئی اور تھوڑی ہی دیر بعد پرشاد بھی اجازت لے کر چلا گیا تو شکنتلا اور جے کشن تنہا رہ گئے۔ جے کشن تمام وقت خاموش رہے۔ وہ اس وقت پیالے سے کوئی دوا وغیرہ پی رہے تھے۔ دوا پلانے کے بعد کنیز نے ان کا منہ کپڑے سے صاف کر دیا اور باادب کھڑی ہوگئی۔ دوسری کنیز نے آگے بڑھ کر شکنتلا کے پاؤں گود میں رکھنے کے بعد جوتے اتارے اور ان پر ملائمت سے ہاتھ پھیرنے لگی۔

☆......☆

''دلاور......'' کوٹھاری باریک آواز میں غرایا۔

''جی سرکار......'' دلاور ادب سے بولا۔

''خوب بہت خوب کوٹھاری چہکا۔ اب تو اپنی اوقات پر آ رہا ہے!''

''تم بہت شکتی مان ہو کوٹھاری۔ دلاور تم سے ہار بھی مانتا ہے۔''

''سچ کہہ رہے ہو دلاور؟'' کوٹھاری کی باریک آنکھوں میں شبہے کے آثار تھے۔

''جب تمہاری بات نہیں ماننا ہوتی تھی تب بھی سچائی سے کہہ دیتا تھا۔ اب بھی سچ ہی کہہ رہا ہوں شاباش۔ دلاور!'' کوٹھاری اس کے شانے تھپتھپاتے ہوئے خوفناک انداز میں مسکرایا۔

''آج سے تم میرے نائب ہو میرا حکم ماننا تم پر فرض اور تمہاری خواہشات پر تکمیل میرا فریضہ رہا۔ اب چھوٹے موٹے کاموں کیلئے مجھے نہیں جانا پڑے گا۔ تم جایا کرو گے اور حسکران تمہاری سہائتا کے لیے تمہارے ساتھ ہوگا لیکن تمہیں نظر نہیں آئے گا۔ پرنتو یاد رکھنا۔ دلاور کوٹھاری کی نظریں پہاڑوں کے اندر بھی دیکھ سکتی ہیں اور بازو......تمہاری سوچ سے بھی لمبے ہیں۔ کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔

''دلاور......اب تمہارے ساتھ ہے کوٹھاری جیسا امتحان چاہے لے لو۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ آج رات تم ایک ایسے سفر پر نکلو گے جس کے دو راستے ہیں۔ کامیابی یا موت......اس کے علاوہ کچھ نہیں۔''

''دلاور حاضر ہے گرو۔'' تفصیل بتا دی جائے۔

''یہاں سے مشرق کی طرف......کئی سو کوس دور......ایک بہت بڑا جنگل ہے۔ جس کا نام ہاراکاری ہے۔''

''ہاراکاری......؟ دلاور نے زیر لب دہرایا۔

''ہاں ہاراکاری......ہاراکاری کا مطلب ہے خودکشی۔ یعنی اس جنگل میں گھسنے والا۔ اپنی موت کا سامان پیدا کر لیتا ہے بچ کر آنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے! اس جنگل کے بیچوں بیچ سیاہ پتھروں سے بنی ہوئی ایک عمارت ہے! جو صدیوں سے وہاں کھڑی ہے۔ وہاں ایک ایسا قبیلہ آباد ہے جس کے لوگ لمبی لمبی زندگی پاتے ہیں کئی سو سال کی زندگی......یہ وہ

حبشی لوگ ہیں ہزاروں سال سے وہاں کے باشندے ہیں اس قبیلے کا سردار تبریشا نام کا ایک آدمی ہے۔ تبریشا نامعلوم کب سے زندہ ہے نامعلوم کب تلک زندہ رہے گا۔ یہ لوگ انسانی گوشت کھاتے اور انسانی خون پیتے ہیں اور انسانی کھوپڑیوں کے گھر بنا کر وہاں رہتے ہیں۔ زندہ انسان حاصل کرنے کے لیے یہ لوگ اپنی بستی سے نکل کر جنگل کے کناروں تک آ جاتے ہیں۔ جنگل شروع ہونے سے قبل سرخ پہاڑیاں اور ان سے قبل ریگستانی علاقہ ہے ریگستانی علاقے میں سفر کے دوران کئی دفعہ قافلوں کے قافلے راستہ بھول جاتے ہیں اور سرخ پہاڑیوں کی طرف جا نکلتے ہیں جہاں سے یہ ہاراکاری قبیلے کے ہاتھ چڑھ جاتے ہیں۔ ہاراکاری قبیلے کے لوگ انسانوں کو انوکھے انوکھے طریقوں سے مارتے ہیں اور اگر کھانے کے لیے ان کے پاس وافر انسان موجود ہوں تو پھر قیدیوں سے مختلف کام بھی لیتے ہیں!''

''لیکن کوٹھاری جی ان کو وافر تعداد میں اس ریگستان سے انسان کیسے مل جاتے ہیں۔ وہاں سے تو بہت کم قافلے گزرتے ہوں گے۔ جبکہ وہاں سے انسان اغوا ہوتے ہیں۔''

''تمہاری بات ٹھیک ہے دلاور لیکن ہاراکاری قبیلے کے لوگوں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں وہ صرف دو سو ہے۔ بہت کم ان کے ہاں اولاد ہوتی ہے اور جب ایک بچہ پیدا ہوتا ہے تو ان میں سے کسی ایک کا مرنا ضروری ہو جاتا ہے اس کے لیے باقاعدہ دنگل ہوتا ہے جو کمزور پڑتا ہے وہ قتل ہو جاتا ہے۔''

''اس کے علاوہ ان لوگوں کے انسانوں کی تجارت کرنے والوں سے بھی رابطے ہوتے ہیں۔''

''ہمارا کام کیا ہوگا سرکار؟'' دلاور اصل موضوع پر آتے ہوئے بولا۔

''تمہیں قبیلے کے سردار تبریشا کا سر کاٹ کر لانا ہوگا، لیکن یاد رکھ کہ تبریشا صدیوں سے زندہ ہے اور اس کی جان ایک اچھیادھاری ناگ کے اندر ہے! جو اس نے کسی ایسی جگہ پر چھپا کر رکھا ہے جو ہر طرح سے محفوظ ہے۔''

''تم اس کا کیا کرو گے؟'' دلاور کو یہ کام شاید فضول سا معلوم ہوا۔

''ہاہاہا...... اس کے سر کے اوپر ایک خاص قسم کا جادو کروں گا تاکہ ابدی جیون مجھے ہو جائے...... اور پھر میں تم دونوں کو آزاد کر دوں گا اور غزالہ کو بھی تم سے ملا دوں گا۔''

''غزالہ......'' غزالہ کا نام آتے ہی دلاور اُداس ہو گیا۔ اس کی رگ و پے میں یاسیت سرایت کر گئی۔ ''مم۔ مجھے غزالہ کی ایک جھلک دکھا دو کوٹھاری...... میں اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

''ناممکن......'' اب یہ بات ناممکن ہو چکی ہے کوٹھاری فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''پہلے تبریشا میرا دوست تھا اور اب ہم جانی دشمن ہیں۔ عنکبوت اسی کے قبضے میں وہ جن ہے جو اس کے حکم سے غزالہ کو اٹھا لے گیا ہے!''

''کیوں کہ غزالہ کا جنم ایک اہم ساعت میں ہوا۔ اس لڑکی کی تبریشا کو صدیوں سے تلاش تھی جو دو صدیوں کے عین سنگھم میں پیدا ہوتی ہوا ایک صدی ختم ہوئی اور دوسری شروع ہوئی ان دونوں کے درمیان والا وہ وقت جب پہلی صدی کے بعد دوسری صدی کی پہلی گھڑی ختم ہونے سے پہلے پیدا ہوئی ایسا جنم ہزاروں سالوں میں ہوتا ہے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو وقت ضائع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تم اگر حسکران کی مدد سے تبریشا کو قتل کر کے اس کا سر لانے میں سپھل ہو گئے تو دونوں کو آزادی بھی مل جائے گی اور غزالہ بھی تم سے آ ملے گی، پھر میں تمہیں دولت کے انبار بھی دے دوں گا اور باقی جیون تم عیش عشرت سے بسر کرو گے اور اگر تم مارے گئے تو غزالہ بھی ماری جائے گی اور تمہارا کھیل ختم ہو جائے گا اور اگر تم ناکام واپس آئے تو میں تمہیں بھی ہری داس کی طرح خارش زدہ کتا بنا کر چھوڑ دوں گا۔''

☆......☆

شکنتلا شب خوابی کے مہین لباس میں تھی۔ جے کشن مسلسل کھانستے کھانستے اب نڈھال ہو چکے تھے۔ ابھی ابھی شاہی طبیب انہیں دوا وغیرہ پلا کر گئے تھے! اب وہ آہستہ آہستہ نیند کی وادی میں اتر رہے تھے۔ شکنتلا کئی دنوں سے ایسا ہی تماشا دیکھتی تھی وہ جب سے رانی بن کر آئی تھی راجہ کی حالت بگڑتی جا رہی تھی اور اس کی ہر رات کانٹوں پر گزر رہی تھی، جبکہ دیگر پلنگ داسیاں تو بیچاری کنیزیں ہی بن کر رہ گئی تھیں راجہ کا پلنگ تو شکنتلا کو نصیب نہ ہوا تھا ان کے مقدر کیسے کھلتے۔

جے کشن سو گیا تو شکنتلا آہستگی سے اُٹھی اور ہلکی سی پھنکار کے ساتھ ناگن بن گئی اور روشندان کے راستے چھت پر آ گئی۔ ادھر امیت جو اس کے انتظار میں چھت پر سے روشندان کے اندر جھانک رہا تھا اس نے جو شکنتلا کو انسان سے ناگن بنتے دیکھا تو بے اختیار اس کی دلخراش چیخ نکل گئی۔ چھت پر آتے ہی شکنتلا تیزی سے دوبارہ انسان بنی اور سرعت سے امیت کی طرف لپکی جو ششدر نگاہوں سے اسے تکے جا رہا تھا۔

''آ...... آ...... آپ ناگن ہیں رانی جی؟'' امیت کی آواز بمشکل نکلی اور اس کا سر ڈھلک گیا اور وہ دھڑام سے گر گیا۔

یہ تو عجیب صورتحال ہوگئی ہے۔ شکنتلا بڑبڑائی۔ چلو جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ آگے بڑھی اپنے دانت امیت کی شہ رگ پر رکھ دیے۔

☆......☆

اگلے دن راجہ دیر سے دربار گئے ان کے جاتے ہی پرشاد آ دھمکا۔ اتفاق سے شکنتلا اس وقت بالکل اکیلی تھی۔ وہ وارفتگی سے اٹھی تھوڑی سی باہیں اٹھائیں لیکن پھر شرمانے کے انداز پلکیں جھکا کر مسکرانے لگی۔ پرشاد اس کی اس ادا پر فدا ہو گیا۔

''آؤ بیٹھو پرشاد بھوجن کر لیا......؟''

''جی...... شکنتلا۔'' میں منہ اندھیرے بھوجن کرنے کا عادی ہوں۔ پرشاد کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''لیکن راجکماری تو...... دیر سے اُٹھتی ہے؟'' شکنتلا نے اسے ٹٹولا۔

''ہاں میں اکیلا ہی بھوجن کرتا ہوں۔''

''اور دوپہر کو......''

''دوپہر اور شام کا کھانا وہ میرے ساتھ ہی کھاتی ہے۔''

''کبھی مجھے بھی موقع دو۔'' شکنتلا نے پتا پھینکا۔

''ضرور ضرور شکنتلا تم کہو تو میں کیسے انکار کر سکتا ہوں۔''

''اچھا بتاؤ کیا کھاؤ گے؟''

''ابھی......؟'' اس نے الٹا سوال کیا۔

''ہاں ہاں......!''

''جو تمہاری مرضی؟''

شکنتلا نے فوراً تالی بجائی تو کنیز آ گئی۔

''فوراً اچھی سی چائے اور ساتھ میں ہرن کے گوشت کے کباب بناؤ۔''

''بہتر رانی ماتا......'' کنیز فرشی آداب کرتی ہوئی الٹے قدموں جانے لگی...... ''اور سنو...... کوئی اندر نہ آنے پائے۔''

''جو حکم سرکار۔''

''اور سناؤ پرشاد......'' شکنتلا چہرے پر مسکراہٹ سجا کے بولی۔

''بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔''

''رات اروپ تو ناراض ہوئی ہوگی!''

''ہاں وہ بہت غصے میں تھی۔''

''من مانی کرنے کی عادت ہے اسے، میرا خیال ہے بہت پیار کرتی ہے تجھ سے......''

''پیار کرے یا نہ کرے...... البتہ اپنی منوانے کی اسے بہت بری عادت ہے!''

☆......☆

(حیرت کے نئے رنگوں سے آباد اس سلسلے وار ناول کی اگلی قسط انشاءاللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خُدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خُدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہر حال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا دقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو کین منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)...... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)...... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)...... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' 110، آدم آرکیڈ، شہید ملت روڈ۔ کراچی

□ ا۔م۔کراچی

o جناب بابا جی السلام علیکم! میں پہلے بھی آپ کو خط لکھ چکی ہوں، مسئلہ یہ تھا کہ ہم پر بے انتہا قرض ہے۔اس قرض کو اتارنے کے لیے میرے بھائی نے شادی شدہ بہنوں کا زیور تک بیچ دیا لیکن قرض جوں کا توں ہے۔آپ نے سورۃ توبہ کی آخری آیت پڑھنے کو کہا تھا 21 دن تک میری والدہ نے مسلسل تین مہینے تک آیت پڑھی لیکن مسئلہ حل نہیں ہوا۔میری بہن اسماء جن کے رشتے ہی نہیں آتے ہیں، آتے ہیں تو انکار ہو جاتا ہے، اپریل میں ان کا رشتہ آیا لڑکا اچھا ہے، بابا جی ہمارے پاس تو کچھ بھی کرنے کو نہیں تھا۔ہم تو خود پائی پائی کے محتاج ہیں، لڑکے والوں کی دن تاریخ ٹھہری ہوئی تھی، 12 اکتوبر۔ہال بک تھے سب نے ہم پر زور دیا کہ لڑکی کی شادی ہے ہاں کہہ دو لڑکی کے معاملے میں اللہ تعالیٰ خود مدد کرتا ہے۔لڑکا اچھا تھا ہم نے ہاں کہہ دی، لیکن بابا جی اب مسئلہ یہ ہے کہ شادی میں صرف دو مہینے رہ گئے ہیں اور ہمارے پاس کوئی انتظام نہیں ہے، میرے بھائی بنارسی کپڑے کی پیکنگ کا کام کرتے ہیں۔وہ بالکل ختم ہو گیا ہے گھر میں پیسے کی تنگی ہے، بھائی نے جہاں جہاں کام کرتا ہے سب سے مدد کے لیے کہا لیکن کوئی مدد کرنے کو تیار نہیں ہے، اب بھائی نے بھی منع کر دیا ہے کہ وہ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے گا اور وہ بہت ذلیل ہو گیا ہے لوگوں سے منتیں کر کر کے اور اب وہ شادی نہیں کرے گا۔بابا جی اب ذرا غور کیجیے کہ شادی میں صرف 2 مہینے باقی ہیں ہمارا ابھی ہال بک ہے سب لوگوں کو پتا ہے کہ ہمارے گھر شادی ہونے والی ہے اور ہماری تیاری ہی نہیں ہے اور اب شادی سے دو مہینے پہلے بھائی نے بھی دلبرداشتہ ہو کر شادی سے انکار کرنے کا کہہ دیا ہے۔گھر میں تو ہم جیسے بھی گزارا کر رہے ہیں کہ یہ وقت بھی گزر جائے گا لیکن بابا جی اب ہمت جواب دے رہی ہے۔ہم جس کرب و دکھ میں ہیں اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں۔ میں بہت دُکھی دل سے آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں۔اب تو وظائف کر کر کے بھی دل گھبرا گیا ہے کہیں سے کوئی بھی امید نظر نہیں آ رہی۔بابا جی ہماری عزت کا سوال ہے۔اب آپ بتائیے ہم کیا کریں؟ آپ سے التجا ہے کہ کوئی ایسا حل بتائیے جس سے میری بہن اسماء کی شادی 12 اکتوبر کو بخیر و خوبی ہو جائے اور ہم پر جو پرانا اتنا قرض ہے وہ بھی اُتر جائے اور ہمیں مزید کوئی نیا قرض بہن کی شادی کے لیے نہ لینا پڑے آپ ہمارے لیے خصوصی دعا بھی کروا دیجیے بہت بہت مہربانی ہوگی، مجھے اس خط کا جواب جلدی دیجیے اور اسے ڈائجسٹ میں بھی شائع کروا دیجیے، شکریہ۔

☆بیٹی تمہاری خواہش پر تمہارا خط شائع کر رہا ہوں۔ اس دعا کے ساتھ کہ کوئی نیک انسان تمہاری سفید پوشی کا بھرم رکھتے ہوئے تمہاری مدد کر دے، کاش کہ لوگ یہ بات سمجھ سکیں کہ جائز ضرورت مند اپنے پورے کنبے کو لے کر ٹی وی اسکرین پر اپنی بے بسی کا تماشا نہیں لگا تا اللہ ہدایت دے کہ یہ لوگ مدد کرنے والوں کے جذبات سے کھیلنا ترک کر دیں۔

□ شبانہ۔شبقدر

o بابا جی کیسے ہیں آپ؟ امید ہے خیریت سے ہوں گے، تعویذ بھجوانے کا بہت بہت شکریہ۔بابا جی! تعویذ کے ٹھیک 21 یا 22 دن بعد بہنوئی کا فون آیا تھا کہ وہ میری بہن کو لے جانا چاہتا ہے۔لیکن اب خاموش ہیں، اب عدالت میں کیس بھی چل رہا ہے کہ یا تو بہن کو گھر لے جائے یا چھوڑ دے۔پلیز بابا جی ہم ہر حال میں بہن کا گھر بچانا چاہتے ہیں۔بابا جی شمارے میں جواب دینے کا بہت بہت شکریہ۔ہمارے لیے خاص دعا کریں۔

☆بیٹی شبانہ! بہن سے کہو ورد جاری رکھے، سوائے اللہ کے کسی سے مدد کی طلب گار نہ رہے۔ جو لوگ پورے یقین سے اللہ سے مانگتے ہیں وہ ضرور کامیاب ہوتے ہیں۔

□ ایمان خان۔ملتان

☆بیٹی ایمان! اللہ تمہیں خوش رکھے، بیٹی نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تمہاری والدہ کے ساتھ شدید قسم کا نفسیاتی مسئلہ ہے۔ انہیں علاج کی ضرورت تھی لیکن اب بہت وقت گزر چکا ہے۔تم لوگوں کو اب صبر اور ہمت سے حالات کا سامنا کرنا ہوگا۔گھر میں قرآن شریف کی تلاوت ضرور کیا کرو۔حسب استطاعت ضرورت مندوں کی مدد کرو، الحمد شریف ترجمے کے ساتھ بہت پڑھا کرو اور ترجمے پر غور کرو کہ اللہ تعالیٰ کیا فرما رہا ہے۔ جہاں تک تمہاری بہن کا تعلق ہے اس سے کہو ہر نماز کے بعد سورۃ الناس اور سورۃ الفلق ضرور پڑھا کرے۔کرم ہوگا۔ بیٹی تم مجھے ایک ماہ بعد حالات سے

آ گاہ کرو اگر تعویذ دینا ضروری ہوا تو میں تیار کر دوں گا۔

□ ثمینہ، ہالینڈ

☆بیٹی ثمینہ! اللہ تمہیں ڈھیروں خوشیاں عطا فرمائے، خط تم تک بہت تاخیر سے پہنچ رہے ہیں اسی لیے کالم میں جواب دے رہا ہوں تمہارا خط مجھے مل گیا ہے آئندہ بھی حالات سے آگاہ رکھنا۔

□ زبیدہ۔کوئٹہ

☆بیٹی زبیدہ! تمہارا خط تمہاری خواہش پر شائع نہیں کیا ہے، تم نے درست لکھا ہے کہ پردہ دار عورت کے لیے زندگی بہت مشکل ہے۔ ہر شخص مدد کے نام پر سر پر ہاتھ رکھنا چاہتا ہے، بیٹی تم دین دار خاتون ہو، یقین رکھو اللہ کی اس دنیا میں کوئی ایک انسان ایسا ضرور ہوگا جو تمہارا تماشا لگائے بنا تمہاری اور بچوں کی امداد کرے گا صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے، میں بھی منتظر ہوں تم بھی صبر کے ساتھ انتظار کرو۔

□ انور۔ہزارہ

o باباجی! میری بہن نے آپ سے تعویذ لیا تھا۔ اُس کا مسئلہ حل ہوگیا۔ اللہ کا احسان ہے مگر پچھلے ہفتے سے اُس کے دونوں پاؤں اکڑ گئے ہیں۔ لڑکے والے شادی کی تاریخ مانگ رہے ہیں مگر اِس پریشانی نے ہمیں بہت تنگ کیا ہے۔ بہن نے مجھے بتایا کہ پہلے تعویذ کے بعد دوسرا تعویذ بھی لینا ضروری تھا جو اُس نے نہیں لیا۔ کہیں یہ اُس کی وجہ سے تو نہیں؟ باباجی! آپ مجھے تعویذ تیار کر دیں، میں ہدیہ اِرسال کر دوں گا۔

☆ بیٹے انور......! ہر کام کا ایک خاص طریقہ ہے، میں ہر مسئلے میں دو تعویذ نہیں دیتا۔ جہاں ضرورت ہوتی ہے، وہاں دیتا ہوں۔ تمہاری بہن نے میری بات نہیں مانی۔ ظاہر ہے، جب علاج نامکمل ہوگا تو تکلیف پھر پلٹ آئے گی۔ انسان اپنا مقصد پانے کے بعد اللہ کا شکر اَدا کرنا ہی بھول جاتا ہے۔ بہن سے کہو اللہ سے معافی مانگے۔ بے شک وہ معاف کرنے والا ہے۔ تعویذ میں تیار کر دوں گا۔

□ نمرہ فضل۔کینیڈا

o باباجان! میری اردو بہت اچھی نہیں، اِس لیے کوئی غلطی ہو تو معاف کر دیں۔ باباجان! میں عید پر پاکستان آؤں گی، کیا میں آپ سے مل سکتی ہوں؟ مجھے بہت شوق ہے کہ آپ کو دیکھوں۔ آج سے دس سال پہلے جب اپنی والدہ کے ساتھ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے دفتر آئی تھی، تب آپ کی ایک جھلک دیکھی تھی تب سے اَرمان ہے کہ آپ کو دیکھوں۔

☆بیٹی نمرہ! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ میں اَب اپنا سارا وقت عبادت میں صَرف کرتا ہوں اس لیے گھر سے نکلنا ہی برائے نام کر دیا ہے۔ پھر ملنا ضروری بھی نہیں۔ میں اپنے بچوں کو ہمیشہ اپنی دُعاؤں میں یاد رکھتا ہوں۔

□ ریحان مغل۔خان پور

o باباجان! اللہ آپ کو لمبی عمر عطا فرمائے۔ میں بہت مشکل کا شکار ہوں۔ 6 ماہ قبل میری والدہ کا انتقال ہوگیا۔ والد صاحب نابینا ہیں۔ ہم دو ہی بہن بھائی ہیں۔ بہن شادی شدہ ہے اور وہ اسلام آباد میں رہتی ہے۔ میرے لیے بہت مشکل ہو رہی ہے کہ نوکری پر جاؤں یا والد صاحب کو سنبھالوں؟ وہ بھی کچھ ضدی طبیعت کے ہیں۔ گھر سے باہر نکل جاتے ہیں اور اِسی لیے اکثر گر پڑتے ہیں اور چوٹ لگ جاتی ہے۔ باباجان! لوگ کہتے ہیں کہ مجھے شادی کر لینی چاہیے تاکہ گھر بار سنبھالنے والا کوئی تو ہو مگر میں ڈرتا ہوں کہ پتا نہیں آنے والی انہیں برداشت بھی کرے گی یا نہیں؟ بتائیے، میں کیا کروں؟

☆ بیٹے ریحان! تمہارے گھر کو بے شک ایک ذمے دار عورت کی ضرورت ہے۔ اپنے جاننے والوں ہی میں سے کوئی سمجھدار اور ذمے دار لڑکی دیکھ کر شادی کر لو۔ یہ درست ہے کہ عورت ہی گھر کے معاملات کو سنبھال سکتی ہے۔ وہم دل میں مت لاؤ۔ ظاہر ہے، جو لڑکی بھی تمہارے گھر میں آئے گی، وہ باپ کی محبت اور حیثیت سے واقف ہوگی۔ اللہ سے دُعا کیا کرو کہ وہ تم پر رحم فرمائے۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۂ سباء ضرور پڑھو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ یوسف۔بٹہ موری

o باباجی! بڑی مشکل سے آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ ہمارے علاقے میں ڈاک کا نظام بہت اچھا نہیں ہے۔ آپ مجھے کالم میں جواب دیں۔ مالی حالات بہت خراب ہیں پھر موسم بھی بہت شدید ہو جاتا ہے۔ پہلے میں کراچی میں نوکری کرتا تھا مگر زلزلے کے بعد گھر کے سارے مرد ختم

ہو گئے تھے۔ صرف بوڑھی ماں اور معذور بہن بچے ہیں۔ تب سے میں ہی اُن سب کا بڑا ہوں انہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتا۔ اس حادثے کو حالاں کہ برسوں ہو گئے لیکن باباجی! بے روزگاری نے گھر کا رستہ دیکھ لیا ہے۔ اَب تو کھانے کے بھی لالے پڑے رہتے ہیں۔ کوئی ایسا عمل بتایئے کہ روزی وافر ہو جائے۔ آپ کا بڑا احسان ہوگا۔

☆ بیٹے یوسف......! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بے شک حالات بہت تکلیف دہ ہیں مگر ہمت اور صبر سے حالات کا مقابلہ کرو۔ نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد 7 تسبیح پڑھو یَاغَنِیُّ یَامُغْنِیُّ اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کرو۔ مدت 2 ماہ ہے۔

□ آئینہ۔ سرگودھا

o محترم باباجی! السلامُ علیکم! امید ہے' اللہ کے فضل و کرم سے آپ خیریت سے ہوں گے اور آپ کے درجات میں اللہ تعالیٰ ترقی فرمائے۔ (آمین!) باباجی! میں نے پہلے بھی آپ سے وظیفے منگوائے ہیں۔ پچھلی دفعہ بھی اپنے بچوں کے لیے آپ سے وظیفہ منگوایا تھا کہ وہ پڑھائی پر توجہ نہیں دیتے اور ضدی بہت ہیں۔ باباجی! آپ نے مجھے ایک ماہ تک ہر نماز کے بعد چاروں قل پڑھ کر دَم کرنے کے لیے کہا تھا۔ میں نے ایک ماہ تک یہ وظیفہ بھی کیا۔ پورا ماہ وظیفہ کرنے کے دوران کچھ فرق پڑا لیکن اَب پھر ویسے ہی بدتمیز ہیں اور پڑھائی پر توجہ نہیں دیتے اور بڑوں کی بات بھی نہیں مانتے۔ اُس کے بعد دوسرا وظیفہ کسی اور نے بچوں کے لیے وظیفہ بتایا کہ سورۃ فتح صبح کو پانی پر دَم کر کے پلاؤ' اور سورۃ مومن کی آخری آیت ہر نماز کے بعد ایک تسبیح پڑھ کر دُعا کرتی ہوں۔ تقریباً ایک ماہ ہو گیا ہے یہ وظیفہ پڑھتے ہوئے' لیکن پھر بھی کچھ فرق نہیں پڑا۔ باباجی! میں اپنے بچوں پر پوری توجہ دیتی ہوں اور اُن کا پورا خیال رکھتی ہوں لیکن پھر بھی وہ نہ میری بات مانتے ہیں اور نہ ہی پڑھائی پر توجہ دیتے ہیں۔

☆ بیٹی آئینہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی کے ساتھ وظیفہ جاری رکھو۔ انشاء اللہ' رفتہ رفتہ سب خیر ہوگی۔ مدت 41 دن ہے۔

□ غفور احمد۔ فیصل آباد

o پیارے باباجان! السلامُ علیکم! سدا سلامت رہیں۔ (آمین!) باباجان! بڑی امید لے کر حاضر ہوں۔ بہت زیادہ پریشان ہوں۔ والد فوت ہو چکے ہیں۔ میں عرصہ آٹھ سال سے دربدر کی ٹھوکریں کھا رہا ہوں۔ دو مرتبہ کراچی میں ملازمت کے لیے جا چکا ہوں' لیکن کہیں بھی کام نہیں بنتا ہے۔ جہاں بھی کام کرتا ہوں' کوئی نہ کوئی رکاوٹ ہو جاتی ہے۔ اپنا درزی والا کام شروع کیا' اس میں بھی بہت نقصان ہوا ہے۔ اَب تو زندگی سے ہی مایوس ہوں۔ بوڑھی والدہ روز اِس آسرے پر میرا انتظار کرتی ہیں کہ کوئی کام مل گیا ہوگا لیکن انہیں مایوس کرتا ہوں۔ نہ معلوم کسی نے کیا جادو یا بندش کردی ہے کہ پریشانی نے گھر کا راستہ دیکھ لیا ہے؟ باباجی! آپ کو خدا اور رسولِ کریم پاکؐ نبی کریمؐ کا واسطہ ہے' میرے لیے کوئی تعویذ یا وظیفہ دیں۔ میں نماز کا پابند ہوں۔ رِزقِ حلال چاہتا ہوں۔ کئی مرتبہ تبلیغ کے لیے بھی والدہ کے ساتھ جا چکا ہوں۔ گھر میں ٹی وی' ٹیپ کچھ بھی نہیں ہے پھر بھی مقدر خراب ہو گیا ہے۔ نہ معلوم میرے لیے اچھے دن کب آئیں گے؟

☆ بیٹے غفور! نماز کی پابندی رکھو اور نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۂ رحمٰن پڑھو رِزق میں برکت کی دُعا کرو۔ بیٹے! ایک بات یاد رکھو، جو لوگ اللہ کو یاد رکھتے ہیں، اللہ بھی انہیں یاد رکھتا ہے۔

□ بشریٰ اعوان۔ کھاریاں

o باباجی! السلامُ علیکم! مسئلہ یہ ہے کہ دوسری شادی کے لیے میرا کوئی رشتہ نہیں آتا۔ میری عمر 26 سال ہے۔ جس شخص سے میری پہلی شادی ہوئی تھی' وہ میرے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ وہ بہت گندہ آدمی تھا۔ اَب میں چاہتی ہوں کہ دوسری شادی کرلوں۔ میرے بوڑھے ماں باپ بھلا کب تک میرا خیال رکھیں گے؟ میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے' مجھے دورے بھی پڑتے ہیں اور جب میری طبیعت خراب ہوتی ہے تو مجھے کچھ بھی پتا نہیں چلتا کہ میں کیا کر رہی ہوں؟ باباجی! کوئی اچھا سا وظیفہ بتادیں کہ میرے دورے ختم ہو جائیں۔ میری شادی کے لیے بھی کوئی اچھا سا وظیفہ بتادیں کہ میں بھی اپنے گھر کی ہو جاؤں۔ باباجی!

میرے خط کا جواب ذرا جلدی دیجیے گا' شکریہ!

☆ بیٹی بشریٰ! اللہ تمہیں مکمل شفاء عطا فرمائے۔ تمہیں پہلے اپنا مکمل علاج کرانا چاہیے۔ تم نمازِ عشاء کے بعد ایک بار سورۂ جن پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 21 دن ہے۔

□ مونس۔ کندھ کوٹ

o بابا جی! مسئلہ میری بہن کا ہے۔ رشتے آتے ہیں لیکن لوگ پلٹ کر دوبارہ نہیں آتے۔ جس نے جو پڑھنے کا بتا دیا، وہ پڑھا۔ بہت وظیفے پڑھے ہیں لیکن شادی کا مسئلہ جوں کا توں ہے۔ عمر تیزی سے بیت رہی ہے۔ اس کے بعد ایک اور بہن اور ایک بھائی ہیں' اُن کی بھی شادی کی عمر ہو رہی ہے۔ آپ سے تعویذ منگوایا تھا جو کہ کافی عرصے پہنا پھر اتار دیا اور ٹھنڈا بھی کر دیا۔ آپ کو دوبارہ خط لکھا' آپ نے کہا کہ تعویذ ٹھنڈا نہیں کرنا تھا۔ اَب ہم سے غلطی ہوگئی ہے۔ اللہ ہمیں معاف کر دے۔ آپ سے بھی معافی مانگتے ہیں۔ اَب آپ کیا کہتے ہیں کہ دوبارہ تعویذ منگوا لیں؟ جواب ضرور دیجیے گا۔ ہم سب بہت پریشان ہیں۔ میری راتوں کی نیند اُڑ گئی ہے۔ آپ کی مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹی مونس! یہ مسئلہ بہت عام ہوتا جا رہا ہے۔ لڑکی والے بہتر سے بہتر کی تلاش میں اور لڑکے والے مالی آسودگی کے انتظار میں مسائل کو بڑھا رہے ہیں۔ شادی کی ایک عمر اور خاص وقت ہوتا ہے، وہ گزر جائے پھر بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ بہر حال تعویذ دوبارہ منگوا لو۔

□ عبید ولی۔ کرک

o بابا جی! اللہ آپ کو صحت دے۔ میرے دونوں بیٹے ایک عرصے سے باہر جانا چاہ رہے ہیں۔ آپ نے وظیفہ دیا تھا اُن کی ماں کو پڑھنے کے لیے۔ اُس کی برکت سے لڑکوں کی بڑی بہن نے اُن کا ویزا بھیج دیا ہے۔ اَب میری آپ سے یہ گزارش ہے کہ ایسا جلالی وظیفہ دیں کہ دونوں کو وہاں اچھا کام مل جائے اور اُن کا دل بھی لگ جائے۔ میں اور میرے گھر والے آپ کے شکر گزار رہیں گے۔

☆ بیٹے عبید......! اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں دکھائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ والدہ سے کہو حسبِ استطاعت صدقہ خیرات کیا کریں۔ بعد نمازِ عشاء 1100 بار سورۃ المائدہ آیت 6 پڑھیں اور دُعا کریں۔ مدت 41 دن ہے۔

□ شازیہ۔ کوٹ ادّو

o بابا جی! ہم لوگ بہت پریشان ہیں۔ ہمارا ایک ہی بھائی ہے، شادی سے پہلے وہ ہم بہنوں اور ماں باپ کا بہت خیال کرتا تھا مگر اَب بہت بدل گیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری بھابی اُس پر جادو کرتی ہے۔ آپ ایسا تعویذ دیں کہ وہ پھر سے ہماری بات ماننے والا بن جائے۔ اس کے علاوہ بابا جان! ایک مسئلہ اور ہے، وہ یہ کہ ہمارے ابو بہت گندی گندی گالیاں دیتے ہیں اور ہماری ماں پر ہاتھ بھی اٹھاتے ہیں، اِس کا بھی حل بتائیے۔

☆ بیٹی شازیہ! تم نے اپنے رویے کی وجہ سے بھائی کو دور کیا ہے۔ پہلے وہ مجبور تھا مگر اَب اُس کا اپنا کنبہ ہے۔ اولاد ہونے کے بعد وہ اور دور ہو جائے گا لہٰذا تم لوگ اپنا رویہ بدلو، اس کی بیوی کو پریشان مت کرو۔ معاملات میں خاموشی اختیار کرو اور ہر نماز کے بعد یَاصغِیرُ یَاکبِیرُ کا بہت وِرد کیا کرو۔ مدت 21 روز ہے۔

□ شرمین۔ سکھر

☆ بیٹی! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ تمہارے شوہر درست کہتے ہیں مگر بیٹی! والدین بہت قیمتی سرمایہ ہیں۔ تم اُن سے ملنے ضرور جایا کرو اور کھڑے کھڑے جایا کرو۔ شوہر کو ساتھ مت لے جاؤ۔ بیٹی! والدین کی خبر گیری کرنا تمہارا فرض ہے۔ بھائی یا بھاوج کے رویّے کی وجہ سے جانا ترک مت کرو تا کہ زندگی میں تمہیں ہمیشہ اطمینانِ قلب رہے۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 71-71 بار سورۃ فاتحہ پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ فرحانہ۔ کراچی

☆ بیٹی فرحانہ! بڑا دُکھ اور افسوس ہوتا ہے جب مسلمان گھروں کے افراد الٹے سیدھے عملیات کروانے والوں کے پاس جاتے ہیں۔ یہ ایمان کی شدید کمزوری ہے اور یاد رکھو اللہ کے ہاں بھی اِس کی معافی نہیں۔ پریشانی' خوشی' بیماری' صحت سب خدا کی طرف سے ہے۔ خوشی میں شاکر رہنا اور پریشانی میں صابر رہنا ہی ایک مومن کا فرض ہے۔ اللہ سے خوب معافی مانگو۔ حسبِ استطاعت صدقہ خیرات نکالو اور ہر نماز کے بعد الحمد شریف' چاروں قل اور آیت الکُرسی پڑھ کر اپنے اوپر ضرور

دَم کیا کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد کیفیت سے آگاہ کرو۔

□ انیلا۔گھوٹکی

☆ بیٹی انیلا! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ میرا مقصد تمہیں پریشان کرنا نہیں ہے مگر بیٹی کچھ باتوں کا جاننا بہت ضروری ہے۔ میرے اندازے کے مطابق بیٹی! تمہارے گھر پر اثرات ہیں جو تم لوگوں کو کافی پریشان کرسکتے ہیں اور تمہاری خوشیوں میں رکاوٹ بھی ڈال سکتے ہیں، لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ جلد از جلد دونوں مسئلوں کے لیے مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ جب تک تعویذ تیار نہیں ہوتے' روز بعد نمازِ عشاء ایک بار سورۃ جن ضرور پڑھو۔ خط جوابی لفافے کے ہمراہ لکھو۔

□ صغریٰ۔مقام نامعلوم

☆ بیٹی! تم نے ایک خط میں کئی مسئلے لکھ دیے ہیں۔ بہرحال بہنوں سے کہو' شادی کے لیے بعد نمازِ فجر ایک بار سورۃ اَحزاب پڑھیں۔ رِزق میں برکت کے لیے سورۃ واقعہ پڑھنا بہت بابرکت ہے۔ جہاں تک بھائی کا تعلق ہے تو بھاوج سے کہو، نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 11-11 بار آیت الکرسی پڑھ کر تصور میں شوہر پر دَم کر دیا کرے۔ انشاءاللہ' ضرور کرم ہوگا۔ مدت 41 دن ہے۔

□ ندرت بتول۔ چک شہزاد

☆ بیٹی ندرت! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بعد نمازِ فجر ایک بار سورۃ مزمّل پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ بیٹی! تمہارے خواب نشاندہی کرتے ہیں کہ کوئی بہت قریبی شخص تم لوگوں کو پریشان کرکے خوش ہوتا ہے۔ خوب صدقہ خیرات کیا کرو۔ چلتے پھرتے گھر کے سارے افراد یَارَحمٰنُ کا وِرد کریں۔ اللہ حامی وناصر ہو۔

□ آمنہ شہوار۔ہالینڈ۔

☆ بیٹی شہوار! میں تمہارے ہر خط کا جواب بہت پابندی سے دے رہا ہوں مگر جانتا ہوں کہ ہمارے ہاں ڈاک کے نظام کی صورتِ حال کیا ہے۔ بہرحال دل میں کسی قسم کا وہم بھی مت لانا۔ تم تو میری بہت اچھی بیٹی ہو۔ فون کرکے خط کی بابت دریافت کرلیا کرو۔ تم سے کوئی بھی ناراض نہیں ہوسکتا۔ کبھی کبھی فون میں بھی مسئلہ ہوجاتا ہے۔ اصل میں سارا مسئلہ فاصلوں کا ہے۔ تم محبت کرنے والی ہو لہٰذا سب تم سے محبت کرتے ہیں۔ بے فکر ہوکر فون کرلیا کرو۔ خوش رہو! آباد رہو!

□ عروبہ غفار۔ملتان

☆ بیٹی عروبہ! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ دل میں وہم مت لاؤ۔ کچھ نہ کچھ رقم اپنے اوپر سے ضرور خیرات کیا کرو۔ جہاں تک بچی کا تعلق ہے تو تم لوگ معاملات میں خاموشی رکھو۔ کوئی فیصلہ بھی جلد بازی میں مت کرنا۔ مجھے 21 روز بعد صورتِ حال سے آگاہ کرو۔

□ فرحین۔ٹنڈو جام

☆ بیٹی فرحین! نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ مائدہ پڑھو اور دُعا کرو۔ یہی عمل بعد نمازِ عشاء کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ انشاءاللہ' ضرور حالات میں مثبت تبدیلی آئے گی۔

□ حنیفہ علی۔لاہور

☆ بیٹی حنیفہ! اللہ پر بھروسا رکھو۔ وظیفہ کرنے سے تبدیلی تو آئی ہے اور یہی مثبت تبدیلی ہے۔ انشاءاللہ' جلد کرم ہوگا۔ والدہ کی صحت اور تندرستی کے لیے دُعا گو رہو۔ بے شک ماں دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ وظیفہ مزید ایک ماہ جاری رکھو۔

□ گوہر علی۔دادو

☆ بیٹے گوہر! تمہیں براہِ راست بھی جواب دیا ہے اور کالم کے ذریعے بھی جواب دے رہا ہوں۔ یقیناً تمہارے حالات بہت تکلیف دہ ہیں۔ ماں باپ کے سامنے اولاد دم توڑ دے' صرف اِس لیے کہ علاج نہ ہوسکے کہ پیسا نہ ہو' بہت تکلیف دہ بات ہے۔ جہاں لوگ روزانہ ہزاروں روپے ضائع کردیتے ہیں' وہاں ایسے بھی لوگ ہیں جو اولاد کا علاج ہی نہیں کروا سکتے۔ بہرحال بیٹے! دنیا میں ابھی اچھے لوگ باقی ہیں۔ تم اللہ سے مدد مانگتے رہو۔ بیٹے! میں جو بھی ہوسکا' وہ ضرور کروں گا۔

□ انیسہ اشرف۔حافظ آباد

o باباجی! میری عمر اِس وقت 45 سال ہے۔ میں نے ساری زندگی انتہائی غربت میں گزاری۔ ماں باپ کے گھر بھی ترستی رہی اور شوہر کے ساتھ بھی زندگی دُکھوں ہی میں گزری۔ باباجی! میں نے ہر حال میں اللہ کا شُکر اَدا

کیا مگر اَب جب جوان بیٹوں کو مایوس دیکھتی ہوں تو بہت دُکھ ہوتا ہے۔ خود کو بہت بے بس اور بے کار محسوس کرتی ہوں۔ بچے مجھے کچھ نہیں کہتے مگر میں اُن کا دُکھ محسوس کر سکتی ہوں۔ بابا جی! اَب اللہ سے شکوہ کرنے کا دل چاہتا ہے مگر پھر ڈر جاتی ہوں، کہیں وہ ناراض نہ ہو جائے۔ بابا جی! بہت مایوس ہوں، میری مدد کریں۔

☆ بیٹی انیسہ! تم مایوس ہو، اِس لیے بچے بھی مایوس ہیں۔ تم نہیں جانتیں کہ ماں اپنی اولاد کو کہاں سے کہاں پہنچا سکتی ہے۔ تم اِن سخت حالات میں بچوں کو مقابلہ کرنا سکھاؤ۔ مایوسی تو موت ہے۔ تمہارے حالات بھی اسی لیے نہیں بدلے کہ تم مایوس رہیں۔ بتاؤ' اللہ اُس شخص کو نوازے گا جو شدید حالات کے باوجود مایوس نہیں اور مستقل جدوجہد کر رہا ہے یا اُس کو نوازے گا جو مایوس ہے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہے؟ بیٹی! ہر حالت میں اللہ کی شکر گزار رہو۔ سب سے پہلے نماز کی پابندی کرو۔ دُرود شریف بہت پڑھا کرو۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۂ مزمل پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ خیال رہے، نماز کی پابندی بہت ضروری ہے۔ مجھے حالات سے ضرور آگاہ رکھو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ سہراب۔ پنڈ دادن خان

☆ بیٹے سہراب! میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ اپنی بیوی کا بہت خیال رکھو۔ اُس سے کہو کہ بعد نمازِ ظہر ایک بار سورۂ یوسف ضرور پڑھے۔ اپنی والدہ اور بہن کو سمجھاؤ۔ بیٹے! رشتوں میں توازن رکھو۔ زیادتی کرنے کا حق کسی کو نہیں۔ تمہیں اپنا رویہ سخت کرنا ہوگا، صرف اِسی رویے سے گھر میں سکون ہوگا، گھر میں سکون ہوگا تو روزی میں بھی برکت ہوگی۔ جب جب یاد آئے، یَاحَفِیظُ یَاحَافِظُ کا وِرد کیا کرو۔

□ اُم عائشہ۔ اسلام آباد

o بابا جان! السلامُ علیکم! آپ سے مسلسل رابطے میں رہتی ہوں اور اللہ کا بڑا احسان ہے کہ آپ کی بدولت بہت دفعہ مشکلات سے بھی بچی ہوں۔ بے شک بڑوں کا سایہ بہت ضروری ہے۔ بابا جان! آپ تو جانتے ہیں کہ میرے سسرال والے مجھے بہت تنگ کرتے ہیں۔ شوہر بھی انہی کا ساتھ دیتے ہیں۔ میں کچھ بھی کرلوں' سب کے منہ بنے رہتے ہیں۔ الٹی سیدھی شکایتیں شوہر سے کرتے رہتے ہیں اور وہ مجھ سے بات پوچھے بنا ہفتوں منہ بنائے پھرتے ہیں پھر مجھے بھی غصہ آتا ہے اور میرا سارا غصہ بچوں پر اترتا ہے۔ اُن کو مارنے کے بعد مجھے بہت دُکھ ہوتا ہے۔ بابا جان! مجھے بتائیے کہ کیا میں کسی کی بیٹی نہیں؟ کیا میری کوئی عزت نہیں؟ جب میں دُکھی ہوں تو کس سے کہوں؟ شوہر بھی بات نہیں سنتے۔ بابا جان! زندہ رہنے کا ہی دل نہیں چاہتا۔ کوئی خوشی، خوشی نہیں لگتی۔ ہر وقت لوگوں کی ناراضگی کا خوف رہتا ہے۔ مجھے کوئی ایسا وظیفہ دیں جس کی بدولت میں بھی سکون سے رہ سکوں۔

☆ بیٹی عائشہ! ایک بات تو ذہن میں بٹھا لو کہ زندگی اللہ کی اَمانت ہے۔ جب اللہ چاہے گا، اپنی اَمانت واپس لے لے گا، لہٰذا بندوں کو یہ فکر نہیں ہونی چاہیے کہ زندگی کو کب اور کیسے ختم کیا جائے؟ جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے تو بیٹی! ہم ہر وقت ہر کسی کو خوش نہیں رکھ سکتے۔ اچھائی کی امید اللہ سے رکھو۔ بندہ کہاں اِس قابل کہ کسی کو کچھ دے سکے؟ جتنا بس میں ہے' وہ کرو اور صلہ اللہ سے چاہو۔ نماز کی پابندی رکھو' دُرود شریف بہت پڑھو۔ جس قدر ممکن ہو' سورۃ الفاتحہ کا وِرد کیا کرو۔ حسبِ استطاعت صدقہ خیرات ضرور کرو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔

□ نور حسن۔ گوجراں

o بابا جی! میں مالی طور پر بہت پریشان ہوں۔ گھر سے دور پڑا ہوں صرف روزی کے چکر میں مگر پھر بھی حالات تنگ ہی رہتے ہیں۔ گھر والے چکوال میں ہیں۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی بیماری یا پریشانی رہتی ہے۔ مجھے کبھی کبھی لگتا ہے جیسے کسی کو میری ضرورت نہیں' صرف پیسا اہم ہے۔ ماں باپ ہوں یا بہن بھائی یا بیوی بچے' سب مجھ سے پہلے اپنی ضرورت کی بات کرتے پھر مجھے پوچھتے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے پوچھنا ہی بھول جاتے ہیں۔ مجھے یہ احساس اَب شدت سے ہونے لگا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ اَب ملک سے باہر چلا جاؤں اور کبھی واپس نہ آؤں۔ صرف پیسا بھیجتا رہوں۔ بابا جی! میں نے اپنا یہ دُکھ کبھی کسی سے نہیں کہا۔ آپ کا کالم پڑھ کر دل چاہا کہ آپ سے اپنا دُکھ کہوں۔ بابا جی! میں بہت چھوٹی عمر سے محنت مشقت کر رہا ہوں اِس لیے محنت کرنے سے نہیں گھبراتا

مگر چاہتا ہوں کہ کم از کم میرے اپنے تو مجھ سے محبت کریں۔ صرف مجھے ضرورتیں پوری کرنے کی مشین نہ سمجھیں۔ آپ مجھے بتائیے' اگر میری سوچ غلط ہے تو پھر میرا دل و ذہن دونوں صاف ہو جائیں؟

☆ بیٹے نور! تم مجھے اپنا بڑا جان کر اپنا مسئلہ بتا رہے ہو، لہٰذا میرا بھی فرض ہے کہ تمہیں بڑوں کی طرح مشورہ دوں۔ افسوس یہ ہے کہ آج کل بڑے، بچوں کی طرح اپنا رویہ رکھتے ہیں۔ بیٹے! تمہاری سوچ غلط ہے۔ لوگ اپنی ضرورت انہی سے کہتے ہیں جو اِس قابل ہوں کہ اُن کی ضرورت پوری کر سکیں۔ ہر شخص، ہر کسی کے سامنے اپنی ضرورت نہیں رکھتا' صرف جن پر بھروسا کرتا ہے اور محبت رکھتا ہے' اُن سے کہتا ہے جیسے تم نے اپنے دل کی بات مجھ سے کی کیونکہ تمہیں یقین ہے کہ میں تمہیں درست مشورہ دوں گا' اِسی طرح تمہارے گھر والوں کو تم پر یقین ہے۔ اُن کے یقین کو مت توڑو۔ کتنے سارے لوگ تم سے وابستہ ہیں۔ اپنے تمام رشتوں کو سنبھال کر محبت کے ساتھ چلو۔ خوشی خوشی اپنی ذمے داریاں پوری کرو۔ نماز ضرور پڑھا کرو۔ جتنا اللہ کو یاد کرو گے' اتنا ہی دل کو سکون ملے گا۔ رِشتوں پر اعتماد بڑھے گا۔ وہم کو دل میں جگہ مت دو۔ خوش رہو۔ زندگی بہت مختصر ہے۔ بیٹے! وہم پال کر اِس کو ضائع مت کرو۔ میری بات کا کیا اَثر ہوا' مجھے ضرور بتانا۔

□ عندلیب۔ کینیڈا

o باباجی! میں بہت دور سے آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ امید کرتی ہوں کہ قریبی شمارے میں جواب دیں گے۔ میں اور میرے میاں قرضوں کی وجہ سے بہت پریشان ہیں۔ بچے چھوٹے ہیں، اِس لیے میں جاب نہیں کر سکتی۔ میرے شوہر جو کچھ کماتے ہیں' وہ گھر پر بھی خرچ ہوتا ہے اور پاکستان ماں باپ کو بھی بھیجتے ہیں۔ اُس کے بعد ہمارے پاس کچھ نہیں بچتا بلکہ قرضہ ہی بڑھ جاتا ہے۔ باباجی! یہاں زندگی بہت مشکل ہے مگر پاکستان میں بیٹھے رشتے دار نہیں سمجھتے۔ مجھے آسان سا وظیفہ دیں تاکہ میں بچوں کے ساتھ آسانی سے زندگی گزار سکوں اور قرض اُتار کر سکوں۔

☆ بیٹی عندلیب......! بے شک پردیس میں زندگی بہت مشکل ہے۔ اپنے ملک میں اپنوں کے درمیان رہنا بہت سارے مسائل حل کر دیتا ہے مگر پھر بھی ہم میں سے بیشتر کو اپنے ملک کی قدر نہیں۔ بیٹی! تم چلتے پھرتے یَاغَنِیُّ یَامُغْنِیُّ کا وِرد کرو۔ کوشش کرو کہ کچھ نہ کچھ رقم ضرور خیرات کر دیا کرو۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔

□ ناہید ورک۔ لورالائی

o پیارے باباجان! السلام علیکم! ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ اپریل 2013 سے میری امی کے گھر مسلسل چوریاں ہو رہی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ چوریاں کون کروا رہا ہے؟ کیونکہ گزشتہ سولہ' سترہ سال سے ہمارے گھر میں کبھی کوئی چوری نہیں ہوئی کیونکہ سب کو پتا ہے، ہم بہت غریب لوگ ہیں۔ ہم ماں بیٹیاں گھروں میں جھاڑو برتن کا کام کر کے گزارہ کرتے ہیں۔ ہمارا ایک ہی بڑا بھائی ہے جو کہ کچھ بگڑے ہوئے لوگوں کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ وہ اپنی کمائی کا کوئی ٹکا پیسا گھر میں نہیں دینا چاہتا۔ ہماری امی نے بہت محنت سے ایک ایک پائی جوڑ کے ایک لاکھ دس ہزار روپے جمع کیے جن سے وہ میری چھوٹی بہن کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔ وہ پیسا چور لے گیا۔ چھے مہینے کے بعد دوبارہ چور آیا، تب ہماری امی کی پانچ ہزار کی کمیٹی نکلی تھی' وہ بھی چور لے گیا۔ اس کے تقریباً تین مہینے بعد پھر سے چور آیا' اسے کچھ نہیں ملا لیکن میری امی نے پھر سے خواب میں دیکھا، چور چوتھی مرتبہ پھر آیا ہے اور گھر کا سامان لے کر جا رہا ہے کیونکہ جتنی مرتبہ چور آیا، آنے سے پہلے ہماری امی نے خواب میں دیکھا ہے۔ باباجان! ہم کرائے کے مکان میں رہتے ہیں۔ اِس مہنگائی کے زمانے میں ہم مکان بھی نہیں بدل سکتے۔ برائے مہربانی آپ اِس مسئلے کا حل تجویز فرمائیے۔ ہم کچھ اور نہیں چاہتے، ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ یہ مسلسل چوریاں رک جائیں کیونکہ اِن چوریوں کی وجہ سے ہم کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے ہیں۔ قرضہ بڑھتا جا رہا ہے۔ ہمارے جتنے بھی رشتے دار ہیں، سب ہمارے دشمن ہیں۔ جن لوگوں پر شک ہے، ان لوگوں کے نام لکھ رہی ہوں۔ آپ ہمیں ایسا وِرد دیجیے جو ہم چلتے پھرتے پڑھ سکیں کیونکہ وظیفہ پڑھنے کا ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔

☆ بیٹی ناہید! جب جب یاد آئے، آیت الکرسی ضرور پڑھا کرو۔ پیسوں کے بارے میں اپنے بھائی سے پوچھو۔ باہر والا کوئی نہیں ہے۔

□ زرینہ۔کوہاٹ

o باباجی! میں بہت مصیبت میں ہوں۔ کیا آپ میری مدد کرسکتے ہیں؟ باباجی! میں پسند کی شادی کرنا چاہتی ہوں۔ میرے گھر میں تمام لوگ اِس رشتے پر تیار ہیں' بس ایک بڑا بھائی ہے جو کہتا ہے کہ تمہارا رشتہ خاندان سے باہر نہیں کرنا۔ باباجی! ہم نے استخارہ بھی کروایا تھا' وہ بھی بہت اچھا نکلا ہے۔ لڑکے کے گھر والے بھی اِس رشتے پر تیار ہیں۔ وہ تو اِس سلسلے میں ہمارے گھر آنا چاہتے ہیں، لیکن بڑا بھائی مان نہیں رہا۔ باباجی! آپ کوئی ایسا وظیفہ دیں کہ میرا بھائی فوراً مان جائے۔ باباجی! میں ڈاک کے ذریعے جواب نہیں منگوا سکتی۔ آپ رسالے میں میرے مسئلے کا جواب دیں۔ یہ کام فوراً ہونا چاہیے کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ بھائی میرا رشتہ کہیں اور نہ کردیں۔ میری شادی کی عمر بھی نکل رہی ہے۔ باباجی! میری مدد کریں، میں کہیں اور شادی نہیں کرنا چاہتی۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ اِس ماہ میرے مسئلے کو شائع کردیں۔ اللہ آپ کو لمبی زندگی دے۔ یہ خط آپ طیبہ۔ کوہاٹ کے نام سے شائع کرنا۔ باباجی! میں بڑی امید لے کر حاضر ہوئی ہوں، میرا مسئلہ ضرور حل کروا دیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ مجھے وظیفہ ضرور بتا دیں۔ باباجی! میں چاہتی ہوں کہ میں کوئی غلط قدم نہ اٹھاؤں، سب کچھ ٹھیک طریقے سے بڑوں کی رَضامندی سے ہو۔ اللہ آپ کو اِس کا نیک اَجر دے۔ (آمین!)

☆ بیٹی زرینہ! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ عشاء کے بعد ایک بار سورۂ یٰسین پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 14 دن ہے۔

□ شاہ حسن۔ بدین

o باباجی! السلام علیکم! ہم دُعاگو ہیں' اللہ تعالیٰ آپ کو خیریت سے رکھے اور آپ کی عمر دراز کرے۔ (آمین!) اور آپ یونہی درد کے ماروں کا علاج کرتے رہیں۔ باباجی! میں نے پہلے بھی آپ کو خط لکھا مگر آپ نے جواب نہیں دیا جبکہ خط کے ساتھ ہدیہ بھی بھیجا تھا۔ باباجی! اِس خط کا جواب ضرور دیجیے گا' آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ باباجی! میرے دو مسئلے ہیں' ایک میرا اور ایک میری بہن کا۔ بہن کا مسئلہ یہ ہے کہ اُس کی شادی پھوپی کے لڑکے سے ہوئی ہے۔ شادی کو 9 سال ہوگئے مگر کوئی اولاد نہیں ہوئی جس کی وجہ سے اُس کا خاوند اور ساس لڑتے ہیں۔ باباجی! میری والدہ والد وفات پا گئے ہیں جس وجہ سے انہیں کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں۔ باباجی! بہن کو کئی ڈاکٹر وغیرہ کو دکھایا مگر اُس میں کوئی خامی نہیں اور نہ ہی خاوند میں خرابی ہے۔ باباجی! ایک مولوی نے اِس مسئلے کو بہن پر ہندو لڑکی کا سایہ بتایا ہے مگر وہ مولوی میرپور خاص میں رہتا ہے۔ وہاں اُس کا خاوند نہیں جاتا۔ باباجی! آپ میری بہن کا کوئی علاج کردیں، وہ غم کے مارے کانٹا ہوگئی ہے۔ باباجی! میری بہن پانچ وقت کی نمازی اور قرآنِ پاک پڑھتی ہے پھر اللہ نے اُسے کن آفتوں میں ڈال رکھا ہے؟ باباجی! میرے چاچو کے ساتھ بھی یہ مسئلہ تھا' اُن کے بھی بارہ سال تک بچے نہیں ہوئے تو انہوں نے 3 سال تک عبداللہ شاہ اَصحابیؒ کے دربار پر حاضری دی پھر اُن کی اولاد ہوئی۔ باباجی! برائے کرم میری بہن کا علاج کردیں' یہ بھائی آپ کو مرتے دَم تک دُعائیں دے گا۔ باباجی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے کراچی آئے ہوئے 5 سال ہوگئے مگر روزگار کے حوالے سے کوئی خاص کام نہ کرسکا۔ جو کماتا ہوں' بیماری کی نذر ہوجاتا ہے۔ کبھی سینے میں' کبھی گردے میں' کبھی پیروں میں تو کبھی سارے بدن میں درد ہوتا ہے۔ رات کو سردی سے بخار چڑھتا ہے' کبھی ڈراؤنے خواب اور کبھی حقیقت میں کچھ چیزیں نظر آتی ہیں۔ اگر میں نماز پڑھنے لگتا ہوں تو سر میں درد اور سینے پر دباؤ سا رہتا ہے۔ باباجی! میں اندرونِ سندھ کا رہنے والا ہوں' جہاں ہم رہتے تھے' وہاں پہلے ہندوؤں کا مرگھٹ تھا۔ یہ ہم نے لوگوں سے سنا ہے۔ باباجی! کوئی ایسا تعویذ دیں جو یہ سایہ دور ہوجائے۔ باباجی! مجھے اور بہن کو کیرے کی بیماری ہے۔ مجھے تو زیادہ یہ سینے پر گرتا ہے۔ باباجی! سنا ہے' جس کے اوپر سائے کا اثر ہوتا ہے' انہیں سینے' گردے' بلغم' کیرے وغیرہ کی بیماری ہوجاتی ہے۔ ہمارے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ باباجی! ہمیں بیماری کی دوا اور ایسے تعویذ بنا دیں جس سے یہ آفت دور ہوجائے۔ باباجی! میرے کاروبار کا بھی کچھ کریں جو میں خود اپنا کام کرلوں۔

☆ بیٹے شاہ حسن! اپنی بہن سے کہو' نمازِ عشاء کے

بعد ایک بار سورۂ انبیاء پڑھے اور دُعا کرے۔ بیٹے! تم الحمد شریف اور چاروں قُل پڑھ کر دن میں 3 سے 4 بار اپنے اوپر ضرور دَم کرو۔ رات کو سونے سے قبل ایک گلاس گرم دُودھ بسم اللہ پڑھ کر ضرور پیو۔ مجھے ایک ماہ بعد مطلع کرو۔ ابھی فی الحال تعویذ کی ضرورت نہیں۔

□ گلنار۔ چیچو کی ملیاں

o محترم باباجان! السلامُ علیکم! باباجان! میں نے آپ کے دیے ہوئے وِرد کو پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ آپ یقین کریں، مجھے کافی سکون ملا ہے۔ بابا جان! میں نے کچھ عرصے پہلے آپ سے بچی کے رِشتے کے لیے تعویذ اور بال لمبے کرنے کے لیے دَوا منگوائی تھی مگر آپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پیارے باباجان! برائے کرم بچی کے رِشتے کے لیے کوئی تعویذ اِرسال کر دیں اور یہ بھی بتائیں کہ بالوں کے لیے کون سی خاص غذا یا تیل استعمال کریں؟ باباجان! میرے شوہر کی ترقی کے لیے دُعا فرما دیں، اور یہ دُعا بھی فرمائیں کہ وہ نمازی بن جائیں۔ میں نماز کے لیے کافی زور دیتی ہوں لیکن وہ میری بات سنتے ہی نہیں۔ میرے بچے بھی نماز پڑھتے ہیں مگر اُن پر اَثر نہیں ہوتا، اِس وجہ سے بھی میں کافی پریشان ہوں۔ ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ میرے بہن بھائی آپس میں ناراض رہتے ہیں، اِس کے لیے بھی کوئی وِرد بتا دیں۔ بابا جی! میری ایک بہن جس سے مجھے بہت محبت ہے، وہ مجھ سے نہیں ملتی۔ میں اُس کے گھر جاتی ہوں تو غصہ کرتی ہے۔ فون کرتی ہوں تو جواب نہیں دیتی۔ پیارے بابا جی! دُعا فرمایئے کہ اُس کی رنجشیں دور ہوں اور وہ مجھ سے ملنے لگے۔ (آمین!)

☆ بیٹی گلنار...... !صلۂ رحمی بہت اچھی بات ہے، تم اپنی بہن کو سمجھاؤ کہ قطع رحمی اللہ کو پسند نہیں۔ کسی عزیز سے کہہ کر آفس سے تیل منگوالو اور سر دھونے کے بعد جڑوں میں یہ تیل لگاؤ، فائدہ ہوگا۔ بچوں پر الحمد شریف اور چاروں قُل پڑھ کر دَم کرتی رہا کرو۔ ہر نماز کے بعد 3 تسبیح "اَللّٰھُمَّ ھُدیٰ میری بہن" پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

☆......☆



غزل

بِنا تیرے مرا ہر پَل کئی صدیوں پہ بھاری ہے
تمہاری یاد میں پل پل قیامت مجھ پہ طاری ہے
بہت بے کل ہوئے کل شب تمہارا فون نہ آیا
بیاں لفظوں میں کیسے ہو کہ کیسے شب گزاری ہے
جو اپنے آپ میں کھو کر ہمیں بھی بھول جاتا ہے
ہماری زندگی ہر پَل اُسی کی یادگاری ہے
زمانے کو فتح کرنا بہت آسان تھا لیکن
خود اپنی زندگی ہم نے تیری چاہت میں ہاری ہے
تمہیں پانے کو عادل نے بہت صدمے اُٹھائے ہیں
تمہارے واسطے ہر اِک خوشی ٹھوکر پہ ماری ہے
شاعر: عادل حُسین۔ کراچی

غزل

تُو حسنِ کائنات مرقع اے زہرہ تمثال
غزل کے ہر مصرعے میں لکھوں تیرا رُوپ جمال
کتنی سُندر آنکھیں تیری کتنے سُندر بال
کتنے سُندر ہونٹ ہیں تیرے لال گلابی گال
کتنا سُندر مکھڑا تیرا مکھڑے پہ اک خال
کتنی سندر پلکیں تیری اَبرو نوک ہلال
کتنے سندر جامے تیرے کتنی سندر شال
کتنی سندر جھانجھر تیری کتنی سندر چال
دھیمے دھیمے لہجے میں تیری کتنی سندر کال
کتنے سندر تیرے دل کی دھڑکن کے سُر تال
تو شگفتہ حور شمائل دلبر باکمال
"جی آ" جگ میں ڈھونڈ نہ پایا تجھ سی کوئی مثال
شاعر: عبدالعزیز جی آ۔ چکوال سٹی

غزل

میری آنکھوں کے دریا کی روانی کیوں نہیں دِکھتی
اُسے اجڑی ہوئی میری جوانی کیوں نہیں دِکھتی
مرا کردار شامل وہ اگرچہ کیوں نہیں کرتا
اُسے یہ غم زدہ مری کہانی کیوں نہیں دِکھتی
کہ جس پر دل کی دنیا بھی لُٹائی جا چکی میری
میرے دل پر اُسی کی حکمرانی کیوں نہیں دِکھتی
میری آنکھیں سلگتے دشت کی صورت ہوئیں آخر
کسی کے پیار کی کوئی نشانی کیوں نہیں دِکھتی
زمانہ جانتا ہے میں اُسی سے پیار کرتی ہوں
اُسے میری محبت راج دھانی کیوں نہیں دِکھتی
جہاں بھر سے وہ کرتا ہے بہت ہی پیار کی باتیں
اُسے اپنی یہ تمثیلہ بھی رانی کیوں نہیں دِکھتی
شاعرہ: تمثیلہ لطیف، جودھالہ

دیر سے لوٹا نہیں کرتے

کہا تھا نہ!
گھر دیر سے لوٹا نہیں کرتے
نئی صبحیں، نئے چہرے
نئے اب لوگ بستے ہیں
تمہارا منتظر نہیں کوئی
تمہارا رہبر نہیں کوئی
تمہیں اس گھر میں رہنا ہے
مگر اِک اجنبی بن کر
تم چاہو گے بھی تو کوئی
تمہارا بن نہیں سکتا
کہ رشتے ہی بنانے میں



عمر یا بیت جاتی ہے
میرے ساتھی کہا تھا نا
دیر سے لوٹا نہیں کرتے
شاعرہ: شائستہ جمال۔ کراچی

معصوم دستک

دروازے کی دستک پر
وہ معصوم وہ سوالی بچے
جن کے دامن میں
جلتے گلاب کھلتے ہیں
جن کی آنکھیں بھی خواب بنتی ہیں
کہ!!
وہ کتابیں جنہیں پڑھنا تھا مجھے
وہ معصوم بچپن جسے جینا تھا ابھی
نہ جانے کیوں!!
کھو گیا
افلاس کی راہوں میں
اے دل تُو ہی بتا!!
کیا میرا بچپن یہی ہے؟
جس کے معصوم قبرستان میں
میری خواہشیں دفن ہیں، ماں کی سسکیاں اور آہیں دفن ہیں
جنہوں نے میرے روشن مستقبل کے خواب دیکھے تھے
وہ نظارے دفن ہیں
جو آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے تھے
وہ تمام سپنے دل کے ساتھ ٹوٹ گئے
جنہیں سمیٹتے سمیٹتے میری روح تک گھائل ہو گئی ہے
میری خاموش آنکھیں تم سے سوال کرتی ہیں!!
میرا بچپن لوٹا دو مجھے!! لوٹا دو مجھے......
میرا بچپن......؟
شاعرہ: ثمینہ ناز۔ کراچی

عید کا چاند

کسی کا چین کسی کا قرار عید کا چاند
کسی کے واسطے لایا بہار عید کا چاند
سبھی کو ایک سی مالا میں یوں پرویا ہے
کہ جیسے بن گیا ہے جگنو ہار عید کا چاند
الگ ہی رونقیں بکھری ہیں جابجا ہر سُو
مٹائے شکوے گلے سب ہزار عید کا چاند
کہیں پہ مہندی، کہیں چوڑیاں، کہیں خوشبو
کہیں پہ ہار، کہیں پر سنگھار عید کا چاند
تمام وقت بہت ظلمتوں میں کاٹا ہے
مٹائی تیرگی لایا نکھار عید کا چاند
یہ عید، عید رہے اور سب رہیں شاداں
یہی دعا ہے یہی ہے پکارا عید کا چاند
شاعرہ: فرح علی۔ کراچی

اکیلی ہوں

دیکھ صحرا میں اب بھی اکیلی ہوں
سارے جہاں میں خود ہی اپنی سہیلی ہوں
وجود ان کا سائباں سمجھا تھا
شاید خوابوں میں ان سے ملی ہوں
تمام ہم سفر میرے سائے کے ساتھ تھے
سفر محبت میں پھر بھی اجلی ہوں
کمرے کی کھڑکی کھلی ہے اب تک
تیرے عشق، تیرے انتظار میں جلی ہوں
ہر سپنے، ہر منظر میں تو ہی تو
قسم تمہاری نہ آج بھی بدلی ہوں
گلاب بھی پتھروں میں پناہ لیتا ساحل
زمانے میں جنگ، شعور خالی ہوں
شاعر: ساحل ابڑو، ڈیرہ اللہ یار بلوچستان

جانے والے

ویران ویران سا چہرہ مرا، دھندلی آنکھیں
آنسوؤں سے بوجھل پلکیں
اُجڑا ہوا دل کا ہر اک کونا
تمہاری تصویر ہاتھوں میں تھامے
سوچ رہی ہوں کہ
تم کب آؤ گے واپس

کب آئیں گے ہماری دنیا میں
خوشیوں بھرے لمحات
کب کھلے گی ہمارے دل کی کلی
کب ہوگی زندگی میں مسرتوں کی بادشاہی
کب ہم کہیں گے لگا کر اک دوجے کو گلے
"عید مبارک"
مگر!!
مٹی میں سو جانے والے
بھلا کب واپس آتے ہیں
شاعرہ: سدرہ انور علی۔ جھنگ صدر

اے میرے وطن

اے میرے وطن تجھ کو ایسے سنواروں
نئی اِک دلہن سا تجھ کو نکھاروں
کہ خونِ جگر سے کھلاؤں ترے گل
تو سینہ عَدو پہ سجاؤں تیرے گل
یہ سبزہ جو سینۂ سنگ سے اُٹھے ہے
جبینِ فلک بھی کہیں پہ جھکے ہے
یہ لختِ جگر تیرے ماتھے کے ٹیکے
ہیں تیری کشش کو بڑھانے کے صیغے
ہے عصمت تری آبرو ہم کو پیاری
ترا پتا، بوٹا ہو صَد برگ جیسے
ہو لالۂ گل تیرا ہر پھول جیسے
میں اپنی یہ کُل زندگی تجھ پہ واروں
میں قوسِ قزح جھرنوں میں پھر ملاؤں
فلک پر ترا نام لکھ جس سے پاؤں
کہ اُبھرے گا تُو آسمانِ زمیں پر
نہ پھر تاب لائے گا سورج کہیں پر
کہ اسمِ محمد ﷺ ہے بنیاد تیری
ہے دینِ خداوند پہچان تیری
نئی کوئی دلہن کا کیا روپ ہوگا
جو تیرا محافظ، وہ غیور ہوگا
شاعرہ: کشمالہ احمد تشنہ۔ کراچی

شعرِ عید

کتنی عیدیں گزر گئیں تم بن
اب خدا کے لیے نہ تڑپانا
دیکھو پھر عید آنے والی ہے
عید کے ساتھ تم بھی آجانا
شاعر: کاشف عبید کاوش۔ بٹہ موری بٹگرام

تھر کے معصوم بچوں کے نام

ماؤں سے اپنا چہرہ چھپا کے چلے گئے
کچھ بچے تھر کی پیاس بجھا کے چلے گئے
ہے کربلا کا یا کہ ہے ہر تھر کا کوئی دشت
چشم اجل کو رقص دکھا کے چلے گئے
مسلے گئے ہیں بھوک کے قدموں تلے یہ پھول
ہر جبر سے نقاب ہٹا کے چلے گئے
چھوڑا ہے آدھا دودھ کسی اور کے لیے
باقی کا رزق خود ہی بچا کے چلے گئے
ایم جے قریشی اپنے تو تلخ لہجے میں خوش بیاں
ہمدردیوں کا درس سکھا کے چلے گئے
شاعر: ایم جے قریشی۔ ڈی آئی خان

غزل

ایسا نہیں کہ نفس کا شیطان مرگیا
شیطان تو ہے زندہ ہاں انسان مرگیا
سجدوں میں سر جھکانے کی فرصت نہیں رہی
مومن کی روح میں تو مسلمان مرگیا
مسجد تو پکی بن گئی اور شاندار بھی
کچی ہیں رب کی چاہتیں ایمان مرگیا
باطل کو جھوٹ کہنے کی طاقت نہیں رہی
ہو حق کا سر بلند یہ ارمان مرگیا
شاعرہ: کنول ناز۔ کھاریاں

غزل

محبت کو امر کر جاؤں گی
اس بات سے نہ میں مکر جاؤں گی

تم سے محبت ہے نہ مروت مجھے
یہ جھوٹ بول کہ کدھر جاؤں گی
ہار مان لی میں نے جو کہتی تھی
تم نہ ملے تو مرجاؤں گی
تم بے وفا ہو یہ جان کر میں
یقین کرو بکھر جاؤں گی
لوگ موت سے ڈرتے ہیں عاشا
قبر ملے میں اس میں اُتر جاؤں گی
شاعرہ: عائشہ نور عاشا۔شادیوال، گجرات

غزل

شب ہجر کے بعد دیکھے ہیں سپنے سہانے کہاں
وہ چلا گیا اس کی یادیں ہیں جانے کہاں
اسی اک پل میں ٹھہری ہوئی ہوں
مجھے آتے ہیں تیرے خواب دفنانے کہاں
اس خود غرض کی یاد کو چھپاؤں کہاں
بے وفاؤں کے لیے ہیں صنم خانے کہاں
تیرے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے میں چلتی تھی
ڈھونڈتی ہوں، اب وہ زمانے کہاں
تیرے نام کا جوگ لیے پھرتی ہوں
مانگنے سے کبھی ملیں گے وہ فسانے کہاں
شاعرہ: اقصیٰ نگین۔شادیوال، گجرات

غزل

جھوٹ بھی بولے تو اعتبار آتا ہے
اُس کی باتوں پہ پیار آتا ہے
کسی نے آج درِ دل پہ ایسے دستک دی
جیسے شبِ غم میں کوئی غمگسار آتا ہے
طویل شب کے بعد وہ لوٹا تو یوں لگا
میری محبت میں دونوں جہان ہار آتا ہے
عشق میں ہم تو غالب کے طرف دار رہے
کہ ہم کو اُن کے غصے پہ پیار آتا ہے
تیرے دیدار کے شائق ہیں جتنے بھی ہیں ہم راز
کوئی پسِ دیوار رہتا ہے کوئی سرِ دیوار آتا ہے
شاعرہ: نصرت سرفراز۔اسلام آباد

ہائیکو

صرف چند حرفوں نے
زندگی بدل ڈالی
آج اس نے ''ہاں'' کہہ دی
شاعر: صادق شمیم چوہدری۔گوجرانوالہ

اک شخص

کل بات بے بات جو نہیں رہا تھا
اندر سے بہت بکھرا ہوا لگ رہا تھا
میری آمد سے وہ کیوں بوکھلا گیا
جو کسی کام کے بہانے محفل سے اُٹھ رہا تھا
شاعرہ: عنبرین نعیم۔کراچی

غزل

بخشا ہے ترے ہجر نے انعام مسلسل
ہوتا ہے تری یاد کا الہام مسلسل
مجھ بے کس وفادار کو ملتا ہے دلاسہ
آتا ہے ترے در سے جو پیغام مسلسل
دنیا کے غموں سے مجھے پیارا ہے ترا غم
آتی ہی نہیں اس کی کبھی شام مسلسل
یہ قریۂ محبوب ہے پلکوں کو بچھاؤ......!
لازم ہے ہر اک گام پہ اکرام مسلسل
میخانے میں کافر و مومن کی نہیں پہچان
ساقی کی نگاہوں سے چلے جام مسلسل
اس دل کی فصیلوں پہ تری یاد کے طائر
دن رات مچاتے ہیں یہ کہرام مسلسل
باطل کی نگاہوں میں کھٹکتا ہوں میں فائق
کرتا ہوں ''فقیروں'' کا جو اکرام مسلسل

شہر میں ہے آج اپنے شعر کا چرچا بہت
کیوں کہ اس میں پیار کم لکھا ہے اور شکوہ بہت
شاعر: عمران فائق۔کامل پور موسیٰ، حضرو، اٹک

اس ماہ کی خاص کہانی

فیضِ عشق

امجد جاوید

عشق کے متوالوں کے لیے عشق میں ڈوبی ایک خاص الخاص کہانی

قسط نمبر 3

"اس کا گھر...... چلو، میں تمہیں اس کے گھر لے چلتا ہوں۔ آپ آؤ۔ ادھر دفتر میں بیٹھو۔" بھاء حمید سوچتے ہوئے کہا۔ نادی رکشے سے اتری۔ پرس کھول کر اس میں سے ایک بڑا نوٹ نکال کر رکشے والے کو دیا اور دفتر میں آ گئی۔ اس نے اپنا فون نکال لیا تاکہ اختر سے بات کر سکے۔

"بیٹی۔! کیا اختر کو فون کرنے لگی ہو؟" بھاء حمید نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"جی۔" اس نے انتہائی اختصار سے کہا۔

"ابھی ٹھہرو۔ میں معلوم کرتا ہوں۔" بھاء حمید نے کہا اور دفتر سے باہر آ گیا۔ اس نے اپنے سیل سے شعیب کے گھر کا نمبر ملایا، ذرا سی دیر میں زبیدہ خاتون نے فون اٹھا لیا۔

"خیریت تو ہے نا بھاء حمید۔ اتنی صبح فون کیا آپ نے؟"

"وہ آپ کو پتا ہے نا بہن، اپنا شعیب جو ہے۔۔ وہ اختر کے نام سے شاعری کرتا ہے۔" اس نے کہا۔

"ہاں...... ہاں...... ہوا کیا ہے۔" وہ پریشان ہوتے ہوئے بولیں۔

"اسے ملنے کے لیے ایک لڑکی یہاں ورکشاپ میں آ گئی ہے۔ دفتر میں بیٹھی ہے۔ اب یہاں شعیب تو ہے نہیں۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہی ہے، کیا کروں اس کا؟"

"لڑکی آ گئی ہے۔ اس نے شعیب کو فون تو نہیں کیا ابھی تک......" زبیدہ نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔۔ لگتا ہے نہیں کیا ہوگا، ورنہ وہ یوں گھر جانے کی بات نہ کرتی...... اپنے اختر کے......" بھاء حمید خاصا پریشان ہو گیا تھا۔

"اسے سمجھا بجھا کر واپس بھیج دیں۔" زبیدہ نے کہا

"ایسے کیسے بھیج دوں بہن۔ کوئی اس کے بارے میں معلوم تو ہو۔ میں نے تو آپ کو اس لیے فون کیا ہے کہ شعیب اتنی دور ہے، اسے کیا پریشان کرنا، پھر اکیلی لڑکی ہے۔ کچھ پتا تو چلے اس کے بارے میں۔ اب میں اس سے کیا پوچھوں؟" بھاء حمید نے بے بس لہجے میں کہا

"اگر ایسی بات ہے تو بھاء حمید اسے یہاں میرے پاس ہی بھجوا دیں۔ پتا نہیں کہاں سے آئی ہوگی۔ فون کر کے شعیب ہی کو پریشان نہ کرے...... آپ بس اسے میرے پاس بھیج دیں......" زبیدہ خاتون نے تیزی سے کہا اور فون بند کر دیا۔

کچھ ہی دیر میں بھاء حمید نے نادی کو اپنی گاڑی میں شعیب کے گھر بھجوا دیا۔ زبیدہ خاتون اس کے انتظار ہی میں تھی۔ نادی اس خاتون کو دیکھ کر چونک گئی۔ اسے یوں



لگا جیسے یہ چہرہ اس نے پہلے دیکھا ہوا ہے۔ جانا پہچانا سا چہرہ، ایسا کیوں ہے؟ اسے فوراً احساس نہ ہوسکا۔

''لڑکی تم کون ہو اور کہاں سے آئی ہو؟'' زبیدہ نے پوچھا تو وہ اپنے حواسوں میں آ گئی۔

''میں نادیہ ہوں اور اختر مجھے بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔'' اس نے فوری طور پر اپنے بارے میں تفصیل بتانے سے گریز کیا۔

''کیا تمہارے پاس اس کا فون نمبر نہیں ہے۔ تم نے اس سے رابطہ نہیں کیا۔'' زبیدہ نے تصدیق کی خاطر پوچھا۔

''فون نمبر تو ہے، لیکن ابھی میں نے اس سے رابطہ نہیں کیا۔ وہ گھر پر نہیں ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، وہ گھر پر نہیں ہے۔'' زبیدہ نے کہا پھر فوراً ہی بولی۔ ''تم اس سے ابھی رابطہ مت کرنا، ابھی تم فریش ہو کر ناشتا کرو، میں خود اس سے رابطہ کرتی ہوں۔ چلو شاباش......'' زبیدہ نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔ نادیہ نے اپنا پرس وہیں پر رکھا اور اٹھ گئی۔ نجانے کیوں وہ یہاں آ کر بڑا سکون محسوس کر رہی تھی۔

☆......☆

پیر سائیں کی فور ویل جیپ لاہور کے مضافات میں پہنچ گئی تھی۔ ڈرائیور جس قدر تیز گاڑی چلا سکتا تھا، اس نے چلائی۔ اگرچہ پیر سائیں غصے کی شدت کے باعث اپنے آپ میں نہیں تھا، لیکن وقت اور حالات کا تقاضا یہی تھا کہ نہایت تحمل اور حوصلے سے اس معاملے کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ نادیہ کی حویلی سے نکل جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی اور وہ بھی اس وقت جب اس کا نکاح ظہیر شاہ سے ہونے والا تھا۔ ایک طرف اس کے سارے منصوبے چوپٹ ہو سکتے تھے اور دوسری طرف یہ خبر اگر پھیل جاتی تو اس کی اپنی حیثیت کیا رہ جاتی۔ نادیہ کے بارے میں شاید اس نے غلط اندازہ لگایا تھا۔ وہ اسے ایسی لڑکی سمجھ رہا تھا جسے باہر کی دنیا کی خبریں نہیں تھی اور اسی وجہ سے وہ حیرت میں ڈوبا ہوا تھا کہ وہ باہر نکل کیسے گئی ؟ یہ معما تھا اس کے لیے جو اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

جس وقت پیر سائیں لاہور اسٹیشن پہنچا۔ اچھی خاصی دھوپ نکل آئی تھی۔ اس نے اسٹیشن پر ایک جانب کھڑی پولیس جیپ کو دیکھا، پھر فون پر رابطہ ہوا تو ایک نوجوان پولیس آفیسر اس کے قریب آ گیا اور پوچھا۔

''جی۔ آپ دلاور شاہ جی ہیں۔''

''ہاں۔! میں ہی ہوں...... گاڑی......'' اس نے پوچھنا چاہا لیکن اس نے پہلے ہی پولیس آفیسر نے کہا۔

''ٹرین آئے تو کافی دیر ہو چکی ہے۔ جس قسم کا حلیہ آپ نے بتایا تھا، ویسی ایک لڑکی یہاں دیکھی تو گئی ہے۔ وہ ایک رکشے میں سوار ہوئی تھی۔ ہم اس رکشے والے کی تلاش میں تھے۔ جس کا پتا تو چل گیا ہے لیکن ابھی وہ ملا نہیں۔''

''کب تک ملے گا وہ......'' پیر سائیں نے اضطرابی انداز میں پوچھا۔

''ابھی کچھ دیر میں مل جائے گا۔ اس کے پیچھے بندے پھیل گئے ہیں، جلدی معلوم ہو جائے گا۔ آپ آئیں، تھانے چلتے ہیں۔ وہیں انتظار کرتے ہیں۔'' پولیس آفیسر نے کہا اور اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔ پیر سائیں نے خود پر قابو پاتے ہوئے ڈرائیور کو اس کے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

☆......☆

شعیب اپنے آفس کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس کا سارا دھیان نادیہ کی طرف تھا۔ رات بھر اس کا فون بند رہا تھا۔ پہلے پہر تک تو وہ خود اس کے فون کا انتظار کرتا رہا، پھر جب خود اس نے اکتا کر فون کیا تو بند تھا، کوئی جواب نہ ملا۔ چند بار جب اس نے کوشش کی اور فون بند ہی ملا، تب اس نے سوچا کہ کوئی نہ کوئی مجبوری ہو گئی ہو گی۔ اس لیے وہ بھی سو گیا، لیکن ایک بے چینی اس کے اندر آ گئی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ نجانے اسے کیوں یہ خیال آتا ہی چلا جا رہا تھا کہ کچھ ایسا انہونا ہوا ہے، جس کی وجہ سے اس کی بات نہیں ہو سکی۔ حالانکہ پہلے کئی کئی دن گذر جاتے تھے اور ان کی بات نہیں ہو پاتی تھی۔

وہ انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ اس کا ملازم ایک چٹ تھامے اندر آ گیا۔ ملازم نے وہ چٹ اس کی طرف بڑھا دی۔

''یہ صاحب آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔''

''کون ہے......؟'' چٹ پکڑتے ہوئے اس نے

یونہی سرسری سے انداز میں پوچھا۔
''چوہدری ثناء اللہ ہیں جی، یہاں کافی عرصے پہلے ڈی ایس پی رہ چکے ہیں۔اب یہ ریٹائیر ہو گئے ہیں۔'' ملازم نے تیزی سے بتایا تو اس نے کاغذ کے اس پرزے پر نگاہ ڈال کر ایک طرف رکھ دیا اور اسے بلانے کے لیے کہا۔کچھ ہی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر صحت مند شخص اندر آ گیا۔سلام و مصافحہ کرنے کے بعد شعیب نے سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''جی فرمائیں۔کیسے تشریف آوری ہوئی؟''
''میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔چند باتیں ہیں جو میں آپ کے گوش گذار کرنا چاہتا ہوں۔اس سے آپ سمجھ جائیں گے کہ میں کس مقصد کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔'' اس نے بڑے نپے تلے انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔
''جی فرمائیں۔!میں سن رہا ہوں۔'' اس نے تحمل سے کہا تو وہ کافی حد تک شائستہ انداز میں کہتا چلا گیا۔
''مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ وہ پہلے آفیسر ہیں، جنہوں نے سلامت نگر آ کر پیر سائیں کی تابعداری نہیں کی۔ایک تو میں آپ کو دیکھنے آیا تھا اور آپ سے ملنا چاہتا تھا۔دوسرا مجھے آپ جیسے آفیسر کی مدد چاہیے۔وہ دراصل میں نے پیر سائیں کی بڑی مخالفت کی تھی۔جب میں یہاں تعینات تھا۔اس کے ناجائز کام نہیں کیے۔ظاہر ہے مجھے پھر یہاں بڑا مشکل وقت گذارنا پڑا۔اس کے چھوٹے موٹے کام نچلے درجے کے اہلکاروں نے نکل جایا کرتے تھے۔اصل مخالفت اس وقت ہوئی جب اُن دنوں حویلی ہی کی ایک ملازمہ شرماں مائی کو قتل کر دیا گیا تھا۔اس کے لواحقین بچارے بہت بھاگے دوڑے، مجھ سے رابطہ کیا۔میں نے پیش رفت کی ہی تھی کہ اچانک لواحقین خاموش ہو گئے۔''
''وہ کیوں خاموش ہو گئے؟'' شعیب نے دلچسپی سے پوچھا۔
''خوف زدہ ہو گئے تھے۔بہت بعد میں پتا چلا تھا کہ پیر سائیں نے ہر طرح سے دباؤ ڈالا اور کچھ دے دلا کر انہیں خاموش کر دیا تھا۔'' وہ بولا۔
''آپ کچھ نہیں کر سکے اس وقت؟'' اس نے سکون سے پوچھا۔
''نہیں، تھانے کا پورا عملہ بہرحال پیر سائیں کے زیر اثر تھا۔انہوں نے سارا واقعہ گول مول کر کے اتفاقیہ موت قرار دے دیا تھا۔'' اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
''اتنی پرانی بات کا اب......'' اس نے کہنا چاہا تو ثناء اللہ تیزی سے بولا۔
''وہی عرض کر رہا ہوں نا، اب پھر وہی تاریخ دہرائی جا رہی ہے۔شرماں مائی کی بیٹی تاجاں مائی بھی حویلی میں کام کرتی تھی۔اب وہ حویلی میں بند ہے۔کچھ معلوم نہیں کہ حویلی والوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔غالب امکان ہے کہ اسے قتل کر دیا گیا ہو گا یا پھر اس کا قتل کر دیں گے وہ......'' اس نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔
''یہ آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں۔'' شعیب نے پوچھا۔
''کیونکہ پیر سائیں کی نگاہ میں تاجاں مائی نے بھی وہی جرم کیا ہے، جو شرماں مائی نے کیا تھا۔شرماں مائی کے زمانے میں پیر سائیں کی بہن نے حویلی سے فرار حاصل کر لیا تھا اور اب اس کی بھتیجی حویلی چھوڑ کر غائب ہو چکی ہے۔ان دونوں ملازمین خواتین نے ان دونوں حویلی والی خواتین کی مدد کی ہے۔'' اس نے پوری طرح مسئلہ بیان کیا۔
''آپ کو یہ باتیں کیسے معلوم ہوئیں۔'' اس نے پوچھا تو ثناء اللہ نے کہا۔
''شرماں مائی کے وقت تو میں کچھ نہ کر سکا، لیکن بعد میں مجھے بہت سارے شواہد مل گئے۔ان لواحقین سے میں نے خود رابطہ رکھا تھا۔آج صبح تاجاں مائی کے بیٹے نے مجھے اطلاع دی ہے تو میں آپ کے پاس آ گیا ہوں۔''
''ٹھیک ہے آپ میرے پاس آ گئے لیکن یہ معاملہ تو پولیس کا ہے۔ہماری دخل اندازی کا جواز کیا ہے بھلا۔'' اس نے کہا۔
''میں مانتا ہوں کہ ابھی کوئی جواز نہیں ہے، مگر معاملہ ایک زندگی کا ہے۔تاجاں مائی کے بیٹے نے تھانے میں درخواست دے دی ہے، مگر بہت مشکل ہے کہ اس پر

عمل درآمد ہو۔'' وہ اس طرح بولا جیسے بے بس ہو
''آپ کیا چاہتے ہیں۔'' اس نے تحمل سے پوچھا۔
''یہی کہ تھانے والوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس واقع سے آپ کو بھی آگاہی ہے۔ آپ کے علم میں ہے۔ میرا مقصد ہے کہ وہ تاجاں مائی کو فی الفور کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔'' ثناء اللہ نے تیزی سے کہا۔
''اس وقت وہ تاجاں مائی کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا۔
''بقول اس کے بیٹے کے رات حویلی کے کچھ ملازمین ان کے گھر آئے تھے اور اس کی ماں کو زبردستی اپنے ساتھ حویلی لے گئے تھے۔ اس کے بعد معلوم نہیں۔'' وہ تشویش سے بولا تو شعیب نے کہا۔
''ٹھیک ہے۔ میں ڈی ایس پی صاحب کو بلا کر ان سے بات کر لیتا ہوں۔ باقی آپ دیکھ لیں۔''
''میں سنبھال لوں گا۔ مجھے ابھی کچھ پریس والوں سے بھی ملنا ہے۔ اخلاقی طور پر ہی سہی، آپ ضرور مدد کیجیے گا۔ روحانی شخصیت ہونے کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ دوسروں کی زندگیوں سے یونہی کھیلتا رہے۔ بہرحال میں نے جو عرض کرنا تھا وہ آپ سمجھ گئے ہیں۔ اب مجھے اجازت دیں۔''
شعیب اس کی ہچکچاہٹ سمجھ رہا تھا۔ اس سے مزید بات کرنا فضول تھا۔ اس لیے کوئی بات نہیں کی۔ وہ چلا گیا۔ تب وہ سوچنے لگا کہ شاید یہ اس کے لیے غیبی مدد آ گئی ہے یا پھر اس کے خلاف کوئی سازش ہے۔ کیونکہ ہمارے ہی اس معاشرے میں جہاں دوسری برائیاں ہیں، وہاں ایک اور برائی منافقت بھی ہے۔ جو بہرحال اعلیٰ درجے کی خباثت ہے۔ جب گھٹیا قسم کے لوگ کسی کا کچھ بگاڑ نہ سکیں اور حسد کی آگ میں جلتے ہوئے بے بسی محسوس کریں تو منافقت ہی وہ ہتھیار ہے جس سے دوسروں کی زندگی تباہ و برباد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، حالانکہ وہ اپنی زندگی اور آخرت پہلے ہی تباہ و برباد کر چکے ہوتے ہیں۔

☆......☆

نادیہ فریش ہو کر ناشتا کر چکی تھی۔ زبیدہ خاتون نے اس کے ساتھ ہی سب کچھ کھایا تھا اور ایک لمحے کے لیے بھی اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا۔ اب اس نے چائے کی پیالی نادیہ کو دیتے ہوئے دوسری اپنے سامنے رکھی، پھر چند سپ لینے کے بعد اس کے چہرے پر دیکھا اور بڑے پرسکون لہجے میں بولی۔
''دیکھ بیٹی نادیہ! میں نہیں جانتی کہ شعیب تمہارے ساتھ اختر بن کر بات کیوں کرتا رہا۔ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ تم دونوں کی آپس میں کیا بات ہے۔ وہ ساری باتیں ہم بعد میں کر لیں گے مگر تم یہاں ہو، اس بارے ابھی شعیب کو بتانے کی ضرورت نہیں۔''
''وہ کیوں آنٹی۔ میں۔'' نادیہ نے حیرت سے پوچھا۔
''وہ یہاں اس شہر میں نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اتنی دور بیٹھا میرا بیٹا پریشان ہوتا رہے۔ جب ضرورت ہوئی تو اسے فون بھی کر لیں گے۔ میں خود بتاؤں گی اسے تمہارے بارے میں، بلکہ خود تمہاری بات کراؤں گی۔'' انہوں نے اس تحمل سے سمجھاتے ہوئے کہا۔
''آپ میری بات سنیں۔۔'' نادیہ نے کہنا چاہا مگر وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔
''اور دوسری بات! یہاں میرے پاس بہت ساری لڑکیاں کام کرنے کے لیے آتی ہیں۔ انہیں تمہارے بارے میں قطعاً معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تم گھر سے بھاگ کر آئی ہو۔''
''تو پھر میں کیا کہوں گی ان سے، اگر کسی نے پوچھ لیا تو......؟'' وہ زچ ہوتے ہوئے بولی۔
''یہی کہ تم میری دور پار کی رشتے دار ہو اور چند دن کے لیے یہاں میرے پاس رہنے کے لیے آئی ہو۔'' اس نے قدرے سختی سے کہا اور برتن سمیٹنے لگی۔ تب نادیہ جلدی سے اٹھ کر خود برتن سمیٹنے لگی اور پھر انہیں لے کر کچن میں چلی گئی۔ وہ زبیدہ خاتون کا سامنا کرتے ہوئے گھبرا گئی تھی۔ وہ کچن میں تھی اور زبیدہ خاتون کمرے میں، دونوں کے ذہن میں کئی خیال گردش کر رہے تھے۔
نادیہ نے کبھی کچن میں کام نہیں کیا تھا۔ زبیدہ نے دیکھا کہ وہ الٹے سیدھے ہاتھ مار رہی ہے۔ تب اس نے نادیہ کو روکتے ہوئے کہا۔
''بس کرو، یہ تم سے نہیں ہوگا۔ آؤ، میں تمہیں شعیب کے کمرے میں چھوڑ آؤں۔ وہاں جا کر سو جاؤ۔ ساری رات جاگتے ہوئے تم تھک گئی ہوگی۔''
''ہاں، مجھے نیند تو آ رہی ہے، لیکن میں یہ کر لوں

تو......'' اس نے کہنا چاہا۔
''آؤ۔!'' وہ بولیں۔
''جی اچھا۔'' اس نے دھیرے سے کہا اور چلتے ہوئے شعیب کے کمرے تک آ گئی۔زبیدہ خاتون باہر ہی سے واپس چلی گئی اور نادیہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اندر چلی گئی۔کمرہ ویسا ہی صاف ستھرا تھا، جیسے وہ ابھی یہاں سے گیا ہو۔اس کمرے کو دیکھ کر شعیب کے اعلیٰ ذوق کا اندازہ ہو رہا تھا۔سامنے دیوار پر اس کی تصویر لگی ہوئی تھی۔''اچھا۔! تو یہ ہے اختر۔۔میرا مطلب ہے شعیب۔۔'' وہ کافی دیر تک اسے دیکھتے ہوئے اپنے من میں اتارتی رہی اور پھر بیڈ پر پھیل گئی۔اسے وہ بالکل منفرد سا لگا تھا۔اس کا چہرہ ویسا نہیں تھا، جیسا وہ سوچتی رہی تھی۔ان لمحات میں اس کا دل شدت سے یہ چاہنے لگا کہ اختر کو فون کرے اور اسے ستائے۔اس کے نین نقش بارے باتیں کرے اسے حیران کرے، مگر اگلے ہی لمحے اسے زبیدہ خاتون سے کیا ہوا وعدہ یاد آ گیا۔اس نے اپنی اس خواہش کو دبا لیا اور کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔آنکھیں بند کرتے ہی پہلی سوچ اس کے ذہن میں یہی در آئی کہ جب زبیدہ خاتون اس کے بارے میں پوچھے گی تو وہ اسے کیا جواب دے گی۔وہ اپنے بارے میں سچ بتائے یا وہی جو اس نے ''اختر'' کو بتایا ہوا تھا۔وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا کہ کیا کہنا چاہیے۔سکون سے لیٹتے ہی تھکن اور نیند اس پر غالب آ گئی اور اسے کچھ ہوش نہ رہا وہ نیند میں کھو گئی۔

باہر دالان میں بیٹھی ہوئی زبیدہ خاتون پریشان ہو گئی تھی۔گھر سے بھاگی ہوئی ایک لڑکی اس کے ہاں آ گئی تھی۔وہ بھی اس کے اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے۔ نجانے ان دونوں میں ایسا کیا چل رہا تھا کہ وہ لڑکی اپنے گھر سے بھاگنے پر مجبور ہو گئی۔نادیہ کے یوں گھر سے بھاگ آنے میں شعیب اس لیے قصور وار دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ اس کا اپنا بیٹا ہے بلکہ حالات و واقعات بتا رہے تھے۔اگر اس میں شعیب کی مرضی شامل ہوتی تو وہ یوں اکیلی یہاں تک نہ پہنچ سکتی، بلکہ کم از کم اسے اسٹیشن سے ضرور لاتا۔ان کا آپس میں رابطہ ہوتا۔وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ شعیب اس سے جھوٹ بولے گا یا پھر کوئی بات چھپالے گا۔وہ یہی سوچتی رہی اور دوپہر سر پر آ گئی۔لڑکیاں اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھیں، مگر اس کے ذہن سے سوچیں ہی نہ نکل رہی تھیں۔نجانے وہ لڑکی کس خاندان کی ہے۔اس کا کوئی آگے پیچھے ہے بھی یا نہیں یا پھر بھرا پرا گھر چھوڑ کر آئی ہے۔زبیدہ خاتون کو اس کا اپنا ماضی بار بار اپنی جانب کھینچ رہا تھا اور وہ اس سے اپنا ذہن بچا رہی تھی۔وہ جیسے جیسے نادیہ کے بارے میں سوچتی جاتی تھی، اس کا اپنا آپ اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا تھا۔اور وہ گھبرا کر نگاہیں چرا لیتی تھی۔وہ صبح ہی سے اسی کشمکش میں تھی۔اس کی عقل یہی کہہ رہی تھی کہ پہلے اسے کریدنے کی کوشش کرے کہ وہ کون ہے؟ پھر اپنے بیٹے کو بتائے، پتا نہیں شعیب کا نادیہ کے بارے میں کیا خیال ہے۔یہ سب اسے بڑے تحمل اور حکمت عملی سے کرنا تھا۔یہ سوچ کر اسے ڈھارس بندھی کہ وہ اس معاملے کو حل کر لے گی۔وہ انہی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی کہ دروازے پر بیل ہوئی، پھر یوں مسلسل بیل ہوتی چلی گئی جیسے کسی نے بٹن پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔اس سمیت سبھی لڑکیاں چونک گئیں۔ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ایک لڑکی نے اٹھ کر باہر جانا چاہا مگر اس نے روک دیا اور خود دروازے تک گئی۔ اس نے دروازہ کھول کر اوٹ میں ہوتے ہوئے پوچھا۔
''کون ہے؟'' اس کے لہجے میں درشتگی تھی۔
''وہ بہن...... میں ہوں بھاء حمید۔! وہ لڑکی......''
باہر سے آواز آئی تو اس نے بھاء حمید کے لہجے میں حد درجہ گھبراہٹ محسوس کی جسے سن کر اس کا ماتھا ٹھنکا۔اس نے اوٹ ہی سے باہر دیکھا تو کئی گاڑیاں کھڑی تھیں، جن میں پولیس کی گاڑیاں نمایاں تھیں اور پولیس والے لوگ بھی موجود تھے۔
''کیا بات ہے بھائی۔خیریت تو ہے نا؟'' اس نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔
''وہ لڑکی جو میں یہاں صبح چھوڑ گیا تھا۔اسے یہ لوگ لینے آئے ہیں، وارث ہیں اس کے۔'' اس نے جواباً تیزی سے کہا۔
''بھاء جی، آپ نے تصدیق کر لی ہے۔یہ واقعی ہی اس کے وارث ہیں۔'' اس نے تحمل سے پوچھا۔مگر نجانے

کیوں اس وقت اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ نادیہ کو یوں ان لوگوں کے حوالے کر دے۔ اگر خود اسے ایسی صورت حال کا سامنا ہوتا۔ کاشف کے ہاتھوں سے اسے حویلی والے واپس لے جاتے تو کیا وہ اب تک زندہ ہوتی؟

''آفیسر! یہ ایسے نہیں مانیں گے۔۔ اندر جائیں اور باہر لے آئیں اسے یا پھر میں جاتا ہوں۔'' پیر سائیں نے انتہائی اکتائے ہوئے لہجے میں کہا جس میں غصہ اور حقارت تھی۔ تبھی بہاء حمید نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے غصے میں کہا۔

''اُو بھائی، تو جو کوئی بھی ہے اتنی اونچی آواز میں بات نہیں کرو۔ یہ میری بہن کا گھر ہے اور یہاں پر کئی گھروں کی بیٹیاں آتی ہیں۔ میں نے یہ بات تم لوگوں کو پہلے بھی سمجھائی تھی۔ اس لیے خاموش رہو۔ وہ بچی آجاتی ہے ابھی......''

''تو پھر لادو نا جا کر اپنی بہن کے گھر سے......'' پیر سائیں نے اسی حقارت بھرے لہجے میں یوں کہا جیسے طنزیہ انداز میں گالی دے رہا ہو۔ تبھی زبیدہ خاتون نے اس شخص کو دیکھا، جس نے اتنی سخت بات کی تھی۔ یا خدا! یہ تو اس کا اپنا بھائی اس کے دروازے پر کھڑا ہے۔ اگرچہ وقت نے اس کو اچھا خاصا بدل دیا ہے لیکن اپنا خون تو نہیں بھلایا جا سکتا۔ تو کیا نادیہ اس کی بیٹی ہے؟ کیا وقت نے اپنے آپ کو پھر سے دہرا دیا۔ وہ جواب تک دنیا کی نظروں سے چھپی ہوئی تھی، اس کا راز فاش ہو جانے کا وقت آ گیا ہے؟ میں اپنا راز چھپاؤں یا نادیہ کو بچا لوں، اگر یہ بچی ان کے حوالے کر دی گئی تو اس کا زندہ بچنا محال ہوگا۔ نادیہ کی زندگی کی قیمت اس کا راز ہے؟ ایک ہی لمحے میں نجانے کتنے سوال اس کے سامنے آن ٹھہرے تھے۔ اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ کسی بھی سوال کا جواب دے سکے۔

''بہن بھیجو نا، اس لڑکی کو......'' بہاء حمید نے کہا تو زبیدہ ایک دم سے چونک گئی، پھر لمحے کے ہزارویں حصے میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ نادیہ کو نہیں دے گی۔ تبھی اس نے بڑے تحمل سے پوچھا۔

''بہاء حمید! یہ جو شخص غصے میں بات کر رہا ہے۔ کیا اس کا نام دلاور شاہ ہے اور یہ سلامت نگر کا ہے؟'' اس کے اس طرح پوچھنے پر پیر سائیں نے خود ہی اونچی آواز میں جواب دیا۔

''ہاں۔! میں دلاور شاہ ہوں۔ وقت ضائع مت کرو اور اس لڑکی کو باہر بھیجو، ورنہ میں خود اندر سے نکال لاؤں گا۔''

تبھی زبیدہ خاتون نے دروازہ کھول دیا اور خود دروازے میں تن کر کھڑی ہو گئی، پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے غصے میں کہا۔

''اگر تم میں ہمت ہے نا دلاور! تو میرے دروازے کی یہ دہلیز پار کر کے دکھاؤ۔۔''

پیر سائیں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وقت نے اس کے چہرے پر اپنی پرچھائیں تو ڈالی تھیں مگر اتنی بھی نہیں کہ نقش مٹ جائیں۔ چند لمحوں میں وہ پہچان گیا کہ سامنے کھڑی عورت اس کی بہن زبیدہ خاتون ہے۔

''تم......تم......ابھی تک زندہ ہو......'' وہ انتہائی حیرت سے بولا

''تمہارا کیا خیال ہے......میں مر گئی ہوں......میں زندہ ہوں دلاور...... اور اب اس معصوم کو مرنے نہیں دوں گی۔ جسے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہے وہ کس کے گھر میں پناہ لے چکی ہے۔''

''کیا میں اندر آ سکتا ہوں۔'' پیر سائیں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اتنی گاڑیاں دیکھ کر وہاں پر کافی لوگ جمع ہو گئے تھے۔

''اگر دشمن بن کر آئے ہو تو انہی قدموں پر واپس چلے جاؤ۔ مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ میں تیرے جیسے دشمن کا راستہ روک سکوں۔ آزمانا چاہو تو آزما لو......اگر بھائی بن کر آئے ہو تو یہ دروازہ پار کر و تو آجاؤ......'' زبیدہ خاتون نے انتہائی سرد لہجے میں کہا تو پیر سائیں نے پولیس آفیسر کی جانب دیکھ کر کہا۔

''آفیسر۔ آپ کا بہت شکریہ۔ آپ نے میری بہت مدد کی۔''

''ٹھیک ہے۔ اگر ضرورت ہو تو کال کر لیں۔'' اکتائے ہوئے پولیس آفیسر نے کہا اور فوراً ہی پلٹ کر اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ اپنی ساتھ لائی نفری سمیت وہاں سے چلا گیا۔ وہ اپنے بندوں کو گاڑی

میں بیٹھنے کا اشارہ کر کے اندر آ گیا تو زبیدہ نے کہا۔
"بھاء حمید آپ بھی آ جاؤ۔"
"وہ انہیں لے کر ڈرائینگ روم میں آ گئی۔ تب تک نادیہ بیدار ہو چکی تھی۔ اسے لڑکیوں نے جگا دیا تھا کہ باہر کیا ہنگامہ ہو رہا ہے، جو اسی کی وجہ سے ہے۔ وہ بھی دروازے سے آن لگی تھی۔
"کہاں ہے نادیہ۔؟" پیر سائیں نے بیٹھتے ہی پوچھا۔
"میرے پاس ہے، مگر اسے قطعاً معلوم نہیں ہے کہ میں کون ہوں اور میرا بیٹا کون ہے۔ اسے فقط میرے بیٹے کی شاعری پسند ہے۔ اسی ناتے وہ یہاں آ گئی۔ کیوں آ گئی ہے، یہ اب سے کچھ دیر پہلے نہیں جانتی تھی مگر اب سمجھ رہی ہوں۔ اب بولو۔ تم کیا چاہتے ہو؟" زبیدہ نے سکون سے کہا۔
"میں اسے واپس لے جانا چاہتا ہوں" اس نے جواباً کہا۔
"تاکہ تم اسے لے جا کر مار دو۔ میں نہیں جانتی تمہیں...... میں اسے......"
"آج اس کی شادی ہے میرے بیٹے ظہیر شاہ کے ساتھ۔ وہ لندن سے صرف اسی لیے آیا ہے۔ اور......"
"وہ نادیہ تمہاری بیٹی نہیں اور اسے تمہارا بیٹا پسند نہیں ہے۔ تبھی وہ حویلی کی زندگی چھوڑ کر ایک غریب شاعر کے پیچھے آ گئی۔ اب میں سمجھی وہ مجبوری میں پناہ کی خاطر یہاں تک آئی ہے۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
"تمہارا بیٹا کدھر ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہوں، اسے سمجھاتا ہوں۔" پیر سائیں نے اب تحمل سے کہا۔
"وہ یہاں نہیں ہے۔ اپنے کام سے کہیں گیا ہوا ہے۔ وہ آ جائے گا تو میں اس سے مشورہ کر کے جو فیصلہ ہوا وہ تمہیں بتا دوں گی۔"
"وہاں، نادیہ کی شادی ہونے والی ہے، اس بات کو سمجھو۔"
"اگر وہ یہاں تمہیں نہ ملتی، تب شادی کی تاریخ کا کیا ہونا تھا۔ جب نادیہ ہی کو شادی منظور نہیں ہے تو میں اسے تمہارے ساتھ کیسے بھیج دوں۔ وہ عاقل بالغ ہے، اپنی مرضی کر سکتی ہے، پھر تم ہی کیوں، جاؤ، اس کے باپ کو بھیجو۔" اس نے زبیدہ نے ذرا سختی سے کہا۔
"تمہیں شاید معلوم نہیں۔ نادیہ دو برس کی تھی جب ظاہر شاہ اپنی بیوی سمیت ایک کار حادثے میں اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔" وہ آہستگی سے بولا۔
"اوہ۔! تو نادیہ یتیم ہے اور اس کے سرپرست ہو تم......" وہ انتہائی دکھ سے بولی۔ اپنے بھائی کے بارے میں سن کر وہ ایک دم سے غم زدہ ہو گئی تھی۔
"ضد نہ کر آپا۔ اسے میرے ساتھ جانے دو۔ وہ میری بہو بننے جا رہی ہے، بلکہ اب تو تم بھی میرے ساتھ چلو، میں ماضی کی ساری باتیں بھلا دینا چاہتا ہوں۔" پیر سائیں نے التجا بھرے لہجے میں کہا تو اس کا دل پسیج گیا۔ وہ موم ہونے لگی۔
"ٹھیک ہے دلاور۔! اگر تم یہ وعدہ کرو کہ تم اسے کچھ نہیں کہو گے۔ تو لے جاؤ اسے" وہ روتے ہوئے بولی۔
"تم بھی ہمارے ساتھ چلو آپا......" اس نے دکھ سے کہا۔
"نہیں، میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ میں اپنے بیٹے کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی۔" وہ بھیگے ہوئے لہجے میں بولی۔
"بھیجو نادیہ کو۔! ایک دو دن میں تم لوگوں کو لینے دونوں آ جائیں گے۔" پیر سائیں نے کہا تو دروازے سے لگی نادیہ نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔
"نہیں پھوپھو۔! میں ان کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ اگر آپ نے مجھے بھیجا بھی تو حویلی میں میری لاش جائے گی۔ میں نے وہاں جا کر بھی مرنا ہی ہے۔"
وہ تینوں اس کی چیخ بھری آواز پر چونک گئے اور جو اس نے بات کی تھی، اس کا سب سے زیادہ اثر بھاء حمید پر ہوا۔ تب وہ تڑپ کر بولا۔
"زبیدہ بہن۔! میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں۔ میری نگاہ میں آپ کا کتنا احترام ہے یہ آپ جانتی ہیں۔ آج آپ پہلی بار میرے سامنے آئی ہیں۔ میری رائے یہی ہے کہ بچی کو ابھی واپس حویلی مت بھیجا جائے۔ اسے اس وقت تک اپنے پاس رکھیں۔ جب تک یہ خود جانے کے لیے تیار نہ ہو جائے۔"
"یہ ہمارا خاندانی مسئلہ ہے۔" پیر سائیں نے تیزی سے کہا۔

''میں مانتا ہوں، لیکن وہ بھی میری بیٹی جیسی ہے۔وہ جب تک نہیں چاہے گی، یہیں رہے گی، چاہے جو مرضی کرلو...... تم جتنے بھی طاقتور ہو، اپنی طاقت آزما لو۔'' بھاء حمید نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

''جاؤ دلاور! چلے جاؤ۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ میں چند دنوں تک نادیہ کو لے کر خود حویلی آؤں گی۔'' زبیدہ خاتون نے کہا اور زاروقطار رونے لگی۔ پیر سائیں چند لمحے یونہی خاموش بیٹھا رہا پھر تیزی سے اٹھ کر باہر چلا گیا، چند لمحوں بعد ان کے دروازے کے آگے کوئی گاڑی نہیں تھی۔ زبیدہ خاتون دونوں ہاتھ چہرے پر رکھے روتے چلی جا رہی تھی۔ تبھی نادیہ اندر آئی اور دھیرے سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ تب زبیدہ نے اسے گلے لگایا اور یوں روئی کہ جیسے سارے آنسو آج ہی بہادے گی۔

☆......☆

حویلی پر سہ پہر کی دھوپ اتر آئی تھی۔ وہی سناٹا اور خاموشی تھی، لیکن دادی اماں کا وجود یوں تڑپ رہا تھا کہ لبوں سے آواز نہیں نکل رہی تھی مگر آنسو یوں رواں تھے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ نجانے کب سے بندھے ہوئے بندھ ٹوٹے تھے۔ اتنے برس بعد اپنی اکلوتی بیٹی زبیدہ کے بارے میں سن کران سے صبر نہیں ہو پا رہا تھا۔ انسان اگر اس دارِفانی سے چلا جائے تو اس پر دھیرے دھیرے صبر آ ہی جاتا ہے، لیکن زندوں کے لیے خود پر جبر کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اگرچہ وقت نے زبیدہ کی یاد پر حالات نے منوں مٹی ڈال دی تھی لیکن اتنے برس بعد بیٹی کے زندہ ہونے کی اطلاع پر وہ اس سے ملنے کے لیے تڑپ اٹھی تھی۔ وہ شاید کسی پر یقین نہ کرتی۔ اسے یقین اس لیے آگیا کہ خود اس کے بیٹے نے یہ بتایا تھا۔ نادیہ کے حویلی سے چلے جانے پر وہ پہلے ہی غم سے نڈھال تھی، جب اس نے سنا کہ وہ زبیدہ کے پاس چلی گئی ہے تو جہاں وہ خوشی سے بے حال ہوگئی کہ چلو ان کی عزت پامال نہیں ہوئی، وہاں اپنی بیٹی کو دیکھنے اور اس سے ملنے کی تڑپ نے اسے بے بس کر دیا۔ وہ دلاور شاہ سے اسی وقت اپنی اس خواہش کا اظہار کر دینا چاہتی تھی، پھر یہ سوچ کر خاموش رہی کہ نجانے اس کا ردعمل کیا ہو؟ وہ تو پہلے ہی نادیہ کے معاملے میں غصے سے بھرا ہوا ہے۔ وہ کیا کرے، کس طرح اپنی بیٹی سے ملے، پتا نہیں زبیدہ حویلی آ بھی سکے گی یا نہیں؟ اس کا بیٹا نجانے کیسا ہوگا؟ ان حالات میں وہ کیا نادیہ کو قبول کر لے گا؟ کیا دلاور شاہ اب نادیہ کو بھول جائے گا؟ ایسا ممکن تو نہیں ہوسکتا؟ کیا اسے ہی اپنی بیٹی سے ملنے جانا پڑے گا؟ کیا اس عمر میں وہ حویلی سے باہر قدم رکھ پائے گی؟ سوالوں کا اک سلسلہ تھا اور ہر ایک سوال کی اپنی الگ سے چبھن تھی۔ ممتا کی تڑپ، رشتوں کا دکھ اور حالات کے جبر کا اظہار وہ فقط آنسو بہا کر ہی کر سکتی تھی۔ ان چند گھڑیوں میں ہی وہ برسوں کی بیمار دکھائی دینے لگی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی سے جا ملے۔ انہی لمحوں میں اس نے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تو اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لیے۔ وہ دلاور شاہ کو دستک کو پہچانتی تھی۔ وہ کافی حد تک حیران نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ اس وقت اس کے کمرے میں کیسے آ گیا؟ وہ تو اس سے کمرے سے باہر ہی ملا کرتا تھا۔ وہ اس کے قریب آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ خاموش رہی اور اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی۔

☆......☆

کچھ دیر بعد اس نے کہا۔

''اماں بی، میں جانتا ہوں، زبیدہ کے بارے میں سن کر آپ اس سے ملنے کی شدید خواہش رکھتی ہیں۔ کیا آپ اس سے ملنا چاہیں گی؟''

''کیوں نہیں بیٹا! میں اسے دیکھنے کے لیے، اس سے ملنے کے لیے بے تاب ہوں۔'' وہ بھیگے ہوئے لہجے میں بولی۔

''آپ یہ فرمائیں کہ آپ اس کے پاس جائیں گی یا پھر اسے یہاں بلائیں گی۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

''جیسے تم چاہو بیٹا!'' وہ حیرت اور خوشی سے گھلے ہوئے لہجے میں بولی۔

''اماں بی۔! مجھے آپ کا زبیدہ سے ملنے پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن میرے خیال میں اسے خود یہاں آنا چاہیے اور جب آئے تو اپنے ساتھ نادیہ کو لے کر آئے۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

''اگر وہ دونوں ڈر کی وجہ سے یہاں نہ آسکی تو......

اکیلی آ جائے تو۔ میں اسے سمجھا لوں گی......'' وہ ممکنہ خدشے کے باعث سوچتے ہوئے انداز میں بولی۔

''اب یہ تو آپ پر منحصر ہے کہ آپ کی بیٹی، آپ سے ملنا بھی چاہے گی یا نہیں؟ اگر اس کے دل میں آپ کے لیے کوئی تڑپ ہوگی تو ہی ملنا چاہے گی۔ اب اگر وہ نادیہ کو لاتی ہے اپنے ساتھ، تبھی اس حویلی میں قدم رکھ پائے گی، ورنہ اس کا یہاں کیا کام۔ اگر وہ نادیہ کی وجہ سے نہیں ملنے آئے گی تو سمجھیں، وہ میری دشمن ہو گی۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''نہیں...... نہیں بیٹا۔ وہ ایسا نہیں کرے گی۔'' دادی اماں تیزی سے بولی۔

''یہ آپ پر ہے اماں بی کہ آپ اسے مجبور کریں، تاکہ وہ نادیہ کو لے کر ہی یہاں آئے۔ آپ سمجھ ہی گئی ہوں گی کہ میں ایسا کیوں کہہ رہا ہوں۔'' وہ پرسکون لہجے میں بولا۔

''دلاور شاہ، تم سختی نہ کرو، ورنہ جو کچھ تم چاہ رہے ہو، ویسا ممکن نہیں ہو پائے گا۔'' انہوں نے تشویش سے کہا۔

''آپ ایسا ممکن کرو اماں بی، ورنہ حویلی کی عزت مٹی میں مل جائے گی۔ یہ ساری شان وشوکت، یہ لوگوں کی عقیدت سب ختم ہوجائے گی۔'' وہ تیزی سے بولا۔

''کچھ بھی ختم نہیں ہوگا۔ اگر تم تحمل سے کام لو تو...... ذرا برداشت کرو...... سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' وہ بولیں۔

''کیسے...... کیسے ہوگا سب ٹھیک...... پہلے زبیدہ گئی اور اب نادیہ۔ زبیدہ کے معاملے پر تو پردہ پڑ گیا تھا۔ اب نادیہ کے ساتھ اس کا معاملہ بھی لوگوں کی زبان پر ہوگا، ان دونوں کو خاموشی سے حویلی آنا ہوگا۔ ورنہ میں دونوں کی آواز بند کرنے پر مجبور ہوجاؤں گا۔'' وہ انتہائی غصے میں بولا۔

''دیکھو۔ !ذرا تحمل سے سوچو، تم نے بتایا ہے ناکہ زبیدہ کا ایک بیٹا بھی ہے۔ اگر تم خود پر قابو رکھو اور میری بات مانو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ سارے معاملات درست ہوجائیں گے۔'' انہوں نے پرسکون انداز میں کہا۔ تب وہ ٹھٹکتے ہوئے بولا۔

''آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں اماں بی؟''

''بیٹا۔ !فرح بھی تو تمہاری بیٹی ہے۔ تم اگر مصلحت سے کام لو نا تو سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔'' وہ اشارے میں سمجھاتے ہوئے بولیں۔

''آپ کی یہ بات ٹھیک ہے کہ اس وقت مجھے مصلحت ہی سے کام لینا چاہیے، باقی جو کچھ بھی ہے، وہ سب بعد کی باتیں ہیں، فی الحال نادیہ کو حویلی میں واپس بلوالیں۔ اس کے ساتھ اگر زبیدہ بھی آجاتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اس وقت صورت حال کیا ہے یہ آپ خود سمجھتی ہیں۔'' دلاور شاہ نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو دادی اماں اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ چند لمحے وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے پھر دلاور نے اپنا فون نکالا اور نمبر ملاتے ہوئے بولا۔ ''لیں۔ یہ کریں بات زبیدہ سے۔'' کچھ ہی دیر بعد رابطہ ہوگیا۔ اس نے فون ان کی جانب بڑھا دیا اور خود کمرے سے باہر چلا گیا۔ دوسری جانب سے ہیلو کی آواز سن کر اماں بی نے بھیگے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''زبیدہ!''

''اماں...... آپ......'' جس بھیگی ہوئی آواز میں اس کا نام لیا گیا تھا۔ وہ آواز لمحے کے ہزارویں حصے میں پہچان گئی۔ ممتا میں گوندھا ہوا یہ لفظ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا تو جذبات کے بند ھ ایک دم سے ٹوٹ گئے۔ اسے یوں لگا جیسے کسی گہرے گھاؤ پر مرہم رکھ دیا گیا ہو۔ وہ سکون کی ان انتہاؤں پر جا پہنچی جہاں سے وہ دور تک اپنے ماضی کو ایک ہی نگاہ میں دیکھ سکتی تھی۔

''ہاں یہ میں ہوں جو آج تک تیری راہ تک رہی ہوں۔ کہاں گم ہوگئی ہو تم ترس گئی ہوں تمہیں دیکھنے کے لئے......'' وہ اپنی رُو میں کہتی چلی گئی، تب زبیدہ کو خود پر قابو نہیں رہا۔ وہ سسکتے ہوئے بولی۔

''میں کہیں بھی گم نہیں ہوئی ہوں اماں، بس اپنا آپ چھپا کر بیٹھی ہوں۔''

''نادیہ اگر تم تک نہ پہنچ پاتی تو شاید میں تیری آواز بھی نہ سن پاتی۔'' اماں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ہاں...... یہ کوئی اتفاق تھا یا قدرت ہی کو ہمارا ملن منظور تھا۔ وہ جو یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ یہ بھی تو میرے اللہ کا احسان ہے نا، ورنہ وہ اگر کہیں۔'' وہ انجانے خوف سے لرزتے ہوئے بولی۔

''وہ اللہ ہی تو ہے جو عزتیں رکھنے والا ہے، بندہ تو نجانے کیا کچھ کرتا پھر رہا ہے۔ میں نادیہ کو بھی دوش نہیں دوں گی کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ یہ بات ساری دنیا میں

سے زیادہ تم اچھی طرح سمجھ سکتی ہو،لیکن بیٹی! کیا حویلی کی قسمت میں ایسا ہی لکھا ہوا ہے۔'' دادی اماں کے لہجے میں شکوہ درآیا تھا۔

''اماں! میرا تو معاملہ ہی کچھ اور تھا، مگر نادیہ کے ساتھ تو ظلم ہونے جا رہا تھا۔ مجھ سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا ہے۔ حویلی اگر انسانوں کے جذبات کو کچل کر رکھے گی تو اس کی قسمت میں ایسا ہی رہے گا۔'' زبیدہ نے واضح لفظوں میں ہمت کر کے کہہ دیا۔

''ہاں! تم ٹھیک کہتی ہو۔ ایسا ہی ہے۔ اب وہ وقت نہیں رہا کہ عورتوں کو دبا کر رکھا جا سکتا ہے۔ اب انہیں سمجھنا ہوگا۔ ان روایات پر سمجھوتا کرنا ہوگا، مگر بیٹی، یہ پرکھوں کی عزت کا معاملہ بھی تو ہے نا اسے بھی تو سمجھو۔'' دادی اماں نے اس سے پوری طرح اتفاق کرتے ہوئے اپنی بات کہہ دی۔

''اماں! میں کسی حد تک سمجھ سکتی ہوں کہ دلاور شاہ اس معصوم بچی کے ساتھ کیوں ایسا چاہ رہا ہے۔ صرف جائیداد کی خاطر، کب تک وہ اس جائیداد سے فائدہ اٹھائے گا۔ اس بچی کو تو پتا بھی نہیں کہ اصل میں اسے حویلی میں قید کس وجہ سے رکھا جا رہا ہے۔ اماں! کیسی روایات ہیں یہ۔ جو انسانوں کو نگل رہی ہیں۔''

''میں تم سے اختلاف نہیں کرتی اور یہ وقت بحث کا بھی نہیں ہے میری بیٹی۔ اتنے برسوں بعد تم مجھ سے ملی ہو۔ کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تم مجھ سے ملو، میں ترس گئی ہوں تمہاری صورت دیکھنے کے لیے، سنا ہے، تیرا بیٹا بھی ہے۔'' اماں نے پوچھا۔

''ہاں! میں نے اپنے بیٹے ہی کے سہارے اتنا طویل وقت گذار لیا ہے۔ اب وہ جوان ہو گیا ہے برسر روزگار ہے اور اماں، میں تو پل پل آپ کیلئے تڑپی ہوں۔ میں کیوں نہیں ملنا چاہوں گی آپ سے۔'' وہ حسرت زدہ لہجے میں بولی۔

''تو پھر تمہیں کس نے روکا ہے۔ آ جاؤ نا میری بچی۔ جب سے تمہارے بارے میں پتا چلا ہے، تمہیں دیکھنے کو، تم سے ملنے کو دل تڑپ رہا ہے۔'' اماں کا لہجہ پھر سے بھیگنے لگا تھا۔

''ایسا ہی حال میرا ہے اماں۔ پر کیا کروں، مجھے اپنے بیٹے کو بھی جواب دینا ہوگا۔ وہ کیا سوچے گا۔ اماں میں نے اسے اپنے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ میں اگر حویلی آ جاتی ہوں تو پھر، آپ سمجھ رہی ہیں نا۔'' وہ اٹکتے ہوئے انداز میں بولی۔

''کیا نادیہ کی موجودگی سے یہ معاملہ نہیں کھلے گا۔ وہ سوال نہیں کرے گا کہ یہ کون ہے؟ کیا تم پھوپھی بھتیجی کا رشتہ چھپا پاؤ گی۔ یہ ماضی تو ایک دن کھل ہی جاتا ہے، تو پھر ڈرتی کیوں ہو؟'' اماں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''جب تک ممکن ہو، میں اپنا ماضی چھپاؤں گی، جیسے آج تک چھپاتی آئی ہوں۔ اگرچہ میں نے غلط نہیں کیا مگر بہت ساری وجوہات ہیں جس کی وجہ سے میں اپنے بیٹے کو نہیں بتاتی ہوں۔ میں شرمندہ نہیں ہوں اماں۔ ہاں! جہاں تک نادیہ کا معاملہ ہے، اس بارے میں آپ کو سوچ کر بتا دوں گی۔'' وہ شکست خوردہ لہجے میں کہتے ہوئے ہانپ گئی۔

''بیٹی! اب جو بھی ہے، حویلی کی عزت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ یہ اچھا وقت ہے کہ تمہارے ماضی پر سوال اٹھائے بنا، تمہارا تعلق حویلی سے جڑ سکتا ہے تم اس لیے۔'' انہوں نے کہنا چاہا تو وہ بات قطع کرتے ہوئے بولی۔

''حویلی کی عزت کا خیال تو ہے، لیکن ان روایات کا کیا ہوگا؟''

''میں سمجھ سکتی ہوں زبیدہ! اب وہ وقت آ گیا ہے، جب ان روایات کو دیکھا پرکھا جائے۔ وقت کے ساتھ سمجھوتا کرنا ہی پڑے گا۔ یہ سب دور بیٹھ کر نہیں، پاس آ کر بات کرنے سے ہوگا۔ تم جو بھی چاہتی ہو۔ یہاں حویلی میں بیٹھ کر منوا سکتی ہو۔'' اماں نے تیزی سے کہا۔

''اماں۔! میں حویلی آ سکوں یا نہ آؤں۔ کیا فرق پڑتا ہے، لیکن معاملہ تو نادیہ کا ہے نا۔ کیا ضمانت ہے کہ اس کے ساتھ کوئی ظلم نہیں ہوگا۔ میرے کہنے پر وہ حویلی آ بھی جائے مگر ہونا وہی ہے جو وہ نہیں چاہتی تو پھر اسے کیا ضرورت ہے حویلی آنے کی۔'' وہ انتہائی سنجیدہ لہجے میں بولی۔

''میں ضمانت دیتی ہوں۔ نادیہ صرف حویلی میں رہے، باقی جو ہوگا، اسی کی مرضی کے مطابق ہوگا۔ اگر پھر بھی وہ کچھ تنگی محسوس کرے۔ تب وہ تمہارے پاس رہ سکتی ہے۔ تم جانتی ہو کہ حویلی سے نادیہ کا یوں غائب ہو جانا

کس قدر اور کتنی افواہوں کی وجہ بن سکتا ہے۔ ایک بار نادیہ حویلی میں آ جائے، پھر وہ چاہے تیرے پاس رہے یا حویلی میں" اماں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اماں! میں سمجھتی ہوں۔ آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔ میں نے کہا نا کہ میں سوچتی ہوں۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"کیا سوچنا ہے تمہیں؟" انہوں نے تیزی سے پوچھا۔

"مجھے نادیہ سے پوچھنا ہے، وہ کیا چاہتی ہے۔" وہ سکون سے بولی۔

"اس سے پوچھنا نہیں، اسے سمجھانا ہے، ورنہ وہ حویلی سے جاتی ہی کیوں؟ تم تو سمجھ دار ہو۔ تم دونوں آؤ۔ یہاں بیٹھ کر بات کرتے ہیں، پھر جو تیرا فیصلہ ہوگا، وہی ہوگا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔" وہ پورے اعتماد سے بولی۔

"ٹھیک ہے اماں، میں بتاتی ہوں آپ کو۔" زبیدہ نے پھر آہستگی سے کہا اور چند باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔ دادی اماں فون بند کر کے یوں ہو گئی جیسے اس میں جان ہی نہ رہی ہو۔ وہ آنے والے وقت کے بارے میں اعتماد سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔

☆......☆

نادیہ حیرت سے اپنی پھوپھو کے چہرے پر دیکھ رہی تھی جہاں حسرت، ندامت اور محبت کے نجانے کتنے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ وہ دادی اماں کے فون آنے کے بارے میں پوری تفصیل سن چکی تھی۔ وہ دونوں آمنے سامنے خاموش بیٹھی ہوئی تھیں۔ کافی دیر بعد وہ بولی۔

"پھوپھو! میں آپ کی کیفیت کو سمجھ سکتی ہوں۔ ایسے میں آپ جو بھی فیصلہ کریں گی وہ مجھے قبول ہوگا۔"

زبیدہ نے انتہائی حسرت سے اس کی طرف دیکھا اور تڑپتے ہوئے بولی۔

"نہیں میری جان، میری مجبوریاں اپنی جگہ، لیکن میں تیری زندگی کے عوض کوئی ایسا سودا نہیں کروں گی، جس میں تیری مرضی شامل نہ ہو۔"

"مگر میں بھی تو یہ نہیں چاہوں گی کہ وہ راز جو آپ نے ساری عمر شعیب سے چھپا کر رکھا، وہ میری وجہ سے کھل جائے۔ نہیں پھوپھو، میں ایسا نہیں چاہوں گی۔" وہ گھٹے ہوئے لہجے میں بولی اور آخری لفظ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو رواں ہو گئے۔

"نہیں میری بیٹی، رونا نہیں۔ یہ وقت بہت سوچ سمجھ کر کوئی فیصلہ کرنے کا ہے۔ ورنہ وقت ہمارے ہاتھ سے بھی نکل سکتا ہے۔ مجھے ڈر صرف اس بات کا ہے کہ اگر شعیب کو اس ساری صورت حال کا پتا چل جاتا ہے تو اس کا ردعمل کیا ہوگا۔ اسے شاک تو ضرور لگے گا۔" زبیدہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

"سب کچھ نارمل ہو جائے گا۔ اگر میں واپس حویلی میں چلی جاؤں گی۔ ظہیر شاہ سے میری شادی ہو جائے گی اور میں......" اس نے کہنا چاہا تو زبیدہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں...... میں ایسا نہیں ہونے دوں گی...... تم یوں حوصلہ مت ہارو"

"اس کے سوا کوئی حل نہیں ہے پھوپھو، آپ کا راز بھی رہ جائے گا، حویلی والوں کی عزت بچ جائے گی اور شعیب کو بھی معلوم نہیں ہوگا تو پھر ردعمل کیسا؟ میں نہیں چاہتی کہ آپ کی زندگی میں کوئی ایسا وقت آئے جس سے آپ کو کوئی پچھتاوا ہو۔ میں واپس چلی جاؤں گی۔ مجھے لگتا ہے کہ میری قسمت میں......؟"

"کوئی جذباتی فیصلہ مت کرو۔ میں دیکھتی ہوں کیا کرنا ہوگا۔ ابھی شام ہونے میں بہت وقت ہے۔ ہم کوئی سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کریں گے۔" زبیدہ نے اسے ڈھارس دی اور پھر اٹھ کر کچن کی جانب چل دی۔

یہ لمحات نادیہ کے لیے بہت کٹھن تھے۔ اس کے ذہن میں بھی نہیں تھا کہ اسے ایسی صورت حال کا سامنا بھی ہو سکتا ہے۔ جہاں خون کے جذباتی رشتے اس کی راہ میں آن کھڑے ہوں گے۔ اسے سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہو رہا تھا کہ وہ تو اختر رومانوی کے پاس آئی تھی۔ اس نے تو یہ سوچا تھا کہ ایک غریب شاعر جس کے پاس اگر وقت اچھا نہیں تو کم از کم برا بھی نہیں گزرے گا۔ وہ حویلی والوں کی نگاہ ہی میں نہیں، دنیا کی نظروں میں بھی گم ہو جائے گی۔ اس کی جگہ تو شعیب نے لے لی تھی جو خود ایک سی ایس پی آفیسر تھا اور اس کے شہر میں تھا۔ اس سے اتنا قریب تھا۔ وہ خود اس سے دور آ گئی ہے۔ اختر رومانوی کا گم ہو جانا اسے شدید صدمے سے دوچار کر گیا تھا۔ اسے یہ قطعاً دکھ نہیں تھا کہ شعیب نے

اس سے جھوٹ کیوں بولا، حالانکہ اس نے خود کون سا سچ بولا تھا۔ تاہم جس طرح کے حالات کا اسے یہاں آ کر واسطہ پڑ گیا تھا، ایسے میں شعیب کیا اسے قبول کر لے گا؟ پھوپھو کی مجبوری بھی یہی ہے کہ شعیب کو معلوم نہ ہو۔ اس لیے اسے حویلی واپس جانا ہی ہوگا۔ جس کے پاس وہ آئی تھی، وہی سراب نکلا۔ وہ دوش کسے دے۔ اگر وہ اب بھی اپنی قسمت سے لڑے گی تو بڑی ٹوٹ پھوٹ ہو جائے گی۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں رہی اور شام کے سائے پھیل گئے۔ وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ حویلی سے آنے والے فون کی منتظر تھیں۔ اس سے پہلے کہ فون آتا، نادیہ خود ہی اپنی پھوپھو کے پاس جا پہنچی۔

"پھوپھو۔! میں سمجھتی ہوں کہ آپ ایسے دوراہے پر آن کھڑی ہوئی ہیں، جہاں سے نکلنے والا ہر راستہ آپ کی اچھی بھلی زندگی میں الجھنیں بھر دے گا۔ اس لیے......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔

"اس لیے......؟" زبیدہ نے چونک کر پوچھا تو وہ بڑے اعتماد سے بولی۔

"مجھے حویلی چلے جانا چاہیے۔"

"وہ تمہاری شادی ظہیر سے کر دیں گے اور اب شاید تمہاری وہ اہمیت نہ رہے گی جو حویلی سے قدم نکالنے سے پہلے تھی۔" وہ تشویش سے بولی۔

"پھوپھو، اگر میں اختر رومانوی کے پاس ہوتی تو یہ الگ بات تھی۔ اس وقت تو معاملہ میری پھوپھو کا ہے۔ ایک ایسی ماں کا جو اپنے بیٹے کے سامنے اپنا راز نہیں کھولنا چاہتی۔ یہ آپ پر کوئی احسان نہیں۔ میرا فرض بنتا ہے پھوپھو، باقی رہی اہمیت کی بات، تو وہ پہلے کہاں تھی۔ یہ اچھا ہے کہ شعیب کو میرے بارے میں علم نہیں ہو سکا۔ میں اسے اپنے رب کی رحمت ہی سمجھوں گی۔ آپ بھی اسے کچھ مت کہیے گا۔ میں حویلی کی ان خاموش دیواروں میں زندگی جی لوں گی۔" نادیہ نے کہنا تو بڑے اعتماد سے شروع کیا تھا، مگر کہتے کہتے اس کے آنسو چھلک پڑے اور لہجہ بھیگتا چلا گیا۔ زبیدہ کتنی دیر اسے حیرت سے دیکھتی رہی پھر اسے گلے لگا کر شدت سے رو پڑی۔ کچھ دیر تک وہ دونوں آنسو بہاتی رہیں۔ تب زبیدہ نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیٹی۔ میں تمہیں ان دیواروں میں قید نہیں ہونے دوں گی، بلکہ اب وقت آ گیا ہے کہ ان روایات کے خلاف آواز اٹھائی جائے۔ ہم حویلی جائیں گے اور انہیں احساس دلائیں گے کہ ان روایات کو ختم کرو۔ جس سے زندگیاں درگور ہو جاتی ہیں۔ تم صبر کرو۔ اب اگر راز فاش ہو جاتا ہے تو ہو جائے مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بڑے اعتماد سے بولی، پھر نادیہ کی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کر دیے۔ زیادہ دیر نہیں گذری تھی کہ حویلی سے فون آ گیا۔

"تو پھر کیا فیصلہ کیا تم نے زبیدہ؟"

"اماں! میں آ رہی ہوں۔ میرے ساتھ نادیہ بھی آئے گی، لیکن آپ کو یہ ضمانت دینا ہوگی کہ اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔" اس نے صاف لفظوں سے اپنا مدعا کہہ دیا۔

"میں ضمانت دیتی ہوں، جو اس کا من چاہے گا، ویسا ہی ہوگا۔" انہوں نے پورے یقین سے کہا۔

"ٹھیک ہے پھر میں آ جاؤں گی۔" اس نے حتمی انداز میں کہا اور الوداعی جملوں کے بعد فون بند کر دیا۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر بھا حمید کو فون کر دیا۔

"بھائی جی! مجھے سلامت نگر جانا ہے، گاڑی تو کوئی بھجوا دیں۔" فون ریسو ہوتے ہی اس نے کہا۔

"اپنے شعیب کے پاس جانا ہے نا...... آ جاتی ہے گاڑی، ابھی چاہیے۔" اس نے پوچھا۔

"کچھ دیر بعد بھیجیں مجھے شعیب کے پاس نہیں، نادیہ کو چھوڑنے جانا ہے آپ بھی اسے مت بتائیے گا۔" اس نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کیا اسے نہیں معلوم کہ نادیہ یہاں......" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"نہیں اور نہ ہی کبھی معلوم ہونا چاہیے، یہی سمجھ لیں کہ وہ کبھی یہاں نہیں آئی تھی اور جو ڈرائیور بھی ساتھ میں بھیجیں، وہ بہت بھروسے کا بندہ ہونا چاہیے۔" زبیدہ نے رندھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اچھی بات ہے بہن جی، جیسا آپ چاہیں۔ میں کچھ دیر بعد گاڑی بھجوا دوں گا۔" اس نے انتہائی اختصار سے کہا اور فون بند کر دیا۔ انہی لمحات میں دونوں نے

فطری طور پر ایک دوسرے کو دیکھا تو نادیہ دکھی انداز میں لبوں پر مسکراہٹ لے آئی جس سے زبیدہ کا دل کٹ کر رہ گیا۔وہ کوئی بات کہے بنا حویلی جانے کے لیے تیار ہونے لگیں۔یہ زبیدہ ہی جانتی تھی کہ وہ کس دل سے اتنے برسوں بعد حویلی جانے کی تیاری کر رہی تھی جبکہ نادیہ یہاں سے اٹھ کر شعیب کے کمرے میں چلی گئی۔وہ کتنی ہی دیر تک اس کی تصویر کے سامنے کھڑی رہی۔یوں بت بنی ساکت وصامت جیسے وہ بھی کوئی تصویر ہی ہو۔کافی دیر تک یونہی تصویر کو تکتے رہنے کے بعد وہ ایک دم سے قہقہہ لگا کر ہنس دی۔رات گئے زبیدہ نے اپنا گھر ایک اعتماد والی عورت کے سپرد کیا اور وہ دونوں بھاء حمید کی بھیجی ہوئی گاڑی میں بیٹھ کر سلامت نگر کی جانب چل دیں۔

رات کے تعاقب میں دن پوری طرح واضح ہو گیا تھا ۔جب ان کی گاڑی سلامت نگر پہنچ گئی۔وہاں کی تو دنیا ہی بدل گئی ہوئی تھی۔زبیدہ اپنے ہی بابل کے دیار میں اجنبی تھی۔اتنے برسوں بعد وہ سلامت نگر کی راہوں پر آئی تھی۔اسے بالکل بھی اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ حویلی کدھر ہے اور ایسا ہی حال نادیہ کا تھا۔وہ بھی سلامت نگر کی گلیوں اور راہوں سے نا آشنا تھی۔وہ تو خود اندھیرے میں نکلی تھی اور اب دن کی روشنی میں اسے حویلی کا راستہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔بس غنیمت یہی تھا کہ سلامت نگر میں صرف ایک حویلی ہی پیر سائیں کی تھی۔جہاں تک پہنچنا مشکل نہیں تھا۔پورا قصبہ گذر گیا اور اس کے باہر دربار شریف تھا جس کے ساتھ حویلی اپنی پوری شان وشوکت کے ساتھ ایستادہ تھی۔بڑے پھاٹک پر اب بھی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔زبیدہ اور نادیہ نے چہروں سمیت اپنا پورا بدن سیاہ حجاب میں چھپایا ہوا تھا۔وہاں موجود لوگوں کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ کون ہیں؟ اسے لیے انہیں روک لیا گیا۔زبیدہ سمجھ گئی کہ نادیہ کے بارے کوئی خبر ابھی حویلی سے باہر نہیں نکلی اور نہ ہی اسے کسی نے دیکھا ہے کہ دیکھتے ہی پہچان لیں۔ایک شخص ان کے پاس آیا تو ڈرائیور نے ہی کہہ دیا جو زبیدہ نے اسے بتایا تھا۔

''اماں بی صاحبہ سے ملنا ہے ،انہیں اطلاع دیں۔ہم شہر سے آئے ہیں۔''

''اماں بی صاحبہ کا نام سن کر بڑا پھاٹک کھل گیا،لیکن ذرا فاصلے پر انہیں روک لیا گیا اور ایک ملازم اندر اطلاع دینے کے لیے چل دیا۔

☆......☆

شعیب اچانک ہی پریشان ہو گیا تھا۔اسے یوں لگ رہا تھا کہ وقت کی طنابیں اس کے ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہیں۔سلامت نگر آتے ہوئے جو ذہنی طور پر پرسکون ہو گیا تھا۔ایک دم سے پریشانی نے اس پر حملہ آور ہو گئی تھی۔انہی دو دنوں میں دو ایسے واقعات ہو گئے ،جس نے اس کا دماغ ماؤف کر کے رکھ دیا تھا۔نادیہ کا نمبر اچانک بند ہوا تو پھر اس سے کوئی رابطہ ہی نہ ہو سکا۔اس کے ساتھ کیا ہوا؟ کچھ معلوم نہیں تھا۔وہ خود پر حیران تھا کہ وہ اتنا پریشان کیوں ہے؟ یہ وہی نادیہ ہے جس سے وہ کبھی خود رابطہ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔وہ چاہتا تھا کہ اس سے تعلق ختم ہو جائے۔اب وہی نادیہ اسے اپنے انتہائی قریب محسوس ہو رہی تھی۔یونہی کھیل ہی کھیل میں ،ایک ساتھ چلتے چلتے اتنی گہری قرابت ہو جائے گی ،ایسا تو کبھی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔اس قرابت کی شدت کا اندازہ اسے ان لمحات میں ہو رہا تھا جب وہ اندھیروں میں گم ہو گئی تھی۔وہ مسلسل اس کے نمبر پر رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ہر بار ایک ہی ٹیپ سنائی دے رہی تھی۔اگرچہ اس کے لاشعور میں کہیں تھا کہ وہ یونہی ایک دن گم ہو جائے گی۔لیکن وہ کیوں گم ہو گئی؟ اس سوال کا جواب اسے حیرت زدہ کر رہا تھا۔یہ نادیہ ہی کی کوشش تھی کہ وہ دوستی کی راہ پر چلتے چلتے بہت دور تک آ گئے تھے۔اس کا بناء کچھ کہے اچانک غائب ہو جانا پریشانی کا باعث ہی نہیں فکر مندی بھی پیدا کر رہا تھا۔وہ اسے کہاں سے اور کیسے تلاش کرے، یہی تو اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔سوائے ایک نمبر کے اس کے پاس تھا ہی کیا ؟ یہی ایک سہارا تھا،ایسے کچے دھاگے سے وہ نادیہ تک کیسے رسائی پا سکتا ہے۔یہ تو کبھی بھی اور کہیں سے بھی ٹوٹ سکتا ہے۔اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ یہ وہی نادیہ ہے جس نے دو دن اور دو راتوں سے اس سے بات نہیں کی تھی، کیوں؟ اس کے بعد سب کچھ اندھیرے میں گم ہو جاتا اور اس پر مایوسی چھائے چلی جا رہی تھی۔

مایوسی بھرے ان حالات میں چوہدری ثناء اللہ کی اطلاع کا بوجھ اس کے ضمیر پر بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اسی شہر میں، اس سے تھوڑی دور حویلی میں تاجاں مائی قتل ہو جانے والی تھی یا پھر شاید اسے قتل بھی کر دیا گیا ہو اور اب تک وہ منوں مٹی تلے دفن پڑی ہو۔ یہ بات اس کے علم میں نہ آتی تو الگ بات تھی۔ بہتیرے ایسے واقعات ہوتے ہیں، جن کا علم نہیں ہوتا تو ایسے میں دکھ بھی من میں نہیں اُترتا۔ اب یہ اطلاع اسے تھی۔ ذمے داری اور انسانی ہمدردی کا بوجھ تھا کہ اس پر بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اگر وہ عورت قتل ہو جاتی ہے اور اس ضمن میں اس نے کوئی کوشش بھی نہ کی کہ اسے بچالے تو وہ اپنے آپ کو بھی معاف نہیں کر پائے گا۔ اس کے پاس ایسے کوئی اختیارات نہیں تھے، جنہیں وہ استعمال کرتے ہوئے حویلی کی تلاشی لے سکتا اور تاجاں مائی کو برآمد کر لیتا۔ یہ اختیارات دوسرے آفیسر کے تھے۔ وہ شہر کا سب سے بڑا انتظامی آفیسر ہونے کے باوجود بھی بے بس تھا۔ اس کے پاس اختیار نہیں تھے جس کے باعث وہ کچھ نہیں کر پا رہا تھا۔ اسی بے بسی اور مایوسی والی کیفیت میں وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

اگرچہ شعیب کو اس کا دماغ ایک خاص حد تک جا کر مایوسی کا فیصلہ تو دے چکا تھا لیکن وہ مضطرب تھا، ہار نہیں ماننا چاہتا تھا، کوئی راہ نکالنا چاہتا تھا۔ صاف راستے پر اگر رکاوٹ آ جائے تو ساتھ میں کوئی نہ کوئی پگڈنڈی ضرور منزل تک پہنچا دیتی ہے۔ وہ ایسی ہی کسی پگڈنڈی کی تلاش میں تھا۔ دل اسے مسلسل اکسا رہا تھا کہ ناکامی اس کے لیے نہیں بنی۔ کامیابی کے لیے وہ کوشش ضرور کرے۔ وہ اسی کشمکش میں تھا کہ آفس جانے کے لیے تیار بھی تھا لیکن دماغ مسلسل سوچ رہا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ اچانک ایک خیال اس کے دماغ میں آ گیا۔ وہ نادیہ کو تلاش کرنے میں ایک قدم تو اٹھا سکتا ہے۔ وہ پگڈنڈی اس نے تلاش کر لی تھی۔ وہ سیل فون نمبر ہی سے آگے بڑھنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ یہ کوئی قانونی طریقہ نہیں تھا مگر اسے پورا بھروسا تھا، جو معلومات بھی ملیں گی، درست ہوں گی۔ اس نے اپنا سیل فون اٹھایا اور اپنے قابل اعتماد دوست کو فون کر کے نمبر دے دیا۔ اس دوست نے تھوڑی دیر بعد معلومات دینے کا وعدہ کر لیا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے کافی حد تک اطمینان ہونے کے ساتھ ساتھ حوصلہ بھی ہوا۔ اب وہ اپنے آپ کو مطمئن کر سکتا تھا کہ اس نے کوشش تو کی۔ مایوسی کے بادل کسی حد تک چھٹ گئے۔ وہ تازہ دم سا ہو کر آفس چلا گیا۔ راستے میں اسے خیال آیا کہ تاجاں مائی کے معاملے میں بھی ایسی ہی کوئی پگڈنڈی تلاش کر لی جائے۔ اسے خیال آیا کہ پیر سائیں کی ایک فائل اس کے پاس پڑی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا دیوان اسے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں دھمکیاں دے کر گیا تھا، ممکن ہے اس فائل کی وجہ سے کوئی سودے بازی ممکن ہو سکے۔ تاجاں مائی کی بازیابی کے لیے اسے اگر کوئی غیر قانونی حربہ بھی آزمانا پڑا تو وہ آزمالے گا۔ آفس پہنچتے ہی اس نے اپنے اہلکار سے وہ فائل لانے کے لیے کہہ دیا۔ ابھی فائل اس تک نہیں پہنچی تھی کہ چوہدری ثناء اللہ اور تاجاں مائی کا بیٹا الیاس علی اس کے پاس آ گئے۔ وہ ان کے ساتھ بڑے تپاک سے ملا اور حال احوال کے بعد پوچھا۔

''سنائیں چوہدری صاحب۔! کوئی پیش رفت ہوئی؟''

''میں نے پولیس سے تعاون لینے کی کوشش کی تھی، لیکن آپ کو بھی معلوم ہے کہ وہ سیدھے سبھاؤ تیار نہیں ہیں۔ ہاں بس اب ایک ہی راستہ بچتا ہے۔'' وہ اعتماد سے بولا۔

''وہ کیا؟'' شعیب نے پوچھا۔

''یہی عدالت کا راستہ......'' اس نے بتایا۔

''اس میں تو بڑا وقت لگے گا۔ میں نے بھی یہ سوچا تھا، مگر تب تک تاجاں مائی......'' اس نے بے یقینی کے سے انداز میں کہتے ہوئے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''نہیں سر! تاجاں مائی ابھی تک محفوظ ہے، ہاں مگر اس پر تشدد بہت ہوا ہے۔ یہ اس کا بیٹا کرم علی ہے، اسے وہیں سے معلوم ہوا ہے۔'' وہ پھر اعتماد سے بولا۔ ''جہاں تک عدالت کی بات ہے تو ہم نے ایک مشہور وکیل کے ذریعے ایک کوشش کی ہے۔ آپ کا تعاون ہو تو ہم ابھی کچھ دیر بعد حویلی سے تاجاں مائی کو برآمد کر سکتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ قانونی معاملات کے نکات سمجھانے لگا۔ شعیب غور سے سنتا رہا اور پھر بولا۔

''آپ دیر مت کریں۔ میں آپ کے ساتھ ہر طرح کا تعاون کروں گا۔ میں ڈی ایس پی صاحب کو ابھی یہاں بلوالیتا ہوں، پھر سب سنبھال لیتے ہیں۔ آپ فوراً حکم نامہ لے آئیں۔'' شعیب نے کہا تو ثناء اللہ فوراً ہی اٹھ گیا۔ وہ ڈی ایس پی کو فون کرنے لگا۔ اس وقت وہ فون پر بات کر رہا تھا جب اس کا اہلکار اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ وہ اس کے سامنے کھڑا بات سن رہا تھا۔ وہ فون کر چکا تو اہلکار سے پوچھا۔

''میں نے وہ فائل لانے کے لیے کہا تھا۔''

''سر! میں نے وہ فائل اپنے ذمے صرف اس لیے لی تھی کہ میں پہلے بھی پیر سائیں کے سارے کام کرواتا رہتا ہوں۔ سیدھی سی بات ہے کہ اس میں کوئی جائز کام نہیں ہے اور پھر آپ انکار بھی کر چکے ہیں۔ اس لیے اب وہ کیوں سر؟'' اس نے آخری لفظ بہت جھجک کر کہے تھے۔

''اور میں بھی تمہیں صاف بتانا چاہتا ہوں۔ اس فائل کے ذریعے ممکن ہے میں پیر سائیں سے کوئی سودے بازی کر سکوں۔ تمہیں شاید علم نہیں ہے کہ......''

''سر گستاخی معاف۔ ! میں ثناء اللہ کو دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ پیر سائیں کے خلاف ہی جائے گا......'' وہ تیزی سے بولا۔

''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''سر ان کا پرانا ہی معاملہ چلتا چلا آ رہا ہے۔ خیر! آپ کو سودے بازی کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی اور جو معاملہ ابھی درپیش ہے، میں اس کے بارے میں تو نہیں جانتا لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جو معاملہ ہوگا میں اسے آرام سے حل کروا دوں گا۔ اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں۔'' اہلکار نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''کیسے! جبکہ تمہیں معلوم ہی نہیں ہے کہ معاملہ کیسا ہے۔ وہ سیدھے سبھاؤ حل بھی ہو سکتا ہے یا نہیں؟'' شعیب نے پوچھا۔

''سر! مجھے معاملہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں ابھی دیوان صاحب سے کہہ کر آپ کی ملاقات پیر سائیں سے کنفرم کروا دیتا ہوں، آپ براہ راست خود ہی بات کر لیجیے گا۔'' اہلکار نے تیزی سے کہا۔

''کتنا وقت لگے گا؟'' اس نے پوچھا۔

''میں ابھی بات کر لیتا ہوں۔ آپ کی پیر سائیں سے بات ہو جائے گی تو زیادہ اچھا ہے۔ یہ ثناء اللہ جیسے بلیک میلر لوگوں کے ہتھے نہ چڑھیں، یہ خراب کریں گے۔'' وہ جلدی سے فون نکالتے ہوئے تیزی سے بولا۔

''ٹھیک ہے، تم جاؤ اور فائل مجھے لا کر دو۔ ان سے بات کر لو، میں آج بلکہ ابھی ان سے ملنا چاہوں گا۔'' اس نے حتمی انداز میں کہا اور سامنے پڑی فائل کھول لی، اہلکار سمجھ گیا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ اس لیے فوراً ہی پلٹ گیا۔ تب شعیب دونوں آپشن پر سوچنے لگا، جو بھی ہو اور جیسے بھی ہو، اسے اپنا مقصد چاہیے تھا۔

☆......☆

حویلی کی دوسری منزل پر، پورچ سے بالکل اوپر والے کمرے میں اماں بی اور زبیدہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان دونوں کے درمیان اتنی باتیں ہو چکی تھیں کہ سب کچھ جاننے کے باوجود کئی سوال جنم لے چکے تھے۔ اتنے برسوں کا فاصلہ اتنی دیر میں تو نہیں سمٹ سکتا تھا اور وہ تھیں کہ اس فاصلے کو سمیٹنے کی غرض سے باتیں کرتی چلی جا رہی تھیں۔ نادیہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ فرح اپنے کمرے میں مچل رہی تھی کہ وہ نادیہ سے ملے، مگر اس کی امی نے اسے نادیہ سے ملنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ ظہیر شاہ نے جب نادیہ کی آمد کے بارے میں سنا تو وہ حویلی سے باہر چلا گیا تھا، کہاں تھا، اس کی انہیں خبر نہیں تھی۔ حویلی کے ماحول میں وہی اجنبی خاموشی تیر رہی تھی۔ ایسی ہی بے اعتماد فضا میں دلاور شاہ اپنی ماں کے پاس آ گیا۔ تب وہ دونوں خاموش ہو گئیں۔ کتنے ہی لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ ہر کوئی یہی خیال کر رہا تھا کہ وہ بات کی ابتدا کرے۔ تبھی دلاور شاہ نے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''آپا! آپ نادیہ کو واپس حویلی لے آئی ہیں۔ آپ کا شکریہ۔ آپ نے اسے یہ تو سمجھا دیا ہے نا کہ اب اس حویلی میں کیسے رہنا ہے۔''

''کیسے رہنا ہوگا۔ مطلب...... میں سمجھی نہیں۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' زبیدہ نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا۔

''اس میں نہ سمجھنے والی کون سی بات ہے۔ اس نے جو کچھ کیا، اس کی بھول سمجھ کر معاف کیا جا سکتا ہے، لیکن آئندہ کے لیے اسے حویلی کی روایات کے مطابق رہنا ہو

گا۔ظہیر شاہ سے شادی کے بعد'' اس نے کہنا چاہا تو زبیدہ نے ٹوک دیا۔

''دلاور! اس کے یہاں آنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب تم جو چاہو اس سے منوالو۔ مجھ سے یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ جو نادیہ چاہے گی وہی ہوگا، لہٰذا وہی ہوگا جو نادیہ چاہے گی۔'' زبیدہ نے حیرت، غصے اور افسردگی کے ملے جلے جذبات میں تیزی سے کہا۔

''ایسا ممکن ہی نہیں ہے آپا زبیدہ۔! میں اگر آپ کے گھر سے خاموشی کے ساتھ واپس آ گیا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اپنی روایات بھول گیا ہوں۔ میں نے صرف اس لیے خاموشی اختیار کی کہ اسی میں حویلی کی بھلائی ہے۔ بات نکلتی تو گڑے مردے اکھاڑ لیے جاتے۔ اس میں آپ کا کردار کیا ہے۔ ساری دنیا کو معلوم ہو جاتا۔ آپ اگر یہاں اس وقت حویلی میں بیٹھی ہیں تو اس وجہ سے کہ میں نے نادیہ کو حویلی میں واپس لانا تھا اور بس، وہ آ گئی ہے۔'' پیر سائیں نے خود غرضی سے کہا۔

''دلاور شاہ۔! تم بہت غلط سوچ رہے ہو۔'' زبیدہ نے غصے میں کہا۔

''غلط یا درست! یہ میں نہیں جانتا، مجھے تو وہی کرنا ہے جو میں چاہتا ہوں۔ آج ہی نادیہ کی شادی ظہیر شاہ سے ہو جائے گی۔ اب آپ کا کام ختم ہے، اب آپ سے مجھے کسی تعلق کی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' اس نے واضح لفظوں میں اپنا مدعا کہا تو وہ دونوں حیران رہ گئیں۔ انہیں پیر سائیں سے اس قدر خود غرضی کی توقع نہیں تھی۔ اس پر زبیدہ نے غمزدہ لہجے میں کہا۔

''تم نے یہ سب مصلحت کے تحت کیا اور تمہیں رشتے ناتوں اور تعلق کی کوئی قدر نہیں، نہ ہی اپنے وعدہ کی۔''

جو کچھ بھی آپ سمجھو، میرے خیال میں اگر ہم بات یہیں ختم کر دیں تو زیادہ بہتر ہے۔ آپ چاہیں تو نکاح کے وقت تک یہاں رہ سکتی ہیں تاکہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اس کا نکاح ظہیر شاہ سے ہو گیا ہے۔'' اس نے کہا اور اٹھ کر جانے لگا تو زبیدہ نے بپھرتے ہوئے کہا۔

''جو کچھ تم نے کہا، یہ فقط تمہاری سوچ ہے۔ یہ اس وقت تک حقیقت نہیں بن سکتی جب تک نادیہ نہیں چاہے گی اور پھر تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تمہاری مصلحت کے جال میں آ کر نادیہ کو یہاں لے آئی ہوں اور اسے چھوڑ کر واپس چلی جاؤں گی۔ وہ بھی تمہاری دھمکیوں سے ڈر کر، اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔''

''میں نے جو سوچا ہے، وہی کرنا ہے۔ ابھی تم خود ہی دیکھ لوگی۔'' وہ غصے میں ادب آداب بھی بھول گیا۔ وہ اٹھا تو اماں بی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''دلاور شاہ! کیا تم اپنی ماں کے وعدوں کا پاس بھی نہیں کرو گے۔ میں نے زبیدہ کو زبان دی ہے۔''

''حویلی کی عزت سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے، دلاور شاہ کی ذات بھی نہیں۔'' اس نے کہا ہی تھا کہ اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف دیوان تھا۔ وہ چند لمحے اس کی بات سنتا رہا اور پھر بولا۔ ''انہیں مردان خانے میں بٹھاؤ، میں آتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اس کھڑکی کی جانب بڑھ گیا جہاں سے حویلی کا بڑا دروازہ دکھائی دے رہا تھا، پھر کچھ کہے بنا فوراً ہی کمرے سے نکل گیا۔ دونوں ماں بیٹی نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ تب زبیدہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''اماں! آپ فکر نہ کریں، دلاور شاہ نے اگر مجھے دھوکہ دیا ہے تو میں بھی اسے معاف نہیں کروں گی۔''

''کیا کرو گی تم ...... کچھ بھی نہیں کر سکتی ہو مجھ سے ہی غلطی ہو گئی جو میں نے تمہیں یہاں بلوا لیا۔'' اماں نے بھیگتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اماں! میں جب یہاں آئی تو یہ سب سوچ کر آئی تھی مجھے کسی حد تک اندازہ تھا کہ وہ کیا کر سکتا ہے اس لیے میں نے۔'' زبیدہ یہ کہتے ہوئے چونک گئی۔ وہ تیزی سے کھڑکی تک چلی گئی اور ہونقوں کی مانند باہر دیکھنے لگی، جیسے باہر اس نے کوئی جن بھوت دیکھ لیا ہو، پھر لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''یہ...... یہ...... یہاں کیسے پہنچ گیا؟''

''کون...... کون پہنچ گیا۔'' اماں بی نے گھبرا کر اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ زبیدہ کی حالت دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

''میرا بیٹا شعیب!'' وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

''شعیب یہاں...... کہاں ہے وہ۔'' اماں نے شدید حیرت سے کھڑکی کے پاس آ کر گیٹ کی طرف دیکھا۔ ایک سرکاری گاڑی کے پاس تین لوگ کھڑے تھے۔ ان میں ایک شعیب تھا، ایک ڈرائیور اور تیسرا اہلکار۔

''وہی شعیب ہے، جو تینوں میں سے لمبا ہے'' زبیدہ نے آہستگی سے یوں کہا، جیسے وہ شعیب سے اپنی آواز بھی چھپا رہی، جبکہ نانی نے نہال ہوتے ہوئے کہا۔
''ماشااللہ! کیسا کڑیل جوان ہے۔ میرا نواسہ اللہ نظر بد سے بچائے، بالکل باپ پر گیا ہے۔''
''یہ آ کیسے گیا......؟'' زبیدہ نے کہا۔ وہ مسلسل نیچے انہیں دیکھ رہی تھی۔
''ہاں...... یہ تو ہے، لیکن تم تو کہہ رہی تھی وہ کہیں کام سے گیا ہے۔ گھر آ کر پوچھا ہوگا تو...... یہاں آ گیا۔ اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔'' دادی نے اپنے تئیں اندازہ لگا کر کہا۔
''نہیں اماں! میں نے شعیب کے بارے میں بتایا تھا آپ کو، وہ بچہ نہیں ہے، اسے نادیہ کے بارے میں قطعاً نہیں معلوم کہ وہ میرے گھر وہاں گئی تھی اور نہ ہی میرے بیٹے کو یہ معلوم ہے کہ میرا ابھی کوئی تعلق اس حویلی سے ہے۔'' وہ سوچتے ہوئے لہجے میں بولی۔
''تو پھر یہ یہاں کیسے آ گیا......؟'' اماں بی نے شدت حیرت سے پوچھا تو وہ کھڑکی سے شعیب کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔
''میرا بیٹا یہیں اس سلامت نگر میں سب سے بڑا انتظامی آفیسر ہے۔'' اس کے لہجے میں فخر تھا، ایک ماں کا فخر جو اپنی ہونہار اولاد کے لیے ہوتا ہے۔
''اُوہ! اس طرح تو پھر یہاں ایک طوفان اٹھ جائے گا۔'' اماں بی نے لمحوں میں سوچتے ہوئے کہا۔ مہیب خوف کے سناٹوں میں شعیب کے بارے میں ہونے والی خوشی اچانک دب کر رہ گئی، یوں جیسے خوف کی ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گئی ہو۔
''کاش دلاور شاہ اپنی من مانی نہ کرے اور......'' زبیدہ نے کہا اور غور سے نیچے دیکھنے لگی۔ دیوان اس کے پاس چلا گیا تھا اور اس کو لے کر مردان خانے کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ اسی طرف غور سے دیکھے چلی جا رہی تھی، پھر خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔ ''یہ آیا کیسے ہے؟''
''میں ابھی معلوم کرتی ہوں۔'' اماں بی نے اٹھتے ہوئے کہا اور اپنی ملازمہ کو آواز دے دی۔ مضطرب سی زبیدہ کھڑکی سے لگی کھڑی تھی، وہ بڑے پھاٹک کے پاس کھڑی سرکاری گاڑی کو تکے جا رہی تھی۔ جس میں اس کا بیٹا آیا تھا۔ چند لمحوں میں ملازمہ اماں بی کے پاس آ گئی۔
''پتا کرو، مردان خانے میں کون لوگ آئے ہیں اور کیوں؟'' ملازمہ یہ سن کر پلٹنے لگی تو اماں بی نے دھیمے لہجے میں تاکید کی۔ ''اور سنو، کسی کو معلوم نہ ہو۔''
''جی اماں بی......'' ملازمہ نے کہا اور الٹے قدموں واپس پلٹ گئی تو اماں بی نے زبیدہ کی طرف دیکھ کر کہا۔
''آ، زبیدہ، بیٹھ ادھر میرے پاس، تو پریشان نہ ہو، دلاور شاہ نے وعدہ خلافی کر کے اچھا نہیں کیا، میں اسے سمجھاؤں گی......اور اسے......''
''وہ تو اب میں اسے دیکھ لوں گی کہ وہ نادیہ کی مرضی کے خلاف کیا کر سکتا ہے، لیکن شعیب یہاں کیسے آ گیا۔ یہ کوئی تھوڑی پریشانی نہیں ہے۔ لگتا ہے اب میرا راز کھل جائے گا۔ میں...... میں اپنے بیٹے کا سامنا کیسے کر پاؤں گی۔'' وہ پاگلوں کی طرح خود کلامی میں کہتی ہوئی کھڑکی ہی کے پاس کھڑی تھی۔
''حوصلہ کرو میری بیٹی! اگر اسے معلوم ہو بھی گیا ہے تو کیا ہوگا۔ کیا ماں اور بیٹے کا رشتہ ختم ہو جائے گا؟ ایسے پاگلوں کی طرح مت سوچو، سکون سے میرے پاس آ کر بیٹھو، ممکن ہے وہ اپنے ہی کسی کام سے آیا ہو۔ یہ آفیسر لوگ تو یہاں آتے ہی رہتے ہیں۔ آ میری بیٹی، بیٹھ ادھر۔''
''اللہ کرے ایسا ہی ہو...... میں نے ساری زندگی اس سے یہ بات چھپائی ہے اور اگر اب......'' وہ کہتے ہوئے رک گئی، پھر غصے میں بھرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میرے بارے میں پتا چلتے ہی نادیہ کے بارے میں بھی معلوم ہو جائے گا...... بات یہیں تک نہیں رکنے والی۔ لیکن اب مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔ بات کھلتی ہے تو کھل جائے۔ اب میں دلاور شاہ کو معاف نہیں کروں گی۔''
''اللہ خیر کرے گا، تم صبر تو کرو۔'' اماں بی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا، تب پھر ان دونوں میں خاموشی چھا گئی۔
وہ لاشعوری طور پر ملازمہ کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ اس کی اطلاع پر ہی وہ سوچ سکتی تھی کہ اب اس نے کیا کرنا ہے۔ یہ لمحات بہت بھاری تھے۔ گذارے نہیں گذر رہے تھے۔ ایک طرف دلاور شاہ لکیر کھینچ کر جا چکا

تھا اور دوسری طرف شعیب حویلی آن پہنچا تھا۔ اس وقت زبیدہ ایسی کیفیت میں تھی جیسے کوئی خلا میں ہوتا ہے۔ نہ ہی کچھ سوچ سکتی تھی اور نہ ہی کچھ کہہ سکتی تھی، ایک جمود اس پر طاری تھا کہ وہ انتہائی بے بسی محسوس کر رہی تھی۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ملازمہ پلٹ آئی۔ اس کے چہرے پر عجیب طرح کا تاثر پھیلا ہوا تھا۔

''بولو، کون لوگ ہیں وہ۔؟'' اماں بی نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔

''وہ شہر کے افسر ہی ہیں اماں، لیکن تاجاں مائی کو لینے آئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ پیر سائیں نے اسے قتل کر دیا ہے۔ وہ اسے......'' وہ تیزی سے کہنے لگی تو زبیدہ نے پوچھا۔

''دلاور شاہ کا رویہ کیسا ہے ان کے ساتھ......؟''

''ٹھیک ہے۔ غصے میں نہیں ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ تاجاں مائی کو جانے کی اجازت نہیں، اس سے ملوایا جا سکتا ہے۔''

''اور وہ نہیں مان رہے ہوں گے؟'' اماں بی نے جلدی سے پوچھا

''بس یہی بحث چل رہی ہے۔'' ملازمہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''تاجاں مائی کہاں ہے۔'' اماں بی نے انتہائی آہستگی سے پوچھا تو ملازمہ نے زبیدہ کی طرف دیکھتے ہوئے جھجک کر کہا۔

''وہ تہ خانے میں ہے۔ پیر سائیں نے اسے وہاں بند کر دیا ہوا ہے۔''

''وہ ضد کا بڑا پکا ہے۔ تاجاں مائی کو لے کر ہی جائے گا، مگر وہ تاجاں مائی ہی کو کیوں لینے آ گیا۔'' زبیدہ نے پوچھا۔

''تاجاں مائی کا بیٹا کرم علی ان کے ساتھ ہے۔'' ملازمہ جلدی سے بولی تو اماں بی چند لمحے سوچتی رہی پھر اس سے بولی۔

''اچھا، تو جا...... میں جب تجھے بلاؤں تو آنا۔''

ملازمہ یہ سنتے ہی فوراً پلٹ گئی۔ اماں بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگی۔

''تاجاں مائی تو سب کچھ کہہ دے گی۔ اس کا منہ کون بند رکھے گا۔ اس نے منہ کھولا تو......''

زبیدہ نے سنا تو انجانے خوف سے لرزتی ہوئی چونک اٹھی تھی، اسے فقط اپنے بیٹے کی فکر تھی۔

☆......☆

نادیہ کو اپنے کمرے میں آتے ہی سب سے پہلی تشویش تاجاں مائی کے بارے میں ہی ہوئی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں اس وقت تک بے چین رہی، جب تک اسے تاجاں مائی کے بارے میں پتا نہیں چل گیا کہ اس کے جانے کے بعد اس پر کیا گزری۔ نادیہ کا دل بھر آیا۔ تاجاں مائی نے اس کے لیے اتنی بڑی قربانی دی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد نادیہ کو یہ معلوم ہو گیا کہ تاجاں مائی اس وقت کہاں ہے؟ نادیہ کے گمان میں یہی تھا کہ پیر سائیں اب اپنا راز رکھنے کے لیے تاجاں مائی کو قتل کروا دے گا۔ یہی اس حویلی کی روایات میں تھا کہ راز افشا کرنے والے کی سانسیں کھینچ لی جاتی تھیں۔ وہ اپنی پھوپھی زبیدہ کا راز رکھنے کے لیے دوبارہ حویلی آ گئی تھی۔ یہاں حویلی آنے کا مطلب تھا کہ اپنی زندگی کو داؤ پر پھر سے لگا رہی تھی۔ اگرچہ پھوپھو زبیدہ اور اماں بی نے اسے یقین دلایا تھا کہ ہو گا وہی جو وہ خود چاہے گی، لیکن یہ بات اس کے دل میں نہیں اتری تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایسا ہی ہو گا۔ پھوپھو زبیدہ سے جہاں خون کا رشتہ نکل آیا تھا، وہاں وہ شعیب کی ماں بھی تھی۔ وہ شعیب جس پر دیکھے بنا اعتماد کر چکی تھی۔ اس نے خود کو ان پر قربان کر دیا تھا۔ اس کی اپنی ذات تو نہ رہی تھی لیکن تاجاں مائی بے چاری کا کیا قصور، اس کی تو مدد کرنی چاہیے نا، اگر اسے کچھ ہو گیا تو ذمے دار وہی ہو گی۔ جس کے باعث وہ تشدد کے اذیت ناک مرحلے سے گزری ہے۔ اب اگر وہ حویلی میں ہے تو اس کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ تاجاں مائی کی مدد کرے۔ اس حویلی کی روایات سے وہ بغاوت تو کر ہی چکی ہے۔ باغی کے لیے جو سزا ہے وہ تو مقرر ہو ہی گئی ہے تو کیوں نا، اپنی مرضی کرے۔ یہ سوچتے ہی وہ اپنے کمرے سے اٹھی اور اس جانب چل دی، جہاں تہ خانے میں تاجاں مائی کو رکھا ہوا تھا۔

تہ خانے کا وہ دروازہ لاک تھا۔ دروازے پر جڑا تالا اس کی طرف بڑی حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ یہی تالا تاجاں مائی کی راہ میں رکاوٹ تھا۔ وہ واپس پلٹ

آئی، کچھ دیر بعد جب وہ وہاں پر واپس آئی تو حویلی کی دو ملازمائیں اس کے ساتھ تھیں اور تالا توڑنے کا سامان ان کے پاس تھا۔ ذرا سی دیر میں تالا ٹوٹ گیا اور وہ اس کمرے میں داخل ہوگئی۔ سامنے ننگے فرش پر تاجاں مائی چت لیٹی ہوئی تھی۔ وہ یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے وہ اپنی آخری سانسوں پر ہو۔ تشدد کے باعث اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا۔ کئی جگہ سے جلد پھٹی ہوئی تھی۔ جس سے خون رس رس کر سوکھ چکا تھا یا پھر آنسوؤں کی لکیروں میں بہ گیا تھا۔ وہ نیم جان حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ نادیہ اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ اس کی حالت دیکھ کر خود اس کا اپنا دل بھر آیا تھا۔ اس نے تاجاں مائی کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور دھیرے سے آواز دی۔

''تاجاں مائی۔!''

''بی بی سائیں آپ...... ! آپ...... کیسے...... یہ ماردیں گے...... جاؤ آپ......''

''میں آگئی ہوں نا، ڈرنے کی ضرورت نہیں...... سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' نادیہ نے اسے تسلی دلاسا دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں...... پیر سائیں ماردیں گے۔ آپ کو بھی اور مجھے بھی۔'' وہ تڑپ کر بولی تو نادیہ نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

''کہا ہے نا، کچھ نہیں ہوتا۔ تم اٹھو اور میرے کمرے تک چلو۔ میں دیکھ لیتی ہوں سب کو...... چلو۔''

''بی بی سائیں ! وہ بہت ظالم ہیں۔'' وہ روہانسا ہوتے ہوئے بولی۔

''تمہیں کہا نا۔ اب کچھ نہیں ہوتا۔ میں تمہیں سب بتاتی ہوں۔ چلو اٹھو۔'' اس نے آہستگی سے کہتے ہوئے اسے اٹھایا۔ تاجاں مائی بہت کوشش کے بعد اٹھ گئی۔ اس سے چلا نہیں جارہا تھا۔ نادیہ اسے سہارا دے کر کمرے سے باہر تک لے آئی، پھر دونوں ملازماؤں کی مدد سے وہ کافی کوشش کے بعد اسے اپنے کمرے میں لانے میں کامیاب ہوگئی۔

نادیہ نے تاجاں مائی کو قالین پر لٹایا اور اس کے زخموں پر مرہم پٹی کرنے لگی۔ تب تک ایک ملازمہ اس کے لیے کھانے پینے کے لیے کچھ چیزیں لے کر آ گئی۔ اس سارے دورانیے میں نادیہ نے تاجاں مائی کو اعتماد میں لے لیا اور اس کی پوری حفاظت کے ذمے داری بھی لے لی۔ وہ کافی حد تک سنبھل گئی مگر پیر سائیں کا خوف اب بھی اس پر مسلط تھا۔ وہ گھبرائی، ڈری اور سہمی ہوئی نادیہ کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ حیران ہورہی تھی کہ یہ سب کیا ہوگیا۔

''بی بی سائیں! آپ صرف بی بی زبیدہ کے لیے یہاں آگئی ہیں۔ اپنی ساری زندگی۔''

''ہاں! وہ بھی میرے ساتھ آگئی ہیں اور اماں بی کے پاس ہیں۔ میں نے ان کا راز رکھنا ہے۔'' نادیہ نے عزم سے کہا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، کمرے کا دروازہ کھلا اور زبیدہ کے ساتھ اماں بی وہیں آ گئیں۔ زبیدہ حسرت سے تاجاں مائی کو دیکھ رہی تھی اور ایسی ہی حالت تاجاں مائی کی بھی تھی۔ وہ اس عورت کو دیکھ رہی تھی جس سے وفا کرتے ہوئے اس کی ماں شرماں مائی نے اپنی جان دے دی تھی۔

''تم بہت چھوٹی سی تھی جب میں نے حویلی کو چھوڑا تھا۔ میں بدقسمت رہی کہ تمہاری ماں کو نہ بچاسکی، لیکن نادیہ نے تمہیں بچالیا'' زبیدہ نے انتہائی دکھ سے کہا۔ تبھی نادیہ نے بڑے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''پھوپھو۔! آپ اسے اپنے ساتھ شہر لے جائیں۔ یہاں میں خود سنبھال لوں گی۔''

''کیا مطلب! تم یہاں رہنا چاہتی ہو؟'' زبیدہ نے چونکتے ہوئے کہا۔

''جی پھوپھو۔! آپ بھی جانتی ہیں اور میں بھی۔ آپ کا راز اور میرا راز صرف اسی صورت میں چھپا رہ سکتا ہے، جب تک میں یہاں ہوں۔'' نادیہ نے کہنا چاہا۔

''میں مانتی ہوں نادیہ کہ یہ تم صرف میرے لئے کر رہی ہو اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میرا راز کھل گیا تو شاید شعیب سے بھی نگاہیں نہ ملاسکوں، میں چاہتی ہوں کہ میرا راز، راز ہی رہے، لیکن اس کی اتنی بھاری قیمت کم از کم میں نہیں ادا کرسکتی۔ میں جو سوچ کر یہاں آئی تھی، حالات ویسے نہیں رہے۔ اس وقت یہاں اس حویلی میں شعیب موجود ہے اور وہ اسے لینے کے لیے آیا ہوا ہے۔'' زبیدہ نے کہا تو نادیہ بری طرح چونک گئی، پھر

وہ لرزتے ہوئے بولی۔

''شعیب یہاں...... کیسے......؟''

''یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم وہ ہر حال میں تاجاں مائی سے ملنا چاہتا ہے، بلکہ اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔'' زبیدہ نے کہا تو نادیہ نے اماں بی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اماں ۔! یہ سب کیا ہو گیا ہے...... یہ...... یہ'' وہ شدت جذبات سے کچھ نہ کہہ سکی۔ تب اماں بی نے سکون سے کہا۔

''تم سب سکون کرو۔ میں کچھ کرتی ہوں۔'' پھر پاس کھڑی ملازمہ سے کہا۔'' جاؤ۔ دیوان سے کہنا، میں بلا رہی ہوں۔''

وہ سنتے ہی پلٹ گئی۔ تب اماں نے تاجاں مائی سے کہا۔'' تم باہر سے آنے والوں سے ملو گی۔ انہیں کچھ بھی نہیں بتاؤں گی، بلکہ یہ کہو گی کہ تم یہاں حویلی میں رہنا چاہتی ہو، تم پر کوئی تشدد نہیں ہوا۔ وہ لوگ چلے جائیں تو پھر میں سنبھال لوں گی۔ اپنے بیٹے کو بھی سمجھا دینا۔''

''جی اماں بی سائیں ۔ میں ایسا ہی کروں گی۔''

تاجاں مائی نے سعادت مندی سے کہا اور پرسکون ہو گئی۔ نادیہ سمجھ گئی تھی کہ اماں بی کیا کرنے جا رہی ہیں۔ اس لیے خاموش رہی۔

☆......☆

مردان خانے میں پیر سائیں اپنی مخصوص نشست پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے دائیں طرف پڑے صوفوں پر شعیب اور اہلکار بیٹھے ہوئے تھے اور تاجاں مائی کا بیٹا کچھ فاصلے پر کھڑا تھا جہاں دیوان بیٹھا ہوا تھا۔ ان کے درمیان باتیں ختم ہو چکی تھیں، صرف فیصلہ پیر سائیں پر تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ شعیب اس سے ذرا مرعوب نہیں ہوا تھا۔ اس نے پیر سائیں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تاجاں مائی کا مطالبہ کیا تھا۔ اس دوران فون بھی آتے رہے اور بحث بھی چلتی رہی۔ تب اچانک پیر سائیں نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں آپ لوگوں کو تاجاں سے ملوا دیتا ہوں۔''

یہ کہنے کے ساتھ ہی باتیں ختم ہو گئی تھیں اور وہ لوگ تاجاں مائی کی آمد کے منتظر تھے۔ چند لمحے گذرے ہوں گے کہ بڑی سی چادر میں لپٹی ہوئی تاجاں مائی ان کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ تبھی اس کا بیٹا حیرت اور درد بھری خوشی میں پکار اٹھا۔

''اماں ۔! تم ٹھیک تو ہو نا......''

''ہاں پتر! میں ٹھیک ہوں۔'' پھر بڑے مؤدب لہجے میں پیر سائیں کی طرف دیکھ کر بولی ۔'' جی، پیر سائیں حکم......''

''یہ لوگ تم سے ملنے آئے ہیں۔ تیرا بیٹا لے کر آیا ہے، پوچھ لو کیا کہتے ہیں؟'' پیر سائیں نے رعونت سے کہا تو وہ ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''تاجاں مائی! کیا تم پر حویلی میں کوئی تشدد ہوا ہے، یا تمہیں یہاں اپنی جان کو خطرہ ہے؟'' شعیب نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں سرکار! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ آپ سے کس نے کہا؟''

''تمہارے بیٹے نے اور یہ تمہارے چہرے پر......''

''اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں سیڑھیوں سے گر گئی تھی۔ تب سے یہیں ہوں۔ میرے چوٹیں آ گئی تھیں۔ یہاں میرا بہت اچھا خیال رکھا جا رہا ہے۔ میرا علاج ہو رہا ہے۔'' تاجاں مائی نے بڑی مشکل سے کہا۔

''اوہ! لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہیں تمہارے گھر سے غنڈے اٹھا کر لے گئے تھے...... اور......'' شعیب نے کمزور سے لہجے میں کہا۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، میں ٹھیک ہوں، مجھے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں۔'' تاجاں مائی نے کہا تو شعیب نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ نجانے اسے تاجاں مائی کے بیان پر یقین کیوں نہیں آ رہا تھا۔ اس کا لہجہ اور آنکھیں یکساں نہیں تھیں، مگر یہاں آنکھوں کی زبان پر نہیں، لفظوں پر یقین کرنا تھا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا، پھر فوراً ہی اٹھتے ہوئے بولا۔

''او کے پیر سائیں۔! آپ کو تکلیف دینے کی معذرت، اب میں چلتا ہوں۔''

''کھانا کھا کر جائیے گا۔'' پیر سائیں نے فتح مندی کے بھرپور احساس کے ساتھ کہا۔

''نہیں۔! میں معذرت خواہ ہوں۔'' یہ کہا اور اس سے

ہاتھ ملائے بغیر وہاں سے نکل کر باہر آ گیا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا مردان خانے سے نکلا تھا۔ پیر سائیں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر دیوان کی طرف دیکھا اور بولا۔

''ان لوگوں کو بھی بھجوا دو، میں اب آرام کروں گا۔''

یہ کہہ کر وہ بھی مردان خانے سے نکل گیا۔ تب تاجاں مائی کا بیٹا فوراً اپنی ماں کی جانب آیا اور احتجاج کرنے والے انداز میں کہا۔

''اماں، یہ تو نے کیا کہا۔ کیوں جھوٹ بولا۔۔''

''تم نہیں جانتے پتر! تم جاؤ...... میں حویلی ہی میں رہوں گی...... جاؤ تم۔'' تاجاں مائی نے بڑے پیار سے کہا۔

''نہیں اماں۔! میں نہیں جانتا کہ تو کیوں جھوٹ بول رہی ہے، پر میں تجھے یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ چلو میرے ساتھ'' بیٹے نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں، میں نے کہا نا...... تم جاؤ...... میں یہیں رہوں گی۔'' اس نے کہا اور واپس پلٹ گئی۔ تب دیوان نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''جاؤ پتر جاؤ۔ اس حویلی کے بغیر تم لوگوں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ آرام سے گھر جا کر بیٹھ...... جا۔''

اس کے یوں کہنے پر وہ سر نیچا کیے وہاں سے چلا گیا تو دیوان نے اہلکار کی طرف دیکھا اور دونوں مسکرا دیئے۔

☆......☆

نادیہ کے کمرے میں زبیدہ، اماں بی اور تاجاں مائی بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ شعیب جا چکا ہے۔ وقتی طور پر راز افشا ہونے کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ اماں بی نے دیوان کے ذریعے سارا معاملہ سنبھال لیا تھا، لیکن نادیہ کے بارے میں زبیدہ تذبذب میں تھی کہ اب وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ یہی سوال لیے وہ خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ تبھی اماں بی نے کہا۔

''زبیدہ! میرے خیال میں تم واپس لوٹ جاؤ۔ ایک طوفان جو حویلی میں اٹھنے والا تھا، وقتی طور پر ہی سہی، وہ تھم گیا ہے، اب جبکہ نادیہ بھی حویلی سے نہیں جانا چاہتی، تم یہ سب بھول جاؤ، سمجھو کہ تم نے خواب دیکھا تھا۔ تم اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ۔''

''لیکن اماں! آپ لوگ جانتے بوجھتے نادیہ کو ایسی زندگی میں دھکیل رہے ہو۔ جہاں اس کی اپنی مرضی نہیں ہوگی۔ وہ زندہ ہوتے ہوئے بھی ایک لاش کی مانند ان در و دیوار میں رہے گی، کیوں ظلم کرتے ہیں آپ؟'' زبیدہ کے لہجے میں حد درجہ احتجاج تھا۔ تب اماں بی چند لمحے خاموش رہیں، پھر انتہائی تحمل سے بولیں۔

''زبیدہ! یہ تمہیں نے کہا تھا کہ جو نادیہ چاہے گی، وہی ہوگا۔ اگر یہ تمہارے ساتھ جانا چاہتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اگر اسے دلاور شاہ بھی روکے گا نا، تو میں تمہارے ساتھ کھڑی ہوں گی۔''

زبیدہ نے سنا اور پھر نادیہ کی طرف دیکھا، جو سر جھکائے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے سر اٹھایا اور زبیدہ کی جانب دیکھا، پھر لرزتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''پھوپھو۔! میں نے اگر حویلی سے جانا ہی ہوتا نا...... تو آپ کے ساتھ آپ کے گھر سے آتی ہی نا......''

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم...... تم صرف میرا راز رکھنے کی خاطر خود کو بھینٹ چڑھا رہی ہو۔ میں اپنے ضمیر پر یہ بوجھ قطعاً برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ میری وجہ سے ایک مجبور لڑکی'' زبیدہ نے کہنا چاہا لیکن نادیہ نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں! میں مجبور نہیں اور نہ ہی کمزور ہوں۔ حویلی کے باہر جا کر اتنا حوصلہ مجھے ہو گیا ہے کہ میں اپنے حق کے لیے لڑ سکوں اور یہ حوصلہ اور ہمت میں نے حویلی والوں کو دکھا بھی دیا ہے۔ یہی بات اگر میں کہوں کہ میری وجہ سے آپ کا راز افشا ہو جاتا ہے تو میں اور میرا ضمیر یہ کیسے برداشت کر پائیں گے۔ بولیں۔''

''مجھے فقط اپنے بیٹے کا ڈر ہے۔ میں اسے بتا دوں گی...... تو پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' زبیدہ نے الجھتے ہوئے کہا۔

''آپ کے پاس کیا ضمانت ہے کہ وہ پھر بھی مجھ سے اپنائیت بھرا سلوک کرے گا۔ وہ نفرت نہیں کرے گا مجھ سے۔ میں زندہ در گور ہو جاؤں گی پھوپھو؟'' اس نے سوالیہ انداز میں بڑے جذباتی لہجے میں پوچھا۔

''نہیں بیٹا! میرا راز۔ کیا ہے میرا راز...... میں اپنے بیٹے کے لیے تمہیں کھو دوں۔ مجھے امتحان میں مت ڈالو۔ ہم اسے بتائیں گے ہی نہیں کہ تم کون ہو، پھر مناسب وقت پر بتا دیں گے۔'' زبیدہ نے کہا۔

''جھوٹ کی بنیاد پر تعمیر کی گئی عمارت کو سچ کو ذرا سی

ہوا بھی گرا دیتی ہے۔ کب تک ایسا کر پائیں گے۔ آپ خدا کے لیے اپنی دنیا میں چلی جائیں اور مجھے میری قسمت کے حوالے کر دیں۔ جو ہوگا اب دیکھا جائے گا۔'' نادیہ نے اپنائیت سے کہا تو زبیدہ اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ نادیہ کو یوں تنہا چھوڑ کر واپس چلی جائے۔ تب وہ چونک کر بولی۔

''نادیہ! بیٹی اگر میں شعیب کو سب کچھ بتا دوں اور اس کا ردعمل وہ نہ ہو جو تم سوچ رہی ہو، تو پھر تمہیں میرے پاس لوٹ کر آنا ہوگا...... میں تمہیں......''

''نہیں پھوپھو! میں جانتی ہوں۔ ظہیر شاہ میری زندگی میں آ چکا ہوگا۔ ایسے میں یہ سب ناممکن ہو جائے گا۔ خدا کے لیے پھوپھو، یہ سب کچھ تج دیں۔ بھول جائیں مجھے۔ خدا کے لیے بھول جائیں۔'' نادیہ نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا تو اماں بی نے اپنے مخصوص تحمل سے کہا۔

''زبیدہ۔! میرا نہیں خیال کہ یہ اب تمہارے ساتھ جائے گی۔ تم چپ چاپ واپس پلٹ جاؤ۔ میں دلاور شاہ کو بھی نہیں بتاؤں گی کہ شعیب کون ہے۔ اسی خاموشی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اماں بی کے آنسو اس کی گالوں تک آ گئے تھے۔ زبیدہ چند لمحے سر جھکائے سوچتی رہی، اس کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو گئے تھے۔ وہ کچھ دیر تو خود پر قابو پاتی رہی، پھر اپنی ماں کے گلے لگ کر زار و قطار رونے لگی۔ کافی دیر بعد اس کا من ہلکا ہوا، پھر وہ نادیہ کے گلے لگ کر خوب روئی۔ آنسوؤں کا یہ سیلاب کچھ دیر بعد تھم گیا تو وہ اٹھی اور باہر کی جانب چل دی۔ اماں بی، نادیہ اور تاجاں مائی اسے جاتا ہوا دیکھتی رہیں۔ اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور حویلی سے نکلتی چلی گئی۔

☆......☆

شعیب اپنے سرکاری گھر کے دالان میں یوں سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا جیسے زندگی کی بہت بڑی بازی ہار چکا ہو۔ اگرچہ وہ جس مقصد کے لیے گیا تھا وہ پورا ہو گیا تھا، اسے تاجاں مائی کی زندگی سے غرض تھی۔ وہ نہ صرف زندہ تھی، بلکہ اس کے سامنے آ کر اس نے بیان بھی دے دیا تھا، لیکن۔! طاقت نے کس طرح کمزور کو اپنے شکنجے میں کس لیا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر انتہائی دکھی ہو گیا تھا۔ اس وقت وہ چوہدری ثناء اللہ کی بے بسی کو بھی دیکھ رہا تھا کہ وہ ایک آفیسر تھا تو کس قدر بے بس ہو گیا ہوگا۔ وہ واپس اپنے دفتر نہیں گیا تھا، بلکہ سیدھا سرکاری رہائش گاہ آ گیا۔ وہ کچھ دیر تنہائی میں خود کو حوصلہ دینا چاہتا تھا۔ پہلے تو اس نے سوچا تھا کہ زندگی کس قدر سسک رہی ہے اور کتنی بے بس ہے۔ اس کا اہلکار فاتح مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا اسے سمجھا تا رہا تھا کہ پیر سائیں سے سمجھوتا کر لینے میں ہی فائدہ ہے۔ وہ انہی سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ اس کے دوست کا فون آ گیا۔ جسے اس نے نمبر دے کر پوچھا تھا کہ معلوم کرو۔ اس نے کال ریسو کی اور پوچھا۔

''ہاں مل گیا کوئی اتا پتا۔''

''ہاں...... نوٹ کرو......'' یہ کہتے ہی پتا لکھوانے لگا۔ وہ جلدی سے نوٹ کرنے لگا۔ اس کے دوست نے پتا لکھوایا اور فون بند کر دیا، جبکہ شعیب حیرت میں ڈوب گیا۔ اس کے سامنے جو پتا تھا وہ یہیں سلامت نگر کا تھا اور جس شخص کے نام تھا، وہ تاجاں مائی کا بیٹا الیاس تھا۔ اس کا دماغ گھوم کر رہ گیا۔

''یہ کیا؟'' اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا پھر فوراً ہی اس نے اپنے دوست کو فون کیا۔ اسے نمبر بتا کر دوبارہ تصدیق کی۔ پتا وہی تھا۔

شعیب کی سمجھ میں قطعاً کچھ نہیں آ رہا تھا۔ نادیہ جس فون نمبر سے بات کرتی رہی ہے۔ وہ الیاس کا ہے۔ یہ کیا ماجرا ہے، کیا حویلی سے بھاگ جانے والی لڑکی، جس کی پاداش میں تاجاں مائی معتوب ہوئی تھی۔ کیا ان کا آپس میں کوئی تعلق ہے۔ کہیں نادیہ، وہی لڑکی تو نہیں ہے جو حویلی سے بھاگی تھی۔؟ کہیں وہ نادیہ......'' اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا تھا۔ یہ کیسا اتفاق ہے، جس نے اسے پوری جان سے لرزا کر رکھ دیا تھا۔ کافی دیر تک وہ سوچ ہی نہ سکا کہ یہ معما کیا ہے؟ وہ بالکل ساکت و صامت یوں کرسی پر بت بن گیا جیسے اس میں کوئی جان ہی نہ ہو۔ وہ بالکل خالی الذہن ہو گیا تھا۔ اسے یہ پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اسے ہوش اس وقت آیا جب فون کی مسلسل بجتی ہوئی بیل نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ چونک گیا۔ وہ فون اس کی والدہ کا تھا۔ اس نے جلدی سے کال ریسو کر لی اور تیزی سے پوچھا۔ (جاری ہے)

☆......☆